تدوینِ حدیث

مصنف

حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ

تعارف

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ



کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

تدوینِ حدیث

18/08/08
الاثنین
۱۵ر شعبان ۱۴۲۹ھ
100/-

جس میں حدیث کی شرعی حقیقت، حدیث کی دینی اہمیت وضرورت، اس کی تدوین و حفاظت، اور اس کے معیارِ ردّ وقبول کے متعلق جملہ مباحث پر نہایت تحقیقی وتفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے نیز ان شکوک وشبہات کا نہایت اطمینان بخش جواب دیا گیا ہے جن کی وجہ سے بعض لوگ حجیت حدیث کا انکار کرنے لگتے ہیں!

حضرت علامہ سیّد مناظر احسن گیلانیؒ

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

تفصیلات

نام کتاب : تدوین حدیث

تالیف : مولانا مناظر حسن گیلانیؒ

اشاعت اول (جدید کتابت) : جنوری ۲۰۰۸ء

مطبع : بی کے آفسیٹ پریس دیوبند

قیمت :

﴿ملنے کا پتہ﴾

دیوبند کے تمام کتب خانے

﴿ناشر﴾

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

عرضِ ناشر

فہم قرآن کے لیے سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کریم کے کسی ارشاد کا مفہوم متعین کرنے کے لیے متکلم کی منشاء تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ یہ بات تسلیم کہ ذاتِ خداوندی تک ہماری رسائی ناممکن ہے اور قرآن کریم کے کسی لفظ' جملے اور آیت کے مفہوم و منشاء کے بارے میں ہم معلوم نہیں کر سکتے کہ اے خدائے قدوس اس سے آپ کی کیا مراد ہے یا اس کے جو مختلف مفاہیم سمجھے جا رہے ہیں ان میں سے کون سا مفہوم آپ کی منشاء کے زیادہ قریب ہے، لیکن اللہ کریم کے پیغام بر تک تو ہمیں رسائی حاصل ہے کیونکہ اللہ کریم کے جس پیغام بر نے ہمیں اللہ کی طرف سے قرآن حکیم کا متن عطا فرمایا ہے، اسی نے اس متن کی تشریح بھی فرمائی ہے اور اس کے اکثر و بیشتر مقامات کی وضاحت بھی اپنے ارشادات، اعمال اور اسوۂ حسنہ کے ذریعے کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وہ پیغام بر حضرت رسولِ کریم ﷺ ہیں، جن کے بارے میں رسول اللہ ؐ کا جملہ بولتے ہی ہم ان کی یہ اتھارٹی تسلیم کر لیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہیں۔ جن کا مشن ہی یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم تک پہنچائیں اور اس کی شرح و وضاحت کر کے ہمیں اللہ تعالیٰ کی منشاء سے آگاہ کریں۔

ہم آج تک یہ بات نہیں سمجھ پائے کہ جناب نبی کریمؐ کو اللہ کا نمائندہ تسلیم کر لینے اور قرآن کریم کا متن ہم تک پہنچانے میں مجاز اتھارٹی کے طور پر قبول کر لینے کے بعد اسی قرآن کریم کی تعبیر و تشریح کے ضمن میں جناب رسول کریمؐ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کو "حتمی معیار" تسلیم کرنے میں آخر کونسی رکاوٹ در آتی ہے؟ جبکہ قرآن کریم جن ذرائع سے امت تک پہنچا ہے وہی ذرائع اس کی تشریح میں آپؐ کے ارشادات و فرمودات کو ہم تک منتقل کر رہے ہیں۔ اگر وہ ذرائع قرآن کریم کو امت تک منتقل کرنے میں قابلِ اعتماد ہیں تو حدیث و سنت کو

امت تک پہنچانے میں کیوں قابلِ اعتماد نہیں ہیں،اور اگر وہ حدیث وسنت کی روایت میں خدانخواستہ قابل اعتماد نہیں ہیں تو قرآن کریم کی روایت میں کس طرح قابلِ اعتماد ہو سکتے ہیں؟ ہمارے بعض کرم فرما اس کے جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم چونکہ تواتر کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے،اس لیے وہ شک وشبہ سے بالاتر ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تواتر آخر کن لوگوں کا ہے اور وہ کون افراد ہیں جو اس تواتر میں شامل ہیں۔کیا یہ تواتر احادیث وسنن کی روایت کرنے والوں سے الگ لوگوں کا ہے؟ اور اگر یہ وہی لوگ ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن کے ضمن میں تو وہ لوگ اعتبار اور اعتماد کی سند سے بہرہ ور ہوتے ہیں جبکہ حدیث وسنت کے معاملے میں اس سند اعتماد ووثوق سے محروم ٹھہرتے ہیں، یہ گورکھ دھندہ اور یہ چیستان ہماری فہم سے بالاتر ہے۔

اسی گورکھ دھندے اور چیستان کا حل تلاش کرنے اور اسی گتھی کو سلجھانے کے لیے ''ہم المیزان'' کے پلیٹ فارم سے عالم اسلام کی ایک نادرۂ روزگار علمی شخصیت مولانا سید مناظر احسن گیلانی ؒ کی شہرہ آفاق تالیف ''تدوین حدیث'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جنہوں نے اس موضوع سے متعلقہ سبھی مباحث کو اپنے خاص اسلوب بیان میں ورطہ تحریر میں لاکر خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ہم نے اپنی جانب سے پوری کوشش کی ہے کہ اس کتاب کو اس کے شایان شان شائع کیا جائے۔تاہم اب یہ کتاب آپ کی دسترس میں ہے۔دعا ہے کہ یہ ہماری پیشکش اس موضوع کی تفہیم کا موثر ذریعہ ثابت ہو اور آخرت میں یہ ہماری نجات کا سبب ٹھہرے۔(آمین)

دعاؤں کا خواستگار

عرض ناشر اول

ابتدائے اسلام سے آج تک دینِ اسلام پر خارجی اور داخلی حملے اس قدر مسلسل اور پیہم ہوئے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ خود اس کے محافظ نہ ہوتے تو اس کی بقا دو ایک صدی بھی مشکل ہی تھا۔ یہ تاریخی حقیقت اس بات کا پورا یقین دلا رہی ہے کہ قیامت تک اسلام کی شمع فروزاں ہی رہے گی۔ خواہ آندھیوں کی تندی و تیزی کسی درجہ کو پہنچ جائے۔ مگر مبارک ہے وہ زبان و قلم اور دست و بازو جو وقتی فتنوں کو سرنگوں کرنے کے لئے بے باکانہ مستعد ہو جائے۔

ہر دور میں خلافِ اسلام مہموں کی نوعیت جداگانہ رہی ہے اور اسی نوعیت کے اعتبار سے مجاہدینِ اسلام نے سیف و قلم سے یہ معرکے سر کئے ہیں۔ دورِ حاضر کے داخلی فتنوں میں ایک بڑا فتنہ انکارِ حدیث کا ہے جو دراصل پھیلایا تو گیا مستشرقینِ مغرب کے ہاتھوں، مگر اب خود بعض مسلمانوں کا زورِ قلم اس کی اشاعت میں لگا ہوا ہے، اور غور سے دیکھئے تو یہ اس قدر خطرناک اقدام ہے کہ اس سے اسلام کی بنیاد پر ضرب کاری لگتی ہے۔ جب قولِ رسولؐ اور اسوۂ رسولؐ جو قرآنِ پاک کی مستند اور معتبر تشریح کا دوسرا نام ہے، معیارِ حجت سے خارج کر دیا جائے تو پھر قرآنِ پاک کی نہ تو کوئی ایک تشریح و توضیح رہ سکتی ہے نہ کسی ایک مفہوم پر ملت کے جمع ہونے کا تصور باقی رہ سکتا ہے۔

انکارِ حدیث کے فتنہ کی مضرت کا احساس بہت سے اہلِ علم و فکر کو ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو مشکور فرمائے کہ بہت سے علماء نے منکرینِ حدیث کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کے مدلل اور مسکت جواب دیئے۔ لیکن ایک بات کی کمی پھر بھی رہی، وہ یہ کہ فتنہ جس قلم سے پھیلایا جا رہا تھا وہ جدید طرزِ نگارش اور جدید زاویۂ فکر کے مطابق چل رہا تھا اس لئے اس کا سحر زیادہ تھا اور جواب جس قلم سے دیا گیا وہ جدید طرزِ انشاء اور جدید ذہنی بناوٹ سے ناآشنا تھا۔ نتیجہ یہ کہ جواب کی اصابت کے باوجود اثر انگیزی کم ہی رہی۔

مجلسِ علمی جس کا مطمحِ نظر ہمیشہ سے اسلام کے داخلی اور خارجی فتنوں کی علمی مدافعت رہا ہے، اس فکر میں تھی کہ فتنہ انکارِ حدیث کا رد کسی ایسی ہستی کے زبان و قلم سے ہو جو جدید و قدیم

کا سنگم ہو۔ ہماری مجلس کے مالک مولانا محمد میاں صاحب لائق صد مبارک باد ہیں کہ ان کا ذہن حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل ہوا۔ جنہوں نے خالص علمی نقطۂ نظر سے اس موضوع پر قدم اٹھایا تھا اور آج سے کئی برس پہلے چار محاضرات خاص "تدوینِ حدیث" کے موضوع ہی پر جامعہ عثمانیہ کے توسیعی لکچرز کی صورت میں پیش فرمائے تھے۔

حضرت گیلانی قدس سرہ چونکہ ایک جدید عالم اور ساتھ ہی جدید علمی دنیا سے بھی پورے باخبر تھے اس لئے ان کی علمی افادات کا رنگ اور اثر عام علماء سے کہیں زیادہ ممتاز ہے۔ ان کی وسعت معلومات اور ژرف نگاہی، ان کا طریقِ استدلال اور سحر نگاری اپنے مخاطب کے ذہن وفکر پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے ہم کو قوی امید ہے کہ حضرت گیلانیؒ کی یہ کاوش فتنۂ انکارِ حدیث کے قلع قمع کرنے میں مؤثر ترین ثابت ہوگی۔

مجلس علمی کے پیشِ نظر اشاعت کتب کے ذریعہ نفع اندوزی کبھی بھی نہیں رہی بلکہ اس مجلس کا قیام محض دینِ اسلام کی علمی خدمت کی غرض پر ہوا ہے۔ اور یہی غرض اس وقت "تدوینِ حدیث" کی پیش کش کا محرک بنی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول و مقبول فرمائے۔

ہم کو انتہائی رنج وملال ہے کہ حضرت گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اس کتاب کو مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکے اور ابھی طباعت کا مرحلہ طے بھی نہ ہوا تھا کہ حضرت مؤلفؒ راہیٔ ملکِ بقا ہوگئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ ان کی مرقد کو انوار سے معمور کرے، اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے کہ وہ دینِ اسلام کے اس دور میں ایک جلیل القدر سپاہی تھے اور اپنی ساری عمر اس راہ میں صرف فرماگئے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

ادارۂ مجلس علمی

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

یہ نیرنگیٔ عالم بھی کس قدر حسرت ناک ہے کہ "تدوینِ حدیث" کو پریس کے حوالے کرتے ہوئے جس قلم نے فاضل مؤلف کے اسمِ گرامی کے ساتھ مدظلہ العالی کے کلمات لکھے تھے آج (۵ ، جون ۱۹۵۶ء کو) اسی قلم سے ان حروف کو کاٹ کر رحمۃ اللہ علیہ کے لفظوں سے بدلنا پڑ رہا ہے — نظر اگر اِنَّا لِلّٰہِ کی حقیقت پر نہ ہوتی تو کیا عجب کہ حسرت یاس تک پہنچ جاتی، اور دل بیٹھ جاتا۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تدوین حدیث کے چار محاضرات اس حقیر کو بھیجتے ہوئے یہ ارقام فرمایا تھا:

"میری غرض یہ ہے کہ آپ کی علمی امداد ان محاضرات کی اشاعت وطباعت میں ہے ترتیبِ صوری کا کلی اختیار آپ کے سپرد کرتا ہوں، آپ کے اختیارِ تمیزی پر مجھے بھروسہ ہے۔ اسی طرح عنوانات کے سلسلے میں بھی آپ کو اختیار دیتا ہوں۔ سورۂ کہف[1] پر آپ نے جو عنوانات قائم کئے تھے، ان ہی کو دیکھ کر میرے حُسنِ ظن میں اضافہ ہوگیا اب آپ جانیں اور مولانا طاسین صاحب[2] ..... اپنا جو حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس کی توقع مشکل ہی سے کر سکتا ہوں کہ خاکی آنکھوں سے اس کتاب کو مطبوعہ شکل میں دیکھنے کی مُہلت مل جائے گی، وقت زیادہ دُور نہیں معلوم ہوتا..... "

پھر جب اس ارشاد کی تعمیل اس ہیچداں نے کر دی اور مُرتَّبہ فہرست کی ایک نقل خدمت گرامی میں پیش کرنے کی سعادت پائی تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ سعیٔ حقیر خاطرِ احسن میں جگہ پاگئی اور ان شفقت بھرے الفاظ میں شاباشی ملی:

"ایک ہفتہ سے زیادہ مدت گزری کہ آپ کا وہ کارنامہ میرے پیشِ نظر ہے جو شاید آپ

---

[1] مولانا گیلانیؒ کی نوشتہ تفسیر سورۂ کہف جواب طبع ہو چکی ہے۔

[2] ناظم "مجلس علمی" کراچی جن کی تحریک اور خصوصی توجہ سے مدوینِ حدیث کی کتاب مجلس علمی کی طرف سے شائع ہو سکی! جزاہُ اللہُ عن جمیعِ المسلمین احسن الجزاء۔

کے سوا کسی اور سے بن پڑنا آسان نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ "متابعات" کے بعد "شواہد" بس ایک لفظ قابلِ ترمیم نظر آیا۔ آپ جو حدیث کے طالب علم نہیں ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کامیاب فہرست کیسے بنالی جو ہمارے عام مولویوں کے لئے بھی آسان نہ تھی، فجزاکم اللہ عنا خیر الجزاء ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (۲۰/ اگست ۱۹۵۵ء)

"تدوین حدیث" کی زیرِ نظر کتاب اس قدر ضخیم ہو کر بھی تشنۂ تکمیل ہی رہ گئی۔ اس میں ایک اور محاضرہ کا اضافہ ہونا تھا جو حضرت مؤلف قدس سرہ کی طویل علالت کے سبب نہ ہو سکا، چنانچہ خود تحریر فرماتے ہیں:

"اسماء الرجال کے فن پر افسوس کہ نہ لکھ سکا، ایک محاضرہ اس کے لئے ضروری تھا معلومات فراہم شدہ ہیں لیکن ترتیب کون دے؟ بندہ کے لئے تو ان چند سطروں کا لکھنا بھی دشوار ہے۔" (۲۰/ اگست ۱۹۵۵ء)

پھر بھی جتنا کچھ مواد جمع فرما گئے وہ اس قدر کافی ووافی ہے کہ اگر کسی نے انکارِ حدیث کی ٹھان ہی نہ لی ہو تو اس کے شکوک وشبہات کی پوری تشفی وتسلی ہو سکتی ہے۔

استاذ الاساتذہ رخصت ہو گئے اور یقین ہے کہ اپنی منہ مانگی مراد بلکہ اس سے بھی کچھ سوا ہی پا گئے ہوں گے مگر جاتے ہوئے انہوں نے اپنی فکر ونظر کا جو سرمایہ ہمارے لئے چھوڑا وہ بھی ان شاء اللہ زندۂ جاوید اور ان کے حق میں صدقۂ جاریہ بنا رہے گا۔ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ رَحْمَةً وَّاسِعَةً۔

محزون

غلام محمد (عثمانیہ)

فہرست مضامین

تعارف از سید العلماء سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

دیباچہ از حضرت مؤلفؒ

ج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

از سید العلماء مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء و جوارح تک خون پہنچا کر ہر آن ان کے لئے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا رہتا ہے، آیات کا شانِ نزول اور ان کی تفسیر، احکام القرآن کی تشریح و تعیین، اجمال کی تفصیل عموم کی تخصیص، مبہم کی تعیین، سب علم حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے، اسی طرح حامل قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حیاتِ طیبہ، اور اخلاق و عاداتِ مبارکہ، اور آپ کے اقوال و اعمال اور آپ کے سنن و مستحبات اور احکام و ارشادات اسی علم حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح خود اسلام کی تاریخ، صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے احوال اور ان کے اعمال و اقوال اور اجتہادات و استنباطات کا خزانہ بھی اسی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اسلام کے عملی پیکر کا صحیح مرقع اسی علم کے بدولت مسلمانوں میں ہمیشہ کے لئے موجود و قائم ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ تا قیامت رہے گا۔

مسلمانوں نے آغازِ اسلام سے قرآن پاک کے بعد اس علم کو اپنے سینہ سے لگایا اور اپنی پوری محنت، قابلیت اور اخلاص و عقیدت کے ساتھ اس کی ایسی خدمت کی کہ دنیا کی کوئی قوم اپنی قدیم روایات و اسناد کی حفاظت کی مثال نہیں پیش کر سکتی اور ایسا ہونا ہی ضروری تھا کیونکہ اسلام قیامت تک کی زندگی لے کر آیا ہے اس لئے اس کے صحیفۂ آسمانی اور حیاتِ نبوی کا رشتہ بھی قیامت کے دامن سے وابستہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کا اظہار قرآن پاک کی اس آیت میں فرمایا ہے:

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ	اور تم کیسے اللہ کے ساتھ کفر کر سکتے ہو حالانکہ تم کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول موجود ہے۔

اس آیت پاک سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دائمی ہدایت کے لئے دو ایسی مشعلیں روشن کردی ہیں جو قیامت تک بجھنے والی نہیں ہیں، ان میں سے ایک تو آیات اللہ ہیں یعنی قرآن پاک اور دوسری چیز رسول کا وجود حقیقی وجود بھی اور مجازی بھی، ظاہر ہے کہ کوئی انسان اس دُنیا میں ہمیشہ کے لئے نہیں آیا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے چنانچہ قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کردیا ہے

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ — اور ہم نے آپ سے پہلے کسی کیلئے بھی ہمیشہ کی حیات دنیا نہیں رکھی۔

اور

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ — آپ بھی مرجائیں گے اور وہ بھی مرجائیں گے۔

لیکن اس موت کے بعد بھی حیات نبویؐ کو مجازاً وہی دوام وقیام نصیب ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی زندگی کے ہر حرف کو دوام بخشا اور علم حدیث کے اوراق میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی اہلِ بصر کو چلتے پھرتے اور بولتے چالتے دکھائی دیتے ہیں، اسی لئے بزرگوں کا مقولہ ہے "جس گھر میں حدیث کا مجموعہ ہے فَكَاَنَّمَا فِيْهِ نَبِيٌّ يَّتَكَلَّمُ اس گھر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی تکلم فرماتے ہیں"

اسی بات کو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول مبارک میں ظاہر فرمایا ہے:

اِنِّيْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهٖ (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالسنۃ) — میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جن دو کو جب تک مضبوط پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہوگے، اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے پاس قرآن پاک اور سنت نبوی دونوں ملکر قیامت تک یہ ہدایت کا سرچشمہ رہے گا۔ دوسری بات اس سے یہ واضح ہوئی کہ اسلام کی صحیح تصویر اور اسلام کی صحیح تعلیم کتاب اور سنت کی باہمی توفیق وتطبیق سے معلوم ہوگی اور جن لوگوں نے یہ چاہا یا چاہیں گے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کریں اور ایک کو مانیں اور دوسرے کا انکار کریں وہ صراطِ مستقیم سے دُور ہوئے اور ہوں گے۔

جن لوگوں کی نظر ملل ونحل اور علم کلام وعقائد اور تاریخ فرق پر ہے وہ آسانی سے اس بات کو مان لیں گے کہ اسلام میں جتنے بدعتی فرقے پیدا ہوئے وہ وہی ہیں جنہوں نے کتاب کو سنت سے یا سنت کو کتاب سے الگ کرنا چاہا خوارج نے کتاب کو مانا اور سنت سے انحراف کیا اور ان کے مقابل کے

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کی کھلی شہادت اس سے ملتی ہے کہ صحابہؓ کے آخری زمانے سے لے کر اس وقت تک سینکڑوں چھوٹے بڑے بدعتی فرقے پیدا ہوئے جنہوں نے اسلام کے چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش کی اور اسلام کے منور آئینہ کو مکدر کر دینا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے ہر دَور میں ایسے لوگوں کو پیدا کیا جنہوں نے بتائیدِ الٰہی ان گرد بیزوں کی ساری آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا اور ان کے بدعات کے گرد و غبار کو ہٹا کر اس آئینہ کو ہمیشہ روشن رکھا۔

اس زمانے میں بھی ان بدعقیلوں کے مقابلہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کو ہمت، جرأت، بصیرت اور اہلیت و استعداد بخشی جنہوں نے ان کے ہر تیر کو اپنے سپر سے روکا، ان کے ہر حملہ کا کلکہ بلکہ جواب دیا، ان کے ہر اعتراض کو دور کیا اور ان کے ہر شبہ کو دفع کیا۔

اس زمانے میں اس فرض کو ادا کرنے کے لئے جو دستہ آگے بڑھا اس کے ہراول میں ہمارے دوست، مناظرِ اسلام، متکلمِ ملت، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی (متع اللہ المسلمین بطول بقائہ) کا نام نامی ہے جن کے قلم کی روانی، اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے وہ ہر سال اور رسالے کے مختلف حصوں میں اپنی تحقیقاتِ علمیہ کے بلند نمونے پیش کرتے رہتے ہیں اور خصوصًا اپنے توسیعی خطبات اپنے تلامذہ کے امتحانی مقالات کے پردے میں علم اور دین کی ایسی خدمتیں انجام دے رہے ہیں جو سارے مسلمانوں کی تحسین اور شکریہ کی مستحق ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ بھی موصوف کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے جس میں انہوں نے زمانہ کی ذہنیت اور مذاق کا لحاظ رکھ کر علم حدیث کی تعریف، علم حدیث کی اہمیت، اس کی تاریخ اور اس کے تحریری سرمایہ کے آغاز و انجام اور اس کی تدوین پر محققانہ مباحث لکھے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ملت کیلئے ان کے وجود کو ہمیشہ نافع سے نافع تر بناتا رہے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ہیچمداں

سید سلیمان ندوی ۱۲، ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ ہجری

فاتحۃ الکتاب

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

سینکڑوں صفحات میں حدیث کی تدوین کی یہ سرگزشت آپ کے سامنے پیش ہو رہی ہے۔ پڑھنے کے بعد پڑھنے والوں کے قلوب میں جو اثر مرتب ہوگا اصلی چیز تو وہی ہے۔ خود غریب مصنف تجربہ سے پہلے کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ اس کے کام کی نوعیت بس اسی قدر ہے کہ کتابوں میں عہدِ نبوت وخلافتِ راشدہ کے متعلق حدیث کی تدوین کے سلسلہ میں جو باتیں منتشر اور بکھری ہوئی صورتوں میں پائی جاتی تھیں، ان سب کو ایک خاص نظام کے تحت مرتب کرکے مسلمانوں کے آگے پیش کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو خود سوچنا چاہیئے کہ اِن روایات کی روشنی میں حدیث کے ساتھ ان کی دینی زندگی کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ اس زمانے میں ادھر ادھر کی چند پراگندہ معلومات کے زیرِ اثر

حدیث کے انکار واقرار کا ایک نیا قصّہ

چھیڑ دیا گیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس کتاب کے پڑھ لینے کے بعد شائد لوگ اسی نتیجہ تک پہنچیں گے کہ انکار واقرار دونوں کے صحیح حدود سے باہر نکل کر لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ ابتدائے اسلام سے اس وقت تک حدیث کا ایک خاص مقام مسلمانوں کی دینی زندگی میں رہا ہے، یہی اس کا طبعی مقام ہے۔ خصوصاً حدیثوں کا وہ ذخیرہ جس کی اصطلاحی تعبیر "خبر احاد" سے محدثین کرام فرماتے ہیں۔ بہرحال قرآن اور قرآنی مطالبات کے عملی توالب وتشکیلات کے سوا مسلمانوں کی دینی زندگی کی تعبیر میں اول سے آخر تک "حدیث" بھی شریک ہے، یہ ایک ایسی ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جس کا انکار وہ بھی نہیں کر سکتے جو مسلمان نہیں ہیں۔ اس واقعہ کا انکار ایک ایسے واقعہ کا انکار ہے جس کا علم تواتر کی راہ سے پھیلا ہوا ہے۔ منکرینِ حدیث اگر اس واقعہ کے منکر ہیں، تو وہ خود بھی

جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں، ایک ایسا دعویٰ کر رہے ہیں جسے خود ان کا دل بھی جھٹلا رہا ہے، لیکن انکار سے ان کا مطلب اگر یہ ہے کہ قرآن اور قرآنی مطالبات کو مسلمانوں کی دینی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے وہی اہمیت کسی زمانہ میں خبر احاد کو نہیں دی گئی۔ جن پر حدیثوں کا عام ذخیرہ مشتمل ہے، اگر ان کے انکار کا حاصل یہی ہے تو پھر ان کا یہ انکار ایک ایسا انکار ہے جس کا اقرار ہر زمانے میں مسلمان کرتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی وہ اسی کے قائل ہیں۔

کاش! حدیث کے انکار و اقرار کا یہ قصہ اگر مصالحت کے اسی اجتماعی نقطہ پر سمٹ کر ختم ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ اس کتاب کے لکھنے کی غرض پوری ہو گئی۔ فقط وَالسَّلَامُ عَلیٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی۔ وَاِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ۔

الفقیر الاٰہن الجانی

مناظر احسن گیلانی

سابق خادم حدیث فی الجامعۃ العثمانیۃ
حیدرآباد دکن

موضوعِ بحث کی تشریح

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

علم حدیث پر بحث کرنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے ان چند سوالات کو رکھ لینا چاہئے۔

① حدیث کی حقیقت کیا ہے۔

② اس علم کی تدوین کب، کس طریقہ سے، کس زمانے میں شروع ہوئی، اور ان طریقوں کا اس علم کے وثوق واعتماد پر کیا اثر مرتب ہوا یا ہو سکتا ہے۔

③ ابتداء سے اس وقت تک اس فن کی ممتاز خدمتیں جن بزرگوں نے انجام دیں خود ان کی اور ان کے کارناموں کی تفصیل۔

④ اس فن کے متعلق کن جدید تکمیلی کوششوں کی ضرورت باقی ہے۔

⑤ حدیث کے بعد فنِ حدیث کے دوسرے متعلقات یعنی فن اسماء الرجال اور اصولِ حدیث کی حقیقت، ان کی تاریخ، موجودہ حیثیت، ان میں آئندہ ترقیوں کے امکانات۔

حدیث کی حقیقت

سب سے پہلے میں پہلے سوال کو لیتا ہوں یعنی حدیث کی حقیقت کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ عموماً دنیا میں دو طرح کی قومیں پائی جاتی ہیں، بعض بلکہ شائد زیادہ تر قومیں ایسی ہیں جنہوں نے اپنے حال کو ماضی سے وابستہ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ کسی قوم کا کوئی حال ماضی سے الگ ہو کر تعمیر پذیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود اس واقعہ کے جیسے جیسے وہ آئندہ کی طرف بڑھتی رہیں اپنے ماضی کو بھلاتی چلی آئیں۔ ان کے پاس اپنے موجودہ حالات پر غور و فکر کرنے کے

لئے گزشتہ حالات و واقعات تجربات و مشاہدات کا کوئی سرمایہ نہیں ہے گویا جس طرح جنگل کی زندگی گزاری جاتی ہے، یہ بھی گزارتے ہیں۔ آخر ریچھوں اور بندروں کو کیا معلوم کہ ان کے جدِ اعلیٰ کون تھے کن کن جنگلوں اور وادیوں، پہاڑوں سے چھلانگیں مارتے ہوئے ان کے آباؤ اجداد موجودہ مقام تک پہنچے۔ کن کن حالات سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔

لیکن ان کے مقابلے میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ ان قوموں کا بھی ہے، جنہوں نے حتی الوسع اس کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حال کی تعمیر میں ماضی کے تجربات اور واقعات سے نفع اٹھایا جائے اور اس کے لئے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ گزرے ہوئے واقعات کو کسی نہ کسی طرح محفوظ کر لیا جائے۔ انسانیت کے اس گروہ کی کوشش کا نام تاریخ ہے۔ ابتدا میں تاریخ کی حفاظت و بقا کا شوق قوموں میں کم رہا ہے۔ لیکن اب تو یہ ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گئی ہے کہ اپنی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ ہر قوم اس پر خرچ کر رہی ہے جس سے ہم اور آپ سب واقف ہیں جنگل کی زندگی بسر کرنے والے بھی اب اپنے اجداد و اسلاف کے کارناموں کی جستجو گڑی ہوئی ہڈیوں اور پرانے مقبروں اور مرگھٹوں میں کر رہے ہیں۔ کونے کونے سے قدیم سکے برآمد کئے جا رہے ہیں، کہنہ قبروں کے کتبوں کے حروف پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پرانے کھنڈروں کی ایک ایک ٹھیکری چنی جا رہی ہے۔ ان ہی پر واقعی کہیے یا خیالی بلند و بالا عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں، گویا اس علم کی ناگزیر ضرورت کو دنیا کی اکثر قوموں نے اب تسلیم کر لیا ہے، اور بجز چند ارتیابی الطبع شکی مزاج، خشک دماغ فلسفیوں کے عام دنیا کا شدید رجحان بھی ان چیزوں کے جاننے کی طرف ہے۔

عام تاریخ اور فنِ حدیث

دنیا کی اسی تاریخ کے ایک عظیم الشان، حیرت انگیز انقلابی حصہ کا نام سچ پوچھئے تو حدیث ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جن انقلابات و حوادث سے گزر کر نسلِ انسانی موجودہ حالت تک پہنچی ہے، ان میں ایک ایسا واقعہ جس نے کسی خاص شعبۂ حیات ہی میں نہیں بلکہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی تمام شعبوں میں انسانیت کا رُخ پلٹ دیا جس سے زمین کا کوئی خاص حصہ نہیں بلکہ بلا مبالغہ مشرق

ومغرب دونوں متاثر ہوئے، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ماضی کے اس مدہش حیرت انگیز واقعہ کی تاریخ یا تفصیلی بیان کا نام حدیث ہے۔ اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے حدیث کا تعلق قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک واقعات وحالات کا تعلق ہے میں حدیث کو انسانیت کی تاریخ کا ایک حصہ اور ایسا حصہ قرار دیتا ہوں جس کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ ایک بے نظیر عدیم المثال عالمگیر انقلابی عہد سے اس کا تعلق ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو آج جس کسی کے پاس یا جس قوم وامت کے ہاتھ میں بھی ماضی بلکہ حال کی تاریخ کا جو حصہ ہے وہ وثوق واعتماد میں تاریخ کے اس "محفوظ حصہ" یعنی حدیث کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں ان آزردہ فطرت شکیوں میں نہیں ہوں جو تاریخ کو جھوٹ کا جنگل قرار دیکر ماضی کا انکار کرتے ہیں اور "جو کچھ محسوس ہو رہا ہے یہ نہیں محسوس ہو رہا ہے"۔ اس سوفسطائی نظریہ پر زور دیکر حال کے وجود کو بھی شک کے دانتوں سے چبا کر ختم کرنا چاہتے ہیں بلکہ تاریخ کے مقررہ معیار پر ماضی کے جن واقعات کی اب تصحیح ہو چکی ہے اس کی قدر کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ آئندہ کی راہ درست کرنے کے لئے ہمیں ہمیشہ ماضی کی روشنی سے نفع اٹھانا چاہئے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ   لوگوں سے پچھلے قصے بیان کیا کر تاکہ وہ سوچیں۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ ایک بڑے مشہور مسلم الثبوت مؤرخ کا بیان ہے کہ "کسی زمانے کے حالات جب قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کرلی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام ونشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں سے وہ واقعات انتخاب کرلئے جاتے ہیں جو قرائن وقیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑے زمانے کے بعد (یعنی کتابی شکل اختیار کرنے کے بعد ہی) ایک دلچسپ تاریخ بن جاتی ہے۔ یورپ کی اکثر تصنیفیں اسی اصول پر لکھی گئی ہیں"۔ اور اس وقت ہمارے پاس ماضی کی تاریخوں کا جو ذخیرہ ہے خواہ وہ روم ہو یا یونان، چین ہو یا ایران ان قدیم اقوام کی تاریخ جن ذرائع سے مرتب ہوئی ہے اگر ان کے اساسی سرچشموں کی جانچ کی جائے گی تو جو کچھ اس فاضل مورخ نے بیان کیا ہے بہت کچھ اس کی توثیق کرنی پڑے گی۔ مشکل ہی سے انسانوں کے پاس اس وقت کوئی ایسی

تاریخی یادداشت مل سکتی ہے جسے واقعہ کے عینی شاہدوں نے خود مرتب کیا ہو، یا ان کے براہ راست بیانوں کو خود ان ہی سے سن کر کتابوں میں درج کیا ہو۔ اتفاقاً اگر کوئی ایسی چیز مل بھی جائے تو اس کا پتہ چلانا قطعاً دشوار بلکہ شاید ناممکن ہے کہ ضبط و اتقان، سیرت و کیرکٹر کے لحاظ سے ان کا کیا درجہ تھا۔ معتبر سے معتبر ترین کسی تاریخی ذخیرہ کے وثوق کے متعلق اگر کوئی بات پیش کی جاسکتی ہے تو یہی ہے کہ جس زمانہ میں واقعہ گزرا ہے مورخ خود ہی اس زمانے میں موجود تھا۔ اتفاق سے کسی واقعہ کے متعلق اگر ایسی شہادت میسّر آجاتی ہے تو تاریخ کا یہ حصہ زریں شاہکاروں میں شریک کردیا جاتا ہے۔ لیکن خود اس معاصرت کا یہ حال ہے کہ قدیم ماضی کے تاریک زمانے کو تو جانے دیجئے آج جب کہ جدید صناعات و ایجادات نے زمین کی طنابیں کھینچ کر ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملا دیا ہے، تعلیم عام ہوچکی ہے، کم از کم یورپ کے مکتبوں اور اسکولوں میں روئے زمین کے اطلسوں کا مطالعہ ہر ایک کو کرادیا جاتا ہے۔ لیکن ایک واقعہ نہیں، آئے دن ایسی ایسی جہالتوں اور غلط فہمیوں کے شکار غریب جاہل مشرقی ہی نہیں بلکہ فرزانہ و دانا فرنگ کے ارباب خبر و علم ہوتے رہتے ہیں کہ بعض دفعہ آدمی کو حیرت ہوجاتی ہے اور تاریخ جھوٹ کا جنگل ہے، دماغ سوچنے لگتا ہے کہ کیا اس دعوی میں کچھ واقعہ کا عنصر بھی شریک ہے؟ بہت پرانے زمانے کی بات نہیں ہے کہ ۱۹۰۵ء میں کانگڑہ (پنجاب) کا مشہور زلزلہ ہندوستان میں آیا تھا۔ ایک نہیں بلکہ متعدد انگریزی اخباروں میں اس زلزلہ کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ کانگڑہ جو بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے وہاں ایک سخت زلزلہ آیا۔" اور بے چارے اخبار والے تو شہر خبروں کی جماعت ہے۔ عام طور پر گپ نویسی میں یہ بدنام ہے، لیکن مشہور ریفرنس بک ہیزل کی اینویل جو مشہور کتاب ہے اور ہر قسم کے حوالہ جات کے لئے ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے اس میں اسی زلزلے کے متعلق یہ عبارت اس وقت تک موجود ہے۔ "ایک سخت زلزلے نے ایک وسیع ضلع میں جو آگرہ اور شملہ کے درمیان واقع ہے عام تباہی اور سخت نقصان برپا کیا۔"

نقصان کی تفصیل بتاتے ہوئے صرف اسی مورخ نے نہیں بلکہ دوسروں نے بھی یہ رقام فرمایا ہے کہ "اس سے کئی سو آدمی ہلاک ہوئے" حالانکہ پنجاب گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق اس زلزلے میں بیس ہزار سے کم آدمی ہلاک نہیں ہوئے تھے۔ معاصر مورخین کی کتابوں میں اگر اس قسم کی طرفگیوں اور بوالعجبیوں

حفاظت میں لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی وہ ساری کوششیں اور تدبیریں صرف ہوئی ہیں، جو کسی واقعہ کی حفاظت کے متعلق آدمی کا دماغ سوچ سکتا ہے بلکہ اس کی حفاظت وصیانت میں بعض ایسے قدرتی عوامل نے بھی کام کیا ہے، (جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہوگا) جو دُنیا کے کسی تاریخی واقعہ کو نہ اُس وقت تک میسر آئے اور نہ آئندہ آسکتے ہیں۔ کس احترام واعزاز کی مستحق ہونی چاہیئے۔

حدیث کی مذہبی تعریف

لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہوں اس پر بھی متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ حدیث جس کے متعلق نہ جاننے والوں کا صرف یہ خیال ہے کہ وہ دینیاتی طرز کی کوئی چیز ہے اور دینیات کے لفظ کے ساتھ ہی ان کا دماغ فوراً دور وحشت کے ان قدیم خرافات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جسے بدقسمتی سے اس زمانہ میں مذہب یا مذہب کی ایک قسم خیال کیا جاتا ہے۔ گویا دینیات کے معنی چند وہمی رسومات وعادات یا چند رٹے ہوئے الفاظ منتر جنتر، جادو، ٹوٹکے وغیرہ کے ہیں، جن میں صحرائی باشندے کسی زمانے میں کیا اب تک مبتلا ہیں۔ مذہب کے متعلق جن کے دلوں میں اس قسم کے خیالات ہیں، حدیث جو مسلمانوں کے مذہبی علوم کا ایک جزو ہے، اس کے متعلق میرے ان دعووں کو سن کر ممکن ہے کہ انہیں حیرت ہو۔ اور ان کی حیرت تو چنداں محل تعجب نہیں، اس لئے کہ جہل ان مسکینوں کے لئے بڑا عذر ہے لیکن جاننے والوں کو بھی شائد شبہ ہوتا ہوگا کہ مدرسہ میں جس فن کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور واقعات جو ان کے سامنے پیش آئے لیکن ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی (جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں) غرض پیغمبرؐ کے اقوال وافعال وتقریر کا نام حدیث ہے اور بعضوں نے اس کو آگے بڑھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اور بعضوں نے صحابہؓ کے شاگردوں یعنی تابعین کے اقوال وافعال کو بھی اس فن کے ذیل میں شریک کر لیا ہے۔

کہاں حدیث کی یہ مدرسی اور مذہبی تعبیر اور کہاں میرا یہ دعویٰ کہ حدیث مسلمانوں ہی کی نہیں، بلکہ انسانیت کے اہم ترین انقلابی عہد کی تاریخ کا معتبر ترین ذخیرہ ہے۔ ان دونوں میں کیا نسبت ہے۔ شائد یہ خیال کیا جاتا ہو کہ زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر میں نے اپنی تعبیر بدلی ہے لیکن یہ واقعہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر چیز کے سمجھانے کے لئے اسی زبان میں گفتگو کی جاتی ہے جسے مخاطب سمجھ سکتے ہوں۔ مجھے

[illegible]

کا اپنے مورخ یا مورخین سے وہ تعلق تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابۂ کرام کے ساتھ تھا، سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ مشکل ہی سے آج کوئی ایسا تاریخی حصّہ ہمارے پاس نکل سکتا ہے جس کے مورخین خود ان واقعات کے عینی شاہد ہوں، بلکہ جیسا کہ پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے عموماً ان تاریخوں کی تدوین یوں ہی ہوئی ہے کہ ابتدا میں مبہم مجہول الحال افواہوں کی صورت میں واقعات اِدھر اُدھر بکھرے رہے۔ پھر ان میں سے جب کسی کو شوق ہوا تو اس نے ان ہی افواہوں کو قلمبند کرنا شروع کیا، پھر خود اس مورخ ہی نے یا اس کے بعد والوں نے قرائن و قیاسات سے جہاں تک ممکن ہوا جس حصہ کو چاہا باقی رکھا، جسے چاہا قلمزد کر دیا۔ یہ تو شروع میں ہوا۔ بعد کو جوں جوں ان قلمبند شدہ واقعات پر زمانہ گزرتا گیا اوراق میں زیادہ بوسیدگی پیدا ہوئی کیڑوں کی خوراک سے بچ کر جو حصہ باقی رہا پچھلی نسلوں کے لئے وہی تاریخی وثیقہ بن گیا۔ آج اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مطبوعہ کتابوں سے زیادہ بھروسہ قلمی کتابوں پر ہے اور قلمی کتابوں میں بھی سب سے زیادہ قیمتی وہ مسودات ہیں جو بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکے ہوں، اور سنگی برنجی یا آہنی تختیوں کا کوئی ذخیرہ اگر کسی مورخ کو مل گیا تو وہی چیز جو ہمارے ہی جیسے انسانوں نے کسی زمانہ میں لکھ کر زمین میں گاڑی تھی بلکہ ہم تو اپنے معاصرین کو ایک حد تک جانتے بھی ہیں لیکن ان کے لکھنے والوں[1] کا تو کچھ پتہ نہیں ہوتا، مگر کیا کیجئے کہ بایں ہمہ وہ معصوم فرشتوں کے بیان کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ مذکورۂ بالا کلیہ سے تاریخ کے بعض حصّے مستثنیٰ بھی ہیں خصوصاً اسلامی دور میں مسلمان بادشاہوں کے حکم سے جب تاریخوں کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا اور باضابطہ شاہی

---

[1] بلکہ اگر بعض ثقہ راویوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ ہندوستان کے بعض قوموں کے علمی مرکزوں میں "قدیم ہند" کے لئے تاریخی مواد فراہم کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی گئی ہے کہ آہنی اور برنجی پتروں یا تختیوں پر پرانی زبانوں اور پرانے حروف میں اپنے مطلب کے موافق عبارتیں کندہ کر لی جاتی ہیں اور کسی مشہور آثاری کھنڈر میں ان ہی کو دفن کر دیا جاتا ہے پھر کچھ دنوں کے بعد ان ہی کو نکال کر علمی ذخیرہ میں جدید اکتشاف کی حیثیت سے اُن کا اور اُس سے جو نتائج نکلتے ہیں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو علم پر جاہلوں کا یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہم جن قدیم کتبوں پر اندھا دھند ایمان لا رہے ہیں ان میں بھی اشتباہ کی کس حد تک گنجائش ہے بلکہ سکندر کی لاٹنی مدفون زرہوں کا افسانہ اگر صحیح ہے، تو صرف کتاب ہی سے نہیں بلکہ ان کھنڈروں سے جو چیزیں نکل رہی ہیں اور ان سے جو نتائج نکالے جا رہے ہیں وہ بھی محل غور و فکر بن جاتے ہیں۔

وسائل و ذرائع کے ذریعہ سے مورخوں کو واقعات کے فراہم کرنے میں امداد دی گئی، یقیناً ان کتابوں کی نوعیت قدیم تاریخوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ اسی طرح مسلمان مورخوں کی بنائی ہوئی راہوں پر اس زمانے میں خصوصاً مغربی قومیں نسبتاً زیادہ حزم و احتیاط سے کام لے رہی ہیں، لیکن کچھ بھی ہو کسی کی تاریخ ہو، ان کے مورخوں کو ان واقعات سے یا صاحب واقعات سے قطعاً وہ تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے جو صحابہ کرامؓ کو ذات قدسی صفات سے تھا۔ یہی نہیں کہ ان بزرگوں نے حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان و اسلام کی بیعت کی تھی، آپ کی نبوت پر وہ ایمان لائے تھے۔ آپ سے ان کو وہ تعلق تھا جو ایک امتی کو اپنے پیغمبر سے ہونا چاہیئے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جیسا کہ واقعات سے پتہ چلتا ہے وہ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زندگی کو عزیز رکھتے تھے وہ سب کچھ حضورؐ پر قربان کرنے کے لئے تیار تھے گویا ایک قسم کے عشق و سرمستی کے نشہ میں مخمور تھے۔ یقیناً یہ ایسا امتیاز ہے جو کسی تاریخی واقعہ کو اپنے مورخین کے ساتھ حاصل نہیں، آخر دنیا کی ایسی کونسی تاریخ ہے جس کے بیان کرنے والے مورخین اس تاریخ سے ایسا والہانہ تعلق رکھتے ہوں کہ بیان کرتے جاتے ہیں اور روتے جاتے ہیں، کانپتے جاتے ہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق ان کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے لیکن اگر کبھی زبان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آگیا، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد اُرْتَعَدَ وَارْتَعَدَتْ ثِيَابُهُ تَنْفَخُ اَوْدَاجُهُ اِغْرَوْرَقَتْ عَيْنَاهُ کانپنے لگتے اور ان کے کپڑوں میں تھرتھری پیدا ہو جاتی گردن کی رگیں پھول جاتی تھیں، آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں (مستدرک حاکم)

ایک عبداللہ بن مسعودؓ ہی نہیں بلکہ ان اصحاب کی ایک فہرست تیار ہو سکتی ہے جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے وقت ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ حضرت ابوذرؓ کبھی کبھی کوئی حدیث بیان کرنا چاہتے مگر منہ سے اوصانی حبی ابوالقاسم اوصانی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ نکلتے اور چیخ مار مار کر بیہوش ہو جاتے تھے۔ اسی قسم کے واقعات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذکر میں بھی ملتے ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس تاریخ کو اس کے مورخوں میں محبوبیت کا یہ مقام عالی حاصل ہو قدرتی طور پر ان کے دل و دماغ، ان کے حافظے اس سے کس حد تک متاثر ہو سکتے ہیں۔

تیسری خصوصیت اس تاریخ اور اس کے راویوں کی یہ ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا تعلقات کے ان براہِ راست مورخوں یا چشم دید راویوں اور گواہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت ہی اس بات پر کی تھی کہ تاریخ کے اس عجیب و غریب واقعہ کے ہر ہر جزو، ایک ایک خط و خال کے زندہ نقوش اپنے اندر پیدا کریں گے۔ انہوں نے جس قرآن کو خدا کی شریعت اور قدرت کا قانون یقین کرکے مانا تھا اس میں بار بار مطالبہ کیا گیا تھا کہ تم میں سے ہر ایک کی زندگی کا نصب العین صرف یہی ہونا چاہئے کہ جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اُسے سنو، سن کر یاد رکھو اور اس پر ایمان لاؤ یقین کرو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کرتے ہیں ان کی ہر ہر ادا پر نگاہ رکھو اور ٹھیک من و عن جس طرح ان کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھتے ہو تم بھی اس کام کو اسی طرح انجام دینے کی کوشش کرو۔

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔	رسول نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اسے پکڑے رہو اور جس سے انہوں نے روکا ہے اس سے رک جاؤ۔
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن صرف اس لئے کہ اس کی پیروی اور اطاعت خدا کے حکم سے کی جائے۔
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔	کہدو اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں چاہنے لگا۔
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔	تمہارے لئے اللہ کے رسول میں اچھا نمونہ ہے۔

سمع و طاعت، اطاعت و اتباع کے ان پُرجلال مطالبوں سے قرآن گونج رہا تھا اور ان لوگوں کے سامنے گونج رہا تھا جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف اس کی آواز میں گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے، ان کا یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح، مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں لیکن حضرات صحابہ کرام کے اس فیصلہ کا علم مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کو ہے۔ بتایا جائے کہ دنیا کے کس تاریخی واقعہ سے اس کے مورخین اور راویوں کا یہ تعلق ہے۔ عجیب بات ہے کہ جن بزرگوں سے کسی زمانے میں انسانوں کے کسی گروہ کو اگر یہ تعلق پیدا بھی ہوا تھا تو ان کی تاریخ ہی آج ناپید ہے اور تاریخ کا جو سرمایہ آج ہمارے پاس ہے اس کے مورخوں کو ان تعلقات کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ کہاں پچھلوں کی مجلسوں کی گرم بازاری کے لئے

مورخین کے بیانات اور کہاں ان سوختہ سامانوں کی تاریخی شہادتیں۔

اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کی اطاعت و اتباع ہی ان بزرگوں کے لئے ضروری نہ تھی بلکہ جس قرآن اور جس فرمان نے ان پر یہ فریضہ عائد کیا تھا اسی نے ان کو اس کا بھی ذمہ دار بنایا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہتے ہوئے انہوں نے سنا ہے اور جو کچھ کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا ہے وہ دوسروں تک مسلسل پہنچاتے چلے جائیں۔ ہر حاضر غائب کو، اور ہر پہلا پچھلوں کو ان کی طرف بلاتا جائے۔ قرآنی آیتوں،

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.	تم ایک بہترین امت ہو انسانوں کی (بھی خواہی) کے لئے تم ظاہر کئے گئے ہو، تاکہ اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دو اور بری باتوں سے ان کو روکو۔
وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.	چاہئے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو، جو نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلائے، اچھی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے۔

ہی کی یہ تفسیر تھی جو مختلف پیرایوں میں صحابہ کرام کو مخاطب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے، منیٰ کا میدان ہے، خیف کی مسجد ہے، ایک لاکھ سے اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کا مجمع ہے، سب کو مخاطب کر کے فرمایا جاتا ہے:

نَضَّرَ اللہُ عبدًا سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَوَعَاهَا ثُمَّ اَدَّاهَا اِلٰی مَنْ لَمْ یَسْمَعْهَا۔ (صحاح)	تروتازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک انہیں پہنچا دیا۔

یہی منیٰ کا میدان ہے، حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں اعلان فرمایا جاتا ہے:

ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھا کتاب اللہ وسنتی ولن یتفرقا حتی یردا علی الحوض۔ (صحاح)	میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں جن کے بعد تم پھر گمراہ نہیں ہو سکتے (ایک تو) اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت، یہ دونوں باہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک کہ حوض کوثر پر میرے سامنے آجائیں۔

اور یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام کے دائرہ میں جو قبائلی داخل ہوتے جاتے تھے، دربار رسالت سے ان کی تعلیم و تلقین کے لئے ذمہ دار اصحاب کو بھیجا جاتا تھا۔ حکم دیا جاتا تھا کہ جو کچھ تم نے ہم سے سیکھا ہے، وہ انہیں بھی جا کر سکھاؤ۔ صرف استحبابی احکام ہی نہیں بلکہ قرآن کی اس آیت

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ لا اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ	جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جسے ہم نے اتارا ہے اور جو کھلی کھلی باتوں اور سوجھ بوجھ (ہدایت) کی باتوں پر مشتمل ہے اور اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ انسانوں کے لئے کتاب میں ہم نے اسے بیان کر دیا ہے یہی لوگ ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔

کی بنیاد پر صحابہ کرام جس تاریخ کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس کا چھپانا گناہ خیال کرتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بھی روایت کرتے تھے۔

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ ثُمَّ كَتَمَهٗ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ (ابوداؤد و ترمذی)	جس کسی سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائے گی۔

اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سکرات میں مبتلا ہیں، لیکن بعض صحابہ سے یہ مروی ہے اس وقت بھی محض اس خیال سے کہ "علم کے چھپانے" کا الزام ان پر نہ رہ جائے حدیث بیان کرتے جاتے تھے (بخاری و مسلم و عام صحاح)

ان تمام امور کے ساتھ اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جس ذات گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے، اسی نے بار بار بکثرت ان کی فطرت میں مشہور حدیث مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کر لے) کے تہدیدی خوف کو اس طرح راسخ کرنے کی کوشش کی تھی کہ جتنے صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے، مشکل ہی سے چند حدیثیں اس قدر کثیر تعداد صحابہ سے مروی ہوں گی۔ اور یوں بھی قرآن کی رو سے یہ نہایت بدیہی بات تھی جس قسم کے ایمان و یقین کی دولت سے یہ لوگ سرفراز تھے اس فعل کی جرأت کس کو ہو سکتی تھی؟ جس اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے یوں بھی ان سے غلط بیانی کی توقع کون کر سکتا ہے

الفاظ ہیں یعنی بجائے نبی کے رسول کا لفظ استعمال کیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اپنی زبان مبارک سے نَبِیِّكَ کا لفظ ادا فرمایا تھا حکم ہوا کہ میں نے یہ نہیں کہا وہی کہو جو میں نے بتایا۔ ظاہر ہے کہ قانونی طور پر سونے کی دعا کی حیثیت ان شرعی حقائق کی نہیں ہے جنہیں فرض و واجب کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ایک ایک لفظ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سخت نگرانی تھی۔ بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عام گفتگو کے متعلق یہ دوامی عادت بیان کی جاتی ہے کہ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلٰثًا (جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات کرتے تو اس کو تین دفعہ دہراتے) غالباً اس میں بھی زیادہ تر دخل اسی مقصد کو تھا۔ فعل کے متعلق مشہور حدیث ہے کہ ایک صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے، نماز کے تمام ارکان یعنی قیام، رکوع و سجود میں کوئی کمی نہیں کی تھی، صرف ذرا عجلت اور جلد بازی سے کام لے رہے تھے، مگر نماز سے جب وہ فارغ ہوئے تو وہ یہ سن رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ (پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی) ارشاد فرما رہے ہیں۔ انہوں نے پھر نماز دہرائی لیکن اب بھی اس میں وقار اور طمانیت نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ (ٹھیک اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) کے حکم کی تعمیل ہوتی۔ الغرض تیسری بار سمجھانے کے بعد انہوں نے اپنی نماز جیسی کہ چاہیئے ادا کی۔ نماز میں سکینت و اطمینان کی حیثیت اکثر فقہائے امصار کے نزدیک فرض و واجب کی نہیں ہے لیکن جن لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پوری زندگی اس کے ہر پہلو ظاہر و باطن، اندر و باہر کا مورخ بنانا چاہتے تھے، ان پر آپ ان معاملات کے متعلق بھی پوری نگرانی رکھتے تھے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی تاریخ بھی موجود ہے جس نے اپنے مورخین کی اور راویوں کے بیان و ادا کی خود نگرانی کی ہو، اور ایسی کڑی نگرانی؟

تدوین حدیث کے قدرتی عوامل

تدوین حدیث کے سلسلے میں جن امور کی تعبیر میں نے غیر معمولی خاص قدرتی عوامل سے کی ہے اور عام تاریخی سرمایہ سے تاریخ کے اس حصہ کے لئے جن بنیادوں پر میں امتیاز کا مدعی ہوں، اس کے مخصوص اور خصوصی اسباب تو یہ تھے لیکن خصوصیتوں کا یہ قصہ ان ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جن بزرگوں کے ہاتھوں علم کے

اس حیرت انگیز ایوان کی تعمیر ہوئی، ابھی ان کی اور بھی چند باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ جن کا ذکر آپ سن چکے، قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ دعوت جو شاعرانہ زبان میں بلکہ فی الحقیقت مولانا حالی مرحوم کی اس بلیغ تعبیر کی صحیح تصویر تھی ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
ایک آواز میں سوتی بستی جگا دی — نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی

اس نے صحابہ کرام کی ذہنی قوتوں اور عملی توانائیوں میں نئی زندگی کی روح بھر کر ان میں ایسی ہلچل پیدا کر دی تھی کہ بقول گاڈفرے ہگنس "عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیرووں میں پیدا کر دیا تھا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے سود ہے اور میں تو کہتا ہوں کہ عیسائی ہی نہیں بلکہ دنیا کو چاہئے کہ یہ یاد رکھے کہ اس نشہ کی نظیر نہ اس کے پہلے دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد دیکھی جا سکتی ہے۔" عُروہ بن مسعود ثقفی نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کو صحابہ کرام کے اس نشہ کی خبر کتنے صحیح الفاظ میں دی تھی:

اَیْ قَوْمِ وَاللّٰهِ لَقَدْ وَفَدْتُ عَلَى الْمُلُوْكِ وَوَفَدْتُ عَلٰى قَيْصَرَ وَكِسْرٰى وَالنَّجَاشِيِّ وَاللّٰهِ مَا رَاَيْتُ مَلِكًا قَطُّ يُعَظِّمُهٗ اَصْحَابُهٗ مَا يُعَظِّمُ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ مُحَمَّدًا وَاللّٰهِ اِنْ تَنَخَّمَ نُخَامَةً اِلَّا وَقَعَتْ فِيْ كَفِّ رَجُلٍ مِنْهُمْ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهٗ وَجِلْدَهٗ وَاِذَا اَمَرَهُمْ ابْتَدَرُوْا اَمْرَهٗ وَاِذَا تَوَضَّاَ كَادُوْا يَقْتَتِلُوْنَ عَلٰى وَضُوْئِهٖ وَاِذَا تَكَلَّمَ خَفَضُوْا اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَهٗ وَمَا يُحِدُّوْنَ اِلَيْهِ النَّظَرَ تَعْظِيْمًا لَهٗ۔ (بخاری)

لوگو! خدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں بھی باریابی کا موقع ملا ہے قیصر (روم)، کسریٰ (ایران)، نجاشی (ابی سینیا) کے سامنے حاضر ہوا ہوں قسم خدا کی میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کی لوگ اتنی عظمت کرتے ہوں جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی کرتے ہیں، قسم خدا کی جب وہ بلغم تھوکتے ہیں تو نہیں گرتا ہے وہ لیکن ان کے ساتھیوں میں سے کسی آدمی کے ہاتھ میں پھر وہ اپنے چہرہ اور اپنے بدن پر اسے مل لیتا ہے، محمدؐ جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں اس کی تعمیل کی طرف وہ جھپٹ پڑتے ہیں جب محمدؐ وضو کرتے ہیں تو اس وقت ان کے وضو کے پانی پر آپس میں الجھ پڑتے ہیں جب محمدؐ بات کرتے ہیں تو ان کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں، محمدؐ کو نگاہ بھر کر ان کی عظمت کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکتے۔

کیا ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں یقیناً یہی ہو سکتا تھا اور یہی ہو کر رہا۔

بلکہ اسی کے ساتھ ہم جب اس واقعہ کو بھی ملا لیتے ہیں کہ فاقہ کش غریب اور مفلس عرب جو اپنے ملک کے خاص حالات کے لحاظ سے ایام جاہلیت میں معاشی حیثیت سے انتہائی سخت کوشیوں کا شکار بنا ہوا تھا، تعیش و رفاہیت کی زندگی کا تو ذکر کیا ہے، ضروری معاشی رسد کی تکمیل میں بھی ان کو آسمان و زمین کے قلابے ملانے پڑتے تھے، ساری عمر عرب کے چٹیل ریگستانی اور سنگستانی صحراؤں میں بیچارے صرف اس لئے دوڑتے پھرتے تھے کہ دو وقت کی خشک روٹی خواہ کسی شکل میں ہو مل جائے اور وہ بھی بہ مشکل میسّر آتی تھی، لیکن اسلام نے ایک طرف ان کے باطنی قویٰ اور ذہنی طلب میں یہ طوفان برپا کیا، دوسری طرف پندرہ بیس سال کی مدت میں جسمانی اور معاشی مطالبوں کے لئے رسد کا ایک ایسا بے تھاہ سمندر ان کے اس غیر آباد قلیل التعداد ملک میں ٹھاٹھیں مارنے لگا کہ سچ یہ ہے کہ اس کی نظیر بھی عرب آسمانوں نے نہ اس سے پہلے دیکھی تھی اور نہ آج تک پھر وہ تماشا دیکھنا اسے نصیب ہوا، ان خزائن اور دفائن، غنائم اور نفل کے سوا جو قرنہا قرن سے کسریٰ کے خزانے میں جمع ہوئے تھے یا وہ دولت جو زمین فرعون (مصر) سے یا ارض شام سے آئی تھی، ستون فی ستین (یعنی ساٹھ گز چوڑا) والا جو بر نگار بہار نامی ایرانی قالیچہ جس کے تمام نقش و نگار جن کا تعلق مختلف مناظر اور موسموں سے تھا انمول جواہرات کے ذریعہ سے کاڑھے گئے تھے، کسریٰ کا وہ مرصع تاج جو اپنے قیمتی اور وزنی پتھروں کی وجہ سے بجائے سر پر رکھنے کے سونے کی زنجیر سے لٹکا دیا جاتا تھا اور کج کلاہِ ایران اسی میں اپنا سر داخل کر دیتا تھا، کھجوروں کے تنہ پر مدینہ میں جو مسجد کھڑی تھی اس میں یکے بعد دیگرے یہ سب کچھ ہر طرف سے چلا آ رہا تھا۔ خوراکی رسد کا یہ حال تھا کہ عام رمادہ کے قحط میں حضرت عمرؓ نے مصر کے والی عمرو بن عاص کو غلہ کے لئے جب لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اونٹوں کی ایسی قطار غلہ سے لاد کر پایۂ تخت خلافت میں بھیجتا ہوں جس کا پہلا اونٹ مدینہ میں ہوگا اور آخری اونٹ کی دم میرے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ سب تو وقتی دولت تھی اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ دس پندرہ سال کے عرصے میں حجاز، یمن، یمامہ، بحرین، عراق، شام اور مصر کے لاکھوں مربع میل کے جو علاقے فتح ہوئے ہیں جن میں بجز حجاز کے تقریباً اکثر حصہ صرف ثروت و دولت کا بے پناہ سرچشمہ تھا، مصر سے پہلا خط

عمرو بن العاص رضؓ کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام آیا تھا کہ ایک ایسی زمین پر خدا نے قبضہ دلایا ہے جو اچانک موتی کی طرح سفید اور پھر عنبر کی مانند سیاہ اور اسی کے بعد ہیرے کی مانند سرسبز ہو جاتی ہے، ان سارے علاقوں کا ایک بڑا حصہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاگیروں پر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان اموالِ غنیمت کے حصوں کے ساتھ ساتھ ہر صحابی کے گھر میں سالانہ کتنی دولت ان جاگیروں سے آتی تھی، تاریخوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ عہد فاروقی تک پہنچتے پہنچتے مدینہ کے بازار کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ عہد نبوت میں جس گدھے کی قیمت پندرہ درہم تھی اب وہ پندرہ سو میں ملتا تھا۔ بخاری کی مشہور روایت ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غابہ کی زمین جو مدینہ کے پاس ہے کل ایک لاکھ ستر ہزار درہم میں مول لی تھی لیکن ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اسے جب فروخت فرمایا تو اس کی قیمت سولہ لاکھ ملی تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اپنی داد و دہش کی وجہ سے مرنے کے وقت ایک پیسہ نہ چھوڑ سکے لیکن مکانات اور زمین کی شکل میں جو ان کی جائداد تھی اس کی قیمت جیسا کہ بخاری میں ہے پچاس کروڑ دو لاکھ لگائی گئی تھی۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے انتقال کے وقت ترکہ چھوڑا اس کا حساب تو بہت طویل ہے لیکن فراخی و فراغبالی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے ثلث مال سے انہوں نے وصیت کی تھی کہ ہر بدری صحابی کو (جن کی تعداد اس وقت تقریباً ایک سو کے قریب رہ گئی تھی) چار چار سو دینار دیئے جائیں۔ صحابہ اور صحابہ کی اولاد جو وہی عرب تھے جن کے پاس ہزار کے اوپر عدد کے لئے کوئی لفظ ہی نہ تھا، لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ایک ایک وقت میں صرف خیرات کرتی تھی یا اپنے ملنے جلنے والے احباب و اعزہ کو دے ڈالتی تھی۔ عام تاریخی کتابوں میں بکثرت ان کی داد و دہش کے واقعات کا ذکر ہے۔ بخوف طوالت ان کی تفصیل ترک کی جاتی ہے۔

بہر حال مجھے حدیث کے ابتدائی رواۃ یا اس تاریخ کے ابتدائی مورخین کی دولت اور آمدنی کی تفصیل مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ گزشتہ بالا حالات کے ساتھ جب ان کی معاشی فراغبالی کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور پھر سوچا جائے کہ علم کی پیاس کی جو آگ ان کے دل میں لگائی گئی تھی اس کی تسکین کے لئے ان کے پاس کتنے وسیع مواقع قدرت نے مہیا کر دیئے تھے۔ ہو سکتا تھا اور تھوڑے دنوں بعد ہو بھی گیا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(٩٩)

[illegible]

[illegible]

اس علمی ولولہ کی کیفیت یہ تھی کہ معمولی معمولی عورتیں محض اس لئے کہ ان کا بچہ فن حدیث کا عالم ہو جائے ہزار ہا روپے خرچ کر ڈالتی تھیں۔ اس موقعہ پر عہد صحابہ کا قصہ یاد آیا کہ فروخ نامی ایک معمولی آدمی تھے، آزاد شدہ غلاموں کے طبقہ سے ان کا تعلق تھا۔ غالباً فوج میں ملازم تھے، لیکن اس وقت مدینہ کی دولت کا یہ حال تھا کہ ادنیٰ ادنیٰ غلام سپاہی بھی تیس تیس چالیس ہزار دینار طلائی سکہ پس انداز کر سکتا تھا۔ تقریباً سیر کی اکثر کتابوں میں یہ واقعہ درج ہے کہ اپنا سارا اندوختہ بیوی کو سپرد کر کے وہ کسی نوکری پر طویل مدت کے لئے باہر چلے گئے۔ پندرہ بیس سال کے بعد واپسی ہوئی۔ جس وقت جا رہے تھے ان کی بیوی حاملہ تھیں، پیچھے لڑکا پیدا ہوا، نام ربیعہ رکھا گیا۔ اس نیک دل خاتون کے علمی ذوق کا حال سنئے کہ انہوں نے شوہر کے سارے اندوختہ کو بچے کی تعلیم و تربیت پر ختم کر دیا اور اس زمانہ کی تعلیم کیا تھی؟ یہی قرآن و حدیث کی خدمت۔ فروخ جب گھر واپس ہوئے تو لڑکا جوان ہو کر نہ صرف عالم بلکہ مسجد نبوی کے حلقہائے درس کے ایک ممتاز ترین معلم کی حیثیت حاصل کر چکا تھا، امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری جیسے لوگ جنہیں بعد کو امت میں امامت کا منصب عطا ہوا، وہ ان کے شاگردوں میں شریک تھے۔ فروخ باہر سے بھی چار پانچ ہزار روپیہ کما کر لائے تھے۔ دو تین دن کے بعد بیوی سے اپنے گزشتہ پس انداز کا حساب دریافت کیا، بولیں کہ سب کو میں نے گاڑ رکھا ہے، کچھ دم لے لو تو انہیں نکالوں، لیکن ذرا کل تم صبح کی نماز کے بعد مسجد نبوی کے حلقہائے درس میں گشت تو لگانا۔ دوسرے دن انہوں نے یہی کیا، ایک حلقہ میں پہنچے تو خدا کی قدرت نظر آئی کہ ان کے لڑکے کو چاروں طرف سے شاگردوں کا حلقہ گھیرے ہوئے ہے۔ خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے۔ گھر پہنچے اور بیوی سے حال بیان کیا۔ بیوی نے کہا کہو روپیہ لینا چاہتے ہو یا ایسا عالم لڑکا؟ میں نے تمہارے روپے اس کی تعلیم پر خرچ کر دیئے۔ فروخ نے اپنی بیوی کے فعل کی تحسین کی۔

علم حدیث کی تفصیل و تدوین و اشاعت و نشر میں عہد صحابہ اور اس کے بعد لوگوں نے کتنی حیرت انگیز مالی قربانیاں کی ہیں اس کے لئے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے، میں اس وقت صرف دماغوں کو ادھر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ منجملہ دیگر اسباب کے عہد صحابہ کی معاشی فراغبالی کو بھی دنیا کی تاریخ کے اس عجیب حصہ کی حفاظت میں غیر معمولی دخل ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ جو کام سے

[illegible]

کسی حصہ پر نظر ڈالئے کہ ابتدا میں ان واقعات کے بیان کرنے والوں یا ان کو ریکارڈ کرنے والوں کی تعداد کیا تھی ؟ قطع نظر اس سے جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ واقعات کے عینی شاھدوں کا ان تاریخوں میں بجائے خود ایک پیچیدہ ترین سوال ہے۔ بالفرض اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا کوئی حصہ ایسا مل بھی جائے جسے ہم خود چشم دید گواہوں کا بیان قرار دے سکتے ہوں اور اسی کے ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ ہمیں ان کی دماغی اور اخلاقی منزلت کا بھی کسی نہ کسی ذریعہ سے علم حاصل ہو گیا ہو، اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے تاہم مان لیجئے کہ اس میں کامیابی ہو بھی جائے پھر بھی جہاں تک میرے معلومات ہیں اور میرا اندازہ ہے، ان تاریخوں کے ابتدائی راویوں کی تعداد بمشکل ایک دو سے متجاوز ہو سکتی ہے۔ آخر ہماری تاریخوں کی آج جو کچھ بھی بنیاد ہے وہ کوئی پرانے زمانے کی کسی پرانے مصنف کی کوئی یادگار، پرانی قبروں کا کوئی کتبہ، پرانے سکوں کے ٹھپے، پرانے کھنڈروں کی کوئی سنگی یا برنجی تختی، یا از ین قبیل کوئی اور چیز ہے۔ یقینی سے یقینی تر چیز کسی شخص کی ذاتی خود نوشت سوانح عمری ہو سکتی ہے۔ اس احتمال کے سوا کہ اس قسم کی بیوگرافیاں کیا موجودہ زمانہ کے بیوفسٹی بیانات نہیں ہو سکتیں، اور مان لیا جائے کہ ان میں گفتنی کے ساتھ تمام گفتنیوں کے اندراج کا بھی التزام کیا گیا ہو یا یوں کہئے کہ صاحب شعر و دیوان ہونے کی حیثیت کے ساتھ محلہ[1] والوں کے معلومات بھی اس میں بیان کئے گئے ہوں، لیکن ان سب سے بھی اگر قطع نظر کر لیا جائے تو جب بھی اس یقینی ترین تاریخی سرمایہ و خود نوشت سوانح عمری کی حیثیت ایک شخصی بیان ہی کی ہو سکتی ہے اخلاقی اطمینان کے باوجود ایک شخصی دماغ پر نسیان و ذہول، بھول چوک کی راہیں جتنی کھلی ہوئی ہیں ظاہر ہے لیکن اب آئیے تاریخ کے اس نادرۂ روزگار حصہ پر نظر ڈالئے جس کا نام "حدیث" ہے جن چشم دید گواہوں اور عینی شاہدوں کے بیانات سے یہ واقعات حاصل کئے گئے، ہیں ان کی تعداد کیا تھی ؟ ابھی اس سلسلۂ روایت کی بعد کی کڑیوں سے بحث نہیں بلکہ آپ کے سامنے اس کا صرف پہلا حلقہ یعنی ان لوگوں کا سوال ہے جو خود اس واقعہ

---

[1] یہ اکبر مرحوم کے مشہور شعر ؎ اکبر کی حقیقت کو تم کچھ پوچھو محلے والوں سے،

ہاں شعر تو اچھا کہتے ہیں، دیوان تو اُنکا دیکھا ہے۔ کی طرف تلمیح ہے۔

میں شریک ہے انہوں نے اس کو دیکھا اور اس نظر سے دیکھا جس سے ہر معمولی واقعہ نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ایک امتی جس نظر سے اپنے پیغمبر کو، یا ایک مرید اپنے پیر کو، یا صاف لفظوں میں کہئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عجیب وغریب صحابیوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ دیکھنے کے بھی وہ ذمہ دار تھے اور بیان کرنے کے بھی ذمہ دار تھے۔ جانتے ہیں کہ ان کی تعداد کیا تھی؟ علی بن ابی زرعہ جو فن رجال کے بڑے مشہور ائمہ میں ہیں، ان سے یہی سوال پوچھا گیا، جواب میں انہوں نے فرمایا:

تُوُفِّيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ رَآهُ وَسَمِعَ مِنْهُ زِيَادَةٌ عَلَى مِائَةِ أَلْفِ إِنْسَانٍ مِنْ رَجُلٍ وَامْرَأَةٍ كُلُّهُمْ قَدْ رَوَى عَنْهُ سَمَاعًا أَوْ رُؤْيَةً (اصابہ جلد ۱ ص۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اس وقت ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے حضورؐ کو دیکھا اور آپ سے سنا تھا ایک لاکھ سے زیادہ تھی ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ سب حضورؐ سے سن کر اور دیکھ کر روایت کرتے تھے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ابن ابی زرعہ نے یہ صحابیوں کی تعداد نہیں بتائی ہے بلکہ اِن خاص اصحاب کی تعداد ہے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور دیکھنے کے بعد آپ کے متعلق کوئی نہ کوئی بات روایت کی ہے۔ حدیث تاریخ کے جس حصہ کی تعبیر ہے اس کے ابتدائی رواۃ کی یہ تعداد کیا کوئی معمولی بات ہے؟ عموماً اس کو سن لیا جاتا ہے اور لوگ گزر جاتے ہیں لیکن مقابلہ سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ ایک طرف آپ کے سامنے تاریخ کا وہ ذخیرہ ہے جس کے ابتدائی راویوں کا حال اگر معلوم بھی ہو سکتا ہے تو ان کی تعداد دو تین سے آگے بمشکل متجاوز ہو سکتی ہے اور بیچاری ایک تاریخ کیا بڑے بڑے مذہبی مستندات جن کے بھروسہ پر آج کروڑہا کروڑ انسان ایمانی زندگی بسر کر رہے ہیں زیادہ تر ان کا بھی یہی حال ہے۔ خیال تو کیجئے کہ کہاں ایک لوقا[1] ایک مرقس یا ایک سنجے گاڑی بان کا بیان اور کہاں یہ ایک لاکھ سے اوپر چشم دید گواہوں کی شہادتیں۔ پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ عام تاریخی واقعات جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، پراگندہ اور منتشر کثرتوں کا مجموعہ ہے۔ اور ان بکھری ہوئی کثرتوں کے سمیٹنے والے

---

[1] مختلف انجیلوں کے مختلف ابتدائی راویوں کے نام ہیں اور سنجے اس گاڑی بان کا نام ہے جو ہندوؤں کی مشہور کتاب گیتا کا سری کرشن سے تنہا راوی ہے۔ محض اس کی روایت کی بنیاد پر ہندو گیتا کو گویا ایک قسم کی آسمانی کتاب سمجھتے ہیں۔

صرف ایک دو ہیں۔ادھر ایک شخصی ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور ان کی بچی ادھر ہو بہو جیسے کہ وہ تھے تصویر اتارنے کے لئے اردگرد لاکھوں زندہ آنکھوں کے کیمرے قدرت کی جانب سے کھڑے کئے گئے ہیں۔

چہ نسبت خاک را بعالم پاک

راویوں کی تعدادی مقدار کے روایت پر کیا کیا اثرات مرتب ہوسکتے ہیں، بادنیٰ تامل ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔

کثرتِ تعداد کا روایتوں کی وثاقت پر اثر

سب سے پہلی بات تو یہی ہے، ایک یا دو آدمی سے ظاہر ہے کہ اتنے واقعات کا احاطہ یقیناً ناممکن ہے، جو مشاہدہ کرنے والوں کی کثرت کی صورت میں ممکن ہے، پھر اسی کے ساتھ جب ہم اس کو بھی ملا لیتے ہیں کہ ان راویوں میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتوں کی بھی ایک بڑی جماعت شریک ہے تو احاطہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مورخین صرف مرد ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے محض وہی واقعات پہنچے ہیں جن کا تعلق گھر کے باہر کی زندگی سے ہے لیکن بجائے جلوت کے خلوت یا گھریلو زندگی کے حالات پر یقیناً پردہ پڑا رہتا اور ایسے بہت سے مسائل جن کا خصوصی تعلق صرف عورتوں سے ہے ان کے متعلق کوئی واضح ہدایت نامہ ہمارے پاس نہ ہوتا۔لیکن کون نہیں جانتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر پہلو جلوت کا ہو یا خلوت کا، کسی کو راز میں نہیں رکھا گیا۔راویوں کی کثرت اور ان کی مختلف نوعیتوں ہی کا نتیجہ ہے کہ دوست ہی نہیں آج دشمن بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہیں کہ "یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔" یہ باسورتھ اسمتھ کی شہادت ہے جس کا اظہار اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت (ص۱۵) میں کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی اگر ملحوظ رکھا جائے کہ باہر میں ہو یا اندر میں، قدرت نے ایسے اسباب فراہم کردیئے تھے کہ صحرائے عرب کے ایک دور افتادہ نخلستانی قصبہ میں تقریباً دنیا کے بڑے بڑے قابل ذکر مذاہب یعنی بت پرستی، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت کے ماننے والوں کو مسلمان کر کے حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں

پہنچا دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی و تکمیلی نذیں دنیا کے تمام مذاہب پر جو پڑ رہی تھیں اس کے سمجھنے کے لئے خود ان مذاہب کے جاننے والوں کی ضرورت تھی، اور قدرت نے اس کا بھی سامان کر دیا تھا باہر میں بھی اور اندر میں بھی، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے اور عام طور پر لوگ اس سے واقف بھی ہیں۔ عملی طور پر ان عینی شاہدوں کی کثرت کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ قطع نظر اس سے کہ ایک واقعہ کے جب بہت سے دیکھنے والے ہوتے ہیں تو ہر ایک دوسرے کی تکذیب کے خیال سے عموماً غلط بیانی کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ اگر صحابہ کرام کے جن خصوصیات کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ان کی بناء پر یوں بھی ان سے قصداً کسی غلط بیانی کی کون توقع کر سکتا ہے لیکن جیسا کہ قرآن میں قانون شہادت کے ذکر کے سلسلے میں بیان کیا ہے ایک گواہ کے سمجھنے یا یاد رکھنے میں اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو دوسرا اس کی اصلاح کر سکتا ہے۔ حدیث کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ایک موقعہ پر نہیں بلکہ متعدد مواقع اس قسم کے پیش آئے ہیں جہاں راویوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے غلط فہمیوں کی اصلاح ہوئی ہے۔ میرا مضمون بہت طویل ہو جائے گا ورنہ ان کے نظائر جن سے معمولی طلبہ تک واقف ہیں، یہاں پیش کرتا۔

ماسوا اس کے صحابی راویوں کی جو تعداد ابن ابی زُرعہ کے حوالے سے میں نے اوپر نقل کی ہے ظاہر ہے کہ صحبت مبارک میں ان سب کا اجتماع ایک وقت میں نہیں ہوا تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہر لمحہ یا ہر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ یہ سارا مجمع رہتا۔ اگرچہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر تقریباً ایک لاکھ سے اوپر صحابیوں کا مجمع جمع ہو گیا تھا۔ لیکن یہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے ورنہ عموماً مدینہ منورہ میں جو تعداد صحابہؓ کی رہتی تھی یا غزوات واسفار میں جو لوگ آپ کے ساتھ ہوتے تھے ان کی ظاہر ہے کہ اتنی تعداد کبھی اکٹھی نہیں ہوئی، بیس ہزار، دس ہزار، پانچ ہزار، تین ہزار، چار ہزار یا اس سے نیچے کی تعداد فوجی مہموں میں حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عموماً رہی ہے۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں ابتداءً انصار کے ساتھ مہاجرین کا ایک خاص گروہ آپ کے ساتھ تھا لیکن جس وقت غزوۂ تبوک کا واقعہ پیش آیا ہے۔ کعب بن مالکؓ جو اس سفر میں رفاقت سے محروم رہے تھے اور اس کا ایک دلچسپ واقعہ بخاری میں ان ہی کی زبانی منقول ہے، اس میں مدینہ کے اصحاب کا ذکر فرماتے ہوئے آپ نے یہ جملہ فرمایا تھا:

طالب العلمی کے ان دنوں میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کیا کیا گزری، بعد کو مزے لے لے کر بیان کرتے۔ کبھی کہتے جیسا کہ امام بخاری راوی ہیں:

وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِنْ كُنْتُ لَاَعْتَمِدُ عَلَی الْاَرْضِ بِكَبِدِیْ مِنَ الْجُوْعِ وَاَشُدُّ الْحَجَرَ عَلٰی بَطْنِیْ۔	اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے کہ بھوک کی وجہ سے میں جگر تھام کر زمین پر ٹیک لگا لیتا اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا۔

کبھی فرماتے:

رَاَیْتُنِیْ اُصْرَعُ بَیْنَ مِنْبَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَحُجْرَةِ عَائِشَةَ فَیُقَالُ مَجْنُوْنٌ وَمَا بِیْ جُنُوْنٌ اِنْ هِیَ اِلَّا الْجُوْعُ۔ (صحاح)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ کے درمیان میں چکرا کر گر پڑتا، خیال کیا جاتا کہ میں پاگل ہوں حالانکہ مجھے جنون سے کیا تعلق، وہ تو صرف بھوک کا اثر تھا۔

مگر یہ سب کچھ گزر رہا تھا، دوسرے ساتھیوں کو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کاروبار کر کے آرام اٹھا رہے ہیں، مگر تیس بتیس سال کا یہ دوسی یمنی نوجوان

موجِ خون سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے   آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

کہہ کر بیٹھ گیا تھا، اور اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ حتی توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور اس قسم کے یہ ایک آدمی نہیں ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ جن کا خطاب ہی صحابہ کی جماعت میں صاحب النعلین والسواک والوسادۃ تھا، حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہم جب یمن سے آئے تو ابن مسعودؓ کے متعلق مدت تک ہم سمجھتے رہے کہ:

اَنَّهٗ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ بَیْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِمَا نَرٰی مِنْ دُخُوْلِهٖ وَدُخُوْلِ اُمِّهٖ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔	وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے کوئی آدمی ہیں جس کی وجہ ان کی اور ان کی ماں کی آمد و رفت تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی رہتی تھی۔

ان کو دربارِ رسالت سے یہ حکم ملا ہوا تھا کہ

علی ترفع الحجاب وتسمع سوادی۔ — ابن مسعود! تم پردہ کو اٹھا کر میرے حجرہ میں آسکتے ہو اور تنہائی کی گفتگو سن سکتے ہو۔

(اصابہ)

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جو نو سال تک مسلسل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی خدمت میں رہے۔ اور ان کے سوا بھی حضورؐ کے موالی مثلاً رافع، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں جو بہت کم مجلس رسالت کی حاضری سے محروم رہتے تھے۔ یہ تو مردوں میں، اور عورتوں میں یہی حال امہات المومنین کا تھا، جن میں کوئی نہ کوئی خلوت کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحابہ میں جن لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جن امور کا علم براہِ راست حاصل نہ ہوتا تھا ان کو وہ اپنے دوسرے بھائیوں اور ساتھیوں کے ذریعہ سے معلوم کر لیا کرتے تھے اور اس میں بڑے اور چھوٹے کی بحث نہیں تھی۔ خود حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ

كَانُوْا يَعْرِفُوْنَ لُزُوْمِىْ فَيَسْأَلُوْنِىْ عَنْ حَدِيْثِهٖ مِنْهُمْ عُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِىٌّ وَطَلْحَةُ وَالزُّبَيْرُ۔ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میری وابستگی کا حال لوگوں کو چونکہ معلوم تھا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں مجھ سے پوچھا کرتے، ان کے پوچھنے والوں میں عمرؓ بھی ہیں اور عثمانؓ بھی علیؓ بھی طلحہؓ بھی زبیرؓ بھی۔

(ابن سعد)

حدیث کی کتابوں میں اس کا ایک ذخیرہ موجود ہے، جس میں خلفائے راشدین اور دوسرے جلیل القدر اصحاب نے باہم ایک دوسرے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پوچھی ہے۔ مردوں میں اگر پتہ نہیں چلتا تو امہات المومنین کے پاس آدمی بھیجا جاتا کہ اگر ان کو کوئی علم ہو تو بیان کریں۔ ایک دن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا ابھی ذکر گزرا، حالانکہ نو سال تک صحبت نبوی میں ان کو ہمہ وقتی رفاقت کا موقعہ ملا ہے، لیکن ایک حدیث بیان کر رہے تھے کہ حلقہ کے لوگوں میں سے کسی نے پوچھا،

أَنْتَ سَمِعْتَهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ — کیا آپ نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا :

مَا كُلُّ مَا نُحَدِّثُكُمْ بِهٖ سَمِعْنَاهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنْ كَانَ يُحَدِّثُ بَعْضُنَا بَعْضًا۔ (مستدرک حاکم)

ہم تم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو باتیں بیان کرتے ہیں، سب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہم نے نہیں سُنا ہے بلکہ ہم میں بعضوں نے بعض سے بھی سنا ہے (یعنی ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے سنا ہے)۔

اور یہی تھا بہت بڑا عظیم نفع حضرات صحابہ کی کثرت تعداد کا۔ ہر ایک اپنی کمی دوسرے کے علم سے پوری کرتا تھا۔ اپنے علم کی تکمیل کے شوق ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ تابعین یا اصاغر صحابہ ہی کے زمانے میں نہیں بلکہ خود باہم ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے اپنے علمی نقص کی تکمیل کے لئے کبھی کبھی لمبے لمبے سفر کئے ہیں اور قرآن نے اسوۂ حسنہ کی کامل اتباع اور پیروی کا ان سے جو مطالبہ کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا گھر مدینہ ہی میں تھا اور خاص طور پر حدیث کے مشہور سرمایہ داروں میں ان کا شمار ہے، جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ خود بیان کرتے ہیں :

بَلَغَنِيْ حَدِيْثٌ عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَابْتَعْتُ بَعِيْرًا فَشَدَدْتُ عَلَيْهِ رَحْلِيْ ثُمَّ سِرْتُ اِلَيْهِ شَهْرًا حَتّٰى قَدِمْتُ الشَّامَ فَاِذَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اُنَيْسٍ الْاَنْصَارِيُّ فَاَتَيْتُ مَنْزِلَهٗ وَاَرْسَلْتُ اِلَيْهِ اَنَّ جَابِرًا عَلَى الْبَابِ فَرَجَعَ اِلَيَّ الرَّسُوْلُ فَقَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ فَقُلْتُ نَعَمْ فَخَرَجَ اِلَيَّ فَاعْتَنَقْتُهٗ وَاعْتَنَقَنِيْ قَالَ قُلْتُ حَدِيْثٌ بَلَغَنِيْ عَنْكَ اَنَّكَ سَمِعْتَهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَظَالِمِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے ایک صاحب کے واسطے سے مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پہنچی۔ میں نے اسی وقت ایک اونٹ خریدا اور اس پر اپنا کجاوا کس کر ایک ماہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ شام پہنچا اور عبداللہ بن انیس انصاری (جن سے حدیث پہنچی تھی، ان) کے گھر پہنچا اور اندر آدمی بھیجا کہ دروازہ پر جابر کھڑا ہوا ہے آدمی نے واپس آکر پوچھا کیا جابر بن عبداللہ ہیں؟ میں نے کہا ہاں! عبداللہ بن انیس باہر نکل پڑے، دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے۔ پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے ذریعے ایک حدیث پہنچی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ثُمَّ اَسْمَعُهُ اَنَا مِنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الحدیث
(جامع بیان العلم ابن عبدالبر ص۹۳)

سے مظالم کے متعلق آپ نے سنی ہے اور میں نہیں سن سکا ہوں۔ عبداللہ بن انیس نے جواب میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے (پھر عبداللہ نے پوری حدیث سنائی)۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدفونِ قسطنطنیہ[1] کا ہے کہ ایک حدیث انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خود سنی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ شک پیدا ہوا۔ آپ کے ساتھ اس حدیث کے سننے کے وقت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی بھی دربارِ رسالت میں موجود تھے لیکن وہ مصر میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف ایک حدیث میں معمولی شک مٹانے کے لئے حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ سے مصر روانہ ہوتے ہیں، اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہو کر فرماتے ہیں:

حَدِّثْنَا مَا سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ سَتْرِ الْمُسْلِمِ لَمْ یَبْقَ اَحَدٌ سَمِعَهُ غَیْرِیْ وَغَیْرُكَ۔

مجھ سے اس حدیث کو بیان کرو جسے تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی عیب پوشی کے متعلق سنا ہے اب اس حدیث کے سننے والوں میں میرے اور تمہارے سوا کوئی باقی نہیں رہا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے سامنے اس حدیث کو دہراتے ہیں، حدیث یہ تھی، مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا عَلٰی خِزْیَةٍ سَتَرَهُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ وہ سنتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، وہ اس سے بھی عجیب تر ہے کہ

---

[1] قسطنطنیہ میں آپ کے دفن کا واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے پڑے تھے جس میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ اتفاق سے بیمار ہوئے اور یقین ہوگیا کہ آخری وقت ہے وصیت فرمائی کہ میری وفات کے بعد جنازہ کو لیکر مسلمان حملہ کریں اور دشمن کی زمین میں جہاں تک گھس سکتے ہوں گھستے چلے جائیں آخری نقطہ جہاں تک تمہاری رسائی ہو، اسی میں مجھے دفن کر دینا۔ جنازہ لیکر مسلمانوں نے حملہ کیا، غنیم کو پسپا کرتے ہوئے فصیل کی دیوار تک پہنچ گئے۔ وہیں قبر کھود کر حضرت کو دفن کر دیا گیا۔ محمد فاتح نے جب صدیوں بعد قسطنطنیہ فتح کیا تو خواب میں آپ نے اپنی قبر کا نشان دیا اسی پر جامع ابی ایوب تیار ہوئی۔

فَاَتٰی اَبُوْ اَیُّوْبَ رَاحِلَتَهٗ فَرَکِبَهَا وَانْصَرَفَ اِلَی الْمَدِیْنَةِ وَمَاحَلَّ رَحْلَهٗ۔ (۹۴ - جامع)

حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیث سنتے ہی اپنی سواری کی طرف پلٹے، سوار ہوئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے، آپ نے (مصر میں) اپنا کجاوہ بھی نہ کھولا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے نام نامی سے حدیث کا ابتدائی طالب علم بھی واقف ہے، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان اباسعید رحل فی حرف یعنی حدیث کے ایک حرف کی تصحیح کے لئے ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باضابطہ کوچ کیا۔ دارمی میں ایک اور صحابی کے متعلق ہے

اَنَّ رَجُلًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَحَلَ اِلٰی فُضَالَةَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ وَهُوَ بِمِصْرَ فَقَدِمَ عَلَیْهِ وَهُوَ یَمُدُّ لِنَاقَةٍ لَّهٗ فَقَالَ مَرْحَبًا قَالَ اَمَا اِنِّیْ لَمْ اٰتِكَ زَائِرًا وَّلٰكِنْ سَمِعْتُ اَنَا وَاَنْتَ حَدِیْثًا مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَجَوْتُ اَنْ یَّكُوْنَ عِنْدَكَ مِنْهُ عِلْمٌ۔ (دارمی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے ایک صحابی فضالہ بن عبداللہ کے پاس مصر پہنچے۔ فضالہ اس وقت اپنی اونٹنی کا چارہ تیار کررہے تھے، انہوں نے خوش آمدید کہا۔ صحابی نے جواب میں فرمایا کہ میں تمہاری ملاقات کو نہیں آیا ہوں بلکہ ہم نے اور تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی تھی۔ میں یہ امید لیکر آیا ہوں کہ وہ تمہیں یاد ہوگی۔

یہ تو بڑے بڑے صحابیوں کا حال تھا۔ باقی ایسے کم سن اصحاب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک سے اتنا فائدہ نہ اٹھا سکے تھے یا ان کے معاصر یا تلامذہ جنہیں تابعین کہتے ہیں، اس باب میں تو ان کے کارناموں کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ میں نے ذکر کیا تھا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما باوجود قرابتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے صحابہ کے دروازوں پر تلاش حدیث میں گرد کھاتے پھرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے صحابہ کی کثرتِ تعداد کے اس فائدے کو محسوس کرلیا تھا کہ ان کے ذریعہ سے اپنی تاریخ کے تمام خط و خال کی تکمیل میں پوری مدد مل سکتی ہے، اس سلسلے میں اپنے ایام طلب کے قصے بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ میں نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ

هَلُمَّ فَلْنَسْاَلْ اَصْحَابَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ

چلو بھائی! ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنَّهُمُ الْيَوْمَ كَثِيْرٌ۔	سے چل کر دریافت کریں کیونکہ ابھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے۔

لیکن ان کے رفیق بحث کے چھوٹے تھے، بولے:

يَا ابْنَ عَبَّاسٍ اَتَرَى النَّاسَ يَحْتَاجُوْنَ اِلَيْكَ وَفِي النَّاسِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (دارمی)	ابن عباس کیا تم سمجھتے ہو کہ لوگ تمہارے بھی محتاج ہوں گے، حالانکہ ابھی تو لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابی موجود ہیں۔

لیکن اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ یوں ہی چھوٹے بڑوں کے گزرنے کے بعد بڑے بنتے ہیں۔ بعد کو اپنے علمی سرمایہ کی بدولت جب ابن عباسؓ مرجع انام بن گئے تو وہ بیچارے پچھتاتے تھے اور کہتے تھے، کَانَ هٰذَا الْفَتٰى اَعْقَلَ مِنِّيْ (یہ نوجوان مجھ سے زیادہ دانشمند تھا)۔ تابعین میں سعید بن المسیب، مسروق وغیرہ، جن کے حالات آگے آرہے ہیں، ان کے بیانوں میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ حضرت سعید بن المسیب سے امام مالک راوی ہیں:

اِنِّيْ كُنْتُ لَاَسِيْرُ اللَّيَالِيَ وَالْاَيَّامَ فِيْ طَلَبِ الْحَدِيْثِ۔ (جامع)	میں حدیث کی تلاش میں کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں مسلسل چلتا رہا ہوں۔

حضرت مسروق کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ رحل فی حرف (یعنی صرف ایک لفظ کی تحقیق کے لئے کوچ کیا) ان تابعیوں کی نزاکتِ ذوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بسا اوقات کوئی حدیث ان کو ایسے آدمی سے پہنچتی جو شرفِ صحبت سے فیض یاب نہ ہوتے، حالانکہ اس حدیث کا علم ان کو حاصل ہوچکا ہوتا، لیکن اگر یہ معلوم ہوجاتا کہ جس صحابی سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے وہ زندہ ہیں تو خواہ وہ کسی مقام پر ہوتے، ان تک پہنچ کر کوشش کرتے کہ براہِ راست بھی اس روایت کو صحابی سے خود سن لیں۔

دارمی نے ابو العالیہ سے یہ روایت درج کی ہے:

كُنَّا نَسْمَعُ الرِّوَايَةَ بِالْبَصْرَةِ عَنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ نَرْضَ حَتّٰى رَكِبْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَسَمِعْنَاهَا	ہم لوگ بصرہ میں ایک روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے حوالے سے سنتے تھے مگر ہم صرف اسی پر قناعت نہیں کر لیتے تھے جب تک سوار ہو کر مدینہ پہنچ کر خود ان صحابیوں

مِنْ أَفْوَاهِهِمْ۔ (دارمی) کی زبانی بھی اس روایت کو نہ سن لیتے۔

یہ کسی خاص شخص کا حال نہیں ہے بلکہ عام تابعین کے طرزِ عمل کا بیان ہے۔ طلب حدیث کے لئے رحلت کا ایسا عام مذاق پھیل گیا تھا کہ بطور امورِ عامہ کے بعض بعض تابعین کی زبان پر یہ لطیفہ جاری ہو گیا یعنی شاگردوں سے حدیث بیان کرتے اور آخر میں انہیں مخاطب کر کے بطور طیب کے فرماتے:

خُذْهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ قَدْ كَانَ الرَّجُلُ يَرْحَلُ فِيمَا دُونَهَا إِلَى الْمَدِينَةِ (ابن سعد) بغیر کسی معاوضہ کے (مفت) یہ حدیث لیلو ورنہ حال یہ تھا کہ اس سے بھی کم چیز کے لئے لوگ مدینہ تک سفر کرتے تھے۔

یہ حضرت شعبی کا قول ہے جو کوفہ میں اپنے طلبہ سے مزاحاً کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا عوامل و مؤثرات سچ پوچھئے تو بجائے خود ان میں ہر ایک حدیث یعنی تاریخ کے اس عجیب و غریب سرمایہ کی حفاظت کی کافی ضمانت ہے، لیکن جہاں یہ سارے اسباب اکٹھے ہو گئے ہوں؟ اور اب اسی کے ساتھ آپ اس عام تاریخی دعوے کو بھی اپنے سامنے رکھ لیجئے کہ:

مَذْهَبُ الْعَرَبِ أَنَّهُمْ كَانُوا مَطْبُوعِيْنَ عَلَى الْحِفْظِ مَخْصُوصِيْنَ بِذٰلِكَ۔ (جامع) عرب کا عام طریقہ تھا کہ زبانی یاد رکھنے کی کچھ ان کی فطری عادت سی تھی، اس بات میں ان کو خاص خصوصیت حاصل تھی۔

عرب کا بدو کتابوں کے طومار کو دیکھ کر مذاق اڑاتا تھا۔ بدوؤں کا یہ عام چلتا ہوا فقرہ تھا "حَرْفٌ فِيْ تَامُوْرِكَ خَيْرٌ مِنْ عَشَرَةٍ فِيْ كُتُبِكَ" (دل میں ایک حرف کا محفوظ رہنا، کتابوں کی دس باتوں سے بہتر ہے)

عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

لَيْسَ بِعِلْمٍ مَا حَوَى الْقِمَطْرُ مَا الْعِلْمُ إِلَّا مَا حَوَى الصَّدْرُ

علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے نہیں ہے علم لیکن صرف وہی جو سینہ میں محفوظ ہو۔

دوسرا کہتا ہے ؎

اِسْتَوْدَعَ الْعِلْمَ قِرْطَاسًا فَضَيَّعَهُ وَبِئْسَ مُسْتَوْدَعُ الْعِلْمِ قَرَاطِيْسُ

جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کیا اس نے اسے ضائع کیا۔ علم کے بدترین مدفن کاغذ ہیں۔

تیسرے کا شعر ہے ؎

عِلْمِیْ مَعِیْ حَیْثُ مَا یَمَّمْتُ اَحْمِلُهٗ　　بَطْنِیْ وِعَاءٌ لَّهٗ لَا بَطْنُ صَنْدُوْقٍ

میرا علم میرے ساتھ ہے جہاں جاتا ہوں اٹھائے لئے جاتا ہوں، میرا باطن اس علم کا محافظ ہے نہ کہ شکم صندوق۔

اِنْ کُنْتُ فِی الْبَیْتِ کَانَ الْعِلْمُ فِیْهِ مَعِیْ　　اِذَا کُنْتُ فِی السُّوْقِ کَانَ الْعِلْمُ فِی السُّوْقِ

اگر گھر میں رہتا ہوں تو علم میرے ساتھ رہتا ہے، جب بازار میں ہوتا ہوں تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے۔

کم از کم ان اشعار سے اس قوم کے خاص رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنے اور کتابت کے متعلق شاید ہی کسی زبان میں اس قسم کے اشعار مل سکتے ہیں۔ سوسائٹی کے اس خاص مذاق کا یہ نتیجہ تھا کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظہ پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انسان اپنی جس قوت کو زیادہ استعمال کرتا ہے، اس میں جلا پیدا ہو جاتی ہے۔ مختلف اقوام کی مختلف چیزوں کے ساتھ خاص مناسبت کی یہی وجہ ہے۔ اسی لئے یہ مسلم ہے، اِنَّ الْعَرَبَ قَدْ خُصَّتْ بِالْحِفْظِ (عرب حافظہ کی قوت میں خصوصیت رکھتے تھے) ان کے حافظہ کی قوت کے جو واقعات کتابوں میں درج ہیں کتابی قوموں کیلئے حقیقت یہ ہے کہ ان کا باور کرنا دشوار ہے۔ حافظ عمر بن عبدالبر لکھتے ہیں:

کَانَ اَحَدُهُمْ یَحْفَظُ اَشْعَارَ بَعْضٍ فِیْ سَمْعَةٍ وَّاحِدَةٍ۔　　ان میں بعض لوگ صرف ایک دفعہ سن کر لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے سامنے عمر بن ابی ربیعہ شاعر آیا اور ستر شعر کا ایک طویل قصیدہ پڑھ گیا۔ شاعر کے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق گفتگو چلی، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ مصرعہ اس نے یوں پڑھا تھا۔ جو مخاطب تھا اس نے پوچھا کہ تم کو پہلی دفعہ میں کیا پورا مصرعہ یاد رہ گیا؟ بولے کہو تو پورے ستر شعر سنا دوں اور سنا دیا۔ حدیث کے مشہور راوی امام زہری کا بیان لوگ نقل کرتے ہیں کہ

اِنِّیْ لَاَمُرُّ بِالْبَقِیْعِ فَاَسُدُّ اُذُنَیَّ مَخَافَةَ اَنْ یَّدْخُلَ فِیْهَا شَیْءٌ مِّنَ الْخَنَا فَوَاللّٰهِ مَا دَخَلَ اُذُنَیَّ شَیْءٌ قَطُّ فَنَسِیْتُهٗ۔　　میں بقیع کی طرف گزرتا ہوں تو اپنے کانوں کو بند کر لیتا ہوں اس اندیشہ سے کہ ان میں کوئی فحش بات داخل ہو جائے، کیونکہ قسم خدا کی میرے کان میں کوئی بات اب تک ایسی

(ابن عبد البر) داخل نہیں ہوئی ہے، جسے میں بھول گیا ہوں۔

شعبی بھی یہی کہتے تھے:

مَا كَتَبْتُ سَوْدَاءَ فِي بَيْضَاءَ وَمَا اسْتَعَدْتُ حَدِيْثًا مِنَ النِّسْيَانِ۔ (ابن سعد)

میں نے کبھی سیاہی سے سفیدی پر کچھ نہیں لکھا اور نہ کسی شخص کی گفتگو میں نے کبھی بھولنے کے باعث دہرائی۔

غیروں پر توحجت نہیں ہو سکتی، لیکن علماء اسلام کا خیال ہے کہ علاوہ اس کے کہ عرب کا حافظہ قدرتی طور پر غیر معمولی تھا، یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق جس نے انا له لحافظون کا اعلان کیا تھا، اسی نے قرآن کی عملی شکل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حفاظت جن کے سپرد کی تھی ان کے حافظوں کو غیبی تائیدوں کے ذریعہ سے بھی کچھ غیر معمولی طور پر قوی تر کر دیا تھا۔ اور یہ تو بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دربارِ رسالت میں نسیان کی جب شکایت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص توجہ اور دعا کے ذریعہ سے ان کا حافظہ ایسا ہو گیا کہ پھر وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت تمام صحاح کی کتابوں میں مروی ہے، تقریباً شہرت کے انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہے۔

صحابۂ کرام حدیث کے زندہ نسخے تھے،

بہر حال صحابہ کا ذوق اتباع میں حتی الوسع ممکنہ حد تک اپنے کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر کرنے کی کوشش اور اسی رنگ میں دوسروں کو رنگنے کا ان میں بے پناہ جذبہ، ان تمام خصوصیات کے ساتھ جن کا میں نے ذکر کیا، اس کے بعد میں دعویٰ کروں کہ جن واقعات اور حالات اور جن اقوال وملفوظات کا ظہور آنحضرتؐ سے ہوا تھا صحابۂ کرام اپنے اپنے علم کی حد تک آنحضرتؐ کے زندہ مثنی بنے ہوئے تھے اور اس طرح تاریخ کی وہ کتاب یعنی حضورؐ کی زندگی عہد صحابہ میں بجائے ایک نسخہ کے ہزاروں نسخوں کی صورت میں موجود ہو چکی تھی تو کیا میرے اس دعوے کو کوئی غلط ثابت کر سکتا ہے؟ پس تدوین حدیث کی پہلی صورت تو خود صحابۂ کرام کی زندگی تھی اور یہی تھی حفاظتِ حدیث یا اس تاریخ کے محفوظ کرنے اور ہونے کی پہلی صورت۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہر صحابی اپنی زندگی میں بالکلیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو بہو نقل تھے۔ اگرچہ خلفائے راشدین ہی نہیں بلکہ درجہ میں ان سے بھی جو فروتر اصحاب ہیں، ہم کتابوں

میں یہ الفاظ ان کے متعلق پاتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید سے ترمذی میں مروی ہے کہ میں نے حضرت حذیفہؓ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

حَدِّثْنَا بِاَقْرَبِ النَّاسِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَدْيًا وَدَلًّا نَلْقَاهُ فَنَاْخُذُ عَنْهُ وَنَسْمَعُ مِنْهُ۔

مجھے بتائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال میں جو آدمی سب سے زیادہ قریب ہو وہ کون ہے؟ تاکہ میں ان سے ملوں، ان سے علم حاصل کروں، حدیثیں سنوں۔

ایک معاصرؓ دوسرے معاصر کے متعلق یہ شہادت ادا کرتا ہے یعنی حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اَقْرَبُ النَّاسِ هَدْيًا وَدَلًّا وَسَمْتًا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِبْنُ مَسْعُوْدٍ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال وضع و انداز میں سب سے زیادہ قریب ترین آدمی ابن مسعودؓ ہیں

صرف اُن ہی باتوں میں نہیں جن کا تعلق شریعت و قانون سے ہے بلکہ بعض صحابہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہو بہو تصویر اتارنے کے لئے یہاں تک کرتے تھے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق عام طور سے مشہور ہے:

كَانَ يَتَّبِعُ اٰثَارَهٗ فِيْ كُلِّ مَسْجِدٍ صَلّٰى فِيْهِ وَكَانَ يَعْتَرِضُ بِرَاحِلَتِهٖ فِيْ طَرِيْقٍ رَاٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَّضَ نَاقَتَهٗ۔ اصابہ

جن جن مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے راستوں میں نمازیں پڑھی تھیں، ابن عمرؓ ان مقامات کو تلاش کرتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے۔ راہ میں جہاں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کا رخ پھیرا تھا۔ ابن عمرؓ بھی قصداً اس مقام پر یہی کام کرتے تھے۔

یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ سفر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر استنجا کے لئے اونٹ سے کہیں اتر کے بیٹھے تھے تو باوجود عدم ضرورت کے استنجا کرنے والوں کی شکل بنا کر ابن عمرؓ اونٹ سے اتر کر وہاں بیٹھا کرتے۔ اسی سلسلہ میں ان کی یہ عام عادت بیان کی جاتی ہے۔

يَسْاَلُ مَنْ حَضَرَ اِذَا غَابَ عَنْ قَوْلِهٖ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قول و فعل سے یہ غائب

ے فن تنقید رجال میں انسانی فطرت کی اس کمزوری کا خیال کیا گیا ہے جس کی تعبیر المعاصرۃ اصل المنافرۃ "ہم عصری باہمی نفرت کی بنیاد ہے" کے مشہور فقرہ سے کی گئی ہے، اس لئے معاصر کی معاصر کے متعلق تعریف بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔

[illegible]

[illegible] (١٣٠) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (١٣١) [illegible]

حضورؐ پڑھتے تھے، اسی طرح وہ جھکتا ہے جس طرح حضورؐ جھکتے تھے، اسی طرح زمین پر سر رکھتا ہے جس طرح حضورؐ رکھتے تھے، اسی پر مسلمانوں کے دوسرے مذہبی اور دینی اعمال و عقائد کو قیاس کر لیجئے، کچھ نہیں تو کم از کم اس تاریخ کی کوئی ایک آدھی بات کلمۂ شہادت ہی سہی، اس تاریخ کا یہ جز تو ہر ایک مسلمان کے اندر اب تک محفوظ ہے۔

حدیث کا بہت بڑا حصہ متواتر ہے

اور اسی بنیاد پر کل کے متعلق تو نہیں لیکن تاریخ کے اس عظیم الشان ذخیرے کے ایک بڑے حصہ کو میں متواتر خیال کرتا ہوں یعنی بغیر کسی انقطاع کے نسلاً بعد نسلٍ لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کروڑہا کروڑ انسانوں کے ذریعہ سے مشرق و مغرب میں یہ حصہ منتقل ہوتا ہوا دنیا کے موجودہ دور تک پہنچا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک پہنچتا رہے گا، ان کی مقدار کیا ہوگی؟ اس کے لئے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ امت اسلامیہ کے تمام فرقے جن مسائل پر متفق ہیں، تقریباً سب کا یہی حال ہے۔ عقائد و ایمانیات کے سوا طہارت، غسل، وضو، عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، معاملات، عقوبات، سیاسیات، مباحات و محذورات وغیرہ وغیرہ مختلف ابواب سے ان اتفاقی مسائل کا اگر انتخاب کیا جائے جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں طبقۃً بعد طبقۃٍ خلفاً عن سلفٍ تواتر کے ساتھ اس حیثیت سے مسلم ہیں کہ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور طرزِ عمل تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز نہ ہوگی اور ان کا شمار کرنا زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔

گویا قرآن کے بعد ہم جس چیز کو بغیر کسی تذبذب و دغدغہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال و تقریرات کا یہی حصہ ہے جو ہم تک تعامل و توارث کے ذریعہ پہنچا ہے، لیکن اس مسئلہ میں صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی ہے بلکہ اسی کے ساتھ ان معلومات کے ہر ہر جز کو مسلسل روایت کے ذریعہ سے فن حدیث میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یوں باہم ایک کی دوسرے سے توثیق ہوتی ہے۔ اب روایتوں کے ذریعہ سے یہ چیزیں جس طرح مروی ہیں ان کو اور مسلمانوں نے تعامل کے ذریعہ سے ان چیزوں کو جس طرح ایک نسل سے دوسری

نسل تک منتقل کیا ہے، دونوں کو سامنے رکھئے، ہر ایک کی تصدیق دوسرے سے ہوگی، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا وہ حصہ جس کی منتقلی اس اتفاقی تعامل کے ذریعے عمل میں نہیں آئی ہے، اس کے لئے سب سے پہلے تو ہمارے پاس وہی روایت کا ذریعہ ہے۔ روایت کے اس سلسلہ کی آئندہ کڑیوں پر تو آگے بحث آئے گی عہدِ صحابہ میں جس حزم و احتیاط کے ساتھ ان چیزوں کو اپنی اصلی حالت پر محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی داستان آپ سن چکے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر فعل کی نگرانی، صحابۂ کرام کا ایک ایک لفظ کے شک مٹانے کے لئے سینکڑوں میل کا سفر طے کرنا، اس کا ذکر بھی آپ سن چکے ہیں، لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی بلکہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں خود صحابہ بھی ایک دوسرے سے اس معاملہ میں پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، ہر ایک اپنے علم کو دوسرے کے علم پر پیش کرتا تھا۔ ان کے اس طرزِ عمل ہی سے روایت کی قوت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

متابعات اور شواھد

اسی کے ساتھ صحابہ سے روایت کرنے والے حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ ایک ہی روایت جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو اس میں کمی نہ کی جائے۔ اصطلاحِ حدیث میں روایت کے اس طریق عمل کا نام متابعت تھا اور جو روایتیں اس طریقہ سے حاصل کی جاتی تھیں یعنی ایک ہی واقعہ کو تصدیق و توثیق کے لئے شاگرد اپنے استاذ کے رفیقوں اور ہمعصروں سے بھی جو روایت کرتا ہے ان کا نام اصطلاحاً متابعات و شواہد ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا محدثین میں توابع و شواہد کے جمع کرنے کا شوق زیادہ شدت پذیر ہوتا رہا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف ایک مشہور حدیث إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ سات سَو طریقوں سے مروی ہے یعنی حدیث ایک ہے لیکن اس کی سندیں سات سو ہیں اور یہ عدد بھی ایک خاص نقطۂ نظر سے ہے ورنہ اس حدیث کے طرق دراصل اس سے بھی زیادہ ہیں۔ روایتوں میں قوت پیدا کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا، محدثین نے اس پر بہت زیادہ زور دیا ہے جس کا قصہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئیگا۔ حدیث کی مشہور کتاب صحیح مسلم میں امام مسلم کا نقطۂ نظر زیادہ تر اسی عمل پر مرکوز رہا ہے۔ خیر یہ تو بعد کو ہوا لیکن عہدِ صحابہ میں بھی جہاں تک ممکن ہوا ہے اس طریقے کے برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ

غیر متواتر حدیثوں کا بھی جو ذخیرہ ہمارے پاس ہے زیادہ تر ان میں ایک ایک حدیث کے راوی آٹھ آٹھ دس دس صحابی ہیں۔ مشہور محدث امام ترمذی نے اپنی کتاب میں جہاں اور بہت سی مفید باتیں اضافہ کی ہیں، اس کا بھی التزام کیا ہے کہ ہر حدیث کو بیان کر کے آخر میں بتاتے ہیں کہ کن کن صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے۔ اور یہ تو واقعہ کے عینی شاہدوں یا ہمعصروں کی تعداد ہے۔ بعد کو صحابہ کے شاگردوں اور ان کے شاگردوں کے شاگردوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوتا چلا گیا ان کا تو شمار کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہمارے پاس بحمد اللہ ایسی ایک نہیں متعدد کتابیں موجود ہیں جن میں ہر حدیث کے تمام اسناد ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ آج دنیا میں کون ہے جو گزرے ہوئے واقعات میں سے کسی ایک واقعہ کے متعلق بھی وثوق و اعتماد کے ان آہنی ذرائع کو پیش کر سکتا ہے؟ باسورتھ اسمتھ حدیث کی اسی تاریخی وثاقت کو دیکھ کر یہ لکھنے پر مجبور ہوا ہے کہ "کوئی شخص یہاں (سیرت نبوی) کے متعلق نہ خود کو دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے کہ یہاں دن کی پوری روشنی ہے۔" (لائف آف محمدؐ از باسورتھا اسمتھ ص ۱۰) لیکن ابھی بات پوری نہیں ہوئی، ایک اہم نقطہ بحث کا ابھی باقی ہے، قبل اس کے کہ میں ادھر توجہ کروں، ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے چلوں۔ عموماً لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حدیث کی ابتدائی نوعیت کسی علم کی نہیں تھی، متفرق طور پر متفرق صحابیوں نے آنحضرت سے کچھ سنا یا کچھ کرتے ہوئے دیکھا تھا، پھر یا تو بضرورت انھوں نے کبھی اس کا اظہار کر دیا یا بعض تو یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ جیسے گھر کے پرانے بڑے بوڑھے اپنی ریٹائرڈ زندگی میں نوجوانوں کے درمیان بیٹھ کر اپنے عہد جوانی کے قصے دل بہلانے اور گرمی بزم کیلئے بیان کرتے ہیں۔ یوں ہی العیاذ باللہ حدیث کی ابتدا ہوئی بعد کو پھر بتدریج لوگوں نے اس کو ایک علم بنا لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور سیرت طیبہ کو جو تعلق قرآن اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی بنیاد پر مسلمانوں کی اخلاقی و مذہبی زندگی سے تھا، آپ اس کا حال سن چکے۔ کیا اس کے بعد کوئی ایک سکنڈ کے لئے بھی سوچ سکتا ہے کہ خدانخواستہ کسی زمانہ میں بھی آپ کے اقوال و اعمال خصوصاً عہد صحابہ میں اتنے غیر اہم ہو سکتے تھے جیسا کہ اس شیطانی وسوسہ کا اقتضا ہے؟ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے اس کے ذمہ دار تھے کہ قرآن کی تعمیلی شکل اور اس کے تشریحی مطالب کو خود اپنی زندگی کے

نمونوں سے مسلمانوں کو بتائیں اور مسلمان بھی اس کے ذمہ دار قرار دیئے گئے ہیں کہ ان کو اپنی زندگی کا جزء بنائیں اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلانے کی کوشش کریں۔ ایسی صورت میں دیوانوں کے سوا اس قسم کے اوہام میں اور کون مبتلا ہو سکتا ہے؟ ماسوا اس کے خود عہدِ نبوت میں جیسا کہ کہہ چکا ہوں، قرآن اور سنن وسیرت کے سیکھنے سکھانے کے لئے ایک باضابطہ تعلیم گاہ صُفّہ کے نام سے قائم تھی، جس میں طلبہ کی تعداد ایک ایک وقت میں اسی اسی تک ہوتی تھی۔ اس مدرسہ میں تعلیم دینے کا کام ابوھریرہ، ابن مسعود، زید بن ثابت، ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم عہدِ صحابہ میں انجام دیتے تھے، مسلمان ہو ہو کر باہر سے لوگ آتے تھے اور حسب ضرورت اس مدرسہ میں قیام کر کے اپنے گھر جاتے تھے۔ خود قرآن میں اس کا حکم بھی دیا گیا تھا جیسا کہ ارشاد ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (توبہ)

پھر ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر آبادی میں سے ایک گروہ نکل آئے، تاکہ دین کی سمجھ حاصل کرے اور واپس جا کر اپنے لوگوں کو ڈرائے ہو سکتا ہے کہ لوگ اس کے بعد پارسائی اختیار کریں۔

اس مدرسہ میں انہیں کن کن باتوں کی باضابطہ تعلیم دی جاتی تھی؟ حدیثوں میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ فروہ بن مسیک جو یمن سے مدینہ منورہ آئے تھے اور بعد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یمن کے قبائل مراد زبید، مذحج کے گورنر بنا کر بھیجے گئے، ان کے ذکر میں بیان کیا جاتا ہے:

جَاءَ مِنَ الْيَمَنِ وَتَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَفَرَائِضَ الْإِسْلَامِ وَشَرَائِعَهُ ۔ (ابن سعد)

یمن سے آئے اور قرآن اور اسلام کے فرائض و قوانین کی تعلیم حاصل کی۔

اور یہ تو ان لوگوں کی تعلیم کا طریقہ تھا جو خود مدینہ چلے آتے تھے۔ لیکن جو نہیں آسکتے تھے، ان کیلئے آستانۂ نبوت سے باضابطہ معلمین بھیجے جاتے تھے، اسی سلسلے میں بئر معونہ اور رجیع کے معلموں کا مشہور واقعہ ہے جن میں ان بیچارے معلموں کو دھوکہ دے کر شہید کر دیا گیا تھا۔ ان کے سوا حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ منجملہ اور اغراض کے تعلیمی غرض سے بھی یمن بھیجے گئے تھے۔ حضرت معاذؓ کو جو حکم دیا گیا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بَعَثَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى قَوْمِيْ أَدْعُوْهُمْ إِلَى اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَأَعْرِضُ عَلَيْهِمْ شَرَائِعَ الْإِسْلَامِ۔ (مستدرک)	مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی طرف اس لئے بھیجا کہ ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف بلاؤں اور ان پر اسلامی قوانین پیش کروں۔

الغرض قرآن کے ساتھ ساتھ شرائع اسلام یعنی قرآن کے احکام کی تعمیلی شکل جو صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود کر کے بتایا کرتے تھے، عہد نبوت ہی میں ان دونوں کی حیثیت مستقل علم کی ہو چکی تھی۔ حدیث کا وہ ذخیرہ جس میں تعلیم و تعلم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پیرایوں میں ابھارا ہے۔ آج کل کی لیڈرانہ تقریروں میں تو اس کے تحت داغ اور امیر کی شاعری اور شکسپیرؔ اور کالی داس کے ڈراموں تک کی تعلیم حاصل کرنے کو داخل کر دیا جاتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ زیادہ تر ان سے مراد قرآن اور سنت ہی کی تعلیم تھی، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، نہ صرف مدینہ منورہ بلکہ ان تمام مرکزی شہروں میں جہاں جہاں اسلام کی حکومت پہنچ چکی تھی اور حضرات صحابۂ کرامؓ کی مختلف جماعتیں وہاں جا کر توطن پذیر ہو گئی تھیں جن میں خود مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، یمن، یمامہ، بحرین، دمشق، کوفہ، بصرہ، مصر کو خاص اہمیت حاصل ہے، جلیل القدر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شہروں کے جوامع میں قرآن کے ساتھ ساتھ روایت حدیث کے باضابطہ حلقے قائم کر دیئے تھے، مدینہ منورہ میں مردوں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عورتوں میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمات اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں تھیں، اسی طرح دمشق میں حضرت ابو درداءؓ، کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ بصرہ میں عمران بن حصینؓ، از یں ہر مرکزی شہر میں ان اغراض سے تعلیمی حلقے جاری ہو چکے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا ذوق روایت تو اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ جمعہ کے دن بھی چونکہ مسجد میں عام مسلمانوں کا بڑا مجمع جمع ہو جاتا تھا، اس مجمع کو غنیمت خیال کر کے تقریباً ہر جمعہ میں قبل اس کے کہ امام خطبہ کیلئے منبر پر آئے، آپ کا یہ عام قاعدہ تھا جیسا کہ حاکم کی مستدرک میں روایت ہے کہ:

كَانَ أَبُوْهُرَيْرَةَ يَقُوْمُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ إِلٰى جَانِبِ الْمِنْبَرِ ثُمَّ يَقْبِضُ عَلٰى رُمَّانَةِ الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ قَالَ أَبُو الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ	جمعہ کے دن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر کے ایک کنارے کھڑے ہو جاتے پھر منبر کا گولا تھام کر فرماتے "فرمایا ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے، فرمایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے

وسلم قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم	فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، فرمایا الصادق المصدق،
قال الصادق المصدوق صلى الله عليه وآله	صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ پھر جب انہیں محسوس ہوتا کہ مقصورہ[1]
وسلم فاذا سمع باب المقصورة بخروج الامام جلس.	کے دروازے سے امام نکل رہا ہے، بیٹھ جاتے۔

ابن سعد کی ایک تابعی سے روایت ہے کہ

دخل مسجد حمص فاذا بحلقة فيهم	وہ (شام کے مشہور شہر) حمص میں داخل ہوئے، کیا دیکھتے ہیں
رجل جميل وضاح الثنايا وفي القوم	کہ ایک خوبصورت آدمی جن کے دانت الگ الگ تھے لوگوں
من هو اسن منه وهم يقبلون عليه	کے مجمع میں بیٹھے ہوئے ہیں، مجمع میں ایسے آدمی بھی ہیں جو اس
يستمعون كلامه فسألته من انت فقال	حسین آدمی سے عمر میں بڑے ہیں، وہ اس پر جھکے ہوئے اس کی
انا معاذ بن جبل. (ابن سعد)	باتیں سن رہے ہیں۔ میں نے پوچھا تم کون ہو؟ بولے میں معاذ بن جبل ہوں۔

بصرہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوسرے صاحب کا بیان ہے:

اتيت البصرة فدخلت المسجد فاذا انا	میں بصرہ پہنچا اور مسجد میں داخل ہوا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک
بشيخ ابيض الرأس واللحية مستند الى	بوڑھے آدمی جن کے سر اور داڑھی کے بال سپید تھے مسجد کے ستون سے
اسطوانة في حلقة يحدثهم. (ابن سعد)	پیٹھ لگا کر ایک حلقہ میں بیٹھے ہوئے حدیثیں بیان کر رہے ہیں۔

ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ

كان لجابر بن عبد الله حلقة في المسجد	مسجد نبوی میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا
النبوي يؤخذ عنه العلم. (اصابہ جلد ۱ ص۲۱۳)	ایک حلقۂ درس تھا، جس میں لوگ ان سے علم حاصل کرتے تھے۔

اور یہ سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر اکابر اصحاب میں ہیں۔ اس کے بعد پھر کون کہہ سکتا ہے کہ "فن حدیث" کی حیثیت عہد نبوت یا عہد صحابہ میں باضابطہ علم کی نہیں بلکہ افواہی قصوں کی سی تھی۔

---

[1] خلفاء پر جب اچانک حملے ہونے لگے تو مسجد میں ایک کمرہ خاص بنا دیا جاتا تھا، جس میں خلیفہ سنتیں وغیرہ پڑھتے اور اس سے باہر ہو کر منبر پر آتے، اسی کو مقصورہ کہتے تھے۔

حدیث کی کتابی تدوین

بہرحال یہاں تک تو فن حدیث کے وثوق و اعتماد کے صرف دو ذریعوں پر بحث ہوئی یعنی ایک تعامل دوسری روایت. لیکن آخر میں ایک سوال رہ جاتا ہے اور دنیا کے اس کاغذی دور میں عموماً گدگدی اسی کی اٹھتی ہے دل ہی دل میں لوگ سوال کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ سہی لیکن کتابی شکل میں آخر تاریخ کا یہ حصہ کب آیا. گویا اسی زمانہ کو تدوین حدیث کا آغاز قرار دینا چاہتے ہیں. اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ گزشتہ بالا ساز و سامانوں کے ہوتے ہوئے شاید اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی، بلکہ کتابت کے متعلق جو عربی مذاق تھا اس کو دیکھتے ہوئے تو اس کی اور بھی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی فقہ و حدیث کے مشہور امام اوزاعی تو فرمایا کرتے تھے:

كَانَ هٰذَا الْعِلْمُ شَيْئًا شَرِيْفًا اِذَا كَانَ مِنْ اَفْوَاهِ الرِّجَالِ يَتَلَاقَوْنَهٗ وَيَتَذَاكَرُوْنَهٗ فَلَمَّا صَارَ فِي الْكُتُبِ ذَهَبَ نُوْرُهٗ وَصَارَ اِلٰى غَيْرِ اَهْلِهٖ۔ (جامع بیان العلم جلد ۱ ص۹۸)	حدیث کا علم بہت ہی قیمتی اور شریف اس وقت تک تھا جب لوگوں کے منہ سے حاصل کیا جاتا تھا. لوگ باہم ملتے جلتے رہتے تھے اور آپس میں اسی کا مذاکرہ کرتے رہتے تھے، لیکن جب سے حدیثیں کتابوں میں درج ہوگئیں اس کا نور اور اس کی رونق جاتی رہی اور ایسے لوگوں میں پہنچ گیا جو اس کے اہل نہیں۔

اور اسی لئے تاریخ حدیث کے بیان کرنے والوں نے حدیث کی کتابی تدوین کا آغاز کب سے ہوا اس کی طرف بہت کم توجہ کی، لیکن آج اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو نہیں جانتے ہیں ان مسکینوں کو تو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی اس حدیث کا کیا اعتبار جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو سو برس بعد مدون ہوئی، اچھے پڑھے لکھے لوگ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بیچارے امام بخاری اور مسلم کے سن وفات کو پیش کر دیتے ہیں. گویا ان کے نزدیک سب سے پہلے حدیثوں کو جس نے قلمبند کیا وہ یہی حضرات تھے۔ اور یہ تو غیر جاہلوں کی باتیں ہیں، لیکن بعض محدثین کے بیانات سے عموماً ارباب واقفیت بھی اس مغالطہ

ہوتا چلا آرہا ہے اور روایت کے متابعاتی و شواہدی طریقوں سے جس طرح یہ موجودہ شکل میں آیا ہے، ٹھیک اسی طرح اپنے چشم دید گواہوں کے زمانہ سے قید تحریر میں آکر مسلسل اسی طرح کتابی شکل میں باقی رہا اور ابتک باقی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ممکن ہے کہ ابتدا میں بعض لوگوں نے حدیث کے بعض ذخیروں کو لکھ لیا ہو، لیکن بعد کو یہ کتابی ذخیرے ضائع ہوگئے اور درمیان میں پھر زبانی روایت پر اس کا دارومدار رہ گیا ہو اور آخر میں لوگوں نے اسے پھر قلمبند کیا۔ ایسا سمجھنا بھی قطعًا واقعات کے خلاف بلکہ جس طرح گلستاں جب سے سعدی نے لکھی اور اب تک درمیان میں غائب ہوئے بغیر اسی کتابی شکل میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے یعنی اس کتاب پر ایسا کوئی زمانہ نہیں گزرا کہ دنیا سے بالکلیہ ناپید ہوگئی ہو اور پھر لوگوں نے اپنے حافظوں کے ذریعہ سے اُسے دوبارہ قید تحریر میں لایا ہو، جیسا کہ تورات وغیرہ کے متعلق ایک دفعہ نہیں بار بار یہ واقعہ پیش آتا رہا ہے کہ تین تین سو چار چار سو سال کے لئے اس کا تحریری سرمایہ ناپید ہوگیا اور پھر سینوں سے اس کو سفینوں میں لانے کی کوشش کی گئی، حدیث کے اس کتابی ذخیرہ پر بحمد اللہ یہ حادثہ کبھی نہیں گزرا۔

بہرحال یہ تو میرا دعویٰ ہے، اس دعوے کے ثبوت کے جو ذرائع میرے پاس ہیں، اب انہیں پیش کرتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ اور باتیں بیان کی جائیں پہلے یہ سن لینا چاہئے کہ اس وقت امت کے ہاتھ میں حدیثوں کا جو معتبر اور قابلِ اعتماد ذخیرہ موجود ہے اس کی مقدار اور ان حدیثوں کی تعداد کیا ہے؟ یوں تو عام طور سے جہاں حدیث کے حافظوں کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو نامعتبر یا ردّ شدہ حدیثوں کے سوا جو قابلِ اعتماد حصہ محفوظ تھا اس کی تعداد سات لاکھ کے اوپر تھی، اسی طرح امام ابوزرعہ جو حفاظ حدیث میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، ان کی حدیثوں کی تعداد بھی سات لاکھ بتائی جاتی ہے۔ امام بخاری کے متعلق عام طور سے لکھتے ہیں کہ انہیں دو لاکھ کے قریب تو غیر صحیح اور ایک لاکھ صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ امام مسلم سے لوگوں نے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ اپنی کتاب صحیح کے متعلق خود فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کان سے سنی ہوئی تین لاکھ حدیثوں سے میں نے یہ مجموعہ منتخب کیا ہے۔ اسی طرح مختلف لوگوں کی طرف بڑے بڑے اعداد منسوب ہیں لیکن ان

بیانوں سے عوام جو سمجھتے ہیں کیا اُس کا مقصود بھی وہی ہے؛ بات یہ ہے کہ لوگ محدثین کی ایک اصطلاح سے چونکہ ناواقف ہیں اس لئے انہیں حیرت ہوتی ہے بلکہ یہ بھی وسوسہ ہوتا ہے کہ مثلاً امام بخاری کو اگر اتنی صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں تو پھر انہوں نے اپنی کتاب میں سب کو درج کیوں نہیں کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ حدیث کی حفاظت و بیان کا جو روایتی طریقہ ہے پہلے بھی میں بتا چکا ہوں کہ اس طریقہ کو مستحکم و مضبوط بنانے کے لئے ابتدار سے متابعات و شواہد کی کثرت کا طریقہ مروج ہو گیا تھا یعنی ایک ایک حدیث کو جن جن سندوں اور طریقوں سے روایت کرنا ممکن تھا محدثین ان تمام طریقوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کی یہ اصطلاح تھی کہ ایک ہی حدیث کو ان کے مختلف طریقوں کے اعتبار سے بجائے ایک کے طریقوں کے حساب سے شمار کرتے تھے۔ مثلاً انما الاعمال بالنیات کی حدیث جیسا کہ بیان کر آیا ہوں، واقعہ کے لحاظ سے ایک حدیث ہے لیکن محدثین چونکہ سات سو طریقوں سے اسے روایت کرتے ہیں اس لئے بجائے ایک کے صرف اسی ایک حدیث کی تعداد سات سو ہو جاتی ہے، اور یہ کسی ایک حدیث کا نہیں بلکہ حدیث کے بیشتر حصہ کا یہی حال ہے۔ حدیثوں کے ان عجیب و غریب اعداد کی بنیاد ایک تو یہ ہے، دوسرے یہ پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ گو ابتدار میں حدیث جس کے لفظی و لغوی معنی بات کے ہیں، اس کا اطلاق محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظاتِ طیبہ پر کیا جاتا تھا، مگر پھر اس میں وسعت پیدا ہوئی اور آپؐ کے افعال و تقریرات کو بھی اس کے نیچے درج کیا گیا اسی طرح رفتہ رفتہ اطلاق میں اور کشادگی پیدا ہوئی اور صحابہ کے اقوال و فتاویٰ اور فیصلوں، بلکہ تابعین و تبع تابعین تک کی چیزوں کو بھی لوگوں نے حدیث کے نیچے داخل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے قدرتاً حدیثوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے لیکن عامی خیال کرتے ہیں کہ یہ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی تعداد ہے، صاحب توجیہ النظر لکھتے ہیں:

إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْمُتَقَدِّمِينَ كَانُوا يُطْلِقُونَ اسْمَ الْحَدِيثِ عَلَى مَا يَشْمَلُ آثَارَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ وَتَابِعِيهِمْ وَفَتَاوَاهُمْ وَيَعُدُّونَ الْحَدِيثَ الْمَرْوِيَّ

متقدمین کی بڑی جماعت عموماً حدیث کے لفظ کا اطلاق، ایسے عام مفہوم پر کرتی تھی جس میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے آثار و فتاویٰ سب ہی داخل ہیں نیز ایک ہی حدیث جو دو[۲]

بِاَسَانِیدَیْنِ حَسَنِیْنِ ۔ (ص۹۳) سندوں سے مروی ہوتی اُسے وہ حدیث قرار دیتے تھے۔

اور یہی مراد ہے ابن جوزی کے اس فقرے سے جو حدیثوں کے ان اعداد کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اِنَّ الْمُرَادَ بِھٰذَا الْعَدَدِ الطُّرُقُ لَا الْمُتُوْنُ (تلقیح ص۱۸۷) یعنی ان اعداد سے مقصد حدیثوں کے متن کی مقدار نہیں ہے بلکہ ان کے طریقے اور اسناد مراد ہیں۔

یہ حدیث کے ان بڑے بڑے اعداد کا حال ہے لیکن واقعی وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ کہاں لاکھ، دو لاکھ، چار لاکھ کی باتیں تھیں اور اب سنئے کہ امام بخاری کی صحیح سند کے ساتھ جو حدیثیں مروی ہیں ان کی تعداد لے دے کے یہ مشکل دو ہزار چھ سو دو ہے اور امام مسلم کی حدیثوں کی تعداد کل چار ہزار ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلم میں بخاری کے سوا چار ہزار حدیثیں ہیں بلکہ زیادہ تر دونوں کی روایتیں مشترک ہیں، اور یہ تو ان دو بڑی کتابوں کی حدیثوں کا حال ہے، مؤطا امام مالک جسے بعض لوگ صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں، اس کی کل حدیثوں کی تعداد صرف چھ سو ستانوے ہے۔ بہر حال شمار کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ صحیح، حسن، ضعیف ہر قسم کی تمام حدیثیں جو اس وقت صحاح ستہ، مسند احمد اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں ان کی تعداد پچاس ہزار بھی نہیں ہے اور یہ رطب ویابس کے مجموعہ کی تعداد ہے۔ تمام کتابوں سے چھان بین کرکے ابن جوزی نے نہیں، جن کی تنقید کا معیار بہت سخت ہے، بلکہ حاکم جو نرمی اور مسامحت میں مشہور ہیں، ان کا بیان ہے کہ اول درجہ کی صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اب حاکم کی اس رپورٹ کو اپنے سامنے رکھئے اور اس کے بعد میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان خطوط اور معاہدوں، امان ناموں، جاگیر وقطائع کے فرامین کے جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا ہے اور جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے اور حدیث کی جو تعریف ہے ان پر وہ بھی صادق آتی ہے۔ حدیث کے اس کتابی ذخیرہ کے سوا عہد نبوت وقرون صحابہ میں حدیث کا کتنا سرمایہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا، دنیا کو یہ سن کر حیرت ہوگی، لیکن کیا کیا جائے، واقعہ یہی ہے کہ دس ہزار نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد میں حدیثیں عہد نبوت اور عہد صحابہ میں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ آخر آپ جوڑ لیجئے۔ محدثین لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

حدیثوں اور مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے اور ایک ذریعہ سے نہیں مختلف ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود اپنی یادداشت کے لئے بھی اپنی روایت کردہ حدیثوں کو کتابی شکل میں لے آئے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع میں ان کے اس کتاب کے واقعہ کو اس طرح درج کیا ہے کہ مشہور صحابی عمرو بن امیہ ضمیریؓ جن کو طلسم ہوشربا اور داستان امیر حمزہ نے عمرو عیار کے نام سے بہت مشہور کر دیا ہے، ان کے صاحبزادے حسن بیان کرتے ہیں:

تحدثت عند ابی هریرة بحدیث فانکره فقلت انی قد سمعته منك فقال ان کنت سمعته منی فهو مکتوب عندی فاخذ بیدی الی بیته فارانا کتبا کثیرة من حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم فوجد ذلك الحدیث فقال قد اخبرتك ان کنت حدثتك به فهو مکتوب عندی۔

(جامع)

میں نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ایک حدیث بیان کی۔ انہوں نے اس کا انکار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس حدیث کو میں نے آپ ہی سے سنا ہے، بولے اگر تم نے مجھ سے حدیث سنی ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی۔ پھر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر میں لے گئے۔ مجھے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی کتابیں دکھائیں، اسی (ذخیرہ) میں وہ حدیث بھی پائی گئی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے اس کے بعد فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں نے اگر کوئی حدیث تم سے بیان کی تھی تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے بھی دوسری سند سے فتح الباری میں اس روایت کو درج کیا ہے، اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہؓ کے پاس صرف چند حدیثیں لکھی ہوئی تھیں بلکہ جو کچھ وہ روایت کرتے تھے کتابی شکل میں ان کے پاس موجود تھا۔ جب یہ معلوم ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار سے اوپر ہے اس کے بعد اگر کہا جائے کہ پانچ ہزار سے اوپر حدیثیں اس وقت لکھی ہوئی تھیں تو کیا اس روایت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی؟ اور صرف ایک نسخہ نہیں، دارمی جو حدیث کی مستند کتاب ہے اور اس کا درجہ صحاح ستہ کی اکثر کتابوں سے بلند ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہور شاگرد بشیر بن نہیک نے ایک نسخہ ان کی حدیثوں کا تیار کر کے خود ان کو پڑھ کر سنایا تھا، روایت کے الفاظ یہ ہیں،

عَنْ بَشِيْرِ بْنِ نَهِيْكٍ قَالَ كُنْتُ أَكْتُبُ مَا أَسْمَعُ مِنْ أَبِي هُرَيْرَةَ فَلَمَّا أَرَدْتُ أَنْ أُفَارِقَهُ أَتَيْتُهُ بِكِتَابِهِ فَقَرَأْتُهُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ لَهُ هٰذَا مَا سَمِعْتُهُ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ

حضرت بشیر بن نہیک سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو حدیثیں میں سنا کرتا تھا، انہیں لکھ لیا کرتا تھا. جب میرا ارادہ ان سے الگ ہونے کا ہوا تو ان کی حدیثوں کو ان کے سامنے پڑھ گیا اور آخر میں کہا کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو آپ سے میں سنی ہیں، بولے، ہاں۔

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوسرے شاگرد ہمام بن منبہ ہیں جو یمن کے اُمرا میں سے تھے، ایک زمانے تک ان کی خدمت میں رہے اور ان کی حدیثوں کو جمع کیا جو صحیفۂ ہمام کے نام سے مشہور ہے امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی مسند میں داخل کر دیا ہے. گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسی زمانے میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثوں کے یہ نسخے تیار ہو چکے تھے. اور ان کا تو پتہ چلا ہے ورنہ ابوہریرہؓ جن کے شاگردوں کی تعداد امام بخاری نے آٹھ سو کے قریب بتائی ہے. کون کہہ سکتا ہے کہ کتنوں نے اس کام کو کیا ہوگا. خود حضرت ابوہریرہؓ نے اپنے لئے جب نسخہ تیار کیا تھا تو کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ ان کے شاگرد ایسا نہ کرتے. اور اس سے بھی میں اور آگے بڑھتا ہوں. صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک یہ بیان درج ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

مَا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَدٌ أَكْثَرَ حَدِيثًا عَنْهُ مِنِّي إِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں حضور کی حدیثوں کا بیان کرنیوالا مجھ سے زیادہ کوئی نہیں ہے البتہ عبداللہ بن عمرو بن العاص اس سے مستثنیٰ ہیں. (یعنی انکی حدیثوں کی تعداد مجھ سے بھی زیادہ ہے)

جس کے معنی یہ ہوئے کہ عبداللہ بن عمرو کی مرویات کی تعداد خود حضرت ابوہریرہؓ کی ذاتی اعتراف کی بنیاد پر ان کی حدیثوں سے زیادہ تھی. جب ان کی حدیثیں پانچ ہزار سے زائد ہیں تو اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر سے یقیناً زائد ہونی چاہیئے. بخاری کے صریح الفاظ کا یہ تقاضا ہے. اب سنئے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیثوں کا کیا حال ہے. بخاری کی اسی حدیث میں ابوہریرہؓ ہی کا یہ بیان درج ہے کہ وہ لکھا کرتے

[illegible]

جس کا یہ مطلب ہوا کہ دس ہزار سے کم ہی ہیں۔ اور معلوم ہو چکا کہ عہد نبوت ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جو مجموعہ جمع ہوا، اس کی روایتوں کو پانچہزار تین سو چوہتر سے تو یقیناً زیادہ ہونا چاہیئے اور ایسے موقع پر یہیں اس کا بھی خیال کرنا چاہیئے کہ عام محاوروں میں "اکثر" کا لفظ جب استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے محض ریاضیاتی زیادتی مراد نہیں ہوتی۔ یعنی صرف دو تین عدد کی زیادتی کبھی مقصود نہیں ہوسکتی بلکہ اکثریت معقول تعداد کی زیادتی کو چاہتی ہے۔ گویا حاکم نے صحیح حدیثوں کی جو تعداد بیان کی ہے قریب قریب یہ باور کرنا چاہیئے کہ عہد نبوت ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی اتنی مقدار خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عبداللہ بن عمرؓو قلمبند کر چکے تھے اور ان کے لکھنے پڑھنے کا جو حال تھا اس کے حساب سے ان کے لئے یہ کام دشوار بھی نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی جب شام و مصر میں ان کو عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کی کتابیں ملیں تو ان سے منتخب کر کے انہوں نے ایک بڑا دفتر تیار کیا تھا اور اس کا نام انہوں نے صحیفۂ یرموکیہ رکھا تھا کسی موقعہ پر ان کی اس کتاب کا ذکر آئے گا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف و تصنیف سے انہیں فطری لگاؤ تھا۔

بہر حال پھر بھی ابھی تک میرے نتیجہ کی حیثیت فی الجملہ قیاسی نتیجہ کی ہے۔ لیکن اب آگے سنئے۔ جن صحابیوں کا شمار ان لوگوں میں ہے جن سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں، اس فہرست میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور صحابہ میں معمر ترین بزرگ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ ان کی حدیثوں کی تعداد ایکہزار دو سو چھیاسی ہے۔ دارمی میں ان سے یہ روایت منقول ہے کہ اپنی اولاد سے جنکی ایک بڑی تعداد تھی فرماتے

يَا بَنِيَّ قَيِّدُوْا هٰذَا الْعِلْمَ — میرے بچو! اس علم حدیث کو قلمبند کر لیا کرو۔

اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حدیثوں کا مجموعہ یقیناً لکھا جا چکا ہوگا۔ صرف اسی قدر نہیں، دارمی ہی میں منقول ہے کہ

رَأَيْتُ اَبَانَ يَكْتُبُ عِنْدَ اَنَسٍ رض — میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز روایت مستدرک میں سعید بن ہلال کا بیان ہے:

كُنَّا اِذَا اَكْثَرْنَا عَلٰى اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ — ہم جب حضرت انسؓ سے زیادہ پوچھ گچھ لگاتے تو وہ اپنے پاس

تَعَالیٰ عَنْہُ فَاَخْرَجَ اِلَیْنَا مَجَالَّ عِنْدَہٗ فَقَالَ ھٰذِہٖ سَمِعْتُھَا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَکَتَبْتُھَا وَعَرَضْتُھَا عَلَیْہِ (مستدرک حاکم)

سے ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنیں اور ان کو لکھا اور لکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کر چکا ہوں۔

تھوڑے رد و بدل سے یہ الفاظ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے اور حضرت انس کے متعلق کتابتِ حدیث کی جن دلچسپیوں کا تذکرہ دارمی سے میں نے پہلے نقل کیا ان کو دیکھتے ہوئے صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو عہدِ نبوت میں علاوہ صادقہ کے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کے قلمبند ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کر کے انہوں نے ان روایتوں کی توثیق بھی کرائی تھی۔ کیا اب بھی صحیح حدیثوں کی جو تعداد ہے، عہدِ صحابہ میں بلکہ عہدِ نبوت ہی میں ان کے قلمبند ہو جانے پر کوئی شک کر سکتا ہے؟

مگر یہ داستان اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ حضرت انسؓ ہی کی طرح دوسرے مکثر صحابی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کی روایتوں کی تعداد جیسا کہ ابن جوزی نے تلقیح میں لکھا ہے، ایک ہزار پانچسو چھ ہے۔ یہ تو پہلے گزر چکا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسجدِ نبویؐ میں درس کا ایک حلقہ تھا۔ اب ان کی روایتوں کے بھی قلمبند ہونے کا حال سنئے۔ صحیح مسلم میں ان کے متعلق یہ روایت درج ہے کہ حج کے متعلق انہوں نے ایک کتاب جمع کی تھی۔ نیز حافظ ابن حجر نے تہذیب میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ان کے ایک شاگرد وہب بن منبہ تھے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ہمام (جن کے صحیفہ ہمام کا ذکر گزر چکا) کے بھائی تھے اور انہوں نے اپنے استاذ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کو قلمبند کیا تھا۔ اسی طرح سلمان بن قیس یشکری نے بھی حضرت جابرؓ کی حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور بڑے بڑے بزرگوں مثلاً شعبی اور سفیان وغیرہ نے قیس سے اس کو سنا بھی تھا۔ خود استاد نے کتاب لکھی تھی تو شاگرد اس کی اتباع کیوں نہ کرتے۔

عورتوں میں سب سے بڑی تعداد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیثوں کی ہے۔

محدثین نے ان کی حدیثوں کی تعداد دو ہزار دس بتائی ہے۔ خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق تو ثابت نہیں کہ انہوں نے اپنی حدیث جمع کی تھی، اگرچہ ان کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ فرائض جن کے مسائل کا حل بغیر حسابی قاعدوں کے ناممکن ہے، بآسانی حل فرماتی تھیں۔ بڑے بڑے صحابہ ان سے فرائض کے پیچیدہ مسائل پوچھوا بھیجتے تھے۔ ایک ایک دفعہ میں کسی شاعر کے قصیدہ کے ساٹھ ساٹھ بلکہ سو سو شعر برجستہ سنا دیتی تھیں، حدیث کی اشاعت کا شوق ان کا بینظیر ہے مگر خود اپنی حدیثوں کے جمع کرنے کا حال معلوم نہیں ہوا لیکن ان کے براہ راست شاگرد اور حقیقی بہن کے لڑکے عروہ بن زبیر جن کا شمار ان لوگوں میں ہے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایتوں کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ان کے متعلق عام طور سے مشہور ہے کہ شروع میں انہوں نے بھی اپنے علم کو ایک کتاب میں قلمبند کیا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں حضرت عائشہؓ کی حدیثوں کا ہونا ضرور ہے کہ سب سے بڑا سرمایہ ان کا یہی تھا لیکن افسوس ہے کہ واقعہ حرہ میں جبکہ مدینہ لوٹا اور برباد کیا گیا تھا غلط فہمی کی وجہ سے انہوں نے قصداً اپنی کتاب ضائع کردی، بعد کو پچھتاتے تھے اور کہتے تھے:

لَوَدِدْتُ اَنِّیْ کُنْتُ فَدَیْتُهَا بِاَهْلِیْ وَمَالِیْ۔ اچھا ہوتا کہ میں اپنے اہل و عیال اور اپنے مال کو اسی کتاب پر فدا کر دیتا۔ (تہذیب جلد ۷، ص ۱۸۳)

بہر حال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ عہد صحابہ ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مجموعہ بھی جمع ہو گیا تھا۔ اگرچہ عروہ کی راہ سے یہ مجموعہ ضائع ہو گیا لیکن حضرت عائشہ کی دوسری مشہور خاتون شاگرد جن کا نام عمرہ بنت عبد الرحمن ہے، جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گود میں پرورش پائی تھی اور حدیث عائشہ کے باب میں ان کا شمار عروہ کے برابر برابر تھا، ان ہی عمرہ بنت عبد الرحمن کے علم کو ان کی بہن کے لڑکے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے مشہور فرمان کی بنیاد پر جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں بھی ہے جمع کر لیا تھا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابوبکر کے نام حضرت کا فرمان آیا تھا:

اَنْ یَّکْتُبَ لَهٗ مِنَ الْعِلْمِ مِنْ عِنْدِ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ وَالْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ عمرہ بنت عبد الرحمن اور قاسم بن محمد کے علم (حدیثوں) کو وہ ان کے لئے لکھ کر تیار کریں۔

اور قاسم بن محمد کے پاس بھی وہی حضرت صدیقہ ہی کی حدیثوں کا زیادہ سرمایہ تھا کہ آپ کے والد

محمد بن ابی بکر ان کے ایام طفلی ہی میں مشہور فتنہ میں شہید ہو چکے تھے۔ اس لئے یتیم بھتیجے کی پرورش حضرت عائشہؓ ہی نے فرمائی تھی، ان ہی کے تربیت یافتہ تھے، سب کچھ ان ہی سے سیکھا تھا۔ بہر حال حضرت عائشہ کی حدیثیں ان ہی دونوں کے ذریعہ سے ابو بکر بن محمد نے جمع کیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ نے ان کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ کے مرکزی شہروں میں بھیجیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ گو حضرت عروہ کی کتاب جل گئی لیکن عمرہ بنت عبدالرحمن کی راہ سے حضرت عائشہ کا جو علم قلمبند ہوا تھا وہ باقی رہا۔ مکثرین (یعنی جن کی حدیثوں کی تعداد ہزار سے اوپر ہے) ان میں اکثروں کے حدیثی سرمایہ کے متعلق عہد نبوت وصحابہ ہی میں قلمبند ہونے کا حال معلوم ہو چکا۔ اب صرف دو تین اور رہ جاتے ہیں، جن میں سب سے زیادہ نمبر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایتوں کا ہے یعنی دو ہزار چھ سو ساٹھ حدیثیں ان کی طرف منسوب ہیں پہلے تو خود ان کے متعلق ابن سعد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام رافع سے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے لکھا کرتے تھے۔ ان کے مشہور آزاد کردہ غلام عکرمہ سے امام ترمذی نے اپنی کتاب العلل نقل کی ہے

اَنَّ نفراً قَدْ مَرَّ عَلَی ابْنِ عَبَّاسٍ مِنْ اَهْلِ الطَّائِفِ بِكُتُبٍ مِنْ كُتُبِهٖ فَجَعَلَ يَقْرَأُ عَلَيْهِمْ

حضرت ابن عباسؓ کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے ان کی کتابیں پڑھنے لگے۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی حدیثوں کا مجموعہ قلمبند ہو چکا تھا۔ لفظ "کتب" جو جمع کا صیغہ ہے، قابل غور ہے۔ ایک کتاب نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے چند کتابیں تیار کی تھیں اور ان کے متعلق تو صحیح مسلم تک میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت علیؓ کے فیصلوں اور فتوی کا ایک بڑا حصہ لکھا ہوا ان کے پاس لایا گیا۔ ابن سعد ہی میں روایت یہ بھی ہے کہ ابن عباس کی وفات کے بعد جو علم انہوں نے چھوڑا وہ ایک بار شتر تھا۔ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اس "بار شتر" کے کتابی مجموعہ میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیثوں کا ذخیرہ نہ تھا۔ خود ابن عباس کے ممتاز ترین رشید شاگرد سعید بن جبیر سے دارمی طبقات ابن سعد وغیرہ میں یہ بیان منقول ہے کہ وہ ان کی حدیثوں کو لکھا کرتے تھے۔ کاغذ ختم ہو جاتا تو جو چیز ملتی حتی کہ ہاتھ پر ہی لکھ لیتے، بعد کو گھر جا کر کاغذ پر اتارتے۔ سعید بن جبیر ان کے علم کے سب سے بڑے راوی ہیں، جب وہ لکھا کرتے تھے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ابن عباسؓ کی شاید ہی کوئی حدیث لکھنے سے رہ گئی ہو۔

ان کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کا نمبر ہے۔ ان کی حدیثوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو تیس ہے۔ ابتک مجھے کوئی تحریری ثبوت اس کا تو نہیں ملا کہ خود ابن عمر نے اپنی حدیثوں کا مجموعہ تیار کیا تھا لیکن دارمی ہی کی یہ روایت ہے بلکہ طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے کہ سلمان بن موسیٰ کا یہ بیان ہے کہ انہوں نے

اَنَّہٗ رَأَی نَافِعًا مَوْلَی ابْنِ عُمَرَ عَلَیْ عِلْمِہٖ وَیُکْتَبُ بَیْنَ یَدَیْہِ۔ ابن عمرؓ کے مولیٰ نافع کو دیکھا کہ لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہے ہیں۔

نافع کے متعلق سب جانتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عمرؓ کے چہیتے آزاد کردہ غلام تھے تیس۳۰ سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ امام مالک کی ان ہی روایتوں کو جو نافع، ابن عمر کے ذریعہ سے وہ روایت کرتے ہیں بعض لوگ سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) قرار دیتے ہیں۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ابن عمر کا علم خود ان کے براہ راست شاگرد کے ذریعہ سے یقیناً قلم بند ہو چکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ابن عباس و ابن عمر کے زمانہ تک بنی امیہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی جس میں تصنیف و تالیف بلکہ ترجمہ تک کا چرچا مسلمانوں میں عام طور پر ہو چکا تھا۔ ان بزرگوں کی حدیثوں کا نہ قلمبند ہونا البتہ محل تعجب ہے پھر جب دلائل موجود ہیں تو انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اور یہ حال تو ان بزرگوں کی حدیثوں کا ہے جو مکثرین کے طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے سوا دوسرے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا شمار اس طبقہ میں نہیں ہے، ان میں ایک نہیں ہے، متعدد صحابیوں کے متعلق ثابت ہے کہ صرف ایک دو حدیث نہیں بلکہ ان کے بھی اچھے خاصے مجموعے لکھے ہوئے موجود تھے جن میں بعض تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھوائے ہوئے تھے، مثلاً وائل بن حجر صحابی جو حضر موت کے شاہزادوں میں تھے مدینہ آکر مسلمان ہوئے اور کچھ دن قیام فرما کر جب واپس جانے لگے تو طبرانی صغیر میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحیفہ لکھوا کر ان کے حوالے کیا جس میں نماز روزہ شراب سود وغیرہ کے احکام تھے۔ دوسری طویل چیز جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی لکھوائی ہوئی ہے اس کا تذکرہ بخاری تک میں ہے، آپ میں سے کون نہیں جانتا کہ حجۃ الوداع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا تھا، اس میں ہر فقرہ بجائے خود اسلام کا ایک اصول تھا اور اچھا خاصا طویل ہے۔ ابوشاہ یمنی صحابی کی درخواست پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے یہ خطبہ ان کو خود لکھوا کر دیا۔ بخاری کی روایت سے شائد شبہ ہو سکتا ہے کہ پورے خطبہ کی نقل کا شائد حکم نہیں دیا گیا تھا۔ امام اوزاعی جو سیر کے امام ہیں ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا پورا خطبہ لکھوایا گیا تھا؟ بولے ہاں۔

هٰذِهِ الْخُطْبَةُ الَّتِيْ سَمِعَهَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (عینی ص۵۷)

یعنی وہی خطبہ جسے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا (لکھوا کر دیا گیا)

دارمی ہی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن والوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قسم کے احکام ایک رسالہ کی شکل میں لکھوا کر بھیجے تھے۔ دارمی کے الفاظ یہ ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اِلٰى اَهْلِ الْيَمَنِ اَنْ لَّا يَمَسَّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ وَلَا طَلَاقَ قَبْلَ مِلَاكٍ وَلَا عِتَاقَ حَتّٰى يُبْتَاعَ (ص۲۹۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن والوں کو یہ لکھوا کر بھیجا کہ قرآن پاک کو پاک آدمی کے سوا کوئی نہ چھوئے اور قبل مالک ہونے کے (یعنی نکاح کے) طلاق نہیں ہے اور جب تک غلام خرید نہ جائے اس کے آزاد کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

اس کتاب میں جب اتنے تفصیلی مسائل تھے تو اسلام کے عام فرائض و واجبات کا ہونا تو زیادہ اغلب ہے اسی طرح کنز العمال میں ایک روایت ہے کہ عمرو بن حزم کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک تحریر بھی لکھوا کر ان کے حوالہ فرمائی گئی جس میں فرائض، صدقات، دیات (یعنی قتل کے خون بہا کا قانون) وغیرہ کے متعلق بہت سی ہدایتیں تھیں، اسی طرح حافظ ابن حجر نے تہذیب میں حضرت سمرہ بن جندب مشہور صحابی کے بیٹے سلیمان بن سمرہ کے متعلق لکھا ہے کہ

رَوٰى عَنْ اَبِيْهِ نُسْخَةً كَبِيْرَةً (تہذیب ج۴ ص۱۹۸)

اپنے والد سے وہ ایک بڑا نسخہ روایت کیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سمرہ کی حدیثیں بھی جمع ہو چکی تھیں خصوصاً کبیرہ کے لفظ سے اس کی تائید ہوتی ہے ورنہ چند حدیثوں کے متعلق ظاہر ہے کہ نسخہ کبیرہ کا اطلاق صحیح نہیں ہو سکتا۔ ترمذی نے کتاب الاحکام میں ایک روایت "باب الیمین مع الشاہد" کے سلسلہ میں جو درج کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خزرج کے مشہور سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس کے حوالے سے ان کے صاحبزادے بعض روایتیں بیان کیا کرتے تھے اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں ہے اس لئے کہ قبل الاسلام

کتاب یعنی لکھنے میں جن لوگوں کو مہارت حاصل تھی ان میں ایک حضرت سعد بن عبادہ بھی تھے۔بخاری کی ایک روایت سے جو کتاب باب الصبر علی القتال میں مروی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔حضرت عبداللہ بن ابی اوفی صحابی رضؓ بھی اپنی حدیث لکھا کرتے۔اسی طرح بخاری، ترمذی اور صحاح کی دوسری کتابوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک صحیفہ کا ذکر پایا جاتا ہے جسے وہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھا کرتے تھے۔روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صحیفہ میں "شریعت" کے بعض اہم مسائل تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بیان فرمائے تھے۔تلاش اور تتبع سے اگر اور کام لیا جائے تو اس قسم کے کتابی ذخیروں میں اور اضافہ ہو سکتا ہے لیکن بالفعل اپنے بیان کے پہلے حصہ کو اسی پر ختم کرتا ہوں اور مقالہ کے دوسرے مباحث کا تذکرہ انشاءاللہ تعالےٰ دوسرے حصہ میں کیا جائے گا جس میں سب سے پہلے یہ بیان کیا جائے گا کہ جب حدیث کے کتابی ذخیروں کا اتنا بڑا سرمایہ عہد نبوت و صحابہ میں جمع ہو چکا تھا اور حدیث کی عام کتابوں میں اس کا ذکر موجود تھا۔پھر باوجود اس کے لوگوں کو یہ مغالطہ کس بنیاد پر ہوا کہ سب سے پہلے حدیث کی کتابی تدوین ابن شہاب زہری نے پہلی صدی کے اختتام میں عمر بن عبدالعزیز رضؓ علیہ کے فرمان سے شروع کی۔

عہدِ صحابہؓ کی مدت

عہد نبوت اور عہد صحابہ میں ان گراں مایہ معلومات کی حفاظت جن اعتمادی ذرائع کے سپرد رہی، ان کا تفصیلی ذکر آپ سن چکے۔اب سوال صرف وقفہ کی اس محدود مدت کی حد تک رہ جاتا ہے جو صحاح ستہ وغیرہ حدیث کی عام کتابوں کے مصنفین سے پہلے اور عہد صحابہ کے بعد بیچ میں گزری ہے، کیونکہ صحاح کی ان کتابوں کے بعد ظاہر ہے کہ ان روایتوں کی حیثیت جن پر حدیث کی یہ کتابیں مشتمل ہیں، متواتر روایتوں کی ہو گئی ہے، مثلاً صحیح بخاری کے متعلق یہ بات کہ محمد بن اسمٰعیل ہی کی تصنیف کی ہوئی ہے، یہ ایک ایسا متواتر واقعہ ہے جس میں شک کی گنجائش قطعاً اسی طرح نہیں جیسے گلستان بوستان نامی کتابوں کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ شیخ سعدی کی کتابیں نہیں ہیں، صحاح بلکہ حدیث کی عام متداول کتابوں کا

یہی حال ہے، گویا سمجھنا چاہئے کہ پچھلے ہزار سال بلکہ ہزار سے بھی زیادہ مدت سے حدیث کی کتابوں کی روایتیں ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بلند تر ہو چکی ہیں، لے دے کر جیسا کہ میں نے عرض کیا، گفتگو کی گنجائش جو کچھ بھی پیدا ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے وہ وقفہ کی اسی محدود مدت میں پیدا ہو سکتی ہے جو عہد صحابہ کے بعد اور حدیث کی کتابوں کے ان مصنفین کے عہد سے پہلے درمیان میں گزری ہے اور اب اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا سوال اس سلسلے میں یہی ہو سکتا ہے کہ خود اس وقفہ کی مدت کتنی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یوں تو ایک سے زائد صحابیوں کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ سو سال بلکہ سو سال کے بعد بھی دنیا میں موجود تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور آپؐ کے خلوت و جلوت کے مشاہدات و تجربات کے بیان کرنے والے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سو سال تک پیغمبرؐ کے بعد زندہ رہے بلکہ بعض تو ایک سو پر بھی ایک سال کا، بعض دو سال کا بعض تین سال کا اضافہ کرتے ہیں۔ بہرحال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پیغمبرؐ کے بعد پیغمبر کی زندگی کے نمونوں کی قولاً و فعلاً کامل ایک صدی تک حضرت انسؓ امت میں اشاعت کرتے رہے ہیں، اسی طرح یہ بھی مانا گیا ہے کہ ہرماس بن زیاد باہلی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک سو بارہ سال تک اور محمود بن ربیع صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک سو نو سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہے ہیں چوتھے صحابی اس سلسلے کے حضرت ابو الطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کا نام عامر بن واثلہ ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ آخری صحابی ہیں جن پر صحابہ کا دور ختم ہو گیا۔ حافظ ابن حجرؒ نے جریر بن حازم جو ایک معتبر اور ثقہ راوی ہیں ان کی یہ چشم دید شہادت نقل کی ہے:

كُنْتُ بِمَكَّةَ سَنَةَ عَشْرٍ وَمِائَةٍ فَرَأَيْتُ جَنَازَةً فَسَأَلْتُ عَنْهَا فَقِيْلَ اَبُوالطُّفَيْلِ (ج ۷ ص ۱۱۰)	میں ۱۱۰ھ ہجری میں مکہ معظمہ میں تھا، اسی زمانہ میں میں نے ایک جنازہ دیکھا، دریافت کیا یہ کن کا جنازہ ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ ابو الطفیل (صحابی) کا جنازہ ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک سو بیس سال تک حضرت

ابوالطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکل میں صحابیت کی یادگار موجود تھی۔

پھر جیسے سیاسی مرکزیت کی وجہ سے کسی بادشاہ کی حکمرانی کا سارا زمانہ اسی بادشاہ کا دور اور عہد سمجھا جاتا ہے، کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی بھی جس زمانہ تک پائے گئے ہیں اس زمانہ کو ہم عہد صحابہ نہ قرار دیں، آخر مسلمانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیاسی نہ سہی دینی مرکزیت کا جو مقام صحابہ کو حاصل تھا وہ سلاطین کی سیاسی مرکزیت سے کیا کم تھا۔ سو یہاں تو حال کی صورت یہ ہے کہ ان ہی معدودے چند اصحاب کی حد تک یہ مسئلہ محدود نہیں ہے بلکہ آپ کے سامنے میں ایک تختہ پیش کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے کتنے صحابی کتنے سالوں تک مسلمانوں کو اپنے ان معلومات اور مشاہدات سے مستفید کرتے رہے ہیں جن کا براہ راست علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ان بزرگوں کو میسر آیا تھا۔

تختہ ان صحابیوں کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسی سے سو سال تک زندہ رہے ہیں

نمبر شمار	نام صحابی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہنے کی مدت	جائے قیام و وفات
۱	سائب بن یزید رضؓ	۸۴ سال تک	مدینہ منورہ
۲	مرثد بن عبداللہ رضؓ	۷۹ ″	″
۳	عبداللہ بن بسر المازنی رضؓ	۸۶ ″	حمص (شام)
۴	سہل بن سعد الساعدی رضؓ	۸۱ ″	مدینہ منورہ
۵	عبداللہ بن ابی اوفی رضؓ	۷۷ ″	کوفہ
۶	عتبہ بن عبد السلمی رضؓ	۷۷ ″	″
۷	مقدام بن معدیکرب رضؓ	۷۷ ″	شام
۸	عبد بن الحارث بن جزء رضؓ	۷۷ ″	مصر
۹	ابوامامۃ الباہلی رضؓ	۸۶ ″	حمص (شام)
۱۰	عبداللہ بن جعفر رضؓ	۸۰ ″	مدینہ منورہ

نمبرشمار	نام صحابی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہنے کی مدت	جائے قیام ووفات
۱۱	عمرو بن حریث رضہ	۷۵ سال تک	کوفہ
۱۲	ابوواقد اللیثی رضہ	۷۵ "	"
۱۳	عمرو بن سلمہ الجرمی رضہ	۷۵ "	بصرہ (شام)
۱۴	واثلہ بن الاسقع رضہ	۷۵ "	مصر
۱۵	عقبہ بن المنذر رضہ	۷۴ "	بصرہ
۱۶	عبداللہ بن حارث رضہ	۷۸ "	بادیۃ العرب
۱۷	زید بن الخالد الجہنی رضہ	۶۸ "	حمص
۱۸	عرباض بن ساریہ رضہ	۶۵ "	شام
۱۹	ابوثعلبہ الخشنی رضہ	۶۵ "	مدینہ منورہ
۲۰	ابوسعید الخدری رضہ	۶۴ "	بادیہ
۲۱	سلمہ بن الاکوع رضہ	۶۴ "	مدینہ منورہ
۲۲	رافع بن خدیج رضہ	۶۴ "	"
۲۳	محمد بن حاطب رضہ	۶۴ "	"
۲۴	ابوجحیفہ رضہ	۶۴ "	"
۲۵	سعید بن خالد الجہنی رضہ	۶۳ "	"
۲۶	اسماء بنت ابی بکر رضہ	۶۳ "	"
۲۷	عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضہ	۶۳ "	"
۲۸	عوف بن مالک الاشجعی رضہ	۶۳ "	"
۲۹	براء بن عازب رضہ	۶۲ "	"
۳۰	جابر بن عبداللہ انصاری رضہ	۶۸ "	"

اس فہرست میں چاہا جائے تو ابھی اور اضافہ کیا جاسکتا ہے، تاہم ان تیس ناموں کے ساتھ ان چار بزرگوں کو بھی ملا لیجئے جن کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ سو سال سے بھی برس دو برس زیادہ عہد نبوت کے بعد زندہ رہے اور اس کے بعد سوچئے کہ اتنی بڑی تعداد صحابیوں کی کیا استثنائی مثال کہلانے کی کسی طرح بھی مستحق ہو سکتی ہے؟ کیا اتنی بڑی تعداد کے متعلق یہ دعویٰ کہ بچے کھچے اکے دکے آدمی آخر میں رہ گئے تھے، کسی حیثیت سے بھی درست ہو سکتا ہے؟

بہرحال تدوینِ حدیث کی تاریخ میں یہ واقعہ کافی اہمیت رکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک سو سال تک کوئی زمانہ ایسا نہیں تھا جو آنحضرتؐ کے صحابیوں سے خالی رہا ہو بلکہ اس طویل عرصے میں ہر اس مقام پر جسے گونہ مرکزیت حاصل تھی اس طبقہ کے کافی لوگ وہاں پائے گئے ہیں، نبوت کے متعلق جس کے تجربات و مشاہدات، براہ راست معلومات و ذاتی مسموعات کا نام حدیث ہے، یہی نہیں بلکہ حدیث کا بڑا ذخیرہ جن صحابیوں سے منقول ہے اصطلاحاً جنہیں مکثرین کہتے ہیں یعنی ہزار یا ہزار سے اوپر جن کی روایتیں کتابوں میں پائی جاتی ہیں، گزشتہ صفحات میں ان کی فہرست پیش کر چکا ہوں آپ پھر اس فہرست کا بھی جائزہ لیجئے اور جو تختہ اب میں نے پیش کیا ہے اس سے مقابلہ کیجئے، آپ پائیں گے کہ مکثرین صحابہ میں سے بجز تین کے سب کے سب اس پیش کردہ تختے میں بھی موجود ہیں۔

باقی مکثرین میں سے تین حضرات یعنی ابوہریرہ، عائشہ صدیقہ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس میں شک نہیں کہ نسبتاً ان بزرگوں کی عمریں دوسرے مکثرین کے مقابلہ میں تھوڑی ہیں لیکن یہ کمی بھی کتنی ہے؟

جب ہمیں معلوم ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد ابن عباسؓ اٹھتر سال تک حضرت ابوہریرہؓ ایک سال کم ستر سال تک، عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دو سال کم ستر سال تک حدیث کی نشر و اشاعت کے کام انجام دیتی رہی ہیں تو عام صحابہ کے لحاظ سے نہ سہی، مگر حدیثوں کی روایت کا جن صحابیوں سے تعلق ہے ان کے متعلق تو بہرحال یہی ماننا پڑے گا کہ پیغمبر کے بعد کامل سو سال پر ان کا عہد مشتمل ہے۔

بہرکیف اگر یہ مان بھی لیا جائے جیسا کہ عوام سمجھتے ہیں کہ ان صحابیوں کے مشاہدات اور روایات

صحاح ستہ اور عہد صحابہ کو سب سے پہلے صحاح کے مصنفین ہی نے قلمبند کیا ہے اور یہ کہ وقفہ کی اس درمیانی مدت میں ان روایتوں کا دارومدار صرف یاد کرنے والوں کے حافظہ اور قوت یادداشت ہی پر رہا جب بھی زیادہ سے زیادہ مدت اس درمیانی وقفہ کی بمشکل سوا اور ڈیڑھ سو سال کے اندر ہی رہتی ہے کیونکہ صحاح ستہ کے مصنفین کے عہد میں اور مذکورہ بالا صحابیوں کے عہد میں آپ کو اس سے زیادہ فاصلہ نظر نہ آئے گا۔ حاشیہ میں ان مصنفین کے سنہ ولادت[1] اور سنہ وفات کو درج کر دیتا ہوں۔ ان سنین کو اور صحابہ کے متعلق جو تختہ میں نے پیش کیا ہے دونوں کو سامنے رکھ کر فاصلہ کی مدت کا اوسط نکالئے، جس نتیجہ تک میں پہنچا ہوں انشاء اللہ آپ بھی اس نتیجے تک پہنچیں گے۔

محدثین کے حافظہ میں شک اور پھر اس شک کی بنا پر انکارِ حدیث حیرت انگیز ہے

شروع میں اگرچہ بہ تفصیل یہ دکھلایا جا چکا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقہ معلومات جنہیں آج حدیث کی کتابوں میں ہم پاتے ہیں، ان کے متعلق یہ خیال سرے سے بے بنیاد ہے کہ صحاح کی موجودہ کتابوں سے پہلے بجائے سفینوں کے صرف سینوں سے سینوں ہی تک منتقل ہوتے رہے، لیکن تھوڑی دیر کے لئے اسی عامیانہ خیال کو تسلیم بھی کر لیا جائے جب بھی میں نہیں سمجھتا کہ ان معلومات کو قطعی طور پر مسترد کر دینے کے لئے اتنی وجہ کیسے کافی ہو سکتی ہے کہ سو ڈیڑھ سو سال تک بجائے کاغذ کے بے جان اوراق کے زندہ انسانوں کے زندہ حافظوں نے ان کی حفاظت کی، آخر آدمی کا حافظہ آدمی کا حافظہ ہے۔ شمع کے ان پروانوں کا حافظہ تو نہیں ہے جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ جلنے کے بعد فوراً ان پروانوں کے حافظہ سے جلنے کا خیال

[1] صحیح بخاری کے مؤلف امام محمد بن اسماعیل بخاری کی ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ، امام مسلم کی ولادت ۲۰۴ھ وفات ۲۶۱ھ، ابوداؤد کی ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۷۵ھ، ابن ماجہ کی ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۳ھ، ترمذی کی وفات ۲۷۹ھ میں ہوئی ہے۔ ان میں سب سے پچھلے نسائی ہیں، ان کی ولادت ۲۱۵ھ اور وفات ۳۰۳ھ میں ہوئی ہے۔

[illegible]

خود تو قاضی یا مفتی نہیں ہوتے لیکن ان کے خاندان میں قاضی یا مفتی کسی زمانہ میں گزرے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے حافظہ کی تاریخی توثیق

حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کے تیس پاروں کے حفظ کا رواج خود حدیث کی تاریخ کی ان شہادتوں کی زندہ توثیق ہے جو ہماری کتابوں میں حدیث کے راویوں کی قوت یادداشت اور حافظے کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ آخر آپ ہی بتائیے کہ تیس تیس پاروں کے بیشمار زندہ حفاظ کو دیکھ کر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حافظے کے اس امتحانی نتیجہ کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے جسے امام بخاریؒ نے کتاب الکنیٰ میں نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مروان بن الحکم جو دمشق کی مروانی حکومت کا سب سے پہلا حکمران ہے اسی کے سکریٹری ابوالزعزعہ کا بیان ہے کہ ایک دن مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کو طلب کیا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کثرت سے جو حدیثیں روایت کیا کرتے تھے اسی سلسلے میں مروان کچھ شکوک و شبہات میں مبتلا تھا، بہرحال بلانے پر حضرت ابوہریرہؓ تشریف لائے۔ مروان نے ان کے آنے سے پہلے ہی اپنے سکریٹری ابوالزعزعہ کو حکم دے رکھا تھا کہ پردہ کے پیچھے دوات قلم اور کاغذ لیکر بیٹھ جائے۔ میں ابوہریرہؓ سے حدیثیں پوچھوں گا جو حدیثیں وہ بیان کریں ان کو تم لکھتے چلے جانا، یہی کیا گیا۔ مروان چھیڑ چھیڑ کر حضرت ابوہریرہؓ سے حدیثیں پوچھنے لگا۔ ابوہریرہؓ بیان کرتے جاتے تھے اور پس پردہ ابوالزعزعہ لکھتا چلا جاتا تھا ان حدیثوں کی تعداد کیا تھی، خود ابوالزعزعہ کا بیان ہے:

فَجَعَلَ یَسْأَلُ وَأَنَا أَکْتُبُ حَدِیْثًا کَثِیْرًا — پس مروان ابوہریرہؓ سے پوچھنے لگا اور میں نے بہت سی حدیثیں لکھ لیں۔

بہرحال "حدیثاً کثیراً" (بہت سی حدیثوں) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حدیثوں کی کافی معقول تعداد تھی جو اس وقت قلمبند ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہؓ بیچارے کو قطعاً مروان کی اس پوشیدہ کارروائی کی خبر نہ تھی، مجلس برخواست ہو گئی، حضرتؓ چلے گئے اور مروان نے حدیثوں کے اس مجموعہ کو بحفاظت تمام رکھوا دیا، سال بھر کے بعد ابوالزعزعہ کہتے ہیں کہ مروان نے ابوہریرہؓ کو دوبارہ طلب کیا اور مجھے حکم دیا کہ مکتوبہ حدیثوں کے اسی مجموعہ کو لیکر پردہ کے پیچھے بیٹھ جاؤ، میں ان سے ان ہی حدیثوں کو پھر پوچھوں گا، دیکھو اب کی دفعہ وہ کیا بیان کرتے ہیں تم ان مکتوبہ حدیثوں سے ان کو ملاتے جانا۔ حکومت کی طرف سے ابوہریرہؓ کا گویا یہ امتحان تھا۔

امتحان لیا گیا، نتیجہ کیا نکلا؟ ابوالزعزعہ ہی کی زبانی سنئے۔ ابوالزعزعہ کے بیان کے بجنسہ الفاظ ہی کو میں نقل کر دیتا ہوں جو یہ ہیں:

فَتَرَکَهٗ سَنَةً ثُمَّ اَرْسَلَهٗ اِلَيْهِ وَاَجْلَسَنِيْ وَرَاءَ السِّتْرِ فَجَعَلَ يَسْأَلُهٗ وَاَنَا اَنْظُرُ فِي الْكِتَابِ فَمَا زَادَ وَلَا نَقَصَ۔ (کتاب الکنیٰ بخاری ص۳۳)

پس مروان نے نوشتہ حدیثوں کے مجموعہ کو سال بھر تک رکھ چھوڑا، سال بھر کے بعد مجھے پھر پس پردہ بٹھا کر حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھنے لگا، اور میں کتاب میں دیکھتا جاتا تھا، پس ابوہریرہؓ نے نہ کسی لفظ کا اضافہ کیا اور نہ کم کیا۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کی ان حدیثوں کے متعلق تو صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ واقعی ان کی صحیح تعداد کیا تھی، بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ چند قلیل روایتیں نہیں تحیں، کثیر روایتوں کا یہ مجموعہ تھا، لیکن قریب قریب اسی کے ابن شہاب زہری کے جس امتحانی واقعہ کا تذکرہ اسماء الرجال کی کتابوں میں کیا گیا ہے، یعنی اسی مروانی حکومت کے فرمانروا ہشام بن عبدالملک نے زہری کا جو امتحان لیا تھا اس میں تو تصریح کی گئی ہے کہ چار سو حدیثوں کا یہ مکتوبہ مجموعہ تھا۔ قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جیسے مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایتوں اور ان کی قوت یادداشت کو جانچنا چاہا تھا اسی طرح اپنے عہدِ حکومت میں ہشام نے بھی ابن شہاب زہری کا امتحان کرنا چاہا۔ اس نے امتحان لینے کی یہ ترکیب اختیار کی کہ ایک دن دربار میں زہری کسی ضرورت سے آئے ہوئے تھے، اس نے خواہش ظاہر کی شاہزادے یعنی اسکے لڑکے کیلئے کچھ حدیثیں لکھوا دیجئے، زہری راضی ہو گئے کاتب بلایا گیا اور زہری نے جیسا کہ الذہبی نے لکھا ہے:

فَاَمْلٰى عَلَيْهِ اَرْبَعَ مِائَةِ حَدِيْثٍ (تذکرہ ص۱۰۲ ج۱) زہری نے چار سو حدیثیں شاہزادے کے لئے لکھوا دیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مہینے کے بعد ہشام کے دربار میں پھر جب زہری پہنچے تو بڑے افسوس کے لہجہ میں ہشام نے کہا، اِنَّ ذٰلِكَ الْكِتَابَ ضَاعَ (یعنی وہ کتاب جسے آپ نے لکھوا کر شاہزادے کو دی تھی وہ گم ہو گئی) زہری نے کہا، تو یہ پریشانی کی کیا بات ہے، کاتب کو بلوایئے پھر لکھوا دیتا ہوں۔ یہی ہشام کی غرض تھی، کاتب بلایا گیا وہیں بیٹھے بیٹھے زہری نے پھر ان ہی چار سو حدیثوں کو لکھوا دیا، پہلا مسودہ درحقیقت

غائب نہیں ہوا تھا، یہ ہشام کی ایک ترکیب تھی۔ جب زہری دربار سے اٹھ کر باہر گئے تو

قَابَلَ بِالْكِتَابِ الْأَوَّلِ فَمَا غَادَرَ حَرْفًا وَّاحِدًا (ص ۲۰) — ہشام نے پہلی کتاب سے دوسری دفعہ لکھائے ہوئے نوشتے سے مقابلہ کیا (معلوم ہوا کہ) ایک حرف بھی زہری نے نہ چھوڑا تھا۔

بلاشبہ زُہری کے حافظہ کا یہ کمال تھا اور جیسا کہ میں نے کہا، حفاظِ قرآن کی زندہ مثالیں ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو اس امتحانی نتیجہ کے ان الفاظ پر یعنی فَمَا غَادَرَ حَرْفًا وَّاحِدًا (جو کچھ پہلی کتاب میں زہری نے لکھوایا تھا اس کے ایک حرف کو بھی دوسری کتاب میں نہیں چھوڑا تھا) اس پر ممکن ہے لوگ تعجب کرتے مگر آج جس کا جی چاہے چار سو حدیثوں کے مجموعے سے بڑا مجموعہ یعنی پورے قرآن کو آپ کسی حافظ سے سن کر لکھتے جائیے اور اسی عمل کو دوبارہ کیجیے یعنی سن کر لکھیے، اس کے بعد قرآن کے ان دونوں نسخوں کا پھر مقابلہ کیجیے یقیناً آپ بھی فَمَا غَادَرَ حَرْفًا (نہ چھوڑا اس نے ایک لفظ بھی) کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پائیں گے۔[1]

ابن رَاہُوَیہ کی قوت یادداشت

امام بُخاری کے استاد ابن راہویہ کے تذکرے میں حفظ اور یادداشت ہی کے سلسلے میں لوگ اس قصے کا ذکر کرتے ہیں کہ مشہور خراسانی امیر عبداللہ بن طاہر کے دربار میں ابن راہویہ کی ایک دوسرے عالم سے بعض مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی، کسی کتاب کی عبارت کے متعلق دونوں میں اختلاف پیدا ہوا، اس پر ابن راہویہ نے امیر عبداللہ سے کہا کہ اپنے کتب خانہ سے فلاں کتاب منگوائیے، کتاب منگوائی گئی، ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اس کے بعد لکھا ہے کہ امیر عبداللہ کو خطاب کر کے ابن راہویہ نے کہا کہ

---

[1] ان لوگوں کیلئے جو کہتے ہیں کہ صحاح کے مصنفین سے پہلے حدیثیں قلمبند نہیں ہوئی ہیں اور جن شواہد اور دلائل سے ان کے اس بے بنیاد دعوے کی تردید کی گئی ہے انکا ذکر تو گزر ہی چکا لیکن ضمناً ان ہی دو واقعوں پر غور کیجیے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثوں کے تین نسخوں کا پہلے ذکر کر چکا ہوں جو ان کی زندگی میں تیار ہو چکے تھے۔ مروان والے واقعے میں مانا کہ ان کی کتابت کے لکھنے کا ثبوت نہیں ملتا لیکن حدیث کثیر مروان کے سکریٹری ابوالزعیزعہ کو اس وقت بھی خود انہوں نے لکھوایا گویا صحابی کی لکھائی ہوئی حدیث کی ایک کتاب یہ بھی تھی جو مروان کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ تھی۔ اسی طرح گو زہری صحابی نہیں ہیں لیکن براہ راست استفادہ کرنے والوں میں ہیں۔ ابن عمر، انس بن مالک، سہل بن سعد وغیرہ صحابیوں کے شاگرد ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ایک نہیں بلکہ زہری کی چار سو حدیثوں کے یہ دو نسخے ہشام بن عبدالملک کے کتب خانہ میں تھے اور دونوں خود زہری کے لکھوائے ہوئے تھے اور اس قسم کے واقعات کیا ایک دو ہیں، لوگ پڑھتے نہیں یا غور نہیں کرتے ورنہ پہلی صدی ہجری میں اس قسم کی چھوٹی بڑی حدیث کی خدا جانے کتنی کتابوں کا پتہ چل سکتا ہے جس کا ذکر دوسرے واقعات کے ضمن میں اتفاقاً کر دیا گیا ہے۔

عُدْ مِنَ الْكِتَابِ إِحْدٰى عَشْرَةَ وَرَقَةً — کتاب کے گیارہ ورق شمار کر کے پلٹئے، اور گنئے، ساتویں سطر
ثُمَّ عُدْ سَبْعَةَ أَسْطُرٍ (جلد ۲ صفحہ ۴۱۳) — میں وہی ملے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔

دیکھا گیا جو کچھ ابن راہویہ کہہ رہے تھے وہی بات کتاب میں نکلی۔ کہتے ہیں کہ امیر عبداللہ نے ابن راہویہ کو خطاب کر کے کہا کہ:

عَلِمْتُ أَنَّكَ قَدْ تَحْفَظُ الْمَسَائِلَ وَ — یہ چیز تو مجھے معلوم ہی تھی کہ مسائل آپ کو خوب یاد ہیں لیکن تمہاری
لٰكِنِّي أَعْجَبُ لِحِفْظِكَ هٰذِهِ الْمُشَاهَدَةَ — قوت یادداشت اور حفظ کے اس مشاہدے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابن راہویہ کی قوت یادداشت اور چیزوں کے اتنے وضوح کے ساتھ ان کے دماغ میں محفوظ رہنا حیرت انگیز ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ کیا یہ بھی واقعہ نہیں ہے کہ ہر اسلامی شہر اور قصبہ میں قرآن کے ایسے حافظ آج بھی بآسانی آپ کو مل سکتے ہیں جو ٹھیک ابن راہویہ کی طرح آپ کو پارہ سورہ رکوع کے حوالہ سے ہر اس آیت کا پتہ دے سکتے ہیں جو ان سے پوچھی جائے اور سچ تو یہ ہے کہ خود حفظ حدیث کے متعلق بھی ابن راہویہ کی مثال واحد مثال نہیں ہے۔

ابو زُرعہ کی قوت یادداشت

حافظ ابوزُرعہ الرازی جو حدیث و رجال کے مشہور ائمہ میں ہیں ابن ابی حاتم نے ان کا یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ابن وارہ جن کا اصلی نام محمد بن مسلم ہے اور فضل بن العباس جو فضلک الصائغ کے نام سے مشہور تھے دونوں حافظ ابوزرعہ کے پاس حاضر ہوئے، دونوں میں کسی مسئلہ پر بحث ہونے لگی، ابن وارہ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک حدیث پیش کی، فضلک نے کہا کہ حدیث کے الفاظ یہ نہیں ہیں، ابن وارہ نے پوچھا کہ پھر صحیح الفاظ اس حدیث کے کیا ہیں؟ فضلک کے نزدیک حدیث کے جو الفاظ تھے ان کو دہرا دیا۔ دونوں کی گفتگو ابوزُرعہ خاموشی کے ساتھ سن رہے تھے، آخر ابن وارہ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے کہ آپ فرمائیے، واقعی حدیث کے الفاظ کیا ہیں؟ انھوں نے پھر بھی اعراض ہی سے کام لینا چاہا، لیکن جب اصرار ابن وارہ کا حد سے زیادہ بڑھ گیا تب ابوزُرعہ نے کہا کہ ذرا میرے بھتیجے ابوالقاسم کو بلائیے، ابوالقاسم بلائے گئے، حافظ ابوزُرعہ نے ان سے کہا کہ:

أُدْخُلْ بَيْتَ الْكُتُبِ فَدَعِ الْقِمَطْرَ الْأَوَّلَ وَالثَّانِيَ وَالثَّالِثَ وَعُدَّ سِتَّةَ عَشَرَ جُزْءًا وَائْتِنِي بِالْجُزْءِ السَّابِعَ عَشَرَ (تہذیب جلد ۷ صفحہ ۳۳)

کتب خانہ جاؤ، پھر پہلے دوسرے تیسرے بستے کو چھوڑ کر اس کے بعد جو بستہ ہے اس سے کتاب نکالو گن کر سولہ جز کے بعد سترہواں حصہ جو کتاب کا ہے میرے پاس لاؤ۔

ابوالقاسم گئے اور حسب ہدایت مطلوبہ جزء نکال لائے۔ لکھا ہے کہ حافظ ابوزرعہ نے اوراق الٹے اور حدیث جس صفحہ پر تھی اس کو نکال کر ابن وارہ کے سامنے پیش کردیا۔ ابن وارہ نے پڑھا اور اقرار کیا کہ غلطنا (یعنی واقعی میں ہی بر سر غلطی تھا) اس واقعہ کے ساتھ حافظ ابوزرعہ کے اس دعوے کو پیش نظر رکھیے جسے ابن حجر نے ابوجعفر التستری کے حوالے سے تہذیب میں نقل کیا ہے کہ وہ ان سے کہتے تھے:

إِنَّ فِي بَيْتِي مَا كَتَبْتُهُ مُنْذُ خَمْسِيْنَ سَنَةً وَلَمْ أُطَالِعْهُ مُنْذُ كَتَبْتُهُ وَإِنِّي لَأَعْلَمُ فِي أَيِّ كِتَابٍ هُوَ فِي أَيِّ وَرَقَةٍ هُوَ فِي أَيِّ صَفْحٍ هُوَ فِي أَيِّ سَطْرٍ هُوَ۔ (تہذیب جلد ۷ صفحہ ۳۳)

پچاس سال ہوئے جب میں نے حدیثیں لکھی تھیں اور وہ میرے گھر میں رکھی ہوئی ہیں، لکھنے کے بعد اس پورے پچاس سال کے اندران حدیثوں کا میں نے پھر دوبارہ مطالعہ نہیں کیا ہے لیکن جانتا ہوں کہ حدیث کس کتاب میں ہے اس کتاب کے کس ورق میں ہے کس صفحہ میں ہے کس سطر میں ہے۔

یہ بات کہ پچاس سال کے عرصہ میں دوبارہ یاد کی ہوئی اور لکھی ہوئی حدیثوں کے دہرانے اور دیکھنے کا موقعہ حافظ ابوزرعہ کو نہ ملا۔ اس پر بھی اتنی تفصیل کے ساتھ ان حدیثوں کا یاد رہ جانا یقیناً قوت یادداشت اور حافظہ کی پختگی کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے اور مثال کے بغیر واقعات کے ماننے میں ہچکچانے والی عقل شاید آسانی کے ساتھ حافظ ابوزرعہ کے اس دعوے کو مشکل ہی سے تسلیم کرسکتی تھی، اگر قرآن کے حفاظ میں ایسے افراد نہ پائے جاتے جنہوں نے یاد کرنے کے بعد پھر قرآن کو کبھی کھول کر نہیں دیکھا لیکن جس آیت کو جس وقت جی چاہے پوچھ سکتے ہیں اور اسی تفصیل کے ساتھ یعنی کس پارے کس سورہ کس رکوع کی یہ آیت ہے آپ کو وہ جواب دے سکتے ہیں، بلکہ ان میں بعض تو ایسے حافظ بھی دیکھے گئے ہیں کہ برسوں کے بعد تراویح سنانے کا موقعہ ان کو ملا ہے لیکن دن کے دَور کئے بغیر انھوں نے پورا قرآن تراویح میں سنا دیا۔ اگرچہ عام طور پر اس قسم کے حفظ کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں ورنہ عام قاعدہ حافظوں کا یہی ہے کہ کم از کم ایک دفعہ

دن کو دور کرلینا یعنی جو کچھ رات کو سنانے والے ہیں اس کو ایک دفعہ دہرا لینا عام حالات میں ضروری ہے۔ پورے قابو یافتہ ہو کر قرآن سنانے کا عام قاعدہ یہی ہے۔

تحفظِ حدیث کی اہمیت پر حدیثی استدلال

بہرحال کم ہی سہی لیکن قرآن کے حفاظ میں اس قسم کے افراد جب پائے جاتے ہیں تو جس زمانے میں حدیثوں کے زبانی یاد کرنے کا عام دستور مسلمانوں میں مروج تھا اگر حدیث کے حافظوں میں ایسی مثالیں پائی جاتی تھیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ کسی چیز کو یاد کرلینے کے بعد اس قسم کے تجربات میں اتنی ندرت نہیں باقی رہتی ہے کہ خواہ مخواہ ان کے متعلق شبہ کیا جائے اور شک اور شبہ کی بیماری ہی کسی میں ہو تو خدا کا شکر ہے کہ قرآن کے حفظ کی زندہ مثالوں سے ان کے شکوک کا بآسانی ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ٹھیک جیسے اس وقت تک قرآن کو زبانی یاد کرنے کا رواج مسلمانوں میں باقی ہے، زمانے تک قرآن کے ساتھ حدیثوں کو بھی زبانی یاد کرنے کا بھی دستور جاری رہا ہے اور پیغمبر کی حدیثوں کے حفظ کا یہ ذوق خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا پیدا کرایا ہوا تھا۔ صحاح کی مشہور حدیث کہ "خدا تر و تازہ رکھے اس شخص کو جو لوگوں سے ہماری حدیثوں کو سنتا ہے" اس کے بعد ارشاد ہے "فحفظھا" (پھر ان حدیثوں کو یاد کرلیتا ہے) یا جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو حاضر ہیں وہ ان لوگوں کو جو حاضر نہیں ہیں میری حدیث اور میری باتیں پہنچاتے چلے جائیں۔ اس میں بھی ہے کہ

فَإِنَّهُ لَعَلَّهُ أَنْ يُبَلِّغَهُ مَنْ هُوَ أَوْعَى لَهُ — کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ پہنچانے والا ایسے آدمی کو پہنچادے جو
أَوْ مَنْ هُوَ أَحْفَظُ لَهُ. — اس سے زیادہ اس کا یاد رکھنے والا ہو، یا زیادہ محفوظ رکھنے والا ہو

صحابۂ کرامؓ بھی اپنے شاگردوں کو اور ان لوگوں کو جو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سنا کرتے تھے یہ کہا کرتے تھے:

إِنَّ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُحَدِّثُنَا فَنَحْفَظُ فَاحْفَظُوا كَمَا كُنَّا نَحْفَظُ
(جامع بیان العلم ص ۶۴)

تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے اور ہم ان کو زبانی یاد کرلیتے تھے، پس تم لوگ بھی اسی طرح حدیثوں کو زبانی یاد کیا کرو جیسے ہم یاد کیا کرتے تھے۔

تابعین کا طریق حفظ

امام مالک صحابہؓ سے استفادہ کرنے والے حضرات کے دستور کو بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ ان میں بعض لوگ حدیثوں کو لکھ کر یاد کرتے اور جب یاد ہو جاتی تھیں تو مٹا دیتے تھے (دیکھو جامع بیان العلم ص۶۶) اور یہ دستور زمانے تک جاری رہا۔ ابن سیرین کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کا بھی قاعدہ تھا کہ حدیثوں کو لکھ لیتے

فَاِذَا حَفِظَهٗ مَحَاهٗ (طبقات ابن سعد ج۷ ص۱۰۱) مگر جب یاد کر لیتے تو پھر اس کو مٹا دیتے۔

خالد الحذاء کے حالات میں بھی ہے وہ خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ بڑی حدیثوں کو میں پہلے لکھ لیتا ہوں۔

فَاِذَا حَفِظْتُهٗ مَحَوْتُهٗ (ابن سعد جلد ۷ ص۲۳ قسم دوم) پھر جب ان کو یاد کر لیتا ہوں تو نوشتہ کو مٹا دیتا ہوں۔

ان میں بعض لوگوں سے تو صراحۃً اس قسم کے الفاظ منقول ہیں مثلاً ابن عساکر نے اسماعیل بن عبیدہ محدث کا قول نقل کیا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ:

يَنْبَغِيْ لَنَا اَنْ نَحْفَظَ حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا نَحْفَظُ الْقُرْاٰنَ (تاریخ دمشق ج۲ ص۳) ہم لوگوں کو چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو اسی طرح یاد کریں جیسے ہم قرآن یاد کرتے ہیں۔

ذہبی نے مشہور حافظ حدیث ابن خزیمہ کے متعلق یہ الفاظ ابوعلی نیشاپوری کے حوالہ سے نقل کئے ہیں کہ

كَانَ ابْنُ خُزَيْمَةَ يَحْفَظُ الْفِقْهِيَّاتِ مِنْ حَدِيْثِهٖ كَمَا يَحْفَظُ الْقَارِئُ السُّوْرَةَ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص۲۶۱) فقہی حدیثوں کو ابن خزیمہ اسی طرح یاد کرتے تھے جیسے قاری قرآنی سورتوں کو یاد کرتا ہے۔

ذہبی ہی نے اسرائیل بن یونس کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ اپنے دادا ابواسحاق کی روایت کردہ حدیثوں کے متعلق خود کہا کرتے تھے کہ

كُنْتُ اَحْفَظُ حَدِيْثَ اَبِيْ اِسْحَاقَ كَمَا اَحْفَظُ السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (صفحہ ۱۹۹) ہم ابواسحاق کی روایت کردہ حدیثوں کو اس طرح یاد کرتے تھے جیسے قرآن کی سورتیں یاد کی جاتی ہیں۔

شہر بن حوشب کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ احمد عبدالحمید بن بہرام کے پاس شہر کی حدیثوں کا ذخیرہ تھا اور ان کو

كَانَ يَحْفَظُ كَاَنَّهٗ يَقْرَأُ سُوْرَةَ الْقُرْاٰنِ ساری حدیثیں زبانی یاد تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

[illegible]

کرنے کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔ ابن سیرین بھی ان ہی لوگوں میں ہیں جن کے والد نے بچپن ہی سے ابوہریرہؓ کے سپرد کر دیا تھا۔ لکھا ہے کہ ابن سیرین کے ایک بھائی یحییٰ نامی بھی تھے، دونوں بچوں کی قوتِ یادداشت اور حدیثوں کے زبانی یاد کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ابوہریرہؓ نے کیا تو یحییٰ میں زیادہ صلاحیت نظر آئی، کہتے ہیں کہ:

فَكَنَّاهُ اَبُوْهُرَيْرَةَ لِحِفْظِهٖ (ابن سعد ج۱ ص۱۵) — ابوہریرہؓ نے یحییٰ کی یادداشت دیکھ کر ان کی کنیت رکھی۔

جیسے قرآن کے حفظ میں سمجھا جاتا ہے کہ بچپن میں حفظ کا کام جتنا استوار اور مضبوط ہوتا ہے عمر ہونے کے بعد یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ حسن بصری فرماتے ہیں کہ:

طَلَبُ الْحَدِيْثِ فِي الصِّغَرِ كَالنَّقْشِ فِي الْحَجَرِ (جامع ج۱ ص۸۲) — بچپن میں حدیث کی تعلیم حاصل کرنا ایسا ہے جیسے پتھر میں نقش کرنا ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ کے خلیفہ اور شاگرد رشید علقمہ خود اپنے متعلق فرماتے:

مَا حَفِظْتُ وَاَنَا شَابٌّ فَكَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ فِيْ قِرْطَاسٍ اَوْ وَرَقَةٍ (جامع ج۱ ص۸۲) — اپنے نوجوانی کے زمانہ میں جو چیزیں میں نے زبانی یاد کرلی تھیں ان کی حالت ایسی ہے کہ کاغذ یا ورق میں لکھے ہوئے گویا وہ میرے سامنے ہیں۔

اور صرف یاد کر لینا ہی کافی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یاد کرنے کے بعد بار بار ان ہی کی یاد کی ہوئی حدیثوں کو دہراتے رہنا یہ بھی ایسا مسئلہ تھا جس کی ہر استاذ اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے ہوئے اصرار کرتا تھا۔ صحابہ کرامؓ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے، فرمایا کرتے تھے:

اَكْثِرُوْا ذِكْرَ الْحَدِيْثِ فَاِنَّكُمْ اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا يَدْرُسْ عِلْمُكُمْ (جامع جلد ا ص۱۰۱) — حدیث کو بار بار دہراتے رہو اگر ایسا نہ کرو گے تو تمہارا علم فرسودہ ہو کر مٹ جائے گا۔

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے:

تَذَاكَرُوا الْحَدِيْثَ فَاِنَّ حَيَاتَهٗ مُذَاكَرَتُهٗ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم، صفحہ ۱۴۱) — بار بار حدیث کو دہراتے رہو کیونکہ اس کو زندہ رکھنے کی یہی شکل ہے۔

ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

[illegible]

"حفاظِ حدیث" کی تیاری میں احتیاطیں

اور صرف یہی نہیں بلکہ قرآن حفظ کرنے والوں کا آموختہ جیسے سنا جاتا ہے، صحابہ اور تابعین ہی کے عہد سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے یاد کرنے والوں کا بھی آموختہ لوگ سنتے تھے۔ عروہ بن زبیر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے علم کے راوی ہیں، ان ہی کا حال ان کے صاحبزادے ہشام بن عروہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد مجھے اور میرے دوسرے بھائیوں عبداللہ، عثمان و اسمٰعیل وغیرہ کو حدیثیں پڑھا دیتے پھر ہم سے دوبارہ سنتے اور کہتے کہ

كَرِّرُوا عَلَيَّ وَكَانَ يَعْجَبُ مِنْ حِفْظِي (تاریخ کبیر بخاری ص۱۳)	جو کچھ تم نے پڑھا اور یاد کیا ہے وہ مجھے سناؤ اور وہ (یعنی ہشام کے والد عروہ) میری (یعنی ہشام کی) یادداشت کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے

ابن عباس کے شاگرد سعید بن جبیر بھی کہتے تھے کہ ابن عباسؓ مجھ سے فرماتے :

اُنْظُرْ كَيْفَ تُحَدِّثُ عَنِّيْ فَإِنَّكَ قَدْ حَفِظْتَ عَنِّيْ حَدِيْثًا كَثِيْرًا (ابن سعد ج۶ ص۱۲۹)	مجھے بتاؤ کہ مجھ سے تم حدیثیں کس طریقہ سے روایت کرو گے کیونکہ تم نے بہت ذخیرہ حدیثوں کا مجھ سے سن کر یاد کیا ہے۔

سعید ہی کا بیان ہے کہ شروع میں ابن عباسؓ نے مجھ سے آموختہ سننا چاہا تو میں گھبرایا، میری اس کیفیت کو دیکھ کر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ

أَوَلَيْسَ مِنْ نِعْمَةِ اللهِ عَلَيْكَ أَنْ تُحَدِّثَ وَأَنَا شَاهِدٌ فَإِنْ أَصَبْتَ فَذَاكَ وَإِنْ أَخْطَأْتَ عَلَّمْتُكَ (ابن سعد ج۶ ص۱۷۹)	کیا حق تعالیٰ کی یہ نعمت نہیں ہے کہ تم حدیث بیان کرو اور میں موجود ہوں، اگر صحیح طور پر بیان کرو گے تو اس سے بہتر بات کیا ہو سکتی ہے اور اگر غلطی کرو گے تو میں تم کو بتا دوں گا۔

اسی لئے تاکہ یاد کرنے والوں کو یاد کرنے میں سہولت ہو، چند حدیثوں سے زیادہ ایک دن کا سبق عموماً نہیں ہوتا تھا۔ زہری اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ

لِيَكُنِ الْحِفْظُ لَهُ بِالتَّدْرِيْجِ قَلِيْلًا قَلِيْلًا (تدریب الراوی ص۱۶۱)	چاہئے کہ بتدریج حدیثوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے یاد کیا جائے۔

لکھا ہے کہ اس موقعہ پر زہری اس مشہور حدیث کو بھی یاد دلاتے جو رسول اللہؐ نے فرمایا ہے یعنی

خُذُوْا مِنَ الْأَعْمَالِ مَا تُطِيْقُوْنَ	کام کا بوجھ بس اتنا اٹھاؤ جسے تم برداشت کر سکتے ہو۔

وہ یہ بھی کہتے کہ:

مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ جُمْلَةً فَاتَهُ جُمْلَةً (تدریب ص۱۵۱) جو ایک ہی دفعہ چاہتا ہے کہ سارے علم کو نگل جائے وہ سب کو کھو بیٹھتا ہے۔

سلیمان تیمی کے تذکرہ میں ذہبی نے لکھا ہے کہ چند خاص شرائط کے ساتھ اپنے حلقہ درس میں طلبہ کو شریک ہونے کی اجازت دیتے تھے پھر ان کے معیار پر جو پورے اترتے ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے کا حق دار وہی قرار پاتے تھے لیکن باوجود اس کے

فَحَدَّثَهُ خَمْسَةَ اَحَادِيْثَ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۴۲) صرف ایک دفعہ میں کل پانچ ہی حدیثیں سناتے۔

اسی طرح مشہور تابعی ابو قلابہ کے تذکرہ میں ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ان کے شاگرد خالد بیان کرتے تھے کہ

كُنَّا نَاْتِیْ اَبَا قِلَابَةَ فَاِذَا حَدَّثَنَا ثَلَاثَةَ اَحَادِيْثَ قَالَ قَدْ اَكْثَرْتُ (ابن سعد ص۱۳۴) ہم ابو قلابہ کے پاس جاتے، تین حدیثیں بیان کرنے کے بعد کہتے کہ بہت ہو گیا۔

اور زہری کا یہ بیان جو نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے:

اِنَّمَا الْعِلْمُ حَدِيْثٌ اَوْ حَدِيْثَانِ (تدریب ص۱۵۱) علم تو کل ایک حدیث یا دو حدیثیں ہو سکتی ہیں۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو حدیثوں سے زیادہ وقتِ واحد میں وہ نہیں سکھاتے تھے، بڑی سے بڑی مقدار جو اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہے وہ امیر المومنین فی الحدیث شعبہؒ کے متعلق یحیی بن سعید القطان کا بیان ہے کہا کرتے تھے:

لَزِمْتُ شُعْبَةَ عِشْرِيْنَ سَنَةً فَمَا كُنْتُ اَرْجِعُ مِنْ عِنْدِهٖ اِلَّا بِثَلَاثَةِ اَحَادِيْثَ وَعَشَرَةٍ اَكْثَرُ مَا كُنْتُ اَسْمَعُ مِنْهُ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ (خطیب ص۱۳۳) شعبہ کے حلقہ میں بیس سال تک میں پابندی کے ساتھ شریک رہا، اس تمام عرصے میں میں نے دیکھا کہ ان کے پاس جتنی حدیثیں روز سن کر ہم گھر لوٹتے، ان کی تعداد تین سے دس تک ہوتی تھی۔

اپنے اس طریق پر محدثین کو کتنا اصرار تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابراہیمؒ[1] موصلی کے صاحبزادے اسحاق کو حدیث کا جب شوق ہوا تو عباسی دربار کے مشہور وزیر یحییٰ بن خالد برمکی سے اسحاق نے چاہا کہ سفیانؒ بن عیینہ سے سفارش کریں لیکن سفیان پانچ حدیثوں سے زیادہ ایک دن میں پڑھانے پر راضی نہ ہوئے

۱؎ یہ دربار کا مشہور مغنی ہے، شاید اسی لئے اس کے بیٹے کو سفارش کی ضرورت پیش آئی۔ لکھا ہے کہ یحیی برمکی نے سفیان سے پہلی دفعہ جب اس کا ذکر کیا کہ اسحاق کو بھی حدیث پڑھائیے تو انہوں نے ناپسند کیا تھا بعد کو راضی ہوئے لیکن دستور وقت جتنی حدیثوں کے سکھانے کا تھا اس دستور سے ہٹنے پر راضی نہ ہوئے، زیادہ سے زیادہ دس تک پہنچے۔

یحییٰ نے سفیان سے جب بہت اصرار کیا تو سات تک پہنچے اور ان کی تاکید والحاح جب حد سے بڑھ گئی تو مجبوراً راضی ہوئے کہ اگر سویرے سویرے اسحاق میرے پاس آیا کریں گے تو روزانہ دس حدیثیں پڑھا دوں گا۔ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۵

اور محدثین کا کام حدیثوں کے متعلق صرف اساتذہ کے حلقوں ہی تک ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ عام قاعدہ یہی تھا کہ ایام طلب کی مشغولیتوں سے فارغ ہونے کے بعد پڑھی اور یاد کی ہوئی حدیثوں کو اسی طرح دہراتے رہتے تھے جیسے قرآن کے حافظ بھی حفظ سے فارغ ہونے کے بعد اس کا دور کرتے رہتے ہیں یاد کی ہوئی حدیثوں کے دور کا اصطلاحی نام "مذاکرہ" تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دستور کا رواج صحابہ ہی کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ ابن عباسؓ اپنے تلامذہ کو مذاکرہ کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے کہ

مُذَاکَرَۃُ الْعِلْمِ سَاعَۃً خَیْرٌ مِّنْ اِحْیَاءِ لَیْلَۃٍ (تدریب ص ۱۸۱) عبادت میں شب بیداری سے زیادہ بہتر ہے کہ علم کو دہرایا جائے

اور شاید اس لئے کہ قرآن بکثرت لوگوں کے پاس لکھا ہوا اس زمانے میں موجود تھا بخلاف حدیثوں کے کہ زیادہ تر اس کی بنیاد حفظ اور یاد پر تھی حضرت ابو سعید الخدریؓ تو یہاں تک فتویٰ دیتے کہ

مُذَاکَرَۃُ الْحَدِیْثِ اَفْضَلُ مِنْ قِرَاءَۃِ الْقُرْاٰنِ (تدریب ص ۱۸۱) حدیث کو بار بار دہراتے رہنا قرآن پڑھنے سے بھی زیادہ بہتر ہے

اسی قسم کی ہدایتوں کا یہ اثر اور نتیجہ تھا کہ سننے والا اگر کوئی نہ ملتا تو بعض محدثین کا قاعدہ تھا کہ مکتب خانے چلے جاتے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو جمع کر کے حدیثیں سناتے۔ اسمٰعیل بن رجاء کے حال میں لکھا ہے کہ

اِنَّہٗ کَانَ یَجْمَعُ صِبْیَانَ الْکُتَّابِ فَیُحَدِّثُھُمْ لِئَلَّا یَنْسٰی حَدِیْثَہٗ (جامع ص ۱۰۱ و ابن سعد وغیرہ) اسمٰعیل مکتب خانے کے بچوں کو اکٹھا کرتے اور ان سے حدیثیں اس لئے بیان کرتے تاکہ وہ بھول نہ جائیں۔

عطاء خراسانی کے متعلق بھی قریب قریب اسی کے یہ روایت بیان کی گئی ہے۔ یعنی

اِذَا لَمْ یَجِدْ اَحَدًا اَتَی الْمَسَاکِیْنَ فَحَدَّثَھُمْ یُرِیْدُ بِذٰلِکَ الْحِفْظَ (جامع جلد ۱ صفحہ ۱۰۱) جب کوئی ان کو نہ ملتا تو غرباء کی جماعت میں آ کر حدیث بیان کرتے۔ مطلب حدیثوں کو یاد رکھنا تھا۔

بعض لوگ گھر کی چھوکریوں کے سامنے اپنے محفوظات کو دہراتے اور ان سے کہتے بھی جاتے کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری سمجھ میں یہ چیزیں نہ آ رہی ہوں گی لیکن میری غرض تو اپنے علم کو تازہ کرنا ہے اور یہ ابراہیم نخعی کے اس مشورے کی گویا تعمیلی شکل تھی جو اپنے شاگردوں کو وہ دیا کرتے تھے کہ

إِذَا سَمِعْتَ حَدِيثًا فَحَدِّثْ بِهِ حِينَ — جب کوئی حدیث تم سنو تو چاہئے کہ سننے کے ساتھ ہی دوسروں سے اس کا ذکر کرنا
تَسْمَعُهُ وَلَوْ أَنْ تُحَدِّثَ بِهِ مَنْ لَا تَشْتَهِيهِ — شروع کردو خواہ اس قسم کے آدمی کے سامنے کیوں نہ ہو جو تم سے حدیث سننا نہ بھی چاہتا ہو

کہتے کہ اس طرح دہرانے سے یوں سمجھو کہ تم حدیث کو اپنے سینے میں لکھ رہے ہو (جامع ص۱۰۱)

خلاصہ یہ ہے کہ عام طور پر "حدیث" سے تعلق رکھنے والی علمی جماعت کے لئے ان چند چیزوں کو جو ضروری قرار دیا جاتا تھا یعنی کہا جاتا تھا کہ

أَوَّلُ الْعِلْمِ الِاسْتِمَاعُ ثُمَّ الْإِنْصَاتُ ثُمَّ — علم (یعنی علم حدیث) میں پہلا کام تو سننا ہے، پھر کان لگانا،
الْحِفْظُ ثُمَّ النَّشْرُ (جامع، صفحہ ۱۱۸) — پھر یاد کرنا، پھر عمل کرنا اور آخر میں اشاعت۔

عبداللہ بن مبارک، فضیل بن عیاض، سفیان ثوری وغیرہ سب ہی سے مذکورہ بالا الفاظ منقول ہیں۔ بظاہر ان اقوال میں "حفظ" سے مقصد یہی ہے کہ سننے کے بعد سنی ہوئی حدیثوں کو چاہئے کہ محدث زبانی یاد کرے، جس کا طریقہ وہی تھا جو بیان کیا گیا۔

عام طور پر صحیح حدیث کے شرائط کو بیان کرتے ہوئے عدالت اور حفظ وغیرہ کے الفاظ کتابوں میں لوگوں کو جو ملتے ہیں تو بظاہر "حفظ" کے اس لفظ سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ راوی کے حافظ کو غیر معمولی طور پر قوی ہونا چاہئے گویا عام اور معمولی حافظ والے لوگ "صحیح حدیث" کے راوی بن ہی نہیں سکتے یہی اس کا مطلب ہے لیکن دراصل یہ ایک مغالطہ ہے بلکہ یہاں غرض حفظ سے وہی ہے کہ "راوی" نے حدیث کے یاد کرنے میں پوری توجہ اور محنت صرف کی ہو خواہ حفظ اور یادداشت کی قوت اس کی معمولی ہو یا غیر معمولی۔ یاد کر لینے کے بعد معمولی حافظ والے آدمی کی یاد کی ہوئی چیز اسی طرح بھروسہ اور اعتماد کے قابل ہو جاتی ہے جیسے غیر معمولی حافظ والوں کے محفوظات پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ قرآن کے حفاظ جس کی بہترین زندہ مثالیں ہیں۔

ہمارے اگلوں کا حافظہ ہم سے کہیں زیادہ قوی تھا

اگرچہ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں کہا ہے کہ اسلام کی ابتدائی تاریخوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہ نسبت پچھلوں کے اگلوں کا حافظہ زیادہ قوی تھا، خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ قدرتاً عرب کے باشندوں کا سمجھا جاتا ہے کہ یادداشت کی قوت زیادہ بہتر تھی یا نوشت و خواند کا رواج عرب میں کم

تھا، لوگ زیادہ تر حافظہ کی قوت سے کام لینے کے عادی تھے، اور قاعدہ ہے کہ جس قوت سے جتنا زیادہ کام لیا جاتا ہے عام طور پر وہی زیادہ بالیدہ اور زیادہ قوی ہوجاتی ہے. جیسے برعکس اس کے جس قوت سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے بتدریج وہ کمزور ہونے لگتی ہے. میکانیکی اور دخانی و برقی سواریوں کے اس دور میں جس کی کھلی دلیل یہ ہے کہ اب آدمی میں پیادہ پا اونٹ گھوڑوں کی پیٹھ پر مسافت کے قطع کرنے کی وہ صلاحیت باقی نہیں رہی ہے جو پچھلی نسلوں کے ان افراد میں پائی جاتی تھی جن کی رسائی عصرِ حاضر کی سواریوں تک نہیں ہوئی تھی یا یہ سمجھا جائے کہ جیسے انسان کی عام فطری اور جبلی قوتوں میں بعض استثنائی غیر معمولی مظاہر کی پیدائش اگرچہ ہر زمانہ میں ہوتی رہتی ہے لیکن ان سے جب کام لیا جاتا ہے تو وہ منظرِ عام پر آجاتے ہیں اور دنیا کو ان سے واقف ہوجانے کا موقعہ مل جاتا ہے، اسی قانون کے تحت حافظے کی غیر معمولی قوتوں سے کام لینے کا مسلمانوں کو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق مل گیا اور اسی استعمال کی وجہ سے عجیب و غریب تجربات انسانی قوت حفظ و یادداشت کے متعلق اس زمانہ میں لوگوں کو ہوئے، اسماء الرجال کی کتابوں سے انتخاب کرکے ان تجربات کو ایک جگہ اگر جمع کردیا جائے تو فطرت انسانی کے اس خاص پہلو کے متعلق معلومات کا ایک حیرت انگیز مجموعہ لوگوں کے سامنے آجائے گا. کمّاً و کیفاً آدمی کا حافظہ ارتقاء کے کن حدود تک پہنچ سکتا ہے اس کا ان معلومات کی روشنی میں پتہ چل سکتا ہے مثلاً ایک نہیں ایسے حفاظ کی متعدد مثالیں ان کی کتابوں میں ملتی ہیں کہ سُن لینے کے بعد بات کا بھولنا ان لوگوں کے لئے ناممکن تھا ابن شہاب زہری یہ کہتے ہوئے کہ ایک دفعہ سن لینے کے بعد آج تک دوبارہ پھر اسی حدیث کے متعلق دریافت کرنے کی ضرورت مجھے کبھی نہیں ہوئی اور نہ کبھی کسی حدیث کے متعلق مجھے شک ہوا، خود اپنا ذاتی تجربہ اپنے حافظہ کے متعلق یہ بیان کرتے تھے کہ کل ایک دفعہ ایک حدیث کے بعض الفاظ میں مجھے شک سا محسوس ہوا. فَسَأَلْتُ صَاحِبِيْ فَإِذَا هُوَ كَمَا قُلْتُ (تذکرہ) میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا تب معلوم ہوا کہ صحیح وہی تھا جو میں کہتا تھا.

یا امام بخاری کے متعلق ان کے رفیق درس جن کا حاشد بن اسمٰعیل نام تھا، خود اپنا یہ ذاتی مشاہدہ جو نقل کرتے تھے کہ بخاری ابھی غلام (نوعمر) ہی تھے اور ہمارے ساتھ حدیث کے ایک حلقہ میں شریک ہوئے حاشد کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کا تو قاعدہ یہی تھا کہ استاد حدیثیں بیان کرتا جاتا تھا اور ہم لوگ لکھتے جاتے تھے،

[illegible]

سعید بن المسیب نے قتادہ کی غیر معمولی یادداشت کی قوت کو دیکھ کر یہ جو کہہ دیا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ تجھ جیسے آدمی کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے، شاید یہ یا اسی قسم کی دوسری باتوں نے قتادہ میں یہ خیال پیدا کر دیا ہو کہ حافظوں کے جن غیر معمولی آثار و نتائج کا تجربہ اس زمانے میں ہو رہا ہے یہ اسلام کی کوئی خصوصیت خاصہ ہے۔

حدیث کا سارا دار و مدار قوت حافظہ ہی پر نہیں ہے

کچھ بھی ہو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سارے محدثین اسی قسم کی غیر معمولی قوتیں حفظ اور یادداشت کی رکھتے تھے، بلکہ انسانی کمالات کی جو عام حالت ہے، یعنی ان میں اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ ہر درجے کے لوگ ہوتے ہیں، یہی حال یادداشت کی اس قوت میں محدثین کا بھی تھا۔ آخر جہاں غیر معمولی حافظوں کی ان مثالوں کا کتابوں میں تذکرہ پایا جاتا ہے، وہیں ان کتابوں میں محدثین ہی کے متعلق ہمیں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں، مثلاً الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں یحییٰ بن یمان کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

کَانَ یَحْفَظُ فِی الْمَجْلِسِ الْوَاحِدِ خَمْسَ مِائَةِ حَدِیْثٍ ثُمَّ تَنْسیٰ قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ نُمَیْرٍ کَانَ سَرِیْعُ الْحِفْظِ سَرِیْعُ النِّسْیَانِ (جلد ا، صفحہ ۲۶۳)

ایک ایک نشست میں پانچ پانچ سو حدیثیں ان کو یاد ہو جاتی تھیں مگر ان کو بھول بھی جاتے تھے، محمد بن عبد اللہ بن نمیر کا بیان ہے کہ وہ زود حفظ اور زود فراموش تھے (یعنی اُن کو یاد بھی جلد ہو جاتا تھا اور فوراً بھول بھی جاتے تھے)

اور یہ تو خیر یاد کرنے کے بعد فوراً بھول جاتے تھے علی بن الحسن بن شقیق جو صحاح کے راویوں میں ہیں، ان بیچارے کے حافظہ کا آخری انجام تو عجیب ہوا۔ ایک زمانہ تھا کہ عبد اللہ بن المبارک کی کتابیں فرفر زبانی سناتے تھے۔ ذہبی نے یہ لکھنے کے بعد کہ

کَانَ جَامِعًا[1] یُعَدُّ مِنْ اَحْفَظِهِمْ لِکُتُبِ عَبْدِ اللّٰهِ (تذکرۃ الحفاظ جلد ا، صفحہ ۳۳۷)

وہ ایک جامع عالم تھے، عبد اللہ بن المبارک کی کتابوں کے سب سے بڑے حافظ سمجھے جاتے تھے۔

---

[1] جامعًا کا مطلب یہ ہے کہ علاوہ اسلامی علوم کے یہود و نصاریٰ کی کتابوں کے بھی بڑے عالم تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ کتب الانجیل والتوراۃ (خود اپنے ہاتھ سے انجیل و تورات بھی لکھی تھی) دراصل ان کو اہل کتاب سے مناظرے کا شوق تھا اور اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ براہ راست انجیل و تورات کے مطالعہ کرنے والے لوگ مسلمانوں میں خصوصًا ابتدائی صدیوں میں نہیں پائے جاتے تھے۔ علی بن الحسن دوسری صدی ہجری کے آخری حصہ میں تھے ۲۱۵ھ میں اٹھتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ (تذکرہ ص۳۳۷)

لیکن آخر عمر میں جو ستر سے متجاوز تھی، ان ہی کا یہ حال ہو گیا تھا کہ

صَارَ لَا یُمْکِنُہٗ اَنْ یَّقْرَأَ فَبَقِیَ یُحَدِّثُ بِالْحَدِیْثَیْنِ وَالثَّلَاثَۃِ — پڑھنے کی ہی سکت باقی نہیں رہی تھی، بمشکل دو تین حدیثیں کے سنانے تک ان کی پرواز محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ (تذکرہ صفحہ ۴۴)

اس قسم کے واقعات اگر اسماء الرجال کی کتابوں سے ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو جیسا کہ میں نے کہا، بنی آدم کی قوت یادداشت کی مختلف النوعیت والآثار اقسام کا ایک عجیب وغریب مرقع سامنے آجائے گا۔ میرے مقصد کے لئے مندرجہ بالا چند مثالیں کافی ہیں۔ ضمناً ان چند مثالوں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حفظ و یادداشت کی بعض غیر معمولی قوتوں کا ہماری کتابوں میں جو ذکر کیا گیا ہے، مثلاً امام بخاری یا حافظ ابوزرعہ یا زہری وغیرہ کے حافظوں کے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں بعض بدگمانوں کو ان پر شاعری کا جو دھوکہ لگا ہے وہ کتنا بے بنیاد ہے۔ ان کو سمجھنا چاہئے کہ محض حدیث کے راوی ہونے کی وجہ سے بطور خوش اعتقادی کے خصوصاً اسماء الرجال کی کتابوں میں قطعاً کسی کی تعریف نہیں کی گئی ہے بلکہ واقعۃً جن لوگوں میں جن کمالات کا پتہ چلا ہے، ان کے متعلق کمالات کا اعتراف کیا گیا ہے اور جن میں نقائص کا سراغ ملا ہے ان کی طرف نقائص کا انتساب کیا گیا ہے۔ آخر بخاری یا زہری کے حافظ کی تعریف ائمۂ رجال نے اگر اسی لئے کی ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے وہ راوی ہیں تو راوی ہونے کا شرف کیا یحییٰ بن یمان اور علی بن الحسن بن شقیق کو حاصل نہیں ہے۔ آئندہ ان مسائل کے تفصیلی ذکر کا موقعہ جب آئیگا تو وہاں آپ کو معلوم ہو گا کہ حدیث کے ان راویوں کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر جن سے روایت کی صحت وعدم صحت کا تعلق ہے، ائمۂ نقد نے کتنی بے لاگ تنقیدیں کی ہیں، جس کا جی چاہے ان کی کتابوں میں پڑھ سکتا ہے اور انشاء اللہ اپنے مقام پر خود اس کتاب میں کافی سرمایہ اس کا آپ کو ملے گا۔

خیر گفتگو اس مسئلے میں ہو رہی تھی کہ حدیث کے راویوں میں حفظ و یادداشت کی غیر معمولی قوت رکھنے والوں کے اس فطری ملکہ سے بھی مدد ملی ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ حدیث کا سارا دارومدار حفظ کی ان ہی غیر معمولی قوتوں پر تھا، قطعاً ایک خلاف واقعہ دعویٰ ہو گا بلکہ یاد کرنے والے جیسے قرآن کو اس وقت تک یاد کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہی طریقہ حدیثوں کے یاد کرنے کا بھی تھا یعنی ایک ایک دو دو آیتوں کو یاد کرتے ہوئے

سورہ، پارہ اور آخر میں پورے قرآن کے جیسے لوگ حافظ ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ حدیثوں کے یاد کرنے کا بھی یہی قاعدہ تھا۔ یاد کرنے کے بعد جیسے لوگ قرآن کا بار بار دور کرتے رہتے ہیں، اسی طرح اپنی اپنی محفوظہ حدیثوں کا محدثین بھی دور کیا کرتے تھے اور تدریجی طور پر یاد کرنے کا یہ ایسا عام طریقہ ہے کہ بالفرض اگر غیر معمولی حافظہ رکھنے والے بزرگوں سے استفادہ کا موقعہ حدیث کی روایت میں نہ بھی ملتا جب بھی باطمینان تمام معمولی حافظہ رکھنے والوں کی یاد پر بغیر کسی دغدغہ کے اسی طرح ہم کو بھروسہ کرنا چاہئے جیسے معمولی حافظہ رکھنے والے حفاظِ قرآن کے حفظ پر ہم بھروسہ کرتے ہیں۔

اس دور میں دُنیوی ترقی بھی علوم دینی کی خدمت پر مبنی تھی!

اور سچی بات تو یہ ہے کہ آج جب دین اور اخروی ثواب کے سوا قرآن کے حفظ پر آمادہ کرنے والی کوئی دوسری چیز باقی نہیں رہی ہے بلکہ دین باختوں کا ایک گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو حفظ قرآن کے رواج کے متعلق اس قسم کی باتیں صراحۃً یا کنایۃً پھیلاتا رہتا ہے کہ مسلمان بچوں کے وقت کی بربادی کا ذریعہ بنا ہوا ہے، لیکن ہمت شکنی کی ان تمام کوششوں اور حوصلہ گسلی کے اس انتہائی مخالفانہ یاس انگیز ماحول میں بھی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دیوانوں کا ایک طبقہ اس وقت تک اپنے جگر کے ٹکڑوں کو حفظ قرآن کی راہ میں نذر گزران رہا ہے، آئندہ اس بچے کے سامنے مستقبل کن حالات کو پیش کرے گا ان سے قطعاً بے پرواہ ہو کر یاد کرانے والے اپنے بچوں سے قرآن یاد کرا رہے ہیں، جس کا نتیجہ ہے کہ لاکھوں لاکھ حفاظِ قرآن ہر سال اسلامی دنیا میں تیار ہوتے رہتے ہیں۔

اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دینی بلندیاں ہی نہیں بلکہ اسی قرآن اور حدیث کے جاننے اور ان کے یاد کرنے پر دنیا کی ترقیاں بھی جب مبنی تھیں اس وقت کا کیا حال ہوگا۔ دور کیوں جائیے، ابن شہاب زہری جن کا مختلف حیثیتوں سے اب تک ذکر آچکا ہے۔ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ان کے حالات کو درج کرتے ہوئے خود ان ہی کی زبانی اس قصہ کو درج کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مروانیوں کے پہلے خلیفہ عبدالملک بن مروان کا عہد حکومت جیسا کہ لوگوں کو معلوم ہے خصوصاً اس کی حکمرانی کے ابتدائی سالوں میں مدینہ منورہ کے لئے انتہائی فقر و فاقہ آلام و مصائب کا زمانہ تھا، واقعۂ حرہ

[illegible]

ساتھ لئے ہوئے شاہی دربار میں پہنچے خلیفہ کو بشارت سنائی کہ جس چیز کی آپ کو تلاش ہے وہ مل گئی پھر زہری کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان سے پوچھئے، حدیث اور اس کے متعلقہ معلومات آپ کے سامنے عرض کریں گے۔ عبدالملک نے سعید بن المسیب سے اپنی طالب العلمی کے زمانے میں حدیث سنی تھی۔ زہری نے کہا کہ ان ہی سے میں بھی اس حدیث کو روایت کرتا ہوں۔ پھر پوری حدیث اور اس کی تفصیلات کو عبدالملک کے سامنے زہری نے پیش کیا۔

اپنی بھولی ہوئی باتیں عبدالملک کو یاد آتی چلی جاتی تھیں اور جن جن چیزوں میں شک تھا، زہری کے بیان سے اس کا ازالہ ہو رہا تھا، عبدالملک کا دماغ ہلکا ہوا اور اب اس نے زہری کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ نام اور پتہ زہری نے اپنا بتایا، ان کے والد جو حکومت کے سرآوردہ مخالفین میں تھے، ان کے نام کو سنتے ہی عبدالملک کا چہرہ بدل گیا اور شکایت کے الفاظ اس کی زبان سے نکلنے لگے۔ زہری نے سورۂ یوسف کی آیت یاد دلائی جو اپنے بھائیوں کو معاف کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام نے فرمائی تھی یعنی لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ الآیۃ۔ بہرحال زہری کے علم سے عبدالملک کچھ اس درجہ متاثر ہو چکا تھا کہ ناراضی اس کی دیر تک باقی نہ رہ سکی اور معافی کا اعلان کرتے ہوئے حال پوچھا جو گذر رہی تھی زہری کو اس کے اظہار کا موقعہ ملا۔ اس وقت کی ضرورتیں تو خیر پوری ہو گئیں جن کی ایک طویل فہرست ابونعیم نے نقل کی ہے، درحقیقت دربار میں ان کی یہی رسائی آئندہ فراغ بالیوں کا ذریعہ بنی۔ ان کو بنی امیہ کی حکومت سے جاگیر بھی ملی تھی، نقد تنخواہ کے سوا جب تک زندہ رہے، بنی امیہ کے خلفاء یہ یقین رکھتے ہوئے کہ طبعاً اس شخص کا میلان بنی ہاشم کی طرف ہے اور اپنے اس جذبہ کو زہری نے کبھی چھپایا بھی نہیں جب کبھی ایسا موقعہ آتا علانیہ وہ ایسی باتیں کرتے تھے جن سے بنی ہاشم کے ساتھ ان کی ہمدردیاں نمایاں ہو جاتی تھیں لیکن ان کے علم و فضل سے خلیفہ اور خلیفہ کا دربار اتنا متاثر تھا کہ مسلک کا یہ اختلاف حکومت کی قدر افزائیوں کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ بنی امیہ کے چھ حکمرانوں کا دور زہری کے سامنے گزرا، ہر ایک کے زمانے میں وہ معزز اور محترم رہے بلکہ ہشام جس کا قیام زیادہ تر بجائے دمشق کے رفاصہ میں رہتا تھا، ایک مدت تک اس نے اپنے ساتھ رکھ کر رفاصہ کے شاہی کیمپ میں ان

سے علم حاصل کیا۔[1]

اور خود یہ قبیصہ بن ذویب جو مسجد سے زہری کو دربار خلافت میں لے گئے تھے، خلیفہ کی معتمدی خاص کے عہدہ تک پہنچے تھے۔ ان کی ترقیوں میں منجملہ دوسری خصوصیتوں کے اس خصوصیت کو بھی دخل تھا کہ ان کا شمار بھی وقت کے ممتاز محدثین میں تھا۔ ابن سعد نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ

كَانَ ثِقَةً مَامُوْنًا كَثِيْرَ الْحَدِيْثِ (جلد ۵ صفحہ ۱۳۱)

قبیصہ ثقہ اور ان لوگوں میں تھے جن پر بھروسہ اور اعتماد کیا جاتا تھا، حدیث کا بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا۔

امام بخاری نے ان ہی کے متعلق اپنی تاریخ میں یہ فقرہ نقل کیا ہے:

كَانَ قُبَيْصَةُ اَعْلَمَ النَّاسِ بِقَضَاءِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رض (تاریخ کبیر صفحہ ۱۷۵)

زید بن ثابت صحابی کے فیصلوں کے قبیصہ سب سے بڑے عالم تھے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ جس زمانے کے حکمرانوں کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی ہو جیسا کہ ابن سعد نے نافع کے حوالے سے یہ نقل کرتے ہوئے کہ جوانی کے زمانے میں عبدالملک سے زیادہ مستعد چست و چالاک جوان مدینہ میں میں نے نہیں دیکھا۔ آگے ان ہی کی زبانی عبدالملک کی ایک نمایاں خصوصیت وہی یہ بھی بیان کرتے تھے کہ

وَلَا اَطْلَبَ لِلْعِلْمِ مِنْهُ (ابن سعد ج۵ ص۱۷۳)

اور نہ اس سے زیادہ علم کا طالب کسی کو پایا۔

انتہا یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر میں ابن ذکوان کے اس قول کو عبدالملک کے متعلق درج کیا ہے۔

كَانَ عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ مَرْوَانَ رَابِعَ اَرْبَعَةٍ فِي الْفِقْهِ وَالنُّسْكِ فَذَكَرَ سَعِيْدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ وَعُرْوَةَ بْنَ الزُّبَيْرِ وَقُبَيْصَةَ بْنَ ذُوَيْبٍ وَعَبْدَ الْمَلِكِ بْنَ مَرْوَانَ۔ (جلد ۴ صفحہ ۱۷۵)

یعنی علم فقہ (جو اس زمانہ میں زیادہ تر آثار و حدیث کی تعبیر تھی) اور عبادت گزاری میں چار ممتاز نوجوان جو مدینہ میں تھے، ان میں ایک عبدالملک بن مروان بھی تھا، پھر چاروں کے نام کی یہ فہرست بتائی سعید بن المسیب عروہ بن زبیر قبیصہ بن ذویب عبدالملک بن مروان۔

---

[1] دمشق اس زمانہ میں وبائی طاعون کا اکثر شکار رہتا تھا، دمشق کے طاعون سے محفوظ رہنے کی تدبیر خلفائے بنی امیہ نے یہ نکالی تھی کہ صحرائے شام میں شاہی محل تعمیر کئے گئے تھے۔ اچھی خاصی آبادی ہو گئی، اسی کا نام رفاصہ تھا۔ وبائی ایام میں حکومت کا دفتر رفاصہ میں منتقل ہو جاتا تھا۔

ساری چیزوں کی آڑ لینے اور وسیلہ بنا کر کام نکالنے کی ناکام کوشش کی تو اسی دن سے لوگوں نے اس کو دونق (پیسہ) جس کی جمع دوانیق ہے، اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے :

فَلُقِّبَ بِأَبِی الدَّوَانِیقِ (معرفۃ الحاکم صفحہ ۲۱۴) — "ابوالدوانیق" (پیسوں کا باپ) اسی لقب سے وہ مشہور ہو گیا

اور اسی دوانیق کی نسبت سے کبھی "الدوانیقی" بھی اس کو کہتے تھے۔ بعض موقعوں پر اپنی اس نسبت سے وہ خوش بھی ہوا ہے[1]۔ اسی ابوجعفر کے زمانے میں حجاج بن ارطاۃ جو محدث اور فقیہ تھے خطیب نے نقل کیا ہے کہ

مَکَثَ الْحَجَّاجُ بْنُ اَرْطَاۃَ یَعِیشُ مِنْ غَزْلِ اَمَۃٍ لَّہٗ کَذَا وَکَذَا مِنْ سَنَۃٍ (جلد ۸ صفحہ ۲۲۶) — حجاج بن ارطاۃ کا گزارہ سالہا سال تک ان کی ایک چھوکری پر تھا جو کات کر ان کے لئے سامان معیشت مہیا کرتی تھی۔

لیکن یہی حدیث اور آثار کا علم تھا جس کی بدولت ان ہی حجاج بن ارطاۃ کے متعلق یہ بھی دیکھا گیا جیسا کہ خطیب ہی راوی ہیں :

ثُمَّ اَخْرَجَہٗ اَبُوْ جَعْفَرٍ مَعَ ابْنِہِ الْمَھْدِیِّ اِلٰی خُرَاسَانَ فَقَدِمَ بِسَبْعِیْنَ مَمْلُوْکًا (ص ۲۳۱) — پھر ابوجعفر (عباسی خلیفہ) نے حجاج بن ارطاۃ کو اپنے بیٹے مہدی کے ساتھ خراسان روانہ کیا۔ خراسان سے جب حجاج واپس آئے تو اس وقت ستر غلاموں کے وہ مالک تھے۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ دیکھنے والے جس زمانے میں اس تماشے کو دیکھ رہے تھے قطع نظر دین کے دنیا ہی کے لئے انسان کی فطرت ان حالات میں جو کچھ کر سکتی ہے، کیا اس سے باز آ سکتی تھی۔ دیکھا جا رہا تھا کہ ایک غریب اندھا آدمی ہے لیکن کرۂ زمین کا اپنے وقت میں جو سب سے بڑا مطلق العنان فرمانروا تھا، وہ اسی نابینا کے ہاتھ دھلا رہا ہے، میرا اشارہ مشہور محدث **ابومعاویہ الضریر** کے اس قصے کی طرف ہے جس کا ذکر خود ابومعاویہ براہ راست علی بن مدینی سے کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہارون الرشید کے ساتھ ایک دن میں نے کھانا کھایا۔ کھانے سے جب فارغ ہوا تو محسوس ہوا کہ دھلانے کے لئے کوئی میرے ہاتھ

---

[1] کہتے ہیں کہ بغداد کا شہر جس قطعۂ زمین پر تعمیر کیا گیا تھا پہلے کچھ غیر آباد سا مقام تھا۔ دجلہ کے ساحل پر بعض تارک الدنیا عیسائی فقیروں اور راہبوں کی دیر (خانقاہیں) بنی ہوئی تھیں۔ شروع شروع میں اس مقام کے محل وقوع کو پسند کر کے شہر بسانے کا ارادہ ابوجعفر نے جب کیا تو علاقے کے بعض ان ہی عیسائی درویشوں سے بھی اس نے رائے لی۔ اس پر ایک راہب نے کہا کہ ہماری بعض کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ "دوانیقی" نامی کوئی بادشاہ اس کو بسائے گا۔ یہ سن کر ابوجعفر بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا کہ یہ نام تو میرا ہی ہے۔ تاریخ بغداد اور دوسری تاریخوں میں ابوجعفر کی کنجوسیوں کے بیسیوں قصے منقول ہیں۔

پر پانی ڈال رہا ہے لیکن یہ نہ سمجھ سکا کہ کون ہے کہ خود ہی پانی ڈالنے والے نے پوچھا، ابو معاویہ! تمہارے ہاتھ پر پانی کون ڈال رہا ہے؟ میں نے عرض کیا، میں پہچان نہ سکا کہ کون ہے۔ جواب میں میرے کانوں میں یہ آواز آئی کہ "میں ہی پانی ڈال رہا ہوں" ابو معاویہ کہتے ہیں کہ میں سناٹے میں آگیا اور بے ساختہ بول اٹھا "آپ یا امیرالمؤمنین"، ہارون نے جواب میں کہا کہ

اِجْلَالًا لِلْعِلْمِ (تاریخ بغداد جلد ۱۴ صفحہ ۸) (ہاں میں ہی ہوں، علم کا احترام مقصود ہے۔

یہی ابو معاویہ کہتے ہیں کہ ہارون کے سامنے میں حدیث بیان کرنے لگتا تو ہارون ادب کے ساتھ بیٹھ جاتا اور جتنی دفعہ بھی میرے مُنہ سے قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے الفاظ نکلتے، ہارون صَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِیْ کہتا جاتا (دیکھو تاریخ بغداد، جلد ۱۴ صفحہ ۹)

ان قصوں کو کہاں تک کوئی بیان کرسکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جس علم کو خلفاء وقت عوام کے حلقوں میں ان ہی کے ساتھ بیٹھ کر فخر کے ساتھ خود سیکھا کرتے تھے، یہی ہارون ہے۔ عاصم بن علی جو بخاری کے راویوں میں ہیں، ذہبی نے نقل کیا ہے کہ حدیث کے املاء کی مجلس بغداد میں ان کی کبھی اتنی بڑی ہوجاتی تھی کہ جس میدان میں وہ املاء کراتے تھے، اس کی پیمائش سے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ایک لاکھ سے زائد آدمی اس میں شریک ہوئے تھے۔ عوام کی اسی مجلس میں ہارون الرشید کو بھی دیکھا جاتا تھا کہ کھجور کے ایک ٹیڑھے درخت کے تنے پر بیٹھا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے لکھنے کا ثواب حاصل کررہا ہے (دیکھو تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۳۵۹) یہی حال مامون الرشید کا تھا بلکہ جو حالات مامون الرشید کے لوگوں نے لکھے ہیں ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہی کا نہیں بلکہ حدیث کا بھی شاید وہ حافظ تھا، نوعمری ہی میں اس کا یہ حال تھا کہ عبداللہ بن ادریس محدث کے گھر باپ کے حکم سے وہ اور امین الرشید دونوں پہنچے۔ ابن ادریس نے سو حدیثیں ان کو سنائیں۔ سن لینے کے بعد ابن ادریس کو مخاطب کرکے مامون نے کہا کہ

یَا عَمِّ أَتَأْذَنُ لِیْ أَنْ أُعِیْدَهَا مِنْ حِفْظِیْ تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۹) چچا! کیا آپ اجازت دیں گے کہ میں اپنی یاد سے ان کل سُنائی ہوئی حدیثوں کو دہرا دوں۔

ابن ادریس نے سنانے کی اجازت دی۔ مامون نے اسی وقت کل حدیثیں ان کو سنادیں، واللہ اعلم

[illegible]

اسی سلسلہ میں سنا رہے تھے کہ حاضرینِ مجلس میں سے ایک صاحب جن کا نام بشیر بن کعب تھا یمن کے رہنے والے تھے اور حمیری خانوادے سے ان کا نسلی تعلق تھا جس میں اسلام سے پہلے بھی لکھنے پڑھنے کا کافی رواج تھا۔ بشیر کی نظر سے حکمت و اخلاق کی بعض کتابیں گزری تھیں، چونکہ اخلاقی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو سن لینے کے بعد ان سے اتنی سی غلطی ہوئی کہ بعض پرانی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے بولے کہ جی ہاں ان کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ اس جذبہ کی پرورش آدمی میں سکون و وقار کی کیفیت پیدا کرتی ہے لیکن کبھی کبھی ضعف اور کمزوری کا سبب بھی حیا کا جذبہ بن جاتا ہے کہتے ہیں کہ حضرت عمرانؓ کو اس کے بعد دیکھا گیا کہ چہرہ ان کا سُرخ ہے اور فرما رہے ہیں کہ

أُحَدِّثُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — میں تو تجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتا ہوں

وَتُعَارِضُ فِيْهِ وَتُحَدِّثُ عَنْ صُحُفِكَ۔ — اور تو مقابلہ کرتے ہوئے اپنے صحیفوں اور کتابوں کی باتیں بیان کرتا ہے

بات شاید بہت زیادہ بڑھ جاتی لیکن مجلس والوں نے کہنا شروع کیا:

إِنَّهُ مِنَّا يَا اَبَا نُجَيْدٍ إِنَّهُ لَا بَأْسَ بِهٖ — کوئی مضائقہ اور اندیشہ کا مقام نہیں، یہ تو ہم ہی میں سے

(صحیح مسلم) — ہیں اے ابانجید۔ (ابونجید حضرت عمرانؓ کی کنیت تھی)

تب قصہ رفت و گزشت ہوا۔ قریب قریب اسی کے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس واقعہ کی نوعیت ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ابن عمرؓ کے صاحبزادے بلال بن عبداللہ بیٹھے ہوئے تھے، اسی مجلس میں ابن عمرؓ نے یہ کہتے ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور اس کے بعد فرمانے لگے:

لَا تَمْنَعُوا النِّسَاءَ حُظُوْظَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ — مسجد میں عورتوں کا جو حصہ ہے، اس سے ان کو نہ روکو۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ جماعت کی نماز میں شریک ہونے کے لئے عورتیں اگر مسجد آنا چاہیں تو ان کو ثواب سے محروم نہ کرو اور مسجد آنے سے نہ روکو۔ بلال ابھی جوان تھے اور ان کے عہد تک حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے جن کی وجہ سے ان کی رائے اس کے خلاف تھی یہ ممکن تھا کہ اپنی رائے کو کسی اور طریقے سے پیش کرتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن لینے کے بعد کہنے لگے کہ

"مگر میں تو اپنی بیوی کو مسجد آنے سے روکوں گا، پھر جس کا جی چاہے اپنی بیوی کو آزاد چھوڑ دے"۔

ابن عمرؓ کا یہ سننا تھا کہ خود بلال راوی ہیں، میری طرف متوجہ ہوئے اور تین دفعہ لعنک اللہ (خدا کی تجھ پر لعنت ہو) کہتے ہوئے فرمانے لگے:

"مجھ سے تو سن رہا ہے کہ میں کہہ رہا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو مسجد میں آنے سے نہ روکا جائے اور تو کہتا ہے کہ میں ان کو روکوں گا۔"

بلال کا بیان ہے کہ یہ فرما کر ابن عمرؓ رونے لگے اور غصہ میں اٹھ کر چلے گئے (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص۱۸۳) بعض روایتوں میں ہے کہ جب تک بلال زندہ رہے ابن عمرؓ نے ان سے گفتگو نہ کی[1] (دیکھو فتح الباری)

اور یہ قصہ تو خیر عہد صحابہ کا ہے، ہارون الرشید جس کے زمانے میں علوم الاوائل (یعنی اسلام سے پہلے دنیا میں جن فکری و عقلی علوم و فنون کا رواج تھا) ان سے مسلمانوں میں کافی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی، خود اسی عباسی خلیفہ کے زمانے میں بیت الحکمت قائم ہو چکا تھا جس میں ان ہی علوم الاوائل کے تراجم و تالیف کا کام جاری تھا لیکن بایں ہمہ پیغمبر کی حدیث کے ساتھ خود ہارون کے قلب کا کیا تعلق تھا، اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ وہی ابو معاویہ ضریر یعنی نابینا محدث، ہارون جن کے ہاتھ دھلاتا تھا وہی اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن ہارون کی مجلس میں ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میں بیان کر رہا تھا مجلس میں ایک قریشی امیر بھی بیٹھا تھا اس نے حدیث پر ایک عقلی اعتراض کیا، ابو معاویہ بیچارے تو نابینا تھے، آنکھوں سے تو ان کو کچھ نظر نہ آیا لیکن ان کے ہوش اڑ گئے جب کان میں بار بار ہارون کی یہ آواز گونجنے لگی:

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ عہد نبوت میں خواتین اسلام کو مسجدوں میں آنے کی اجازت تھی سب سے آگے بالغ مردوں کی صفیں پھر بچوں کی پھر عورتوں کی رہتی تھیں۔ جب اٹھ جاتی تھیں تب مرد صفوں سے باہر نکلتے تھے گو اسی کے ساتھ جب کوئی عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتی کہ سب سے بہتر نماز ہماری کہاں ہوتی ہے؟ تو آپ فرماتے کہ گھر کے اندرونی کمرے کی نماز دالان کی نماز سے اور دالان کی نماز برآمدے کی نماز سے اور برآمدے کی نماز تمہارے صحن کی نماز سے بہتر ہے، مطلب یہ ہے کہ جہاں تک پردے میں ہو اس میں ثواب زیادہ ہے لیکن باوجود اس کے عہد نبوت میں عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے منع نہیں کیا گیا۔ لیکن اچانک مسلمانوں میں دولت و ثروت کی جو ریل پیل ہوئی تو نئی نسلوں کے اخلاق و عادات کا وہ معیار باقی نہ رہا جو عہد نبوت میں فیض نبوت سے قائم ہو گیا تھا۔ صدیقہ عائشہؓ جو عورتوں کے حقوق کی اسلام میں سب سے بڑی وکیلہ ہیں ان تک کا فتویٰ ہوا کہ جو حال لوگوں کا ہو گیا ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ہوتے تو عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیتے۔ بہرحال بتدریج یہ قصہ ختم ہو گیا اور فقہائے اسلام نے حالات کے لحاظ سے اسی کو بہتر قرار دیا۔

امتیاز کی نظر سے دیکھی جاتی تھی محض اس امتیاز کا یہ نتیجہ تھا جیسا کہ خطیب نے النسائی سے نقل کیا ہے کہ

كَانَ يَعْقُوْبُ لَا يُحَدِّثُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ إِلَّا بِدِيْنَارٍ (کفایہ صفحہ ۱۵۶)

یعقوب اس حدیث کو اس وقت تک بیان نہیں کرتے تھے جب تک کہ ایک دینار ان کے سامنے نہ رکھ دیا جاتا۔

بلکہ تاریخ بغداد میں خطیب ہی نے ابوبکر بن داؤد سجستانی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ کہتے تھے :

عَزَمْتُ عَلٰى هٰذَا الْحَدِيْثِ ثَلَاثَةَ دَنَانِيْرَ حَتّٰى سَمِعْتُهُ مِنْهُ (جلد ۱۴ صفحہ ۲۷۸)

اسی حدیث کے لئے مجھے تین اشرفی خرچ کرنی پڑی تب ابراہیم سے اس حدیث کے سننے کا مجھے موقعہ ملا۔

گویا ایک دینار کم از کم تھا جو یعقوب کو اس حدیث کے سننے والے پیش کیا کرتے تھے، بہر حال میرا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ جس زمانے میں اس فن کے "معلومات" کی مانگ کی یہ حالت تھی، لوگوں نے دنیاوی منافع اس کے ذریعے سے نہیں حاصل کئے۔ جب دنیا بھی اسی راہ سے مل رہی تھی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محدثین کے ایک طبقہ نے اس سے ضرور نفع اٹھایا ہے اگرچہ ان کے اس طرزِ عمل کو عموماً اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن وہ بیچارے اپنا جو عذر بیان کرتے تھے، دنیا کے ضرورتمندوں کو اپنے اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر ان کے عذر کو سننا چاہئے۔ اس معاملہ میں سب سے زیادہ بدنام اس طبقہ میں جو آدمی ہیں ایک تو مکہ معظمہ کے مجاور اور حافظِ حدیث علی بن عبدالعزیز مکی ہیں۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میرے طرزِ عمل کے لوگ شاکی ہیں، تو لکھا ہے کہ بیچارے نے شاگردوں کو مخاطب کر کے ایک دن کہا کہ

يَا قَوْمِ أَنَا بَيْنَ الْأَخْشَبَيْنِ إِذَا خَرَجَ الْحَاجُّ نَادٰى أَبُوْ قُبَيْسٍ قُعَيْقِعَانَ مَنْ بَقِيَ فَيَقُوْلُ بَقِيَ الْمُجَاوِرُوْنَ فَيَقُوْلُ أَطْبِقْ (کفایہ صفحہ ۱۵۰)

بھائیو! میں دو پہاڑوں کے درمیان زندگی گزار رہا ہوں (یعنی مکہ میں رہتا ہوں)، جس کا حال یہ ہے کہ جب حج کرنے والے اس شہر سے چلے جاتے ہیں تو مکہ کی پہاڑی ابوقبیس اپنے مقابل والی پہاڑی قعیقعان کو پکارتی ہے کہ اس شہر میں اب کون باقی رہ گئے ہیں؟ جواب ملتا ہے کہ صرف وہی لوگ جو حرم کے مجاور ہیں پس ایک پہاڑی دوسرے سے کہتی ہے کہ منطبق ہو جاؤ (یعنی ایک دوسرے سے مل جاتی ہے گویا پٹ بند ہو جاتا ہے اب کوئی آ سکتا نہ جا سکتا ہے)۔

مطلب ان کا یہ تھا کہ حج کے موسم کے بعد مکہ معظمہ خالی ہو جاتا ہے اور بیرونی دنیا سے اس شہر کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں حجاج جو اُن سے علم حاصل کرتے تھے اگر کچھ سرمایہ ان سے لے کر اپنے

پاس میں نہ رکھ لیا کروں تو مکہ جیسے شہر میں ان کی گزر اوقات کی کیا شکل ہو سکتی تھی خصوصاً اس زمانے میں جب آمد و رفت کی ان تمام سہولتوں سے دنیا نا آشنا تھی جن سے اس زمانے میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ اسی طرح دوسرے جلیل محدث حافظ فضل بن دکین ابونعیم ہیں، بخاری و مسلم اور صحاح کی کتابیں ان کی حدیثوں سے معمور ہیں، ان سے بھی لوگوں کو اسی کی شکایت تھی کہ حدیث پر معاوضہ لیتے ہیں حافظ ابن حجر نے تہذیب میں نقل کیا ہے کہ مخالفانہ نکتہ چینیوں کو سن کر ایک دن بولے کہ

يَلُومُونَنِي عَلَى الْأَجْرِ وَفِي بَيْتِي ثَلَاثَةَ عَشَرَ — معاوضہ لینے پر لوگ مجھے ملامت کرتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیئے

وَمَا فِي بَيْتِي رَغِيفٌ (جلد ۸ صفحہ ۲۷۵) — آج تیرہواں دن ہے کہ میرے گھر میں روٹی نہیں پہنچ سکی۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایسی حالت میں اگر دینے والوں سے یہ لوگ کچھ لے لیا کرتے تھے تو خود ہی سوچنا چاہیئے کہ آخر وہ کیا کرتے[۱]۔ خصوصاً جس زمانے سے ہم گزر رہے ہیں، اس کے لحاظ سے میں تو نہیں سمجھتا

---

[۱] واقعہ یہ ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ ایک زمانے تک اگرچہ قرآن و حدیث کی تعلیم ہی نہیں بلکہ قضا تک کے معاوضہ کو مسلمان اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے مگر با ایں ہمہ حکومت یا عام مسلمانوں میں جو اصحاب ثروت و دولت تھے وہ دینی خدمات کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک اپنا فرض خیال کرتے تھے اور لینے والوں پر لوگ اعتراض نہیں کرتے تھے جیسا کہ ابن عساکر نے لکھا ہے اپنا اپنا لوگوں کا مذاق تھا بعض لوگ نہ سلطان سے لیتے تھے نہ اخوان سے۔ سلطان سے مراد حکومت، اور عام مسلمانوں میں جو ان کے عقیدت مند ہوتے تھے ان کو اخوان کہتے تھے۔ بعض لوگ دونوں سے لیتے تھے اور بعض لوگ کسی ایک سے بھی لینا پسند نہ کرتے تھے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان دو[۲] بزرگوں سے یعنی ابونعیم اور علی بن عبدالعزیز سے لوگوں کو جو شکایت پیدا ہوئی اس کی وجہ دوسری تھی، مطلب یہ ہے کہ ہر زمانے میں کچھ لوگ ہوتے ہیں جو داد و ستد کے مسئلہ میں ایک ایسی حد پر پہنچ جاتے ہیں جس سے لوگوں کا شاکی ہو جانا ایک طبعی امر ہے، کہنے کو اپنے آپ کو اس قسم کے حضرات یہی کہتے ہیں کہ ہم لین دین میں بڑے کھرے ہیں، اس موقعہ پر یہ جملہ کہ حساب جو جو بخشش سو سو ان کی زبانوں پر جاری ہو جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کی جبلی کمزوری اور تنگدلی ہوتی ہے، اچھی تعبیروں سے اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالتے ہیں۔ یہی فضل بن دکین ہیں، خطیب نے نقل کیا ہے کہ معاوضہ تو خیر لیتے ہی تھے ہدیہ کرتے تھے کہ ایک ایک درہم کو پرکھتے ذرا سا بھی کوئی کھوٹا ہوتا تو اسے واپس کر دیتے اور جب تک کھرا سکہ اس کی جگہ وصول نہ کر لیتے دم نہ لیتے۔ یہی حال علی بن عبدالعزیز کی کا تھا۔ امام نسائی نے ایک دفعہ نہایت سخت لہجہ میں ان کا ذکر کیا لوگوں نے پوچھا کہ کیا ان کی راستبازی پر آپ کو کوئی شبہ ہے، بولے نہیں آدمی تو سچے ہیں عالم ہیں اور ہر طرح سے سچے ہیں، لیکن یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ کچھ لوگ پڑھنے کے لئے ان کے پاس آئے ان ہی میں بیچارہ ایک غریب آدمی بھی تھا وہ کچھ حاضر نہ کر سکا، تو علی نے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ بیچارے نے کہا کہ میرے پاس صرف ایک پیالہ ہے۔ بولے کہ بھائی میرا تو یہی روزگار ہے لاؤ اسی پیالہ کو لاؤ غریب نے لا کر حاضر کر دیا تب علی بن عبدالعزیز نے درس شروع کیا۔ دراصل یہی تنگ نظری تھی، لوگ دراصل اسی کے شاکی تھے۔ کیا کیا جائے آدمی میں بسا اوقات ہر طرح کی خوبیاں ہوتی ہیں لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ بعض فطری کمزوریاں بھی ہوتی ہیں، بڑے بڑے فضل و کمال والوں کو اس قسم کی کمزوریوں میں مبتلا پایا گیا ہے۔

کہ یہ بھی کوئی تعجب کی بات ہو سکتی ہے، آج دنیا سے مفت پڑھنے اور پڑھانے کا رواج ہی ختم ہو چکا ہے منجملہ دوسری مزدوریوں کے تعلیمی مزدوری بھی ایک مستقل پیشہ اور روزگار کی حیثیت حاصل کر چکی ہے، معلمی کرنے والے گروہ میں صد فی صد معاوضہ اور مبادلہ ہی پر جب کام کر رہے ہیں تو اس گزرے ہوئے زمانہ میں ہزارہا ہزار آدمیوں میں سے ایک دو صاحب اور وہ بھی انتہائی مجبوریوں میں مبتلا ہونے کے بعد اگر پڑھنے والوں سے کچھ اجرت لے لیا کرتے تھے تو کم از کم عصر حاضر کے عام دستور کے لحاظ سے خود ہی سوچئے کہ اعتراض یا تنقید کی گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے، بلاشبہ ہماری کتابوں میں جیسا کہ میں نے عرض کیا ان بزرگوں کے طرز عمل کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا گیا ہے، لیکن اس کی وجہ کیا تھی؟

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت خال خال معدودے چند افراد اگر اس قسم کے پائے جاتے تھے یعنی پڑھنے والوں سے کچھ اجرت بھی بقدر ضرورت لے لیا کرتے تھے تو ان کے مقابلہ میں صرف وہی نہیں جو کچھ نہیں لیتے تھے بلکہ کافی تعداد ایسے بزرگوں کی بھی پائی جاتی تھی جو بجائے لینے کے پڑھنے والوں ہی کو دیا کرتے تھے، اعتراض کرنے والے اس زمانہ میں معاوضہ لینے والوں پر اگر اعتراض کرتے بھی تھے تو درحقیقت ان ہی بزرگوں کے مقابلہ میں کرتے تھے۔ صحاح کی مشہور کئی ہزار حدیثوں کے راوی جو فقہ میں بھی امام ابوحنیفہؒ کے مشہور تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں یعنی حفص بن غیاث، الذہبی نے ان حالات میں لکھا ہے:

كَانَ يَقُوْلُ مَنْ لَّمْ يَاْكُلْ مِنْ طَعَامِيْ لَا أُحَدِّثُهٗ (تذکرۃ الحفاظ جلد ا صفحہ ۲۷۴)	جو میرا کھانا نہ کھائے میں اس کے سامنے حدیث بھی نہیں بیان کروں گا۔

گویا ان کے یہاں حدیث پڑھنے کی شرط ہی یہ تھی کہ پڑھنے والے کو ان کے دسترخوان پر کھانا بھی پڑے گا۔

اسی طرح خطیب نے ایک دوسرے محدث ہیاج بن بسطام کے متعلق بھی یہی لکھا ہے کہ

كَانَ الْهَيَاجُ بْنُ بُسْطَامٍ لَا يُمَكِّنُ أَحَدًا مِّنْ حَدِيْثِهٖ حَتّٰى يَطْعَمَ مِنْ طَعَامِهٖ كَانَ لَهٗ مَائِدَةٌ مَبْسُوْطَةٌ لِّأَصْحَابِ الْحَدِيْثِ كُلُّ مَنْ يَّاتِيْهِ لَا يُحَدِّثُهٗ إِلَّا مَنْ يَّاكُلُ مِنْ طَعَامِهٖ (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۸۰)	ہیاج بن بسطام سے حدیث اس وقت تک لوگ نہیں سن سکتے تھے جب تک کہ ان کے یہاں کھانا نہ کھا لیتے۔ ہیاج کا دسترخوان بہت وسیع تھا حدیث والوں کیلئے عام تھا، جو ان کے پاس آتا اس کو حدیث نہیں سناتے جب تک ان کے یہاں کھانا نہ کھا لیتا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں ایک طبقہ ہی پیدا ہو گیا تھا جو خود تو پیغمبر کی حدیثوں کی نشر و اشاعت میں معروف ہی تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ ان لوگوں کی بھی مالی دستگیری اپنے فرائض میں شامل کئے ہوئے تھا جن کو ان کے علمی مشاغل معاشی کاروبار میں حصہ لینے کا موقعہ باقی نہ رکھا تھا۔ مصر کے مشہور امام جلیل لیث بن سعد جو علم میں امام مالکؒ کے ہم مرتبہ سمجھے جاتے ہیں بلکہ امام شافعیؒ تو باوجود شاگرد ہونے کے اپنے استاد مالکؒ پر لیث کو ترجیح دیتے تھے۔ بالاتفاق موزخین نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ اپنی ساری جاگیر کی آمدنی جو تقریباً سالانہ پچیس تیس ہزار اشرفی تھی، اس کا ایک بڑا حصہ محدثین اور حدیث و فقہ کے طلبار پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ صرف امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سالانہ ایک ہزار دینار (اشرفی) التزاماً بھیجا کرتے تھے، وقتاً فوقتاً اور بھی امداد کرتے، کبھی کبھی پانچ پانچ ہزار اشرفیاں امام مالک کے قرض کی ادائیگی کے لئے ان کو بھیجنی پڑی ہیں۔ مصر کے محدث ابن لہیعہ جو اپنے خاص حالات کے لحاظ سے تدوین حدیث کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، کسی موقعہ پر انشاء اللہ ان کا تذکرہ آئے گا، ان بیچارے کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں مکان کے ساتھ کافی ذخیرہ بھی جل گیا جس میں ان کی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں۔ خطیب ہی کی روایت ہے کہ مکان کی تعمیر کی امداد کے سوا صرف :

بَعَثَ إِلَيْهِ اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ كَاغَذًا بِأَلْفِ دِينَارٍ (ج۱) — لیث بن سعد نے ایکہزار دینار کا کاغذ ابن لہیعہ کو بھیجا۔

لیث بن سعد کے دسترخوان پر کھانا کھانے والے طلبہ اور اہل علم کو جو کھانا ملتا تھا، اس کا تذکرہ سننے کے قابل ہے، خطیب ہی راوی ہیں :

كَانَ يُطْعِمُ النَّاسَ فِي الشِّتَاءِ الْهَرَائِسَ بِعَسَلِ النَّحْلِ وَسَمْنِ الْبَقَرِ وَفِي الصَّيْفِ سَوِيقَ اللَّوْزِ بِالسُّكَّرِ (صفحہ۹) — سردیوں میں لوگوں کو ہریس کھلاتے تھے جو شہد اور گائے کے گھی میں تیار کیا جاتا تھا اور گرمیوں میں بادام کا ستو شکر کے ساتھ لوگوں کو کھلاتے تھے۔

ان ہی بزرگوں میں موصل کے حافظ معافی بن عمران تھے، باوجود حافظِ حدیث ہونے کے لکھا ہے کہ بڑے جاگیر بھی تھے۔ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب جاگیر سے آمدنی آتی تو اپنے

اصحاب اور تلامذہ کے پاس اُس سے اتنی رقم نکال کر بھیج دیا کرتے تھے، جو ان کے لئے کافی ہوتی تھی۔ (تذکرہ جلد ا صفحہ ۲۶۵)

اور اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن مبارک کے قصوں سے تو شاید ہی رجال کی کوئی کتاب خالی ہوگی یعنی علاوہ محدث وفقیہ ہونے کے یہ اپنے وقت کے بڑے اولوالعزم تاجر بھی تھے۔ لکھا ہے کہ چار مہینے طلب حدیث میں، چار مہینے میدان جہاد میں اور چار مہینے تجارت میں صرف کرکے اپنا سال پورا کرتے تھے۔ برسوں اسی قاعدے کے وہ پابند رہے، تجارت سے کافی آمدنی ہوتی تھی ان ہی مصارف پر یہ آمدنی صرف ہوتی تھی، اگر ان کے بذل ونوال کا دروازہ ہر مستحق کے لئے کھلا ہوا تھا لیکن زیادہ تر ان کے حسن سلوک کا تعلق چونکہ حدیث ہی کی خدمت کرنے والوں سے تھا اس لئے ایک دفعہ کسی نے اس تخصیص کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

قَوْمٌ لَهُمْ فَضْلٌ وَصِدْقٌ طَلَبُوا الْحَدِيثَ	ان لوگوں کو برتری بھی حاصل ہے اور سچائی بھی ان میں پائی
فَأَحْسَنُوا الطَّلَبَ لِلْحَدِيثِ لِحَاجَةِ النَّاسِ	جاتی ہے انہوں نے حدیث کی طلب میں بہت حسن سلیقے
إِلَيْهِمْ احْتَاجُوا فَإِنْ تَرَكْنَاهُمْ ضَاعَ عِلْمُهُمْ	کام لیا ہے اور یہ سب انہوں نے اس لئے کیا کہ لوگوں کو ان کے
وَإِنْ أَغْنَاهُمْ سَوَى الْعِلْمِ لِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ	علم کی ضرورت تھی اور لوگ ان کے محتاج ہوگئے، اب اگر ان کو چھوڑ
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا أَعْلَمُ بَعْدَ النُّبُوَّةِ	دیا جائے تو ان کا علم ضائع ہو جائے گا لیکن اگر ان کو آسودہ حال کر
أَفْضَلَ مِنَ الْعِلْمِ.	رکھا گیا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کیلئے علم کی راہیں ان سے ہموار ہوتی
(تاریخ بغداد جلد ا صفحہ ۱۶۰)	ہیں نبوت کے بعد اس علم سے بہتر شے میں کسی اور چیز کو خیال نہیں کرتا

اسی سلسلہ میں خطیب ہی نے نقل کیا ہے کہ شہر رقہ میں ایک نوجوان رہتا تھا، جب رومیوں کے مقابلہ میں جہاد کے لئے مصیصہ کی سرحدی چوکی کو جاتے ہوئے ابن المبارک رقہ سے گزرتے تو یہی نوجوان ان سے حدیث پڑھ لیتا تھا۔ ایک دفعہ ابن المبارک جب رقہ پہنچے تو حسب دستور وہ نوجوان ملنے نہ آیا۔ لوگوں سے اس کا حال دریافت کیا، معلوم ہوا کہ کسی کا قرض اس پر چڑھ گیا تھا، قرض خواہ نے نوجوان کو جیل بھجوا دیا۔ ابن المبارک یہ سن کر خاموش ہوگئے، دوسرے دن اس قرض خواہ کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ تمہارا

کتنا قرض فلاں پر رہ گیا ہے؟ بولا دس ہزار درم، اسی وقت ابن مبارک نے یہ رقم ادا کردی اور اسی دن رقہ سے باہر نکل گئے۔ جوان جیل سے چھوٹ کر جب شہر آیا تو معلوم ہوا کہ ابن مبارک آئے تھے اور تجھے پوچھتے تھے لیکن کل ہی روانہ ہوگئے، جوان اسی وقت ان کے پیچھے چل پڑا۔ دوسری یا تیسری منزل پر حضرت سے ملاقات ہوئی۔ بھائی کہاں تھے؟ قرض کی وجہ سے قید ہوگیا تھا! دونوں میں سوال جواب ہوا ابن مبارک نے تب پوچھا کہ پھر رہائی کیسے میسر ہوئی۔ بولا کہ خدا جانے میری طرف سے قرض خواہ کو کس نے رقم ادا کردی۔ ابن مبارک نے سن کر کہا کہ بس خدا کا شکر کرو کسی سے بھی اللہ میاں نے ادا کرادیا ہوگا۔ جوان بے چارے کو ابن مبارک کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت ہی نے قرض ادا کردیا تھا۔ اور اس قسم کے بیسیوں پوشیدہ حسن سلوک کے قصے کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں۔ مشہور صوفی حضرت فضیل بن عیاض جو ابن مبارک کے مخلص دوستوں میں تھے، تقریبًا ان کے مصارف کے ابن مبارک ہی متکفل تھے۔ ایک دن حضرت فضیل نے ابن مبارک کے تجارتی مشاغل اور ان میں حضرت کا جو انہماک تھا اس کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ

لَوْلَاكَ وَاَصْحَابُكَ مَا اتَّجَرْتُ   اگر تم اور تمہارے اصحاب (محدثین و صوفیہ) نہ ہوتے تو میں ہرگز تجارت نہ کرتا جس سے معلوم ہوا کہ کسی سے لینا تو خیر بڑی بات ہے صرف اس لئے کہ حدیث کی خدمت کرنے والے علماء اور طلبہ کو دوسروں سے لینا نہ پڑے۔ حضرت عبداللہ بن المبارک کی تجارتی کاروبار کی اصل غرض یہی تھی۔ الخطیب نے ابراہیم الحربی کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے ایک اونٹ نظر آیا اور اونٹ والا پوچھ رہا ہے کہ ابراہیم الحربی کا مکان کونسا ہے؟ ابراہیم نے کہا کہ میں ابراہیم ہوں اور اس کا مکان یہی ہے۔ یہ سن کر شتربان اونٹ سے اترا اور دونوں طرف جو بوجھ اونٹ پر لدا ہوا تھا اس کو اتار کر بولا کہ یہ کاغذ ہے خراسان کے ایک آدمی نے میرے حوالہ کیا ہے کہ آپ تک پہنچا دوں۔ ابراہیم نے پوچھا کہ اس شخص کا کیا نام ہے؟ شتربان نے کہا کہ اس نے مجھے قسم دی ہے، نام نہیں بتا سکتا۔ اور کاغذ کے اس طومار کو ان کے حوالہ کرکے روانہ ہوگیا۔ ؎[1]

---

[1] ابراہیم الحربی تیسری صدی کے جلیل القدر محدثین میں ہیں، بے نیازی اور اسباب دنیا سے لاپرائی ان کی زندگی کی بڑی

خود حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے ابن مبارک فقہ میں شاگرد خاص ہیں۔ ان کا طریقۂ عمل بھی یہی تھا۔ امام صاحب کی تجارت بھی لاکھوں لاکھ روپیہ کی تھی لیکن مقصد ان کا بھی وہی تھا کہ جو اپنی تجارت کا مقصد ابن مبارک بتاتے تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" مصنفہ مناظر احسن گیلانی)

تقریباً سارے محدثین بے مزد خدمتِ حدیث میں مشغول رہے

اس میں شک نہیں کہ اس راہ میں انتہائی بلند نظری اور علو ہمتی کی یہ مثالیں ہیں، قدرتاً اس قسم کے افراد کم ہی تھے مگر ایسے لوگ جو پیغمبر کی حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ بغیر کسی اجر و مزد کے زندگی بھر کرتے رہے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاوضہ اور اجرت لینے والوں کی مذکورہ بالا چند مثالوں کے سوا تقریباً اس زمانے کے سارے محدثین اور حفاظ حدیث کا یہ عام رویہ تھا، ان ہی بزرگوں کی کثرت کی وجہ سے ان چند لوگوں کو بدنام ہونا پڑا۔ ورنہ تعلیم و تعلم کا موجودہ مستاجرانہ طریقہ اگر اس زمانہ میں بھی اسی طرح عام ہوتا جیسے آج کل ہے تو شاید ان بے چاروں کا کوئی نام بھی نہ لیتا۔ مشہور ہے کہ "حمام میں بھی کیا کسی کے ننگے ہونے کی شکایت کبھی کی گئی ہے"؟ اس سلسلے میں بزرگوں نے جو نمونے چھوڑے ہیں حقیقت یہ ہے کہ آج مشکل ہی سے کوئی ان قصوں کو صحیح باور کر سکتا ہے۔ خیال تو کیجئے ذوق کی اس صفائی کا خطیب نے کفایہ میں نقل کیا ہے کہ مشہور حافظِ حدیث حمّاد بن سلمہ کا ایک شاگرد بحرِ چین کی تجارتی مہم پر روانہ ہوا اور وہاں سے کافی روپیہ کما کر واپس ہوا، حمّاد استاد تھے بطور تحفہ کے بعض چیزیں ان کی خدمت

خصوصیت تھی۔ خود اپنے ہاتھ سے انہوں نے جو کتابیں لکھیں اور تصنیف کی تھیں، بجائے خود وہ کتب خانہ تھا، جب مرنے لگے تو ان کی لڑکی نے شکایت کی کہ آپ ہمیشہ خلیفۂ وقت اور دوسرے امراء کی امداد کو واپس کرتے رہے، لیکن اب کیا ہوگا؟ بولے کہ اس کمرے کے گوشے میں دیکھو کیا ہے؟ بیٹی نے کہا کہ کتابیں ہیں۔ ابراہیم نے کہا کہ بارہ ہزار جزء کی ایک کتاب جو حدیث کے لغات اور نوادر کی تحقیق میں ہے جسے میں نے خود لکھا ہے، میرے مرنے کے بعد روزانہ ایک ایک جزء بھی بازار بھیجو گی تو درم قیمت اس کی ضرور مل جائے گی۔ تم کو سوچنا چاہیئے کہ بارہ ہزار درم جس کے گھر میں موجود ہوں کیا اس کو محتاج سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے استغنا، سیر چشمی کے بیسیوں واقعات خطیب وغیرہ نے نقل کئے ہیں ایک صاحب دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے اٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے، آخر ابراہیم نے کہا کہ بھائی اب آپ اپنے کھانے کا کچھ نظم کیجئے، بندے کے پاس تو ایک مولی تھی اس کے پتوں سے ناشتہ کا کام لیا گیا تھا اور اب کھانے میں وہی مولی کام آئے گی (ج ۵ ص ۳۳)

[illegible]
[illegible] ([illegible]) [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ([illegible]) [illegible]
[illegible]
[illegible] ([illegible]) [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ([illegible])

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

خلیفۂ وقت نے متعدد بار ان کے پاس بڑی بڑی رقمیں بھیجیں ہمیشہ شکریہ کے ساتھ واپس کرتے رہے ایک دفعہ خلیفہ نے کہلا بھیجا کہ خود اگر نہیں لیتے ہیں تو اپنے پڑوسیوں میں تقسیم کر دیجئے۔ ابراہیم نے کہا کہ خلیفہ سے عرض کرنا کہ جس چیز کے جمع کرنے کی مصیبت میں نے برداشت نہیں کی تو اس کے خرچ کرنے کی مصیبت میں اپنے آپ کو کیوں مبتلا کروں اور آخر میں خلیفہ کے قاصد کو کہا کہ بار بار امیر المؤمنین بھیجنے کی زحمت برداشت کر رہے ہیں اور مجھے ہر دفعہ واپس کرنے کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، ان سے کہہ دیجئو کہ:

اَنْ تَرَكْتَنَا وَاِلَّا تَحَوَّلْنَا مِنْ جِوَارِكَ (ص۲۷) یا تو اس طریقے کو وہ ترک فرمائیں ورنہ آپ کی پڑوس سے میں منتقل ہو جاؤنگا

اس سلسلہ میں ابراہیم ایک بخیل آدمی کا ایک پُر لطف[1] قصہ بیان کیا کرتے تھے یعنی یہ کہتے ہوئے کہ علم کے معاوضہ میں بحمد اللہ میں نے کبھی کوئی چیز آج تک نہیں لی، صرف ایک دفعہ مجھے لینا پڑا پھر اس قصے کو بیان کرتے جو کافی طویل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ کسی بنئے سے ابراہیم نے کوئی چیز خریدی جس کی قیمت کچھ آنے اور ایک پیسہ طے ہوئی، ابراہیم نے آنے تو ادا کر دیئے پیسہ باقی تھا اتنے میں بنئے کو کچھ خیال آیا بولا کہ ابراہیم بزرگوں کا کوئی ایسا قصہ سناؤ جس سے میرا دل کچھ نرم پڑے۔ ابراہیم نے ایک دلچسپ قصہ سنایا[1]۔ بنیا سن کر بہت متاثر ہوا اور اپنے آدمی سے کہا کہ ابراہیم سے اب ایک پیسہ جو باقی ہے وہ نہ لینا اور نہ ان کی چیز کم کرنا۔ ابراہیم فرماتے تھے کہ بس اسی دن ایک پیسہ کی یہ آمدنی علم کے معاوضہ میں مجھے ہوئی۔

---

[1] خطیب نے اس قصے کو بھی بیان کیا ہے، امام حسن علیہ السلام کی سخاوت سے اس کا تعلق تھا۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت امام ایک دن کسی باغ میں پہنچے جس کا محافظ ایک سیاہ حبشی تھا۔ ہاتھ میں اس کے ایک روٹی تھی، سامنے کتا بیٹھا تھا حبشی کو حضرت نے دیکھا کہ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑتا ہے خود کھاتا ہے اور دوسرا ٹکڑا کتے کو دیتا ہے مسلسل وہ یہی کر رہا ہے آپ نے پوچھا کہ تم اس التزام کے ساتھ جو کتے کے سامنے ٹکڑا ڈالتے جا رہے ہو گویا اس کو برابر کا حصہ دار بنا لیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ حبشی نے کہا کہ حضرت کتے کی آنکھ لقمے پر لگی ہوئی ہے، دل گوارا نہیں کرتا کہ اس پر اپنے کو ترجیح دوں۔ حضرت امام حسن کو اس غلام کی یہ ادا ایسی بھا گئی کہ اسی وقت آپ نے اس کا نام اس کے آقا کا نام دریافت کیا اور غلام کے ساتھ باغ کو بھی آپ نے خرید لیا۔ پھر اس حبشی کے پاس آئے اور فرمایا کہ میں نے تجھے بھی خرید لیا ہے اور اس باغ کو بھی۔ حبشی خوش ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تجھے آزاد کر دیا اور باغ بھی تجھے بخش دیا۔ حبشی نے سن کر کہا تو حضرت آپ نے جس کی راہ میں یہ باغ مجھے عطا فرمایا اسی کی راہ میں اس باغ کو میں نے بھی دے دیا یعنی خیرات کر دیا۔ بخیل بنیا اس قصے کو سن کر اچھل پڑا اور احسنت یا ابا اسحاق کہتے ہوئے اپنے آدمی سے وہی بات کہی کہ اب ابراہیم سے مزید ایک پیسہ نہ لینا اور نہ ان کی چیز کو کم کرنا (تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۴)، شاید اس بخیل کی بخالت پر اس پیسے کی بھی کافی چوٹ پڑی ہوگی۔ اس لئے ابراہیم نے اس پیسے کا واپس کرنا مناسب نہ خیال کیا۔

ان بزرگوں کی سیر چشمی اور بے نیازی کے قصے کتابوں میں اتنے بیان کئے گئے ہیں کہ ایک مستقل کتاب ان سے تیار ہو سکتی ہے۔ ایوب سختیانی جن کا بکثرت حدیثوں کی سندوں میں ذکر آتا ہے اور حفاظِ حدیث کے مشاہیر میں ہیں۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کا خلیفہ یزید ابن الولید جس زمانے میں خلیفہ نہ تھا، ایوب میں اور اس میں گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ جس دن خلافت کے لئے اس کا انتخاب ہوا تو لکھا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر ایوب یہ دعا کر رہے تھے:

اَللّٰھُمَّ اَنْسِہٖ ذِکْرِیْ (ص ۱۲۳) پروردگار! میری یاد اس شخص (یعنی خلیفہ) کے دل سے بھلا دے

ذرا وارستہ مزاجیوں کا اس گروہ کے اندازہ تو کیجئے دوست اپنے وقت کی سب سے بڑی طاقتور سلطنت کا بادشاہ منتخب ہوتا ہے، بجائے اس کے کہ اس کی دوستی سے استفادے کی توقعات قائم کرتے، دعا کرتے ہیں تو یہ کرتے ہیں کہ "پروردگار اس شخص کے دل سے میری یاد بھلا دیجئے۔"

اسی قسم کے ایک واقعہ کا نصر بن علی محدث کے تذکرے میں ذہبی نے ذکر کیا ہے، یہ سفیان بن عیینہ وغیرہ کے شاگرد ہیں اور صحاح ستہ کے راویوں میں ہیں۔ لکھا ہے کہ خلیفہ مستعین باللہ نے ان کے پاس آدمی بھیجا تاکہ قاضی بنانے کے لئے ان کو مستعین کے پاس حاضر کرے۔ ان کو خبر ہوئی، بولے، استخارہ کر لوں تب جواب دوں گا۔ گھر آئے دو رکعت نماز پڑھی، سنا گیا کہ دعا کر رہے ہیں:

پروردگار! خیر اور بھلائی اگر تیرے ہی پاس ہے تو مجھے اٹھا لے۔"

دعا کر کے سو گئے، جگانے والا جب جگانے کے لئے آیا تو دیکھا کہ واقعی وہ اٹھا لئے گئے۔ یعنی وفات ہو چکی تھی (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۹۲)

غور کرنے کا مقام ہے، ہمتوں کی بلندیاں جن لوگوں میں عروج وارتقاء کے اس مقام تک پہنچ چکی تھیں، کیا کوئی دشواری ایسوں کے لئے بھی دشواری باقی رہتی ہے، جن کی رات بھی اپنی رات ہو اور دن بھی اپنا دن ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔

سفیان ثوری اور شعبہ وغیرہ کے تلامذۂ حدیث میں ایک بزرگ قبیصہ بن عقبہ بھی ہیں، ذہبی نے "الحافظ الثقۃ المکثر" کے الفاظ سے ان کے خصوصیات کا اظہار کیا ہے۔ ان ہی کے حال میں لکھا ہے

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

مَنْ صَبَرَ عَلَى الخَلِّ وَالبَقْلِ لَمْ يُسْتَعْبَدْ — سرکہ اور بھاجی پر جس نے صبر کرلیا وہ کبھی غلام بنایا نہیں جاسکتا۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۸۷۴)

ہم جیسے لوگ جن کی ایک ایک سانس اور زندگی کا ایک ایک لمحہ دوسروں کے ہاتھ بکا ہوا ہے ان پر احرار کے اس طبقہ کو قیاس کرنا قطعاً صحیح نہ ہوگا۔

جب روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے کہ یاد کرنے والے چند سال میں قرآن مجید حفظ کرلیتے ہیں تو جنہوں نے اپنے سارے وقت کو صرف اپنے ہی قبضے میں رکھا تھا ان کے متعلق کیوں تعجب کیا جاتا ہے، جب کہا جاتا ہے کہ ان کو اتنی حدیثیں زبانی یاد تھیں۔

آپ دیکھ چکے کہ حدیثوں کا بجائے سفینوں کے سینوں ہی کی حد تک محدود رہنے کا دعویٰ جس زمانہ کے متعلق کیا جاتا ہے کلیۃً یہ دعویٰ ہی صحیح نہیں ہے اور کچھ دن حدیثوں پر ایسے گزرے بھی ہیں تو ان کی مدت ہی کتنی تھی۔ آپ تو حدیثوں کے متعلق بھی بے اطمینانی میں مبتلا کئے جارہے ہیں پھر جن مذاہب و ادیان کی بنیادی کتابیں یعنی دینِ اسلامی جو حقیقت قرآن کی ہے، یہی حقیقت ان کے ہاں جن کتابوں کی ہے وہ صدیوں ہی نہیں ہزاروں سال تک بجائے سفینوں کے سینوں ہی والی حفاظت ان بنیادی کتابوں کیلئے کافی ہے۔

تدوین حدیث کا ماحول اور مسئلہ غلامی کی حقیقت

مسلمان غلاموں کے لئے ترقی کی ساری راہیں کھلی تھیں

تدوین حدیث کی خدمت جس ماحول میں انجام پائی ہے اس کی جن خصوصیتوں کا ذکر مقصود ہے، ان میں پہلی خصوصیت وہی ہے جس کی عام تعبیر مسئلۂ غلامی سے کی جاتی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غلامی کے مشہور بدنام مسئلہ کو بداندیشوں کی برگزیدہ بادآنکھوں نے خواہ جس طرح دیکھا یا دکھایا ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تاریخ کی حدود میں پہنچ کر غلامی کی قطعاً وہ حقیقت باقی نہیں رہی جو اس سے پہلے سمجھی جاتی تھی۔ کسی قسم کی بُرائیاں ہوں، ان کے بلند سے بلند ترین زینوں تک پہنچنے سے غلاموں کو اسلام نے صرف

یہی نہیں کہ دو کا نہیں بلکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ انسانیت کے اس مظلوم حصے کو پکڑ پکڑ کر ان بلند ترین زینوں تک اسلام نے خود پہنچا پایا ہے جن پر آزاد مسلمانوں کی رسائی بھی اپنے عہد اقبال و عروج میں آسان نہ تھی، مسلمانوں کی سیاسی و علمی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، میں ان ہی سے پوچھتا ہوں کہ ملکی اور سیاسی راہوں میں بادشاہت و فرمانروائی تک اور علمی و دینی راہوں میں امامت و پیشوائی تک پہنچنے والے غلاموں کی اسلام میں کیا کوئی کمی ہے؟ اسی سے اندازہ کیجئے کہ مفتوح قوموں کے ساتھ جہاں اس قسم کے سلوک کی روایتیں بھی بنی آدم کی تاریخ میں ملتی ہیں کہ فاتح کی دینی اور مذہبی کتابوں کا کوئی فقرہ غریب مفتوح کے کان میں کہا جاتا ہے کہ اتفاقاً اگر کہیں پہنچ جاتا تھا تو گرم گرم پگھلے ہوئے رانگ اور سیسے کو اس کے ناپاک کان میں اس لئے پلا دیا جاتا تھا تاکہ آئندہ پھر کسی چیز کے سننے کا موقعہ اپنی زندگی میں اس بدبخت کے لئے باقی نہ رہے، لیکن اس کے مقابلہ میں ان ہی مفتوح اقوام کے ان افراد کو جو مسلمانوں کے گھر میں غلام بن کر داخل ہوتے تھے، کون نہیں جانتا کہ ان کو قرآن پڑھنے اور پیغمبر کی حدیثوں کے سیکھنے ہی کی اجازت ہی نہیں دی گئی تھی، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ خود مسلمانوں کو قرآن پڑھانے والے قراء عموماً ان کے یہی غلام تھے۔ اسی طرح رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ مسلمانوں نے ان ہی غلاموں سے سیکھا اور پڑھا ہے۔

بہرحال اسی عام طریقہ کار کی وجہ سے یعنی قرآن و حدیث اور سارے دینی علوم کے سیکھنے اور سکھانے، پڑھنے اور پڑھانے کی ابتداء ہی سے موالی اور غلاموں کے متعلق حوصلہ افزائیوں سے اسلام کام لے رہا تھا جس کا نتیجہ تھا کہ جیسے اپنے بچوں کو صحابہؓ قرآن پڑھاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے جو کچھ پایا تھا اس کو سکھاتے تھے، بجنسہ اسی طرح ان ہی بچوں کے ساتھ وہ اپنے غلاموں کو بھی قرآن پڑھایا کرتے تھے اور حدیثیں بھی سکھاتے تھے۔

عرب سیاسی الجھنوں میں پھنس گئے تو موالی قرآن و حدیث کی خدمت میں لگ گئے

بالآخر موالی کا یہ طبقہ قرآن و حدیث کی تعلیم کی طرف چل پڑا۔ مسلمانوں میں جو فاتح تھے یعنی عرب کچھ تو سیاسی الجھنوں میں ان کی عمومیت مبتلا رہی جو فاتح ہونے کا قدرتی نتیجہ تھا، ماسوا اس کے ہر ایک کے

ساتھ علاوہ سیاسی جھگڑوں رگڑوں کے خاندانی قصے قضیئے بھی لپٹے ہوئے تھے۔ بخلاف موالی کے کہ قید ہو کر وہ آتے تھے، اس لئے نہ ان کے ساتھ یہ خاندانی قصے تھے اور نہ سیاسی شغلوں میں بھی الجھنے کا موقعہ خصوصاً اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان کو عموماً ملا۔ اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ان ہی غلاموں کو جوں ہی آزاد ہونے کا موقعہ ملتا تھا اور جیسا کہ معلوم ہے اسلامی قوانین ہی ایسے تھے کہ بکثرت آزادی کے یہ مواقع پیش ہی آتے رہتے تھے تو سب یہی کرتے تھے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن تعلقات سے فرصت اور آزادی کو محسوس کر کے ان آزاد شدہ غلاموں کے ایک بڑے طبقہ کو ہم ان علوم و فنون کی تحصیل میں مشغول پاتے ہیں جن میں ان کے اس دین کی بھی ترقیاں مضمر تھیں جسے اپنے فاتحوں کی ملکوتی صحبتوں میں وہ عموماً قبول کر لیتے تھے۔ اور دنیاوی سربلندیوں کی راہیں بھی، دین کا یہی علم ان پر مسلسل کھولتا چلا جاتا تھا۔ تابعین یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے معلومات حاصل کرنے والوں میں مشہور شامی امام مکحول جن کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ سندھ سے وطنی تعلق رکھتے تھے، ۱۱۳ھ میں وفات ہوئی، جلالتِ قدر کا ان کے اسی سے اندازہ کیجئے کہ زہری جب اپنے زمانہ کے اہلِ علم کا تذکرہ کرتے تو کہتے کہ حقیقی عالم اس زمانہ میں تین ہی ہیں اور تین میں مکحول کا بھی نام لیا کرتے تھے۔ بہر حال یہی مکحول اپنی تعلیمی روداد بیان کرتے ہوئے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ

عُتِقْتُ بِمِصْرَ فَلَمْ اَدَعْ بِهَا عِلْمًا اِلَّا حَوَيْتُهُ فِيْ مَا اَرٰى ثُمَّ اَتَيْتُ الْعِرَاقَ ثُمَّ الْمَدِيْنَةَ فَلَمْ اَدَعْ بِهَا عِلْمًا اِلَّا حَوَيْتُهُ عَلَيْهِ فِيْمَا اَرٰى ثُمَّ اَتَيْتُ الشَّامَ فَغَرْبَلْتُهَا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۰)

میں مصر میں آزاد کیا گیا، آزاد ہونے کے بعد میں نے یہ کیا کہ مصر میں علم کا جو ذخیرہ تھا جہاں تک میرا خیال ہے اس پر حاوی ہو گیا (یعنی علماء سے اس کو سیکھ لیا) پھر میں عراق پہنچا، عراق کے بعد مدینہ آیا، ان دونوں شہروں میں بھی جو علم پھیلا ہوا تھا، اس کو جہاں تک سمجھتا ہوں میں نے سمیٹ لیا۔ پھر شام آیا اور اس کو تو میں نے چھلنی میں چھان لیا۔

ؔ الذہبی وغیرہ نے لکھا ہے کہ سندھی ہونے کی وجہ سے آخر عمر تک قاف کا تلفظ وہ کاف کرتے رہے جس سے معلوم ہوا کہ پنجاب کے باشندوں کی زبان پر اب بھی قاف کاف کی شکل اختیار کر لیتی ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں (دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۱)

(١٧ م)

کہا کرتے تھے کہ خوش قسمتی سے ان کو آخر میں ایک عربی خاتون نے خرید لیا اور ہاتھ پکڑ کر جامع مسجد لے گئی، جمعہ کی نماز کے لئے خطیب منبر پر جا چکا تھا، اس خاتون نے امام اور نمازیوں کو خطاب کر کے کہا کہ :

"لوگو! گواہ رہو، میں نے اس کو اللہ کے نام پر چھوڑ دیا، اب اس کا جو جی چاہے کرے"

پھر کیا تھا علم کا جو شوق اندر دبا تھا دل کھول کر اس کے پورا کرنے کا موقعہ ان کو مل گیا کہتے تھے کہ :

"میرا حال یہ تھا کہ بصرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سنتا اور معلوم ہوتا کہ فلاں صحابی جو مدینہ میں ابھی زندہ ہیں، وہ اس کے راوی ہیں تو اس وقت تک چین نہ لیتا جب تک کہ مدینہ پہنچ کر خود ان صحابی سے اس روایت کو نہ سنتا" (ابن سعد ج ۷ ص ۸۲)

ہر چیز سے الگ ہو کر آزادی کے ساتھ تحصیل علم کا وسیع میدان ان کے سامنے آ گیا تھا اور جو بلندیاں دین و دنیا کی اس کی بدولت ان کو میسر آئی تھیں اس کو بیان کرتے ہوئے یہی ابوالعالیہ کہا کرتے کہ :

"خداوند تعالیٰ کی دو نعمتوں میں سے فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس نعمت کا شکر زیادہ ادا کروں، یعنی ایک نعمت تو یہ ہے کہ خدا نے مجھے مسلمان ہونے کی توفیق عطا فرمائی اور اسی کے ساتھ دوسرا انعام خدا کا میرے ساتھ یہ ہوا کہ حروریہ کی جماعت سے اس نے مجھے نجات دی" (ص ۸۲)

میں نے جو یہ لکھا کہ خاندانی قصوں قضیوں کے سوا سیاسی بکھیڑوں میں الجھنے کے مواقع موالی کے لئے قدرتاً کم تھے۔ میرا تو خیال ہے کہ ابوالعالیہ کے بیان کے آخری فقرے میں شاید اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حروریہ یعنی خارجیوں کی جماعت جیسا کہ معلوم ہے اسلامی حکومت میں یہ پہلی انارکسٹ[1] جماعت تھی۔ حکومتِ قائمہ کے خلاف شورش و فساد یہی ان کا مشغلہ تھا۔ ان ہی کا دوسرا نام خوارج بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوالعالیہ کو ان ہی انارکسٹوں (خراجیوں) نے شروع میں اپنا ہمنوا بنا لیا تھا، لیکن اس قسم کے سیاسی گھن چکروں کی بے حاصلی بہت جلد ان پر واضح ہو گئی۔

---

[1] یعنی نراج پھیلانے والی۔

کا یہ برتاؤ تھا تو عام موالی کا جو حال ہوگا ظاہر[1] ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس واقعہ کو بھی بھولنا نہ چاہیے کہ یہ سارا قصہ جو کچھ بھی تھا، وقت کے حکمرانوں تک محدود تھا، ان کو تو عرب سے فی الحقیقت بحث تھی اور نہ غیر عرب سے سروکار تھا، ان کے سامنے اپنی خاندانی چھچوری خود غرضی کے سوا کوئی بلند نصب العین نہ تھا۔ بنی امیہ نے اپنے زمانے میں عربوں کو ابھار کر کام نکالنا چاہا، ان کے بعد جب عباسی آئے تو اپنے مقاصد کے لحاظ سے عربوں کے دبانے میں ان کو کامیابی نظر آئی پھر کون نہیں جانتا کہ ان ہی

---

[1] الذہبی کے حوالے سے جیسا کہ میں نے نقل کیا ہے، درحقیقت اپنے وقت کے ابن عون بہت بڑے آدمی تھے رجال وسیر کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ان کے حالات لکھے گئے ہیں علم و فضل زہد و عبادت کے سوا اخلاقی معیار بھی غیر معمولی طور پر بلند تھا۔ لکھا ہے کہ ان کی ایک بڑی قیمتی اونٹنی تھی جسے اس کی خوبیوں کی وجہ سے ابن عون بہت چاہتے تھے اسی پر حج بھی کرتے تھے اور جہادی مہموں پر بھی اسی پر سوار ہو کر تشریف لے جاتے۔ ان کا غلام جو اس اونٹنی کی خدمت کرتا تھا ایک دن ایک کوڑا اس بیچاری کو رسید کیا کہ اس کی ایک آنکھ پھوٹ کر بہہ گئی۔ غلام کے بھی ہوش جاتے رہے، اور دیکھنے والوں نے بھی دل میں کہا کہ آج ابن عون کا دن دیکھنے کا دن ہوگا، یعنی آج بھی ان کو غصہ نہ آئے مشکل ہے۔ بہر حال غلام اونٹنی کے ساتھ سامنے آیا، دیکھا، دیکھ کر بولے تو صرف اتنا بولے کہ بندۂ خدا چہرے کے سوا مارنے کیلئے اور کوئی جگہ نہ تھی۔ پھر غلام کی طرف خطاب کر کے فرمایا جا، میں نے تجھے آزاد کر دیا۔ یہ تھا سارا غصہ جس کا ظہور اس شکل میں ہوا وہی بلال بن ابی بردہ جس نے کوڑے سے ان کو پٹوایا تھا لکھا ہے کہ کسی دن ابن عون سے نہیں سنا گیا کہ بلال کے مظالم کا کسی سے عمر بھر انہوں نے کبھی ذکر کیا ہو۔ ایک دن ان کی مجلس میں کسی صاحب نے بلال کا نام لے کچھ کہنا چاہا، روک کر بولے سنو! لوگ ظالم کے ظلم کا چرچا پھر اس بری طرح شروع کر دیتے ہیں اور اتنی کثرت کے ساتھ اس کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں کہ آخر میں ظالم ہی مظلوم بن جاتا ہے۔ یہ بلال بن ابی بردہ اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے عہد میں بصرہ کے والی (گورنر) تھے ایک دلچسپ لطیفہ ابن عون کے متعلق مورخین نے یہ نقل کیا ہے کہ بصرہ میں چند مکانات ابن عون کے تھے جو کرایہ پر چلتے تھے۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ عموماً مسلمانوں کو کرایہ پر مکان دینے سے گریز کرتے ہیں۔ وجہ پوچھی گئی، بولے کہ کرایہ داروں کا قاعدہ ہے کہ ختم ماہ پر کرایہ کی فکر ان کی جان کھانے لگتی ہے، میں نہیں چاہتا کہ اپنی طرف سے کسی مسلمان کے قلب میں دہشت اور خوف ڈالوں۔ خود اپنے دو منزلہ مکان کی بالائی منزل میں رہتے تھے اور نچلی منزل عیسائیوں کو کرایہ پر دے رکھی تھی۔ کہتے تھے کہ بجائے مسلمانوں کے نصرانیوں کو اپنے نیچے رکھنا زیادہ بہتر خیال کرتا ہوں۔ وفات بھی ان کی عجیب طرح سے ہوئی، جمال جہاں آرا، رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی دید کی تمنا رکھتے تھے۔ آخر ایک دفعہ خواب میں یہ دولت بیدار میسر آئی، آنکھ جس وقت کھلی تو شدت سرور سے اتنے بے خود تھے کہ اوپر سے نیچے اترتے ہوئے قدم کو سنبھال نہ سکے چکرا کر گر پڑے سخت چوٹ آئی۔ لوگوں نے لاکھ اصرار کیا کہ علاج کرائیے لیکن راضی نہ ہوئے، غالباً جینے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو چکا تھا، اسی میں وفات ہوئی ہے ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔ (ابن سعد ج ۷، ص ۲۹ قسم دوم)

عباسیوں نے اور جو کچھ کیا اس کی داستان تو طویل اور کافی دردناک ہے لیکن عباسیوں کی حکومت کے بانی ابراہیم الامام نے ابو مسلم خراسانی کے نام یہ فرمان جو لکھا تھا، تاریخوں میں اب تک وہ محفوظ ہے یعنی

لَا یُدَعُ بِخُرَاسَانَ مَنْ یَّتَکَلَّمُ بِالْعَرَبِیَّۃِ — ہر وہ شخص جو عربی بولتا ہو اس کو خراسان میں زندہ نہ چھوڑا جائے۔

(کامل ابن اثیر ج ۵ ص ۱۲۷)

لیکن ان حکمرانوں کے حالات کو عام امت مسلمہ کی طرف منسوب کر دینا نہ صرف غلطی بلکہ میرے نزدیک بدترین علمی خیانت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ملوک بنی امیہ موالی کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے، لیکن خود مسلمانوں کا حال کیا تھا۔ اور تو اور خانوادۂ نبوت کے گوہر شب چراغ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ابن سعد ہی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت والا نے اپنے غلام کو آزاد کیا اور آزاد کرنے کے بعد اپنی صاحبزادی صاحبہ کا اسی مولیٰ سے نکاح کر دیا۔ اسی کے ساتھ اپنی ایک شرعی لونڈی کو بھی آزاد کر کے خود اپنا نکاح اس سے کیا۔ یہ خبر دار الحکومت دمشق پہنچی، عبد الملک حکمران وقت کو حضرت کے اس فعل کی جب خبر ہوئی تو آگ بگولا ہو گیا۔ لیکن کیا کر سکتا تھا، صرف ایک خط حضرت کے نام لکھا، جس میں آپ کے خاندانی شرافت و نجابت کا ذکر کر کے نکاح کے اسی قصہ پر طنز و طعن سے کام لیتے ہوئے تیز و تند فقرے عبد الملک نے استعمال کئے تھے۔ جواب میں سیدنا الامام نے رقام فرمایا کہ

قَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ قَدْ أَعْتَقَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَفِيَّةَ بِنْتَ حُيَيٍّ وَتَزَوَّجَهَا وَأَعْتَقَ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ وَزَوَّجَهُ ابْنَةَ عَمَّتِهِ زَيْنَبَ بِنْتَ جَحْشٍ۔

یقیناً تم لوگوں کے لئے بہترین نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیہ خاتون، صفیہ بنت حی کو آزاد فرمایا اور ان سے نکاح کیا، اسی طرح زید بن حارثہ (اپنے غلام) کو آزاد کیا اور اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش سے اسی آزاد شدہ غلام زید کا عقد کر دیا تھا۔

(ابن سعد ج ۵ ص ۱۵۶)

حضرت امام زین العابدین کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے مولیٰ زید بن اسلم

جن کا مسجدِ نبوی میں تعلیمی حلقہ تھا، عموماً استفادے کے لئے اسی حلقہ میں جاکر شریک ہوتے، بعض جاہلی حمیت والوں نے پوچھا بھی کہ قریش کی مجلس کو چھوڑ کر ایک مولیٰ کے حلقہ میں جاکر آپ بیٹھتے ہیں، اس وقت بھی ارشاد ہوا کہ

جس سے نفع پہنچے، آدمی کو وہیں بیٹھنا چاہئے۔ (ابن سعد ج ۵ ص ۱۶۰)

ابھی آپ مجھ ہی سے ابو العالیہ کا وہ قصہ سن چکے کہ صنادید قریش نیچے بیٹھے رہے اور ابن عباسؓ نے ابو العالیہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ تخت پر بٹھالیا۔ ابن سعد میں اسی روایت کا جن الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بصرہ ہی کا یہ واقعہ ہے جہاں کی جامع مسجد میں لاکر ابو العالیہ کو ان کی مالکہ نے خدا کے نام آزاد کیا تھا، بلکہ اسی میں یہ بھی ہے کہ ابو العالیہ اس قصے کو بیان کرتے ہوئے کہتے تھے کہ

دَخَلْتُ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ وَهُوَ اَمِيْرُ الْبَصْرَةِ فَنَاوَلَنِيْ يَدَهٗ حَتّٰى اسْتَوَيْتُ مَعَهٗ عَلَى السَّرِيْرِ۔ (ابن سعد ج ۷ ص ۸۲)

میں ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس زمانے میں وہ بصرہ کے امیر (گورنر) تھے۔ مجھے دیکھ کر ابن عباسؓ نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ بٹھایا حتیٰ کہ اس تخت پر بالکل ان کے برابر بیٹھ گیا۔

اسی میں یہ بھی ہے کہ اس وقت ابو العالیہ معمولی گھٹیا درجے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے[ا]۔ اور ایک یہی کیا فاروقِ اعظمؓ کے صاحبزادے ان ہی دنوں میں جب بنی امیہ موالی کے ساتھ وہ سلوک کر رہے تھے جس کی طرف اشارہ کیا گیا تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا جاتا تھا کہ بنی مخزوم کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) مجاہد بن جبر گھوڑے پر سوار ہیں اور ابن عمرؓ ان کی رکاب تھامے ہوئے ہیں۔ خود مجاہد بیان کرتے ہیں کہ

[ا] ابو العالیہ ہی کا بیان ہے کہ کل پندرہ درم دام ان سارے کپڑوں کا تھا جو میرے جسم پر تھے، پھر پوچھنے پر تفصیل بھی بتائی کہ لنگی کل تین درم میں اس وقت مل جاتی تھی اور رازی کپڑے کا تھان بارہ درم میں خرید کر لیا کرتا تھا، جس سے میری چادر اور عمامہ دونوں بن جاتے تھے۔ ان کے اس بیان سے اس زمانہ میں کپڑوں کی ارزانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ (دیکھو طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۸۴ قسم دوم)

رُبَمَا اَخَذَ لِی ابْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُمَا بِالرِّکَابِ (تذکرہ ج ۱) بسا اوقات ابن عمرؓ میرے گھوڑے کی رکاب تھام لیتے۔

اور یہ اسی علم کا نتیجہ تھا جسے صحابہ کی صحبتوں میں مجاہد نے حاصل کیا تھا، آج بھی ان کا شمار ائمہ مفسرین میں ہے[1]۔

ظاہر ہے کہ امام زین العابدین، ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے اکابر کے مقابلہ میں مسلمانوں کی عام جماعت حکومت کی کیا پرواہ کرسکتی تھی، غلام طبقہ کے علمار کی عظمت واحترام کا عام مسلمانوں میں یہ حال تھا کہ اور تو اور پیغمبرؐ کے شہر مدینہ میں کوفہ کے مولیٰ عالم حکم بن عقبہ جب کبھی تشریف لاتے تو لکھا ہے کہ

خَلَّوْا لَہٗ سَارِیَۃَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ محض حکم کے خیال سے تاکہ ان کو نماز پڑھنے کا موقع ملے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ستون کو (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کی جگہ) ان کے لئے مدینہ والے خالی چھوڑ دیتے تھے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۱)

ان ہی موالی علمار میں کوفہ ہی کے ایک مشہور عالم حبیب بن ثابت تابعی ہیں، ابویحیی القتات کے حوالہ سے ذہبی ہی نے نقل کیا ہے کہ طائف کے سفر میں میں ان کے ساتھ تھا۔ ابویحیی کا بیان ہے کہ جس وقت طائف میں ہمارا داخلہ ہوا تو حبیب کے احترام میں وہاں کی خلقت کچھ اس طرح ٹوٹی پڑتی تھی کہ کَاَنَّمَا قَدِمَ عَلَیْھِمْ نَبِیٌّ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۰۹) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوفہ والوں کے یاں کوئی پیغمبر آگیا ہے۔

موالی کے اس طبقہ کے ساتھ عام مسلمانوں کی اس احترامی گرویدگی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان تو مسلمان، حد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس زمانے کے یہود ونصاریٰ کا بھی حال یہ ہوگیا تھا کہ منصور بن زاذان جو اسی موالی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، واسط میں قیام تھا، جب ان کی وفات ہوئی تو عباد بن العوام جو اس وقت کم سن تھے اور جنازے میں منصور کے شریک تھے بیان کرتے ہیں کہ

فَرَاَیْتُ النَّصَارٰی عَلٰی حِدَۃٍ وَالْیَھُوْدَ عَلٰی حِدَۃٍ میں نے منصور کے جنازے میں (مسلمانوں کے سوا) دیکھا کہ عیسائیوں کا ایک گروہ بھی الگ اس جنازے میں شریک ہے اور یہودیوں کا گروہ بھی الگ ہے۔

---

[1] یہ وہی مجاہد بن جبر ہیں جنھوں نے بحیرہ روم کے مشہور جزیرہ رودس میں قیام اختیار کرلیا تھا اور وہیں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ (البلاذری ص ۲۴۴)

آنا ہجوم تھا کہ عباد کہتے ہیں :

قَدْ اَخَذَ خَالِیْ بِیَدِیْ مِنْ کَثْرَۃِ الزِّحَامِ (تذکرہ) میرے ماموں نے میرا ہاتھ ہجوم کی کثرت کے خوف سے پکڑلیا

"مسلمان اور موالی" کا یہ عنوان اتنا وسیع ہے کہ اس پر چاہنے والے چاہیں تو اچھی خاصی کتاب لکھ سکتے ہیں۔ میں نے چند برجستہ مثالیں جو رجال کی عام کتابوں میں درج ہیں ان کا ذکر کردیا ہے سچ پوچھئے تو ان بے اعتنائیوں کے باوجود جو حکومت ان موالی کے ساتھ اختیار کئے ہوئے تھی لیکن پھر بھی بسا اوقات اسی حکومت کو رائے عامہ کے سامنے جھکنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔

مصر کے مولیٰ عالم و فقیہ یزید بن حبیب کے حالات میں لکھا ہے کہ بیچارے حالانکہ حبشی خاندان کے آدمی تھے، ابن لَہِیعہ یہ کہنے کے بعد کہ کَانَ اَسْوَدُ نُوْبِیًّا (یزید سیاہ حبشی تھے) کہتے ہیں کہ کَانَّہٗ فَحْمَۃٌ (گویا یزید کوئلہ تھے) مگر علم و فضل و دیانت و تقویٰ کا جو نور ان سے پھوٹ پھوٹ کر سارے مصر کو منور کئے ہوئے تھا، اس نے مصر میں یہ حالت پیدا کردی تھی کہ حکومت کی گدی پر نیا حکمران جب بیٹھتا اور بیعت لینے والے مصر کے باشندوں سے بیعت لینے کے لئے جب آتے تو ہر ایک کا جواب یہی ہوتا کہ یزید بن حبیب اور ان ہی کے ہمعصر ایک دوسرے مولیٰ عالم عُبَیْدُ اللّٰہ بن ابی جعفر جو کچھ کریں گے وہی ہم بھی کریں گے۔ الذہبی نے لیث بن سعد کے حوالہ سے ان کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

هُمَا جَوْهَرَتَا الْبِلَادِ كَانَتِ الْبَيْعَةُ إِذَا جَاءَتْ لِلْخَلِيْفَةِ هُمَا أَوَّلُ مَنْ يُّبَايِعُ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۲۲)

یہی دونوں (یعنی یزید اور عبید اللہ) ملک کے تابناک جواہر تھے، جب خلیفہ کی طرف سے بیعت لینے کے لئے لوگ آتے تو یہی دونوں پہلے بیعت کرتے تھے۔

یہی لَیث بن سعد جن کا ذکر پہلے بھی کہیں گزر چکا کہ مصر کے امراء میں تھے لیکن جب یزید کا ذکر کرتے تو کہتے کہ

یَزِیْدُ عَالِمُنَا وَیَزِیْدُ سَیِّدُنَا (۰) یزید ہمارے ملک کے عالم ہیں، یزید ہمارے سردار اور پیشوا ہیں

مصر میں لیث بن سعد کا جو مقام تھا اس سے آگاہ ہونے کے بعد "سیدنا" کے اس لفظ کا صحیح وزن آدمی محسوس کرسکتا ہے یا بصرہ کے مشہور محدث ایوب السختیانی جو موالی ہی میں سے تھے، خواجہ حسن بصریؒ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بھری مجلسوں میں کہتے :

[illegible]

ابن شہاب زہری اور عبدالملک کا تاریخی مکالمہ

بہر حال ان قصوں کو کوئی کہاں تک بیان کرے، اسلامی تاریخ کے اوراق ان کے ذکر سے معمور ہیں۔ میری غرض ان واقعات کے ذکر سے یہ ہے کہ موالی کا جو طبقہ مسلمانوں میں تھا، ان کے مذکورہ بالا خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچنا چاہئے۔ نہ صرف دین بلکہ دنیا میں جس علم کی بدولت حکومت کے علی الرغم رفعت و اقتدار کی راہیں ان پر کھل رہی تھیں اس علم کے ساتھ ان کے انہماک و استغراق کی جو کیفیت ہو سکتی ہے کیا کوئی اس کی حد مقرر کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو کارنامے بھی ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں کیا کسی وجہ سے ان میں شک کرنے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ عبدالملک بن مروان، مروانی حکمران اور زہری کے جس مکالمہ کا کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے، یعنی کہتے ہیں کہ ابن شہاب زہری، عبدالملک کے دربار میں ایک دفعہ پہنچے تو اس نے پوچھا کہ زہری کیا بتا سکتے ہو کہ مسلمانوں کے مختلف امصار اور شہروں میں آج کل سب سے بڑے عالم جو مرجع انام ہوں کون کون لوگ ہیں؟ زہری نے کہا کیوں نہیں۔ فرمائیے کس کس شہر کے ائمہ کو بتاؤں۔ عبدالملک نے حسب ذیل ترتیب سے پوچھنا شروع کیا:

عبدالملک۔ تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟

زہری۔ مکہ معظمہ سے۔

عبدالملک۔ مکہ میں کس شخص کو چھوڑ کر آئے جو اس وقت مکہ والوں کی پیشوائی کر رہا ہے؟

زہری۔ عطاء بن ابی رباح۔

عبدالملک۔ عرب خاندان کے آدمی ہیں یا موالی سے ان کا تعلق ہے؟

زہری۔ موالی سے۔

عبدالملک۔ کس چیز نے عطاء کو یہ مقام عطا کیا؟

زہری۔ دین اور حدیثوں کی روایت نے۔

عبدالملک۔ ٹھیک ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہیں ہی ایسی کہ آدمی کو پیشوائی عطا کریں۔ خیر بتاؤ کہ یمن کا

امام اور پیشوا مسلمانوں کا آج کل کون ہے ؟

زہری۔ طاؤس بن کیسان۔

عبدالملک۔ کیا عرب سے نسلی تعلق وہ رکھتے ہیں یا موالی سے ہیں؟

زہری۔ موالی سے۔

عبدالملک۔ اس شخص کو کس چیز نے یہ بڑائی عطا کی ہے ؟

زہری۔ ان ہی باتوں نے جس نے عطاء کو بڑھنے کا موقعہ دیا۔

عبدالملک۔ اچھا مصر کا امام ان دنوں کون ہے ؟

زہری۔ یزید بن ابی حبیب۔

عبدالملک۔ عرب ہیں یا موالی میں سے یہ بھی ہیں ؟

زہری۔ موالی ہی سے ان کا بھی تعلق ہے۔

عبدالملک۔ اور شام کا پیشوا آج کل کون ہے ؟

زہری: مکحول

عبدالملک۔ عرب یا موالی ؟

زہری۔ موالی سے ان کا بھی تعلق ہے۔ غلام تھے، قبیلہ ہذیل کی ایک عورت نے ان کو آزاد کیا تھا۔

عبدالملک۔ جزیرہ (یعنی فرات و دجلہ کے درمیانی علاقوں) کا امام کون ہے ؟

زہری۔ میمون بن مہران۔

عبدالملک۔ مولیٰ ہیں یا عربی ؟

زہری۔ مولیٰ۔

عبدالملک۔ خراسان کا سب سے بڑا آدمی آج کل کون ہے ؟

زہری۔ ضحاک بن مزاحم۔

عبدالملک۔ مولیٰ یا عربی ؟

زہری۔ موالی۔

عبدالملک۔ بصرہ کا بتاؤ کہ امام کون ہے؟

زہری۔ حسن بن ابی الحسن (یعنی خواجہ حسن بصری)

عبدالملک۔ موالی ہیں یا عربی؟

زہری۔ موالی۔

عبدالملک۔ ویلک (تجھ پر افسوس ہے) آخر کوفہ میں مسلمانوں کی دینی پیشوائی کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے؟

زہری۔ ابراہیم النخعی۔

عبدالملک۔ کیا یہ بھی موالی ہیں یا عربی النسل؟

زہری۔ جی ہاں، یہ عربی النسل عالم ہیں۔

عبدالملک۔ اف، زہری اب جا کر تم نے ایک بات سنائی جس سے غم کا بادل میرے دل سے کچھ ہٹا بعض روایتوں میں ہے کہ عبدالملک نے کہا کہ یہ آخری جواب تم اگر نہ سناتے تو قریب تھا کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے۔

اس کے بعد عبدالملک اپنے درباریوں کی طرف مخاطب ہوا اور کہنے لگا:

"قطعاً یہ موالی (غیر عربی مسلمان) عرب کے سردار اور پیشوا بن کر رہیں گے، یہ ہو کر رہیگا کہ منبر پر ایک موالی چڑھا ہوا خطبہ پڑھ رہا ہے اور اسی منبر کے نیچے عرب بیٹھے ہیں۔"

غیظ و غضب کے لہجہ میں عبدالملک یہ اور اسی قسم کی باتیں جوش میں کہہ رہا تھا، زہری نے تب کہا کہ

"امیر المومنین! یہ اللہ کی بات ہے اور اس کا دین ہے جو بھی اس کا علم حاصل کرے گا وہ اس کا عالم بنے گا وہی پیشوا بن جائے گا اور جو اس علم سے بے اعتنائی اختیار کریں گے وہ گریں گے ان کو گرنا پڑیگا۔"

---

[1] اس مکالمہ کا تذکرہ حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۹۸ میں بھی کیا ہے۔ حاکم کے سوا ابن صلاح نے مقدمہ میں، سیوطی نے تدریب میں، سخاوی نے فتح المغیث میں بھی اس قصہ کو دہرایا ہے۔ محدثین کی کتابوں کے علاوہ فقہاء کے طبقات و مناقب میں بھی اس مکالمہ کا رد و بدل سے ذکر ملتا ہے۔ بعض روایتوں میں بجائے عبدالملک کے دوسرے اموی خلفاء کی طرف اس مکالمہ کو منسوب کیا گیا ہے۔ نیز بعض کتابوں میں بجائے ابراہیم کے عربی النسل عالم سعید بن المسیب عالم مدینہ کو قرار دیا گیا ہے۔

عرب بھی موالی کی علمی خدمات سے مستفید ہونے پر مجبور تھے

بیچارے عبدالملک کے لئے موالی کا یہ حال سخت دماغی کوفت کی وجہ بنا ہوا تھا، اسلام نے ہر عربی و غیر عربی کو عام اجازت دے رکھی تھی، بلکہ سب سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ قرآن پڑھیں، حدیثیں سیکھیں، فقیہ بنیں، اجتہاد کریں، اسی بنیاد پر لوگ سیکھ رہے تھے، سب کو سکھایا جا رہا تھا، پڑھایا جا رہا تھا اور اپنے اپنے علم اور کمال کے مطابق مسلمانوں میں امتیازی مقامات کے مالک بنتے چلے جا رہے تھے، دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ خود عبدالملک کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے معلم کی ضرورت ہوئی۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ باوجود تلاش کے عبدالملک کی نظر میں جو آدمی جچا، ان کا تعلق بھی موالی ہی کے طبقہ سے تھا، ان کا نام اسماعیل بن عبیداللہ بن ابی المہاجر تھا۔ بیچارہ کیا کرتا مجبوراً ان ہی کو شہزادوں کا معلم مقرر کرنا پڑا۔ لکھا ہے کہ اس خدمت پر اسماعیل کو مقرر کرنے کے بعد عبدالملک نے کہا:

"عرب اور غیر عرب (یعنی عجمیوں) کے تعلقات کی جو نوعیت ہو گئی ہے، عجیب ہے۔ مجھے تو اس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ ان ایرانیوں ہی کو دیکھو، حکومت کی باگ صدہا سال ان کے ہاتھوں میں رہی، اس پورے طویل عرصے میں ان کو ہماری یعنی عرب کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔ ایک مردک نعمان بن منذر کا نام لیا جاتا ہے جس سے ایرانی حکومت نے کام لیا تھا اور پھر یہ قصہ بھی زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا۔ اس غریب نعمان کو بھی آخر ایرانی قتل کر کے رہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ کتنے دن ہوئے ہمارے ہاتھ حکومت آئی ہے لیکن غیر عربی اقوام سے مدد لینے پر اس مختصر مدت میں بھی ہم مجبور ہو گئے ہیں، حد یہ ہے کہ تعلیم تک میں ہم ان عجمیوں کے دست نگر ہو چکے ہیں۔ اسی اسماعیل بن عبید کو دیکھو! امیرالمومنین (مسلمانوں کے بادشاہ) کے بچوں کو پڑھاتا ہے اور کیا پڑھاتا ہے، عربیت سکھاتا ہے۔" (ابن عساکر ج ۲ ص ۲۷)

عبدالملک کے سامنے یہی نکتہ تو اوجھل تھا کہ اسلام صرف عرب کے لئے یا ان کو ساری دنیا کا فاتح بنانے اور دنیا کو ان کا مفتوح بنانے کے لئے نہیں آیا تھا، ایرانی ایران کے لئے اٹھے تھے، اس لئے ایران کے سوا کبھی ان کے دائرۂ حکومت میں تھے کسی کو ابھرنے کا موقعہ نہ دیتے تھے اور نہ دے سکتے تھے، لیکن

اسلام تو عام انسانیت اور سارے بنی آدم کی زندگی کا پیغام تھا۔ بیچارہ عبدالملک اسلام کو عربیت کا مرادف قرار دینا چاہتا تھا لیکن یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسلام لانے کی وجہ سے ان غیر عربی موالی کی نظر میں اتنی بلندی پیدا ہو جاتی تھی کہ حکومت کے ہتھکنڈوں کے شکار بھی وہ نہیں ہو سکتے تھے۔ ان ہی اسماعیل بن عبید کے حال میں لکھا ہے کہ عبدالملک نے بلا کر جب فرمائش کی کہ میرے بچوں کو پڑھاؤ، تمہیں کافی معاوضہ دیا جائے گا۔ روئے زمین کا اس وقت جو سب سے بڑا طاقتور بادشاہ تھا، یہ اس کا فرمان ہے لیکن اسماعیل نے انتہائی سادگی کے ساتھ جواب دیا کہ

"امیرالمومنین! میں معاوضہ کیسے لے سکتا ہوں، مجھے ام الدرداء نے ابوالدرداء صحابی کے حوالہ سے یہ روایت سنائی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ قرآن کی تعلیم پر جو اجرت لے گا قیامت کے دن اس کے گلے میں آگ کی کمان چڑھائی جائے گی۔"

استغنا اور بے نیازی کے اس جواب کو سن کر عبدالملک اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا کہ

"قرآن کی تعلیم کا معاوضہ میں نہیں دوں گا، نحو وغیرہ سکھاؤ گے، اس کا معاوضہ پیش کروں گا۔" [۱]

سخاوی نے فتح المغیث میں ایک بدوی کا لطیفہ نقل کیا ہے جو بصرہ آیا تھا۔ لوگوں سے اسی بدو نے پوچھا کہ یہاں کا سب سے بڑا آدمی مسلمانوں کا پیشوا آج کل کون ہے؟ جواب میں خواجہ حسن بصری کا نام لیا گیا۔ بولا کہ عرب ہیں یا موالی سے تعلق رکھتے ہیں؟ کہا گیا کہ موالی میں ہیں۔ گھبرا کر بدوی نے کہا کہ پھر اتنا بلند ہونے کا موقعہ اس کو کیسے مل گیا۔ واللہ اعلم یہ جواب کس نے دیا، لیکن حکیمانہ فقرہ تھا، بدوی سے کہا گیا:

سَادَهُمْ بِحَاجَتِهِمْ إِلَىٰ عِلْمِهِ وَعَدَمِ احْتِيَاجِهِ إِلَىٰ دُنْيَاهُمْ۔	عربوں کو حسن بصری کے علم کی ضرورت تھی، اور اس کو عربوں کی (مفتوحہ دنیا) کی حاجت نہ تھی، اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ باوجود عربی نہ

---

[۱] اسماعیل بن عبید کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد خلافت میں افریقہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ ابن عساکر کا بیان ہے کہ افریقہ کے عام باشندے جو بربر کہلاتے تھے، ان ہی اسماعیل بن عبید کی کوشش سے مسلمان ہوئے۔
(تاریخ دمشق ج ۳ ص ۲۷)

(فتح المغیث ص ۴۹۹) ہونے کے) ان کا سردار بن گیا۔

کہتے ہیں کہ یہ سن کر بدو ہنسا اور بولا:

هٰذَا لَعَمْرُكَ هُوَ السُّؤْدَدُ۔ تمہاری زندگی کی قسم یہ ہے سرداری۔

خواجہ حسن بصری نے اپنے علم اور معلومات کا مسلمانوں کو کس حد تک محتاج بنا دیا تھا اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ علی بن زید جو مکہ کے مشہور رئیس عبداللہ بن جدعان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اسی لئے لوگ ان کو علی بن زید ابن جدعان کہا کرتے تھے، انہوں نے صحابہ کو دیکھا تھا۔ ۱۳۱ھ ہجری میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ آخر زمانہ میں بصرہ کو وطن بنا لیا تھا۔ بہر حال ان ہی علی بن زید کی رائے ابن سعد نے خواجہ حسن بصری کے متعلق یہ نقل کی ہے، کہتے تھے کہ

لَوْاَنَّ الْحَسَنَ اَدْرَكَ اَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاحْتَاجُوْا اِلٰى رَأْيِهٖ۔ اگر حسن بصری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کا زمانہ پا لیتے (یعنی عالم ہونے کے بعد صحابہ کا زمانہ پاتے) تو قطعاً صحابہ بھی ان سے رائے لینے (اور فتوی پوچھنے میں) محتاج ہو جاتے۔

(ابن سعد ج، ص ۱۱۷)

کسی غیر صحابی مسلمان اور وہ بھی جو موالی سے تعلق رکھتا ہو اس کی یہ انتہائی منقبت اور تعریف ہو سکتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ حسن بصری کے متعلق متعدد طرق سے لوگوں نے اس قصہ کو جب نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص انس بن مالکؓ سے ان کے آخر عمر میں کوئی مسئلہ پوچھنے جاتا تو بجائے جواب دینے کے فرماتے:

سَلُوْا مَوْلٰنَا الْحَسَنَ ہمارے مولیٰ حسن سے پوچھو۔

لوگ عرض کرتے کہ حضرت ہم تو آپ سے دریافت کرتے ہیں اور آپ فرما دیتے ہیں کہ ہمارے مولیٰ حسن سے پوچھو۔ جواب میں حضرت انسؓ فرماتے:

اِنَّا سَمِعْنَا وَسَمِعَ فَحَفِظَ وَنَسِيْنَا ہم نے بھی سنا اور اس نے بھی، مگر ہم بھول گئے اور اس نے یاد رکھا۔

(ابن سعد ج، ص ۱۲۸ قسم اول)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

الْبَرَاغِيثِ . (تذکرہ ج ۱ ص ۱۲۲)   کھٹمل کے خون کے متعلق مسئلہ پوچھتا ہے۔

بجز اس کے کہ خاموشی کے ساتھ ان کی تلملا دینے والی اس تعریض کو جوشہ نے سن لیا۔ کچھ نہ بولا ، اور چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا۔

اس بھی زیادہ دلچسپ لطیفہ طاؤس بن کیسان کا ہے ، ان کا مستقر جیسا کہ معلوم ہے یمن تھا ، بنی امیہ کی حکومت کا زمانہ تھا اور وہ بھی ان کا جبروتی عہد جب ان کی دولت کا طاغیہ حجاج مسلمانوں پر مسلط تھا ، یمن کا گورنر اس زمانے میں اسی حجاج کا بھائی محمد بن یوسف تھا۔ قصہ یہ پیش آیا کہ کسی وجہ سے طاؤس بن کیسان اور ان کے ساتھ یمن کے دوسرے عالم وہب بن منبہ محمد بن یوسف کے دربار میں پہنچے ، موسم سردیوں کا تھا ، خصوصاً اس دن بڑے کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی ۔ محمد بن یوسف نے کرسی منگوائی ، طاؤس کرسی پر بیٹھے ، سردی کا خیال کر کے محمد بن یوسف نے غلام کو آواز دی کہ فلاں دوشالہ لاؤ ، لایا گیا۔ محمد نے حکم دیا کہ طاؤس کے اوپر اس کو ڈال دیا جائے ۔ غلام نے یہی کیا ۔ تماشہ یہیں سے شروع ہوتا ہے راوی کا بیان ہے کہ طاؤس منہ سے کچھ نہ بولے لیکن

لَمْ يَزَلْ يُحَرِّكُ كَتِفَيْهِ حَتّٰى   دونوں مونڈھوں کو مسلسل طاؤس نے ہلانا شروع کیا تا آنکہ

اَلْقٰى عَنْهُ .   دوشالہ بالآخر ان کے کندھوں سے گر پڑا۔

لکھا ہے کہ محمد بن یوسف ان کی اس حرکت کو دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں آگ بگولا ہو رہا تھا ۔ لیکن طاؤس کا جو اثر رائے عامہ پر تھا اس نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ کچھ بولتا ۔ صرف ٹیڑھی ، ترچھی نگاہوں سے دونوں کو دیکھتا رہا ۔ جب وہب اور طاؤس باہر نکلے تو وہب نے کہا کہ بھائی تم نے تو آج غضب ہی کر دیا آخر اس میں کیا بگڑتا تھا کہ اس دوشالے کو آپ لے لیتے ۔ خواہ مخواہ اس شخص کی آگ میں آپ نے اشتعال دیا ۔ آپ کو اس دوشالے کی ضرورت نہ تھی تو باہر نکل کر فروخت کر دیتے اور دام غربا و مساکین میں تقسیم فرما دیتے ۔ طاؤس نے کہا کہ اس کا خطرہ اگر نہ ہوتا کہ لینے کی حد تک تو طاؤس کے فعل کو لوگ دلیل بنا لینگے لیکن جو طریقہ عمل اس دوشالے کے ساتھ میں اختیار کرتا ، اسے ترک کر دیں گے تو شاید میں یہی کرتا۔

(ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵)

استغناء و بے نیازی کے یہ واقعات کچھ ان ہی چند موالی کے ساتھ مختص نہیں ہیں بلکہ ان کے تمام سر برآوردہ بزرگوں میں آپ اسی شان کو پائیں گے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ لوگ موالی اور حکومت یا حکومت کے امراء اور عہدیداروں کے ساتھ ان کے تعلقات کی اس نوعیت کو سامنے رکھ کر اگر سوچیں گے تو سمجھ سکتے ہیں کہ جس علم کی بدولت عامۂ مسلمین میں عظمت و جلال کے ان مقامات کو موالی کا یہ طبقہ حاصل کر رہا تھا اگر اس راہ میں معمولی بے احتیاطیاں بھی ان سے سرزد ہوتیں تو سر پھروں کے اس گروہ کے، پر حکومت، اور حکومت والے کیا ایک بال بھی باقی رکھ سکتے تھے؟ واقعہ یہ ہے کہ ملوک بنی امیہ اپنے طریقۂ حکومت کے لحاظ سے جس حد تک قابل ملامت والزام ہوں لیکن پھر بھی اس دعوے سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے بادشاہ اور ان کے دینی و دنیوی حقوق کے محافظ ہیں۔ واقع میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں لیکن کہتے یہی تھے۔ بلکہ بدگمانی میں زیادہ اغراق سے اگر کام نہ لیا جائے تو ان کے سیاسی اغراض پر جن امور سے زد نہیں پڑتی تھی ان میں جہاں تک میرا خیال ہے کہنے کے ساتھ کرنے میں بھی وہ پیچھے نظر نہیں آتے۔ یہی عبدالملک بن مروان ہے اور اس کی حکومت کا عہد ہے مسلمانوں میں ان لوگوں کی طرف سے جو اسلامی نام رکھ رکھ کر مختلف قسم کی اندرونی دسیسہ کاریوں میں مشغول تھے ایک ترکیب وضع حدیث کی بھی جاری ہوئی۔ یعنی مسلمانوں کے دین کو بگاڑنے کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جعلی روایتیں اور جھوٹی باتیں منسوب کر کر کے پھیلانے والوں نے پھیلانا شروع کیا، جس کا تفصیلی قصہ تو آگے آ رہا ہے۔ یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس فتنے کے مقابلے میں جہاں ابن مبارک کے الفاظ میں "جہابذۃ الحدیث" آستین چڑھا کر کھڑے ہو گئے وہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وضع احادیث کے مراکز جو عموماً بصرہ و کوفہ وغیرہ میں تھے، ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبدالملک اپنے منبر سے اعلان کر رہا ہے کہ

قَدْ سَالَتْ عَلَيْنَا أَحَادِيْثُ مِنْ قِبَلِ هٰذَا الْمَشْرِقِ لَا نَعْرِفُهَا۔ (ابن سعد ج ۵ ص ۱۶۲)	اس مشرق کی طرف سے ایسی حدیثیں بہ کر ہماری طرف آ رہی ہیں جنہیں ہم نہیں پہچانتے۔

یا اسی عبدالملک نے خالص سیاسی اغراض کے تحت جہاں لوگوں کو قتل کیا تھا وہیں حارث بن سعید الکذاب جیساکہ ارباب علم سے مخفی نہیں ہے، اسی لئے اس کو دار پر کھینچا کہ عبدالملک اپنے آپ کو مسلمانوں کے دین کا بھی محافظ سمجھتا تھا، یا غیلان دمشقی کو عبدالملک کے بیٹے ہشام نے جو قتل کیا تو بجز اس جرم کے کہ پیغمبر کے دین میں غیلان رخنہ اندازیاں کیا کرتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرکرکے حدیثیں عوام میں پھیلاتا تھا میں تو نہیں جانتا کہ اس کا کوئی اور جرم تھا[1]۔ بنی امیہ کے بعد عباسی خلفاء کے عہد میں بھی ہم اس باب میں اسلامی حکمرانوں کی ذمہ داریوں کو زندہ پاتے ہیں، ابوجعفر منصور نے اسی وضع حدیث کے جرم میں محمد بن سعید مصلوب کو سولی دی۔ مہدی، رشید، مامون وغیرہ خلفاء عباسی کے عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس باب میں سب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں پیغمبر کی طرف کوئی غلط بات منسوب ہو کر پھیل نہ جائے، اس کی کڑی نگرانی حکومت ہمیشہ کرتی رہی۔ نہ صرف سلاطین و ملوک بلکہ ہر صوبہ کے وُلاۃ اور حکام بھی اس مسئلہ میں کسی رو رعایت کو جہاں تک تاریخ کی شہادت ہے، روا نہیں رکھتے تھے۔ بیان بن زریق کو بنی امیہ کے مشہور گورنر خالد بن عبداللہ القسری نے جو قتل کیا تھا، اسی طرح عباسیوں کی طرف سے بصرہ میں محمد بن سلیمان جب حاکم تھا تو مشہور حدیث ساز (یعنی وضاع) عبدالکریم بن ابی العوجاء کو اسی نے وضع حدیث کے جرم میں قتل کرایا تھا اور سلاطین یا صوبے کے ولاۃ ہی نہیں بلکہ اس قسم کی روایتوں سے مثلاً خطیب نے تاریخ بغداد میں نقل کیا ہے کہ

اِسْمٰعِیْلُ بْنُ اِسْحَاقَ الْقَاضِیْ ضَرَبَ الْهَیْثَمَ بْنَ سَهْلٍ عَلٰی تَحْدِیْثِهٖ عَنْ حَمَّادِ بْنِ زَیْدٍ وَاَنْکَرَ عَلَیْهِ ذٰلِكَ (ج ۱۴ ص ۶۰)	قاضی اسماعیل بن اسحاق نے ہیثم بن سہل کو اس وجہ سے پٹوایا کہ حماد بن زید کے حوالہ سے وہ حدیث روایت کرنے لگا تھا۔ قاضی اسماعیل اس کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی روایت کرنے والوں کی نگرانی کا فرض قاضیوں کے سپرد تھا۔

بہر حال کچھ بھی ہو میرے نزدیک تو بجائے خود بھی ایک صورت حال ایسی ہے جو ان روایات اور حدیثوں کے اعتماد کی کافی ضمانت بن سکتی ہے، جن کا ایک بڑا حصہ ان ہی موالی محدثین کے ذریعہ مسلمانوں

---

[1] رجال کی عام کتابوں میں ان لوگوں کے حالات پڑھئے۔

میں منتقل ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ معمولی بے احتیاطی بھی اس راہ میں کم از کم ملوک بنی امیہ کے لئے بے چارے موالی کی دار وگیر کے لئے ایک دینی دستاویز بن جاتی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت عامہ مسلمین کی مزاحمت بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہوتی لیکن علم و فضل کے ساتھ ان کی سیر چشمیاں، حکومت کے ہاتھ میں جو کچھ تھا اس سے ان کی بے نیازیاں، اسی کے ساتھ خالص اسلامی زندگی کے جو نمونے اس طبقے کی طرف سے مسلسل پیش ہو رہے تھے۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ حکومت کو بھی ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ ابن عساکر کی روایت ہے کہ ہارون الرشید کے پاس جعلی حدیثوں کے بنانے کا مجرم ایک زندیق پیش ہوا۔ مجرم نے کہا کہ امیر المومنین میرے قتل کا حکم آپ کس وجہ سے دے رہے ہیں؟ ہارون رشید نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو تیرے فتنوں سے محفوظ کرنے کے لئے میں نے یہ حکم دیا ہے۔ اس پر زندیق نے کہا کہ میرے قتل کرنے سے کیا ہوگا کیونکہ

أَيْنَ أَنْتَ مِنْ أَلْفِ حَدِيْثٍ وَضَعْتُهَا عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّهَا مَا فِيْهَا حَرْفٌ نَطَقَ بِهٖ۔ (تاریخ دمشق ج ۲ ص ۵۴)

ایک ہزار جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف میں منسوب کر چکا ہوں، ان حدیثوں کا کیا کیجئے گا جن میں پیغمبرؐ کا ایک لفظ بھی تو نہیں ہے۔

مطلب اس کا یہ تھا کہ ان جھوٹی اور ... حدیثوں کو مسلمانوں میں میں چلتا کر چکا ہوں، مجھے قتل بھی کردو گے تو کیا ہوگا، حدیثیں تو مسلمانوں میں پھیل چکی ہیں۔ لکھا کہ اس وقت بے ساختہ ہارون کے دل

---

[1] ان پاجیوں کو جب حکومت گرفتار کرتی اور زندگی سے مایوس ہو جاتے تو اس قسم کے شوشے بھی چھوڑ دیتے تھے کہ میں اتنی جھوٹی حدیثیں پھیلا چکا ہوں۔ مقصود اس سے ان کا یہ ہوتا تھا کہ چلتے چلاتے ایک ایسا فقرہ کہہ دو جس سے مسلمانوں میں صحیح حدیثوں کے متعلق بھی بدگمانی پیدا ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ زیادہ تر اس میں بھی یہ کذب بیانی ہی سے کام لیتے تھے۔ واقعہ یہ ہے جیسا کہ اپنی جگہ پر یعنی موضوع حدیثوں کے باب میں آئندہ تفصیل سے بیان کیا جائے گا کہ سند کا قصہ حدیثوں کے ساتھ کچھ ایسا لگا ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ بات کو منسوب کر کے یہ خیال کرنا کہ ان کی گھڑی ہوئی حدیثیں مسلمانوں میں مروج ہو جائیں گی آسان نہ تھا۔ ایسے مقررہ اصول محدثین کے تھے کہ ان کے معیار پر جانچنے کے ساتھ ہی سچ جھوٹ سے الگ ہو جاتا تھا اس کو جعل سازوں کا یہ گروہ بھی جانتا تھا لیکن ان کا مقصود تو صرف مسلمانوں کو دہشت اور بدگمانی کے فتنے میں مبتلا کرنا ہوتا تھا۔ تفصیل ان مسائل کی آگے آرہی ہے۔ یہاں اجمالاً اس لئے اشارہ کر دیا گیا کہ بعض وسواسی دماغوں کے لئے اتنی سی بات بھی بدگمان بن جانے کے لئے کبھی کافی ہو جاتی ہے۔

نے اس فتنے سے جن دو بزرگوں کے سایہ کے نیچے پناہ ڈھونڈھی ان میں ایک، نام عبد اللہ بن المبارک اسی عالم کا تھا جو طبقۂ موالی سے تعلق رکھتے تھے۔ بہرحال ہارون نے بھی اسی لب و لہجہ میں کہا کہ

اَیْنَ اَنْتَ یَا عَدُوَّ اللّٰہِ مِنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ الْفَزَارِیِّ وَعَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الْمُبَارَکِ یَتَخَلَّلَانِھَا فَیُخْرِجَانِھَا حَرْفًا حَرْفًا۔	ارے خدا کے دشمن! تو ہے کس خیال میں۔ ابو اسحاق فزاری اور عبد اللہ بن المبارک ان تمام حدیثوں کو چھلنی میں چھانیں گے اور ایک ایک حرف (تیری جعلی حدیثوں کا) پچھوڑ پچھوڑ کر نکال پھینکیں گے۔
(ابن عساکر ج ۲ ص ۲۶۴)	

اور یہ تھا الموالی کی خدمات کا وہ غیر معمولی وزن کہ عباسی فرمانروا، وہ بھی ہارون الرشید، مَرو کے ایک عجمی غلام مبارک کے لڑکے کے وجود پر فخر کر رہا ہے۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ بقول عباس بن مصعب جیسا کہ حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں نقل کیا ہے:

خَرَجَ مِنْ مَرْوَ اَرْبَعَۃٌ مِّنْ اَوْلَادِ الْعَبِیْدِ مَا مِنْھُمْ اَحَدٌ اِلَّا ھُوَ اِمَامُ عَصْرِہٖ۔ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ الْمُبَارَکِ وَمُبَارَکٌ عَبْدٌ، وَاِبْرَاھِیْمُ بْنُ مَیْمُوْنِ الصَّائِغُ وَمَیْمُوْنٌ عَبْدٌ، وَالْحُسَیْنُ بْنُ وَاقِدٍ وَوَاقِدٌ عَبْدٌ، وَاَبُوْ حَمْزَۃَ مُحَمَّدُ بْنُ مَیْمُوْنِ الْعَسْکَرِیُّ وَمَیْمُوْنٌ عَبْدٌ۔	مَرو کے شہر سے چار آدمی غلاموں کی اولاد میں ایسے نکلے کہ ان میں ہر ایک اپنے وقت کا امام تھا، یعنی عبد اللہ بن المبارک اور مبارک غلام تھے۔ ابراہیم بن میمون الصائغ اور میمون غلام تھے۔ حسین بن واقد اور واقد غلام تھے۔ ابو حمزہ محمد بن میمون العسکری اور میمون غلام تھے۔
(معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۱۹۹)	

گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ اپنے آخری دین کی حفاظت کے لئے "موالی" کی شکل میں قدرت نے ان راستباز مخلص رضا کاروں کا ایک گروہ ہی پیدا کر دیا تھا جس نے ہر چیز سے الگ ہو کر اپنی ساری توانائیوں کو دین کی خدمت پر مرتکز کر دیا تھا۔ تقریباً مسلمانوں کے اکثر شہروں اور آبادیوں کا یہی حال ہے۔ زہری اور عبد الملک کے اس تاریخی مکالمے کے سوا جس کا ابھی ذکر گزرا، ابن صلاح نے زید بن اسلم کے صاحبزادے عبد الرحمٰن کے حوالہ سے تو یہ کلی دعوٰی نقل کیا ہے کہ

لَمَّا مَاتَ الْعَبَادِلَۃُ صَارَ الْفِقْهُ فِي جَمِيعِ الْبُلْدَانِ اِلَى جَمِيعِ الْمَوَالِي اِلَّا الْمَدِيْنَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ خَصَّهَا بِقُرَشِيٍّ فَكَانَ فَقِيْهُ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ سَعِيْدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ غَيْرَ مُدَافِعٍ ۔ (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۶۲)

جب عبادلہ[1] کا انتقال ہوگیا تو سارے اسلامی علاقوں میں علم فقہ کے مرجع و مرکز موالی ہی بن گئے، بجز مدینہ منورہ کے مدینہ منورہ کو اللہ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی کہ اس شہر کا فقیہ ایک قریشی نژاد عبادلہ کے بعد ہوا یعنی سعید بن المسیب جن کو بالاتفاق لوگوں نے مدینہ کا فقیہ تسلیم کیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ دعوی کی اس کلیت میں اغراق کا پہلو پیدا ہوگیا ہو جیسا کہ ابن صلاح نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے اور ابراہیم نخعی، عامر شعبی وغیرہ عربی النسل علماء کا تذکرہ کرکے عبدالرحمٰن کے اس دعوے پر تنقید بھی کی ہے لیکن کلیت نہ سہی اکثریت کا تو کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً لفظ "الموالی" کے اطلاق میں اس وسعت کو اگر پیش نظر رکھا جائے جو اس زمانہ میں لفظ موالی کے استعمال میں پائی جاتی تھی[2]۔

موالی کے اقسام

میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے موالی کا اطلاق ان غیر عربی لوگوں پر ہوتا تھا جو خود یا ان کے آباواجداد

---

[1] عبادلہ ایک اصطلاحی لفظ ہے چار صحابی جو علم قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ میں ممتاز تھے اور ان میں ہر ایک کا نام عبداللہ تھا ان ہی کی جمع عبادلہ بنالی گئی تھی یہ عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ تھے۔

[2] یہ الموالی کا لفظ عربی زبان کا عجیب لفظ ہے، بیسیوں معانی کے ساتھ یہ بھی عربی زبان کے ان الفاظ میں سے ہے جن سے دو متضاد معانی سمجھے جاتے ہیں یعنی اسی مولیٰ کے معنی جہاں غلام کے ہیں وہاں مولیٰ آقا کو بھی کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہنے والے خداوند تعالیٰ کو بھی مولیٰ تعالیٰ کہتے ہیں۔ پھر غلام کی دو قسمیں مولیٰ کے تحت میں داخل ہیں یعنی ایک تو براہِ راست غلاموں کو بھی موالی کہتے ہیں۔ نیز اسلام کی تاریخ کے چند عجائب میں ایک طرفہ یہ ہے کہ آزاد ہونے کے ساتھ ان آزادیوں سے مستفید ہوتے ہوئے جو مفتوح اقوام کے افراد کو اسلام نے دے رکھا تھا بہت جلد ان آزاد ہونے والے غلاموں کی معاشی حالت اتنی بلند ہوجاتی تھی کہ چند ہی دنوں کے بعد غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کرنے لگتے تھے، اسی طرح یہ غلاموں کے غلام جو مولی الموالی کہلاتے تھے اسی طرح آزاد ہوکر غلام خریدتے اور آزاد کرتے۔ اس سلسلہ میں ابن سعد نے ایک لطیفہ نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن حنین جو زہری وغیرہ کے اساتذہ میں ہیں، لوگ عموماً ان کو حضرت عباسؓ کے موالی میں شمار کرتے ہیں حالانکہ درحقیقت حضرت عباسؓ پانچویں درجہ میں ان کے آقا ہیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عباسؓ نے شماس نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا، شماس نے مسحل نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا، مسحل نے مشقب نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا اور مشقب نے حنین نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا تھا مگر بولنے میں لوگ حنین کو حضرت عباسؓ کا مولیٰ کہہ دیتے تھے۔

(ابن سعد ج ۵ ص ۱۲۱)

میں گو زیادہ تعداد تو ان ہی لوگوں کی تھی جنہوں نے یا جن کے خاندان نے غلامی کے بعد آزادی حاصل کی اور اسلام کے عطا کردہ حقوق سے مستفید ہوتے ہوئے حکومت وقت کی بے اعتنائیوں کے باوجود مسلمانوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر لیا تھا لیکن یہ خیال صحیح نہ ہوگا کہ سب ہی غلام اور غلاموں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ ایک گروہ ان میں دوسری قسم کے موالی کا بھی تھا، چونکہ نسلاً عرب قبائل سے ان بے چاروں کا بھی رشتہ نہ تھا۔ اس لئے حکومت کا نقطۂ نظر ان کے ساتھ بھی قریب قریب وہی تھا جو غلاموں کے ساتھ اور غلاموں کی نسل کے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اس نقطۂ نظر کے قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی، وہ جتنا ان کو گرانا چاہتی تھی، اسلام ان کو اسی قدر بلند سے بلند تر کرتا چلا جاتا تھا۔ آپ ہی خیال کیجئے کہ جہاں حال یہ ہو کہ بخارا کا رہنے والا ایک نو مسلم جس کا نام بشیر تھا، بخارا سے بہ تلاش روزگار مسلمانوں کی نئی چھاؤنیوں اور نئی آبادیوں کی طرف رُخ کرتا ہے حالات مساعدت کرتے ہیں، بنی امیہ کے طاغیہ حجاج بن یوسف اس کے پکائے ہوئے کھانے کو پسند کرتا ہے۔ حجاج کے باورچی خانہ میں اس کا تقرر ہو جاتا ہے، کوفہ میں اس طریقہ سے اس بیچارے کو قیام کا موقعہ مل جاتا ہے، ساتھ اس کے اس کا لڑکا ہشیم نامی بھی ہے۔ ہشیم کوفہ کے تعلیمی حلقوں میں آنا جانا شروع کرتے ہیں۔ غریب باورچی اپنے بچے کے اس علمی ذوق کو پسند نہیں کرتا چاہتا تھا کہ مجھ سے طباخی کے کچھ گر سیکھے، یہ اس بچے کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ اسی عرصے میں ہشیم بیمار پڑتے ہیں۔ اسی زمانہ میں واسطے کے قاضی ابو شیبہ کے حلقۂ درس میں ہشیم آمد و رفت رکھتے تھے۔ بیمار ہو جانے کی وجہ سے حلقۂ درس میں شریک نہ ہو سکے تو قاضی صاحب نے ساتھیوں سے پوچھا وہ نوجوان ہشیم کیوں نہیں آرہا ہے؟ لوگوں نے علالت کی خبر دی۔ قاضی پر ہشیم کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اتنا اثر تھا کہ اسی وقت ہشیم کی عیادت کے لئے روانہ ہوئے۔ بشیر باورچی گھر ہی میں تھا، اطلاع دی گئی کہ قاضی ابو شیبہ تمہارے بچے کی عیادت کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ گھبرا کر باہر نکلا۔ واقعی شہر کے قاضی کو دروازے پر کھڑا پایا۔ ان کی خواہش پر اندر لے گیا۔ جب عیادت کر کے قاضی رخصت ہوئے تب بشیر نے ہشیم کو خطاب کر کے کہا کہ

يَا بُنَيَّ قَدْ كُنْتُ اَمْنَعُكَ مِنْ طَلَبِ الْحَدِيْثِ فَاَمَّا الْيَوْمَ فَلَا۔ صَارَ الْقَاضِيْ يَجِيْئُ اِلٰى بَابِيْ مَتٰى اَمَّلْتُ اَنَا هٰذَا ! ؟ (خطیب ج ۱۴، ص ۸۷)

بیٹے ! تجھے علم حدیث کے سیکھنے سے میں روکا کرتا تھا مگر آج کے دن کے بعد نہیں، شہر کا قاضی میرے دروازے پر آنے لگا، مجھے اس کی کہاں امید تھی ؟

اور باورچی کے اسی لڑکے کا ذکر اس وقت تک حفاظِ حدیث کے سلسلہ میں ان الفاظ کے ساتھ کیا جاتا ہے، جیساکہ الذہبی نے ان ہی الفاظ سے ان کا تذکرہ شروع کیا ہے :

اَلْحَافِظُ الْكَبِيْرُ مُحَدِّثُ الْعَصْرِ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۲۹)

حدیث کے بہت بڑے حافظ اپنے وقت کے محدث۔

ثابت ہوا کہ اس باورچی کے لڑکے کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ عبداللہ بن المبارک جیسے محتاط ناقد کو کہنا پڑا :

مَنْ غَيَّرَ الدَّهْرُ حِفْظَهٗ فَلَمْ يَتَغَيَّرْ حِفْظُ هُشَيْمٍ۔ (ص ۲۳۰)

زمانہ یعنی بڑھاپے کی وجہ سے کسی کا حافظہ متاثر بھی ہوگیا ہو لیکن ہُشَیم ان لوگوں میں ہیں جن کے حافظہ میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔

اور یہ تھیں قدرت کی وہ مخفی کاروائیاں جن کے ذریعہ سے اپنے آخری پیغمبر کے متعلقہ معلومات کی حفاظت واشاعت کے لئے غیر معمولی صلاحیتوں کے رکھنے والے دماغوں اور دلوں کو مختلف گوشوں سے اکٹھا کرکرکے اسی خدمت میں ان کو وہ مشغول کررہی تھی۔ حالات ہی ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ جو بڑے بننے اور بڑھنے کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ دنیا میں بڑھنے سے ان کو روکا جاتا تھا تو قدرتاً وہ دین اور دینی علوم کو لے کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ بصرہ کے ایک تابعی بزرگ جن کا نام فرقد تھا اپنے شاگردوں کو خطاب کرکے کبھی فرماتے بھی تھے :

اِنَّ مُلُوْكَكُمْ يُقَاتِلُوْنَكُمْ عَلَى الدُّنْيَا فَدَعُوْهُمْ وَالدُّنْيَا۔ (صفوۃ الصفوہ ابن جوزی ج ۳ ص ۱۹۶)

تمہارے سلاطین تم سے دنیا کے متعلق جھگڑتے اور لڑائیاں کرتے ہیں پس مناسب ہے کہ ان کو اور ان کی دنیا کو ان ہی کے لئے چھوڑ دو

انتہا اس ذوق کی یہ تھی کہ موالی میں وہی نہیں جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا بلکہ جو مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کے اندر بھی اس علم کے طلب اور حصول کا جذبہ بھڑک اٹھا تھا۔

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یانبی اللہ ادع لی اکون عقولا للحدیث ودعاءلہ۔ (ابن سعد ج، ص ۱۶۳ قسم دوم)
اے اللہ کے نبیؐ! میرے لئے دعا فرمایئے کہ حدیث کی سمجھ مجھ میں پیدا ہو جائے اور اس کا ظرف میں بن جاؤں (یعنی حدیثیں مجھے محفوظ ہو جائیں)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں "طلب حدیث" کے ساتھ لوگوں کے دل و دماغ کے متعلق کیا نوعیت تھی۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ بیداری تو بیداری خواب میں بھی اسی کا ذوق ان پر مسلط رہتا تھا۔

لوگ سوچتے نہیں ورنہ جن معلومات کی جستجو اور تلاش میں لوگوں کا یہ حال ہو کہ نہ وقت کی ان کو پرواہ ہوتی تھی نہ مال کی، اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی جو دی جا سکتی تھی، دینے والے دے رہے تھے۔ عبدان جن کا تذکرہ شروع کرتے ہوئے الذہبی نے لکھا ہے کہ الحافظ الامام رحلۃ الوقت، خود اپنا حال بیان کرتے تھے کہ اپنے سینکڑوں اساتذہ میں سے صرف ایوب کی حدیثوں کی تلاش میں

رحلت الی البصرۃ ثمانی عشرۃ مرۃ (تذکرہ ج ۲ ص ۲۳)
شہر بصرہ کا اٹھارہ دفعہ میں نے سفر کیا۔

ابوحاتم رازی جو علل کے امام ہیں، لکھا ہے کہ رحل وھو امرد، یعنی سبزہ آغاز ہونے سے پہلے ہی طلب حدیث میں وطن سے نکل پڑے۔ برسوں سفر میں رہتے، وطن واپس لوٹتے اور پھر روانہ ہو جاتے۔ خود ان کا بیان الذہبی نے نقل کیا ہے کہ

اول ما رحلت اقمت سبع سنین۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۱۳۲)
پہلی دفعہ گھر سے جب طلب حدیث میں نکلا تو سات سال تک سفر ہی میں رہا۔

کہتے تھے کہ شروع میں کتنے میل چلا اس کا خیال رکھا تھا، تین ہزار میل تک تو میں گنتا رہا لیکن پھر گننا چھوڑ دیا۔ پیدل کتنی لمبی لمبی مسافتیں اس راہ میں انہوں نے طے کی تھیں اس کا اندازہ اسی سے کیجئے، خود ہی بیان کرتے تھے کہ

خرجت من البحرین الی مصر ماشیا ثم الی الرملۃ ماشیا ثم الی طرطوس ولی عشرون
بحرین سے مصر پیدل گیا، پھر رملے سے طرطوس کا سفر بھی پیدل ہی کیا۔ اس وقت میری عمر بیس

سنۃ۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۱۳۲) سال کی تھی۔

اٹلس اٹھا کر دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ بحرین (عرب) سے مصر، مصر سے رملہ (فلسطین) اور رملہ سے طرسوس کا فاصلہ کتنے ہزار میلوں کا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس قسم کے بے سنگ میل والے سفر میں کن کن حالات سے لوگوں کو گزرنا پڑتا تھا خصوصًا اس زمانہ میں جب مواصلات کے موجودہ ذرائع سے دنیا محروم تھی۔ ان ہی ابوحاتم رازی نے اپنے ایک سفر کا قصہ یہ بیان کیا ہے، جسے ذہبی نے نقل کیا ہے، میں اسی سے ترجمہ کرتا ہوں۔ ابوحاتم کہتے ہیں:

"میں اور میرے چند رفقاء جہاز سے اترے خشکی پر پہنچنے کے بعد دیکھا تو زادِ راہ ختم ہو چکا ہے۔ کیا کرتے، ساحل سے پیادہ پا ہم لوگ روانہ ہوئے۔ تین دن تک چلتے رہے، لا ناکل شیئا۔ (قطعًا اس عرصہ میں کچھ نہ کھایا) آخر ایک رفیق جو زیادہ سن رسیدہ اور ضعیف العمر تھے بیہوش ہو کر گر پڑے ملاکھ ہم لوگوں نے ان کو جھنجوڑا، ہلایا۔ لیکن کسی قسم کی جنبش اور حرکت ان میں محسوس نہ ہوئی، مجبورًا بے چارے کو اسی حال میں چھوڑ کر آگے بڑھے، تھوڑی دیر چلنے کے بعد چکرا کر آخر میں بھی گر ہی گیا۔ اب ایک رفیق اکیلا رہ گیا۔ ساحل سمندر کے کنارے کنارے یہ سفر ہو رہا تھا، مجھے چھوڑ کر وہ آگے بڑھا۔ دور سے سمندر میں اس کو ایک جہاز نظر آیا۔ دریا کے کنارے جا کر اس نے رومال ہلانا شروع کیا، جہاز والے متوجہ ہوئے اور چند آدمی اس سے اتر کر اس رفیق سے ملے، حال پوچھا۔ پیاس سے اس کا برا حال تھا، پانی کی طرف اشارہ کیا۔ جہاز والوں نے اس کو پانی پلایا، جب کچھ اس کے ہوش بجا ہوئے، تب اس نے کہا کہ میرے اور دو رفیقوں کی خدا کے لئے خبر لیجئے۔ جہاز والے اس کی راہ نمائی میں اس جگہ پہنچے جہاں میں گرا ہوا پڑا تھا۔ منہ پر چھینٹے دیئے گئے، اس وقت مجھ کو ہوش آیا۔ مجھے پانی پلایا گیا، پھر اس بے چارے ضعیف العمر آدمی کے پاس لوگ پہنچے، ان کو بھی ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی۔"

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۲)

رحلات اور اسفار طویلہ کے یہ قصے کیا کسی ایک دو آدمی تک محدود ہیں، جاننے والے جانتے ہیں کہ "رحلت" یعنی طلب حدیث میں سفر کرنا اس علم کے لوازم میں سے تھا جس کے بغیر کوئی محدث محدث بن ہی نہیں سکتا تھا۔ کسی بڑے ممتاز آدمی کا حال اٹھا کر دیکھئے ایک طویل فہرست ان کے رحلات کی آپ کو نظر آئے گی۔ امام بخاری ہی ہیں۔ یہ لکھنے کے بعد کہ بچپن ہی میں امام بخاری نے عبداللہ بن المبارک کی کتابیں زبانی یاد کرلی تھیں، الذہبی نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

رحل مع امه واخته سنة عشرو مائتين بعد ان مرویات بلده من محمد بن سلام و المسندی ومحمد بن یوسف البیکندی و سمع ببلخ من مکی بن ابراهیم وببغداد من عفان وبمکة من المقری وبالبصرة من ابی عاصم و الانصاری وبالکوفة من عبد الله وموسی و بالشام من ابی المغیرة والفریابی وبعسقلان من آدم وبحمص من ابی الیمان وبدمشق من ابی مسهر۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۲)	اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ ۲۱۰ھ ہجری میں سفر کیا، یہ سفر امام نے ان حدیثوں کے سننے کے بعد کیا تھا جنہیں اپنے شہر (بخارا) کے علماء محمد بن سلام، مسندی اور محمد بن یوسف بیکندی سے وہ روایت کرتے تھے۔ امام نے بلخ میں مکی بن ابراہیم سے، بغداد میں عفان سے، مکہ میں مقری سے، بصرہ میں ابوعاصم اور الانصاری سے، کوفہ میں عبداللہ اور موسیٰ سے، شام میں ابوالمغیرہ و فریابی سے، عسقلان میں آدم سے، حمص میں ابوالیمان سے، دمشق میں ابومسہر سے حدیثیں سنیں۔

حالانکہ یہ فہرست قطعاً غیر مکمل ہے، اس میں نہ مدینہ کا نام ہے اور نہ یمن کا اور نہ بہت سے دوسرے شہروں کا، جہاں امام بخاری حدیث ہی کی جستجو میں گئے۔ تاہم اس ناقص فہرست میں بھی آپ کو بخارا اور بیکند (جو امام بخاری کا وطن ہے) اس کے سوا بلخ، بغداد، مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، عسقلان، حمص، دمشق جیسے شہروں کے نام درج ملتے ہیں جن میں ہزارہا ہزار میل کے فاصلے ہیں۔ الخطیب نے امام کے علمی سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

رحل فی طلب العلم الی سائر محدثی الامصار (ج ۲ ص ۱۲۲)	علم کی طلب میں تمام اسلامی شہروں کا امام بخاری نے سفر کیا۔

امام بخاری کے بعد اسی طرح حافظ ابو زرعہ کے تذکرے میں ذہبی ہی لکھتے ہیں کہ حرمین، عراق، شام، جزیرہ، خراسان، مصر میں وہ گھومتے رہے۔ جیسا کہ میں نے کہا، کسی محدث و حافظ کا تذکرہ اٹھا کر دیکھ لیجئے، ان مقامات اور بلاد کی ایک طویل فہرست آپ کو مل جائے گی جہاں ان کی علمی تشنگی ان کو لئے لئے پھرتی تھی۔ غریب الوطنی کی عام صعوبتوں کے سوا جن سے پردیسی مسافر کو بہر حال دوچار ہی ہونا پڑتا ہے۔ اس قسم کے لمبے لمبے طویل سفر اور سفر ہی نہیں بلکہ طلب علم کے لئے چونکہ سفر کیا جاتا تھا اس لئے لازماً ایک ایک جگہ میں ان لوگوں کو مہینوں اور بسا اوقات برسوں بسر کرنے پڑتے تھے۔ آج بھی تعلیمی سفر اختیار کرنے والے طلبہ جو یورپ و امریکہ جاتے ہیں، دو دو چار چار سال بعد وطن واپس ہوتے ہیں تو اندازہ کرنا چاہئے اس زمانہ کا اور طلب علم کے اس حال کا کسی موقعہ پر ذکر آ چکا ہے کہ ایک ایک حدیث کے لئے مدینہ سے مصر کا لوگ سفر اختیار کرتے تھے یا کسی شہر میں سال سال بھر اس لئے پڑے رہے کہ جس سے حدیث کو حاصل کرنا چاہتے تھے وہ وہاں موجود نہ تھے۔ خصوصاً حفاظ کا جو یہ عام دستور تھا کہ روزانہ دس پانچ حدیثوں سے زیادہ نہیں بیان کرتے تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ لوگوں کو ایک ایک استاد کے پاس کتنے دن ٹھہرنا پڑتا ہوگا۔ علی الخصوص ذخیرۂ حدیث کے بڑے سرمایہ داروں کے پاس یحییٰ بن سعید القطان خود اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ صرف ایک استاد کے پاس ان کو دس سال گزارنے پڑے۔ خطیب نے بجنسہ یہ الفاظ ان سے نقل کئے ہیں:

لزمت شعبة عشر سنة (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۳۶) — شعبہ کے پاس میں دس سال تک ٹھہرا رہا۔

مؤطا کے نسخۂ خاص کے راوی قعنبی امام مالک سے یہ الفاظ نقل کیا کرتے تھے کہ

كان الرجل يختلف الى الرجل ثلثين سنة فيتعلم منه (حلیۃ الاولیاء ص ۳۲۰) — آدمی کا قاعدہ تھا کہ ایک ایک استاد کے پاس تیس تیس سال تک آمد و رفت رکھتا تھا، جب علم سیکھتا تھا۔

بظاہر ان الفاظ سے امام مالک نے خود اپنی طرف اشارہ کیا ہے یا ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کا یہ عام حال ہو کہ لوگ ایک ایک استاد کے پاس تیس تیس سال تک آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ خود امام مالک ہی کے متعلق نافع بن عبداللہ کے حوالے سے حلیہ ہی میں یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ

جالست مالکا اربعین سنة او خمسًا و ثلاثین کل یوم ابکر و اھجر و اروح ۔ (حلیة الاولیاء ص ۳۲۰)

میں امام مالک کے پاس چالیس یا پینتیس سال تک بیٹھتا رہا ، روزانہ صبح کو بھی حاضر ہوتا دوپہر کو بھی پچھلے پہر بھی ۔

زہری کہا کرتے تھے :

مسست رکبتی رکبة سعید بن المسیب ثمان سنین ۔ (حلیہ ج ۱ ص ۳۶۴)

سعید بن المسیب کے زانو سے زانو ملا کر میں نے آٹھ سال گزارے ہیں ۔

اور اس پر بھی یہ حال تھا کہ بعض دفعہ جیسا کہ زہری سے لوگ نقل کرتے ہیں کہ

تبعت سعید بن المسیب فی طلب حدیث ثلثة ایام ۔

ایک حدیث کی تلاش میں سعید بن المسیب کا پیچھا میں نے تین دن تک کیا ، غالباً تین دن کے فاصلہ پر کہیں سعید تھے

جن لوگوں کے ذوق جستجو کا یہ حال ہو جیسا کہ عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ اپنے متعلق کہتے تھے کہ ایک قرآنی آیت کے شانِ نزول کی تلاش میں چودہ سال سرگرداں رہا ، آخر اس کا پتہ چلا کر چھوڑا ۔ (فتح القدیر شوکانی ج ۱ ص ۴)

ذرا اس راہ کے وارستہ مزاجوں کے شوق بے پرواکو ملاحظہ فرمائیے ، حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں ایک دلچسپ قصہ نقل کیا ہے ، حاصل جس کا یہ ہے کہ ایک صاحب جن کا نام غالب القطان تھا ، بصرہ کے رہنے والے تھے ، تجارت کا کاروبار کرتے تھے ، تجارت ہی کے سلسلہ میں ایک دفعہ کوفہ پہنچے ۔ اگرچہ حدیث کے باضابطہ طالب العلم نہ تھے لیکن اس علم کا گونہ ذوق رکھتے تھے ۔ خیال گزرا کہ جب تک کوفہ میں قیام ہے ، محدثِ کوفہ اعمش کے حلقہ میں حدیثوں کے سننے کا اگر موقعہ مل جائے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے ۔ یہی سوچ کر اعمش کے حلقہ میں آمد و رفت کرتے رہے ۔ کہتے ہیں کہ کام جس کے لئے آیا تھا ، جب ختم ہو گیا تو جس دن کی صبح کو کوفہ سے روانگی کا ارادہ تھا ، میں نے اس صبح کی رات اعمش ہی کے پاس گزاری ۔ تہجد کے وقت میری بھی آنکھ کھل گئی ، اس وقت اعمش قرآن کی ایک آیت کا

[illegible]

ہونے کی تاریخ کب آتی ہے۔ وہی کہتے ہیں کہ

فَلَمَّا مَضَتِ السَّنَةُ قُلْتُ يَا اَبَا مُحَمَّدٍ قَدْ مَضَتِ السَّنَةُ (جامع ص ۹۹)	جب سال گزر گیا تو میں نے عرض کیا کہ اے ابو محمد! (اعمش کی کنیت تھی) سال گزر گیا۔ (اب وعدہ پورا کیجئے)

آخر اعمش سے اس حدیث کو سن لینے کے بعد وہ گھر واپس لوٹے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس روایت پر مزید کسی اضافہ کی ضرورت ہے۔ حافظ ابو عمرو بن عبدالبر نے محض یونہی کسی عام معمولی تاریخی روایت کی حیثیت سے اس قصہ کا تذکرہ اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے بلکہ باضابطہ مسلسل سند جو غالب قطان پر جاکر منتہی ہوتی ہے اس سند کے ساتھ اس واقعہ کو انہوں نے خود قطان کی زبانی نقل کیا ہے۔ جہاں تک سند کے رُواۃ ہیں میرے خیال میں سب ہی معتبر اور صاحب حیثیت لوگ ہیں۔

اس عہد کے واقعات اس سلسلہ میں جو پیش آئے ہیں سب کا استیعاب مقصود نہیں ہے بلکہ چیدہ چیدہ چند روایتیں میں نے اس لئے درج کی ہیں کہ جس زمانے میں حدیث کے ساتھ قلوب کے تعلقات کی یہ نوعیت ہو، ایک ایک حدیث کے لئے مکانی ہوں یا زمانی ہر قسم کے فاصلے صفر کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ غور کرنا چاہیئے کہ حفظ حدیث کے متعلق جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں کیا کسی حیثیت سے بھی ان پر تعجب و تحیر درست ہو سکتا ہے؟ جب حدیث کے مقابلے میں اس علم کے حاصل کرنے والے کسی دوسرے کام کو کام اور کسی دوسری ضرورت کو ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے تو ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے، اور یہ حال تو ان کی جفاکشی اور وقتی قربانیوں کا تھا۔ اسی راہ میں قربانی کرنے والوں نے جو ملی قربانیاں پیش کی ہیں وہ ان سے کیا کچھ کم تھیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کے ایک استاذ فی الحدیث جن کا نام ہیثم بن جمیل تھا اور بڑے بڑے حفاظ وقت سے شرف تلمذ رکھتے تھے، ان کے اساتذہ میں سفیان بن عیینہ، حماد بن سلمہ، عبداللہ بن المثنی الانصاری جیسے اکابر شریک ہیں۔ بہرحال ان ہی ہیثم بن جمیل کے تذکرے میں خطیب نے لکھا ہے کہ

اَفْلَسَ الْهَيْثَمُ بْنُ جَمِيْلٍ فِيْ طَلَبِ الْحَدِيْثِ مَرَّتَيْنِ (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۵۶)	ہیثم بن جمیل علم حدیث کی طلب میں دو دفعہ افلاس اور دیوالیہ پن کے شکار ہوئے (یعنی ایک پیسہ بھی گرہ میں نہ رہا سب خرچ کر ڈالا)

لہ قال۔ حدثنی ابو وائل عن عبداللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجاء بصاحب الدَّین یوم القیامۃ فیقول اللہ تعالیٰ عبدی عمل الی وانا احق من وفی بالعهد ادخلوا عبدی الجنۃ۔ ۱۲

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سے سن کر حدیث روایت کرتے تھے) چند دنوں کے بعد محسوس ہوا کہ بخاری کئی دن سے درس میں نہیں آرہے ہیں، تلاش ہوئی کہ بیچارے کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ جہاں مقیم تھے ڈھونڈتے ہوئے ہم لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک اندھیری کوٹھری میں پڑے ہیں، بدن پر لباس نہیں ہے (یعنی جس لباس کو پہن کر لوگ باہر نکلا کرتے تھے) دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ

قد نفد ماعندہ ولم یبق معہ شیٔ۔ | جو کچھ ان کے پاس تھا سب ختم ہو چکا کچھ باقی نہ تھا جس سے لباس تیار کرتے۔

آخر ہم لوگوں نے مل کر رقم جمع کی اور خرید کر کپڑا لائے تب پہن کر بخاری پھر ہم لوگوں کے ساتھ درسگاہ آنے جانے لگے۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۳)

یہی حادثہ امام احمد بن حنبل کے ساتھ پیش آیا۔ مکہ معظمہ میں سفیان بن عیینہ کے پاس جس زمانہ میں پڑھتے تھے، ان کے رفقاء کا بیان ہے کہ ایک دن دیکھا کہ خلاف معمول احمد بن حنبل درس سے غائب ہیں، حال دریافت کرنے کے لئے ان کی فرودگاہ پر پہنچے، اندر چھپے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ سارا کپڑا ان کا چوری ہو گیا[1] اور دام بھی گرہ میں نہیں ہیں۔ روایت کے بیان کرنے والے صاحب جن کا نام علی بن الجہم تھا، کہتے تھے کہ میں نے امام کی خدمت میں اشرفی پیش کی، عرض کیا کہ چاہے ھدیۃً قبول فرمائیے یا قرضاً لیجئے۔ لیکن انہوں نے لینے سے انکار کیا۔ تب میں نے کہا کہ معاوضہ لے کر میرے لئے کچھ کتابت ہی کر دیجئے، اس پر راضی ہو گئے۔ علی بن جہم نے بطور تبرک امام کے دست مبارک کے اس مخطوطہ کو رکھ چھوڑا تھا۔ لوگوں کو دکھاتے اور لکھنے کی شان نزول کو بھی اس کے ساتھ بیان کرتے۔ (ابن عساکر ج ۲ ص ۳۷)

امام احمدؒ کے واقعات اس سلسلے میں اتنے ہیں کہ سب کے درج کرنے کی یہاں گنجائش نہیں،

---

[1] جس گھر میں امام صاحب رہتے تھے ایک بوڑھی بھی وہاں رہتی تھی، وہی یہ قصہ بیان کرتی تھی کہ امام احمد بن حنبل کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے کہ پیچھے میں کسی نے کپڑے ان کے چرا لئے، جب امام آئے تو حادثہ کی خبر ہوئی۔ بڑھیا کا بیان ہے کہ اس شخص نے کسی چیز کے متعلق نہیں پوچھا کہ ہیں یا نہیں، صرف ان مسودوں کو دریافت کیا کہ وہ کہاں ہیں، جو طاق پر نگ کر رہ گئے تھے۔

ان کے یمنی استاذ عبدالرزاق لوگوں کو یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ جب احمد بن حنبل میرے پاس احادیث پڑھنے کے لئے، یہاں یمن آئے تو میں نے ان سے کہا کہ یمن کوئی کاروباری ملک نہیں ہے، پھر میں نے چند اشرفیاں پیش کیں لیکن لینے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے، اسی زمانہ میں اسحاق بن راہویہ بھی عبدالرزاق ہی کے پاس امام احمد کے ساتھ حدیث سنا کرتے تھے۔ اسحاق نے ایک طویل قصہ کا ذکر کرتے ہوئے اسی میں بیان کیا ہے کہ ازاربند بن بن کر امام احمد یمن میں اپنی ضرورت ان ہی ازاربندوں کو بیچ کر پوری کیا کرتے تھے۔ دوسروں نے لاکھ کچھ قبول کر لینے پر اصرار کیا لیکن ہمیشہ انکار کر دیا۔ کہتے ہیں کہ جب کام سے فارغ ہو کر یمن سے امام چلنے لگے تو نانبائی کے کچھ روپے حضرت پر رہ گئے، جوتا پاؤں میں تھا اسی کو روپے کی جگہ نانبائی کے حوالہ فرما دیا، خود پیدل روانہ ہوئے، اونٹوں پر بار لادنے والے اور اتارنے والے مزدوروں میں شریک ہو گئے، جو مزدوری ملتی تھی، وہی زادِ راہ کا کام دیتی تھی، ان سارے واقعات کا ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ذکر کیا ہے، دیکھو ج ۲)

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا واقعات میں گو حضرت امام کی سیرچشمی، بلند نظری کی شہادتوں کے عناصر زیادہ شریک ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ جس قسم کی زندگی سے اپنے آپ کو ان بزرگوں نے راضی کر لیا تھا، ان کی طرف محنت و جفاکشی کے جو واقعات بھی منسوب کئے جائیں ان میں شک کرنے کی کیا کوئی وجہ ہو سکتی ہے؟ علم حدیث میں لوگ کہتے ہیں کہ شعبہ بن الحجاج امیر المومنین سمجھے جاتے تھے۔ ہم ان کی سوانح عمری میں پڑھتے ہیں کہ ستر پچہتر کی عمر گزارنے کے باوجود اپنے آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی معاشی فکر میں الجھانا پسند نہ کیا۔ ذہبی نے لکھا ہے:

ما اکل شعبة من کسبه قط (ج ۱ ص ۱۸۴) اپنی کمائی سے شعبہ نے کبھی نہیں کھایا۔

ان کو یہ کرنا چاہیے تھا یا نہ کرنا چاہیے تھا[1]، یہ الگ سوال ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ایسا آدمی حدیث

---

[1] آخر عمر میں شعبہ اپنے طریقہ کار کی خود مذمت کیا کرتے تھے، شاگردوں سے کہتے کہ ہماری طرح نہ بن جانا کہ میں اپنے بھائیوں کے سینے کا بوجھ بنا ہوا ہوں، لکھا ہے کہ حماد اور بشار نامی شعبہ کے دو بھائی تھے، صرافہ کا کام کرتے تھے وہی ان کے اور ان کے اہل و عیال کے مصارف کے متکفل تھے۔ شعبہ کی طرف یہ قول جو منسوب کیا گیا ہے کہ جو طلب حدیث میں مبتلا ہوا فقر و فاقہ میں مبتلا ہوا۔ اس کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ خود اس کے شکار ہوئے، اپنا حال بیان کرتے ہوئے کبھی شعبہ یہ بھی کہتے کہ اسی طلب حدیث کے قصہ میں اپنی والدہ کا طشت سات دینار میں مجھے بیچنا پڑا۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۸۴)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور کیا ہو سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب خود نبوت کے صحبت یافتوں کا فتوی تھا، ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ

"تھوڑی دیر بیٹھ کر دین کے سمجھنے میں (یعنی تفقہ) میں بسر کرنا میرے نزدیک رات بھر (نمازوں میں) جاگنے سے بہتر ہے"

اس باب میں خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثوں کا ایک ذخیرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے، بلکہ خود قرآن میں اسی اصول کی طرف راہ نمائی کی گئی ہے۔ اسی لئے امام شافعی کا تو عام فتوی تھا کہ علم کا حاصل کرنا نفلی نمازوں سے بہتر ہے۔ مصر کے امام ابن وہب امام مالک کے ارشد تلامذہ میں ہیں، وہی کہا کرتے تھے کہ امام مالک کے سامنے میں پڑھ رہا تھا، اتنے میں ظہر یا عصر کا وقت آگیا، کتاب بند کرکے میں (نفل کی) نیت سے اٹھا، امام سمجھ گئے اور فرمانے لگے کہ

["تعجب ہے جس چیز میں تم مشغول تھے کیا اس سے بھی وہ کام زیادہ بہتر ہے جسکو اب کرنا چاہتے ہو"]

پھر فرمایا کہ

"نیت درست ہو تو وہ بہتر ہے، جس میں تم مشغول تھے"

حافظ ابن عبدالبر نے اس قسم کے بیسیوں اقوال صحابہؓ، تابعین اور ائمہ کے نقل کئے ہیں، میری غرض ان کے ذکر سے اس وقت یہ ہے کہ اب وہ غلط ہو یا صحیح، اس سے بحث نہ کیجئے بلکہ یہ دیکھئے کہ جن کے قلوب میں اس علم نے اپنی اتنی گہری جگہ بنالی تھی کہ دنیا تو خیر دنیا ہی ہے وہ فرائض کے سوا سارے دینی مشاغل پر بھی اس علم کی مشغولیت کو ترجیح دیتے تھے۔ جب نوافل میں ان کے استغراق اور یکسوئی کا یہ حال تھا کہ سجدہ میں گئے تو سجدہ ہی میں پڑے ہوئے ہیں، رکوع میں ہیں تو رکوع سے سر اٹھانے کا نام ہی نہیں لیتے، حتی کہ دیکھنے والا بے چارہ اس مغالطہ میں مبتلا ہو جاتا کہ بھول گئے۔ ان ہی لوگوں کے متعلق سوچئے کہ اس علم کی طلب و تلاش میں ان کی کوششوں کی کیا کیفیت ہوگی جو نفلی نمازوں کو اتنا وقت دے سکتا ہو، غور کرنا چاہئے کہ جو چیز ان کی نگاہوں میں ان نمازوں سے بھی بہتر تھی اس کے لئے جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے کیا اس میں کوئی دقیقہ کوشش کا انھوں نے اٹھا رکھا ہوگا؟

حقیقت تو یہ ہے کہ دین ہی جس کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے اس کے نزدیک دینی معلومات کی ظاہر ہے کہ کیا وقعت ہوگی، لیکن جو دین کو ایک واقعہ یقین کر چکا ہو، اسی قسم کا واقعہ جیسے دین کے انکار کرنے والوں کی نگاہوں میں "دنیا" ایک واقعہ ہے، پھر اس دنیا یعنی زندگی کا وہ وقفہ جسے شکمِ مادر سے نکلنے اور شکمِ قبر میں جانے کے دوران گزارتا ہے، اسی زندگی میں نفع پہنچانے والے معلومات کی جستجو اور تلاش میں جب وہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے جس کا تماشا آج ہم ان ممالک میں کر رہے ہیں، جہاں انسانی زندگی اسی وقفہ تک محدود سمجھی جاتی ہے تو آپ کو جد و جہد کے اس سلسلہ پر اور ان کے نتائج پر کیوں تعجب ہوتا ہے جو دینی معلومات کے حاصل کرنے والے بزرگوں کی طرف کتابوں میں منسوب کئے گئے ہیں، بزرگوں کی وہی جماعت جس میں اس یقین کے پیدا کرنے میں پیغمبروں نے کامیابی حاصل کی تھی کہ اسی دو شکمی وقفہ میں انسانی زندگی گھٹ کر ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ آدمی جس زندگی کو چاہتا ہے کہ کبھی ختم نہ ہو، انہوں نے یقین دلایا ہے کہ واقعہ بھی یہی ہے۔ دین چونکہ اسی نہ ختم ہونے والی لامحدود زندگی کے متعلقہ معلومات کا نام ہے، اس لئے زندگی کو لامحدود یقین کرنے والوں میں اس زندگی کے متعلقہ معلومات کے جاننے کی تڑپ اگر پیدا ہوئی تو آپ ہی بتائیے کہ اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا، جس حد تک اس لامحدود زندگی کے یقین کی قوت بڑھتی چلی جاتی تھی، اسی نسبت سے ان معلومات کی تلاش و جستجو کے جذبہ میں شدت پیدا ہو رہی تھی، جن سے اس زندگی کے نفع و ضرر کا تعلق تھا، جن معلومات سے دو شکمی وقفہ والی زندگی کے مشکلات کے حل میں مدد ملتی ہو یا سہولتوں میں اضافہ ہوتا ہو، جب آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے لئے گھسنے والے سمندروں میں گھس رہے ہیں، پہاڑوں کو کھود رہے ہیں اور جو کچھ ان کے امکان میں ہے سب کچھ کر رہے ہیں تو لامحدود زندگی کو واقعہ یقین کرنے والوں کے متعلق جب سنایا جاتا ہے کہ الدین کے یقین و اعتماد کا جو اصلی سرچشمہ تھا اور جس کی زندگی کا ہر پہلو الدین کے لئے نئے انکشافات کی حیثیت رکھتا تھا، ان ہی انکشافات کی راہوں میں انہوں نے وہ سب کچھ لگا دیا جسے وہ لگا سکتے تھے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کے خلاف کسی توقع کے قائم کرنے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نیوز ایجنسیاں اپنے اپنے الفاظ اور اپنی اپنی تعبیر میں اس واقعہ کی خبر اخباروں کو بھیجتی ہیں۔ جو لوگ سیاسی کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں یا تحقیقی اخبار نویسی کا کام کرتے ہیں یا صحیح واقعات کے علم کا جن لوگوں کو ذوق ہوتا ہے وہ بجنسہ ایک واقعہ کی خبر کو مختلف اخباروں میں پڑھتے ہیں اور نیوز ایجنسی کی تعبیروں کو ملانے کے بعد واقعہ کی اصل نوعیت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ لوگ اخباروں کا مطالعہ اسی التزام کے ساتھ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے علم اور ان کے فیصلوں کی نوعیت عام اخبار بینوں سے بھلا کوئی نسبت رکھتی ہے[1]۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں بیان کر چکا ہوں کہ حدیثوں کی تعداد بتاتے ہوئے عام کتابوں میں لاکھوں لاکھوں تک ان کے شمار کو پہنچا دیا گیا ہے۔ جو نہیں جانتے ہیں وہ شاید باور کر لیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جن اقوال و افعال کو یا تقریرات کو منسوب کیا گیا ہے ان کی تعداد لاکھوں لاکھ تک پہنچتی ہے، حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے[2]۔ میں بتا چکا ہوں الحاکم صاحب مستدرک کی یہ شہادت پیش

---

[1] مثلاً بہت سی باتیں کسی ایجنسی کی خبر میں مجمل رہ جاتی ہیں، دوسری نیوز ایجنسی کی خبر میں اسی اجمال کی تفصیل ہوتی ہے بعض دفعہ نامہ نگار میں سلیقہ اس کا نہیں ہوتا کہ گڑ کی بات اور عام باتوں میں تمیز کر سکے لیکن ہوشیار نامہ نگار بھیجی ہوئی خبروں میں اسی کا انتخاب کرتا ہے یا اسی پر زیادہ زور اپنے بیان میں خرچ کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ خبر کی نوعیت کا اظہار ایک ایجنسی کا نامہ نگار کرتا ہے اور دوسرا چھوڑ دیتا ہے۔ جن کی نظر سب پر ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ کس حد تک خبر قابل اعتماد ہو سکتی ہے بلکہ مختلف اخباروں کے پڑھنے سے ان لوگوں کو اس کا بھی فائدہ ہو جاتا ہے کہ بعض بالکل بے بنیاد جھوٹی خبریں اخباروں میں کسی خاص غرض سے جو شائع ہو جاتی ہیں، محتاط اخبار یا ایجنسیاں ان کے ذکر سے پرہیز کرتی ہیں لیکن بعض اخباروں یا ایجنسیوں کو اسی میں مزہ آتا ہے۔

[2] ابن جوزی سے بڑھ کر اس باب میں خود خیال کیجئے کس کا بیان قابل اعتماد ہو سکتا ہے، انہوں نے اپنی کتاب "صید الخواطر" فصل ۱۷۵ میں حدیثوں کے متعلق اس عددی مغالطہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اِنَّهٗ لَوْ جُمِعَ الصَّحِيْحُ وَالْمُحَالُ الْمَوْضُوْعُ وَكُلُّ مَنْقُوْلٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَلَغَ خَمْسِيْنَ أَلْفًا (یعنی صحیح حدیثوں کے ساتھ ان ساری بے بنیاد جھوٹی اور گھڑی ہوئی جعلی حدیثوں کو بھی جمع کر لیا جائے جو کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو وہ بھی پچاس ہزار تک نہیں پہنچ سکتی ہیں) انہوں نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے سارے اسلامی ممالک کا دو دو دفعہ دورہ ان ہی حدیثوں کے جمع کرنے کے لئے کیا لیکن ان کی مسند میں بھی چالیس ہزار حدیثیں پائی جاتی ہیں جن میں دس ہزار مکرر ہیں، بلکہ ابن عساکر سے تو ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مکررات کو حذف کرنے کے بعد مسند احمد کی قوی و ضعیف حدیثوں کی تعداد تیس ہزار تک بہ مشکل پہنچ سکتی ہے۔ (دیکھو الکتانی ج ۲ ص ۲۰۷) دراصل معنوی اور لفظی تکرار کے لحاظ سے (باقی بر صفحہ آئندہ)

کر چکا ہوں کہ اعلیٰ درجہ کی معیاری حدیثوں کی تعداد

لَا یَبْلُغُ عَدَدُھَا عَشَرَۃَ اٰلَافِ حَدِیْثٍ (مثل ص۱) دس ہزار تک نہیں پہنچتی

اور قوی و ضعیف، صحیح و حسن، معیاری غیر معیاری حدیثوں کی تعداد مکررات کو الگ کر لینے کے بعد میرے خیال میں تیس بتیس ہزار سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتی۔ مگر ایک ایک حدیث کو مختلف راویوں سے سننے کا دستور اور یہ کہ جتنے راویوں سے حدیث سنی جاتی تھی، ایک اصطلاح بنالی گئی تھی کہ حدیث کی تعداد بھی وہی قرار پاتی تھی یعنی دس راویوں سے اگر سنی گئی ہے تو وہی ایک حدیث دس حدیث بن جاتی تھی، الذہبی وغیرہ نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ ابراہیم بن سعید الجوہری کے تذکرے میں نقل کیا ہے کہ ایک صاحب جن کا نام جعفر بن خاقان تھا، انہوں نے ابراہیم سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت کی ہوئی ایک حدیث کے متعلق کچھ دریافت کیا، ابراہیم نے اپنی لونڈی (جاریہ) کو بلایا اور کہا کہ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) شاید گننے میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا ہے، معنا یا ماٰلاً جن دو حدیثوں کا مطلب ایک ہی ہے، ابن عساکر نے ان کو بھی مکررات میں غالباً شمار کر لیا ہے اور ابن جوزی نے ان ہی حدیثوں کو مکرر خیال کیا ہے جن کے الفاظ بھی ایک ہی ہیں، اور ابن جوزی کا شمار تو خیر تشدد پسندوں میں ہے لیکن ان کے مقابلہ میں جلال الدین سیوطی جیسے سہولت پسند بزرگ نے جمع الجوامع کے نام سے حدیثوں کے جمع کرنے کا جو آخری کام کیا ہے اور اسی کتاب کی فقہی ترتیب مشہور ہندی محدث علی متقی نے کنز العمال میں کی ہے، دیباچہ میں شیخ علی متقی نے لکھا ہے اس کتاب یعنی کنز العمال کے پڑھنے والوں کے سامنے نہ صرف جمع الجوامع ہی کی کل حدیثیں آجائیں گی بلکہ ایک حصہ ان حدیثوں کا بھی ان کو ملے گا جو جمع الجوامع میں نہیں پائی جاتیں۔ اب دیکھئے کنز العمال کی حدیثوں کے گننے والوں نے بتایا ہے کہ یہ کتاب چالیس ہزار نو سو انسٹھ (۴۰،۹۵۹) حدیثوں پر مشتمل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کنز العمال کا مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے ان کو اندازہ ہوا ہو گا کہ اس میں اب بھی کتنی حدیثیں مکرر رہیں، میرا تو خیال ہے کہ ان مکررات کو اگر حذف کر دیا جائے تو چالیس ہزار کی یہ تعداد گھٹ کر قریب قریب تیس ہزار تک پہنچ جائے تو تعجب نہ کرنا چاہئے۔ کنز العمال کا خلاصہ بحذف مکررات خود علی متقی نے کیا ہے جو مسند احمد کے حاشیہ پر چھپ بھی چکا ہے۔ شمار کرنے سے ثابت ہوا ہے کہ اس میں کل تیس ہزار اور دو حدیثیں درج ہوئی ہیں اور کون نہیں جانتا کہ حدیث کے ان مجامیع یا دائرۃ المعارف میں رطب و یابس ہر طرح کی حدیثیں لے لی گئی ہیں، اسی لئے میرا خیال ہے کہ صحیح اعلیٰ معیاری حدیثوں کی تعداد اگر دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی تو ضعیف و حسن و صحاح سب کو ملانے کے بعد تیس بتیس ہزار سے آگے ان کی تعداد کا بڑھنا مشکل ہے۔ ۱۲

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ([illegible])

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

اور نہایت عمدہ پکی ہوئی روٹیاں اس سے تیار ہوئیں"۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۰)

خلاصہ یہ ہے کہ صحیح واقعات سے واقفیت کے لئے جیسے اس زمانے میں ہر قسم کی نیوز ایجنسیوں اور ہر طرح کے اخباروں کا مطالعہ ناگزیر ہے، محدثین بھی یہی سمجھتے تھے کہ سچی روایتوں کو جھوٹی روایتوں سے جدا کرنے کے دوسرے ذرائع کے ساتھ ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہر طرح کے راویوں سے حدیثوں کو سننے کی کوشش کی جائے۔ حافظ ابو عمرو بن عبدالبر نے ایوب سختیانی کے حوالے سے یہ تجربہ کی بات نقل کی ہے کہا کرتے تھے

"اپنے استاذ کی غلطیوں سے تم اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ دوسروں کے پاس بھی جاکر نہ بیٹھو"۔ (ص ۹۹ جامع)

بہر حال حدیثوں کی تعداد میں اضافہ کی وجہ بھی اور ایک ایک محدث کے سینکڑوں اساتذہ کا نام کتابوں میں جو لیا جاتا ہے، اس کی وجہ بھی محدثین کا یہی مذاق تھا یعنی جب تک سو سو طرق سے حدیث ان تک نہ پہنچی ہو، اس وقت تک اس حدیث میں اپنے آپ کو یتیم قرار دیتے ان کے اساتذہ کی کثرت کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ شعبہ جو اپنی تسلی کے لئے ہر حدیث کا بیس دفعہ سننا ضروری قرار دیتے تھے، ان کے کل اساتذہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی صحبت یافتہ بزرگوں یعنی تابعین میں ان کے استاذوں کی تعداد جیسا کہ ذہبی نے لکھا ہے کہ

سَمِعَ مِنْ اَرْبَعِ مِائَةٍ مِّنَ التَّابِعِیْنَ۔ تابعین میں سے جن جن استاذوں سے شعبہ نے حدیث سنی تھی، ان کی تعداد چار سو ہے۔ (تذکرہ ج ا ص ۱۸۲)

محدثین کے زہد و تقوی کی چند مثالیں

مقصود اس طول طویل گفتگو سے یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے تن من دھن سب کو دین کیلئے مختص کر دیا تھا، یہی شعبہ نماز میں جن کے سجدوں اور رکوع کی وہ کیفیت تھی، ذہبی ہی نے لکھا ہے کہ باوجود اس جفاکشی کے صائم الدہر رہتے تھے، یعنی ہمیشہ روزے رکھتے تھے، دیکھ کر لوگوں کو رحم آتا، جلد بدن کی خشک نظر آتی تھی۔ بھلا سوچئے تو جن لوگوں کا یہ حال ہو کہ پوچھنے والے نے پوچھا، اب پیرانہ سالی میں آپ کے مشاغل کی نوعیت کیا رہ گئی ہے تو جواب میں بولے کہ بھائی صرف ایک رکعت

میں سورۂ بقرہ پڑھ لیتا ہوں اور مہینے میں اب تین روزوں یعنی ایام بیض کے روزوں سے زیادہ رکھا نہیں جاتا۔ ابواسحاق السبیعی کے حال میں ذہبی نے اس کا تذکرہ کیا ہے جن کے اساتذہ میں اڑتیس تو صرف صحابی ہیں (ج ا ص ۱۰۸) آخر اسی عہد کے محدثین میں جب ایسے لوگ بھی تھے، مثلاً ثابت البنانی کے متعلق لکھا ہے کہ

"دن رات کے چوبیس گھنٹوں کے اندر معمول تھا کہ قرآن ختم کر لیتے تھے اور ہمیشہ صائم الدہر رہتے (ج ا)

سلیمان تیمی بھی صائم الدہر تھے، عموماً صبح کی نماز عشاء کے وضو سے پڑھتے تھے، نفل کی نمازوں میں ان کا بھی حال یہی تھا کہ ستر دفعہ سے کم سجدے میں تسبیح نہ پڑھتے تھے۔ (تذکرہ ج ا ص ۱۴۲)

اس عہد کے بزرگوں کے عبادات و ریاضات کی تفصیل کے لئے حلیۃ الاولیاء، اور صفوۃ الصفوہ وغیرہ پڑھنی چاہئے۔ نسبتاً ان میں جن لوگوں کو عافیت پسند اور آسائش و آرام، فراغت و رفاہیت کی زندگی بسر کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ بڑے خوش خوراک خوش پوشاک تھے لیکن ان کا حال یہ تھا، مثلاً امام نسائی کے متعلق ذہبی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ بڑے وجیہ و شکیل آدمی تھے، برود نوبیہ (ایک قسم کی قیمتی چادر تھی) اور سبز دوشالہ کو پسند کرتے تھے، لکھا ہے کہ

"کھانے میں نسائی زیادہ تر بڑے قد والے مرغ کو پسند کرتے تھے، جو خاص کر ان کے لئے خریدے جاتے تھے اور ان کو خصی کر کے خوب فربہ کر لیا جاتا تھا۔" (ص ۲۴۱)

لیکن باوجود ان تمام باتوں کے محمد بن مظفر بیان کرتے تھے کہ

"میں نے مصر (جہاں امام نسائی نے قیام اختیار کر لیا تھا) وہاں کے سارے علماء اور شائخ کو پایا کہ وہ امام نسائی کی عبادت و ریاضت جس کا سلسلہ شب و روز جاری رہتا تھا، تعریف کرتے تھے۔" (ص ۲۴۲)

ان کے دینی تصلب کے لئے یہی کیا کم ہے کہ محض حق گوئی کی وجہ سے گویا ان کو شہید ہونا پڑا[1]۔ کہتے

[1] یعنی لکھا ہے کہ مصر سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے امام دمشق میں ٹھہرے، عام طور پر خوارج کا اس زمانہ میں شام کے علاقوں میں زور تھا، جامع مسجد میں کسی نے پوچھ لیا کہ آپ بڑے محدث ہیں، امیر معاویہؓ کی تعریف میں بھی تو کچھ حدیثیں بیان کیجئے، باوجودیکہ شام والوں کے عقائد سے امام نسائی واقف تھے، اس باب میں ان کا جو علم تھا اس کو چھپانا استبنی اور تدین کے خلاف معلوم ہوا، بھری مجلس میں کہہ دیا کہ امیر معاویہؓ کے فضائل کیا پوچھتے ہو؟ (باقی بر صفحہ آئندہ)

ہیں کہ خواجہ **حسن بصری** بھی لطیف غذاؤں کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ ابن سعد نے حمید کا قول نقل کیا ہے، کہتے تھے کہ

مَاشَمَمْتُ مَرِقَةً قَطُّ اَطْيَبَ مِنْ مَرِقَةِ الْحَسَنِ (ابن سعد ج ۷ ص ۱۲۱)

حسن بصری کے شوربے سے زیادہ خوشگوار خوشبو میں نے کسی دوسرے آدمی کے شوربے میں نہیں سونگھی۔

یہ بھی اسی میں ہے کہ گوشت کا روزانہ آپ کے دسترخوان پر رہنا ضروری تھا، لیکن زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت مجاہدہ میں جو ان کا حال تھا ان سے کون ناواقف ہے، ابن جوزی نے بیس جزوں میں ان کے حالات لکھے ہیں، اسی سے اندازہ کیجئے۔ یوسف بن اسباط جیسے آدمی کا بیان ہے کہ

"تیس سال سے یہ شخص ہنسا نہیں ہے اور چالیس سال اس حال میں گزارا کہ اس عرصے میں کسی سے مذاق نہ کر سکے۔" (صفوہ ج ۳ ص ۱۵۶)

روتے رہتے تھے، لوگ پوچھتے تو کہتے کہ معاملہ ایسے سے آپڑا ہے جسے کسی کی کوئی پروا نہیں ہے، کون جانے کہ کل میں آگ میں نہ جھونکا جاؤں گا (صفوہ ج ۳ ص ۱۵۶)

حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز کے خوف کو دیکھ کر یزید بن حوشب کہا کرتے تھے کہ

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے لئے حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز کے سوا اور کوئی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔"

یا **امام مالک** ہی ہیں، کھانے پینے، رہنے سہنے میں ان کا نقطہ نظر عام طور پر مشہور ہے، ہمیشہ قیمتی لباس زیب تن فرماتے، عطر اور خوشبو میں ڈوبے رہتے، ان کے دربار کے رعب اور وقار کو دیکھ کر لوگ کہا کرتے تھے کَاَنَّهٗ بَابُ اَمِيْرٍ (کسی امیر آدمی کی ڈیوڑھی ہے)۔ آپ کا بھی معمول تھا کہ گوشت کے بغیر کھانا تناول نہیں فرماتے تھے۔ اور اپنے اس ذوق پر اتنا اصرار تھا کہ کسی دن اگر گوشت کیلئے

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) معاملہ ان کا برابر سرابر بھی ہو جائے تو کیا تمہارے خوش ہونے کیلئے یہی کافی نہیں ہے نتیجہ جو ہو سکتا تھا وہی ہوا کہ خوارج جن سے مسجد بھری پڑی تھی ان پر ٹوٹ پڑے اور بے تحاشا مارنا شروع کیا۔ لکھا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ شرمگاہ اور اندرونی بیضوں کو لاتوں سے لوگوں نے اتنا کچلا کہ اس کی تکلیف سے جانبر نہ ہو سکے۔ دمشق سے کسی طرح مکہ تو ان کو پہنچا دیا گیا لیکن مکہ پہنچ کر وفات ہوگئی۔ (ذہبی ج ۲ ص ۲۴۳)

پیسے نہ ہوتے اور اس کے لئے گھر کی کوئی چیز بیچنی پڑتی تو لکھا ہے کہ یَفْعَلُ وہ چیز بیچ کر گوشت خریدتے)۔ (الدیباج المذہب ص ۱۹) ہر جمعہ کو دستور تھا:

كَانَ يَاْمُرُ خَبَّازَهُ سَلَمَةَ اَنْ يَّعْمَلَ لَهُ وَلِعِيَالِهِ طَعَامًا كَثِيْرًا۔ (ص ۱۹)

سلمہ نامی باورچی جو آپ کا تھا اس کو حکم دے رکھا تھا کہ امام اور امام کے گھر والوں کے لئے بہت زیادہ کھانا تیار کرے۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے ان کے علم وعمل، تقویٰ و دیانت کے جو گہرے نقوش امت کے قلوب پر قائم ہیں کیا وہ قیامت تک مٹ سکتے ہیں۔ اللہ اللہ بارگاہِ رسالت پناہی ﷺ کے ساتھ جس کی نیازمندیوں اور ادب شناسیوں کا یہ حال ہو، عبداللہ بن مبارک کی یہ چشم دید شہادت ہے، فرماتے ہیں کہ

"امام مالک ہم لوگوں کو حدیث پڑھا رہے تھے، بچھو ان کے کپڑوں میں کسی طرح گھس گیا تھا، نے سولہ دفعہ ڈنک مارے، امام مالک کا چہرہ ہر نیش پر متغیر ہو کر زرد پڑ جاتا تھا لیکن حدیث جس طرح بیان کر رہے تھے بیان کرتے رہے، درمیان میں اس کے سلسلہ کو نہ توڑا۔ جب درس ختم ہو گیا اور لوگ ادھر ادھر ہو گئے تب میں نے عرض کیا آج آپ کا یہ کیا حال ہو رہا تھا تب وجہ بیان کی اور فرمایا کہ اِنَّمَا صَبَرْتُ اِجْلَالًا لِحَدِيْثِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے احترام کی وجہ سے میں صبر کئے بیٹھا رہا۔" (دیباج ص ۲۲)

دوسری کتابوں میں ہے کہ درس سے فارغ ہونے کے بعد اندر تشریف لے گئے، کپڑے اتارے تب بچھو نکالا گیا۔ باہر آ کر ابن مبارک سے چہرے کے تغیر کی وجہ بیان کی۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات کا تذکرہ اس طبقہ کے متعلق کیا جاتا ہے جو حدیثوں کی حفاظت و اشاعت کا صحابہ کے بعد ذمہ دار بن لیا تھا، کیا یہ صرف گزر جانے کی بات ہے؟ پیغمبر اور پیغمبر کی حدیثوں کا جس کے دل میں اتنا احترام ہو کہ بچھو ڈنک پر ڈنک مارتا چلا جا رہا ہے لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنا رہا ہوں، سنانے والا صرف اس خیال سے اپنی جگہ سے ہلتا بھی نہیں۔

حفاظِ حدیث کے اس گروہ میں جنہیں وسعت عطا کی گئی تھی خود امام بخاری بھی ہیں۔ بخاری میں

ان کی کافی جائداد تھی اور متعدد پن چکیاں ان کی چلتی تھیں، وسیع پیمانے پر تجارتی کاروبار بھی کرتے تھے جس میں ایک ایک دفعہ میں دس دس ہزار کا نفع ہوتا تھا لیکن بایں ہمہ صرف رمضان میں ان کے مجاہدے کا یہ حال تھا کہ علاوہ تراویح کے پچھلی رات کو نصف یا ایک تہائی قرآن تہجد میں ختم کرتے گویا ہر دوسرے یا تیسرے دن قرآن ختم ہو جاتا تھا، اور یہ اس تلاوت کے سوا تھا جو دن کو روزہ کی حالت میں کرتے تھے۔ دستور تھا کہ دن کو قرآن کو شروع کرتے اور افطار کے وقت تک ختم ہو جاتا تھا۔ امام بخاری کے ساتھ بھی کہتے ہیں امام مالک ہی کے قریب قریب حادثہ پیش آیا، امام مالک تو حدیث پڑھا رہے تھے اس وقت بچھونے کاٹا تھا۔ امام بخاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے شاگردوں میں سے کسی نے باغ میں حضرت کی دعوت کی تھی اتنے میں ظہر کا وقت آگیا، فرض سے فارغ ہو کر نفل میں مشغول ہوئے کہ عین نماز میں بھڑ نے کاٹنا شروع کیا لیکن نماز نہ توڑی۔ جب سلام پھیرا تو لوگوں سے کہا کہ دیکھو میرے کرتے میں کوئی چیز تو نہیں ہے، دیکھا گیا تو بھڑ برآمد ہوئی۔ کئی جگہ اس کاٹنے کی وجہ سے ورم ہو گیا تھا۔ پوچھا گیا کہ نماز آپ نے توڑی کیوں نہیں؟ فرمایا کہ

كُنْتُ فِي سُورَةٍ فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُتِمَّهَا — میں ایک سورہ کی تلاوت میں مشغول تھا جی یہی چاہا کہ اس کو ختم کر لوں۔

(تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۳)

اور میں ان قصوں کو کہاں تک بیان کروں، ان کی کوئی حد و انتہا بھی ہو۔ میرا تو خیال ہے کہ جن بزرگوں کے متعلق سمجھا گیا ہے کہ وہ کچھ غیر معمولی طور پر خوش خوراک خوش پوشاک تھے، ان کی غرض بھی یہی تھی کہ اس ذریعہ سے کام زیادہ قوت اور زیادہ بشاشت کے ساتھ انجام پا سکتا ہے خیال تو کیجئے کہ راتیں جن لوگوں کی اس طرح گزرتی تھیں جیسا کہ امام بخاری ہی کے متعلق ان کے اوراق (مسودہ) نویس محمد بن ابی حاتم کا بیان ہے کہ

"سفر میں امام بخاری کے ساتھ میرا قیام اسی کمرے میں عموماً ہوتا تھا جس میں امام آرام فرماتے تھے، دیکھا کرتا تھا کہ رات کو جب ہم لوگ سو رہتے تو امام بخاری بار بار اٹھ اٹھ کر چقماق سے چراغ جلاتے اور لکھی ہوئی حدیثوں پر کچھ علامت بناتے پھر سو رہتے۔ ایک ایک رات میں پندرہ سے

بیس دفعہ تک میں نے دیکھا ہے کہ اٹھتے ہیں اور لیٹتے ہیں، پھر اٹھتے ہیں اور لیٹتے ہیں، میں عرض کرتا کہ جس وقت آپ اٹھتے ہیں مجھے اٹھایا کیجئے تو فرماتے کہ میاں تم جوان آدمی ہو، تمہاری نیند کو میں خراب کرنا نہیں چاہتا۔" (ص ۱۴)

اس قسم کی محنت اور جفاکشی کے لئے خود ہی سوچنا چاہئے کہ کتنی غیر معمولی توانائی کی ضرورت ہے، ایک دلچسپ لیکن غیر معمولی نتائج کا حامل اسی سلسلے کے بزرگوں میں **وکیع بن الجراح** کا وہ وقت نامہ ہے جسے خطیب نے وکیع کے صاحبزادے سفیان بن وکیع کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ یہ وکیع صرف حدیث ہی کے نہیں بلکہ فقہ کے بھی امام ہیں، حنفیوں کو اس پر فخر ہے کہ وکیع زیادہ تر امام ابوحنیفہ کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر فتوی دیا کرتے تھے۔ سفیان ثوری کے تلمیذ خاص سمجھے جاتے ہیں عبداللہ بن مبارک، احمد بن حنبل، یحیی بن معین، علی بن مدینی وغیرہم اکابر کے وکیع استاذ ہیں، امیر گھرانے کے آدمی تھے، صرف والدہ سے لکھا ہے کہ دس لاکھ درہم وراثت میں ان کو ملے تھے۔ بہرحال چوبیس گھنٹے کا نظام اوقات آخر زمانے میں ان کا کیا تھا وہ سنئے ان کے صاحبزادے کہتے تھے:

میرے والد صائم الدہر تھے، قاعدہ ان کا یہ تھا کہ صبح سویرے (نماز صبح سے فارغ ہونے کے بعد) درس حدیث کے حلقہ میں تشریف لاتے، حدیث کے طلبہ کو پڑھاتے رہتے تا آنکہ دن کافی چڑھ جاتا، حلقہ سے اٹھ کر گھر تشریف لاتے اور سو جاتے، ظہر کے وقت تک سوتے اس کے بعد ظہر کی نماز کے لئے اٹھتے، نماز سے فارغ ہو کر اس سڑک کی طرف چلے جاتے جدھر سے پانی بھرنے والے بہشتے پکھالیں بھر بھر کر شہر کی طرف لاتے تھے اور ہر ایک سے دریافت کرتے کہ قرآن اس کو کتنا یاد ہے، جسے یاد نہ ہوتا اس کو قرآن کی اتنی سورتیں یاد کراتے جو نماز پڑھنے کے لئے کافی ہوں، یہ کام عصر کے وقت تک کرتے، عصر کی نماز اپنی مسجد میں ادا فرماتے اور نماز کے بعد وہیں بیٹھ کر قرآن کا درس دیتے، کچھ وقت بچتا اسے اللہ کی یاد میں گزارتے۔ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لاتے تب افطار کا کھانا آپ کے آگے رکھا جاتا، قریب دس رطل (گویا پانچ سیر) سے کم مقدار مجموعی طور پر کھانے کی نہ ہوتی، کھانے کے بعد آپ کے سامنے نبیذ کا قرابہ

ظاہر ہے کہ دن بھر روزہ رکھنے کی وجہ سے جو ضعف پیدا ہو جاتا تھا اسی کی تلافی رات کو نبیذ سے فرماتے تھے، کیونکہ نبیذ کو نشہ آور عرق قرار دینا تو تجربہ سے خواہ مخواہ بدگمانی میں مبتلا ہو کر ایک دعویٰ کر بیٹھنا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ کھجور اور انگور سے جو عرق نبیذ کی شکل میں حاصل کیا جاتا تھا اس سے کافی قوت پیدا ہوتی تھی اسی لئے تو وکیع نبیذ کے قرابے کو سامنے رکھ کر رات کی نماز پڑھا کرتے تھے، جہاں کچھ سستی محسوس ہوتی ایک پیالہ چڑھا لیتے تھے، جب وہ ختم ہو جاتا تو سو رہتے تھے۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ وکیع ہی کے متعلق الذہبی نے جس واقعہ کا ذکر بطور ایک ظریفانہ لطیفہ کے کیا ہے مجھے تو ظرافت سے زیادہ اس میں حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے، لکھا ہے کہ وکیع ذرا لحیم شحیم بھاری بدن کے آدمی تھے، جب مکہ پہنچے اور سرخیل صوفیہ فضیل بن عیاض سے ملاقات ہوئی تو ان کی فربہی کو دیکھ کر فضیل نے کہا کہ میں نے تو سنا ہے کہ تم راہب العراق ہو پھر یہ فربہی کیسی؟ جواب میں وکیع نے فرمایا:

هٰذَا مِنْ فَرَحِيْ بِالْاِسْلَامِ۔ — اسلام کی وجہ سے نشاط کی جس کیفیت میں رہتا ہوں، یہ اس کا نتیجہ ہے۔

(تذکرہ ج ۱ ص ۲۸۳)

واللہ اعلم کہ ان کا واقعی مطلب کیا تھا لیکن میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ آدمی اپنے جسم کی بھی اگر نگرانی سے غفلت نہ اختیار کرے اور محنت و مشقت کا جو بار اس پر ڈالا جائے اس کی تلافی عمدہ اور لطیف غذاؤں سے کرتا رہے تو جن ذہنی بے چینیوں اور دماغی الجھنوں سے اسلام آدمی کو نجات عطا کر کے روحانی سکون بخشتا ہے ان دونوں باتوں کا مجموعی اثر وہی ہونا چاہئے جس کا وکیع کے وجود میں مشاہدہ کیا گیا تھا۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں نے جیسا کہ عرض کیا، وکیع کے وقت نامے سے اور بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو اسی کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے بزرگوں کی ساری زندگی مقررہ اوقات کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ یہ ان کے ضبطِ اوقات ہی کا نتیجہ تھا کہ ان علمی مشاغل اور مجاہدات

کے ساتھ جو بجائے خود حیرت انگیز ہیں وہ علم کا کام اور کیسا کام انجام دے سکتے تھے۔ بعض لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ جن لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اتنی نمازیں پڑھتے تھے اور اتنی مختصر مدت میں قرآن ختم کرتے تھے، آخر ان کو ہزارہا ہزار حدیثوں کے یاد کرنے کا موقع کیسے مل جاتا تھا، لیکن سمجھا نہیں گیا، پہلی بات تو یہی ہے کہ اپنے اوقات عزیز کو لایعنی مشاغل میں جو صرف کرنے کے عادی ہیں وہ ان لوگوں کے اوقات کی برکتوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے تھے جو اپنی ایک ایک سانس کی قیمت حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ آخر عام لوگوں کا کیا حال ہے، تھوڑا وقت معاشی کاروبار میں وہ ضرور لگاتے ہیں لیکن اس کے بعد کھیل تماشوں، سینمابینی، تاش بازی اور اسی قسم کی مختلف بازیوں میں جتنا وقت بے کار وہ خرچ کر دیتے ہیں اگر اسی میں وہ کام کرنے کا تجربہ کریں تو خود ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ جو کچھ ان بزرگوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آئے۔ ماسوا اس کے محدثین کی زندگی کے دو مستقل دور تھے، ایک زمانہ ان کا طلب حدیث کا ہوتا تھا، گزر چکا کہ اس زمانہ میں عہدِ صحابہ اور اس کے بعد بھی سمجھا جاتا تھا کہ نفلی عبادات پر علمی اشتغال کو ترجیح دینا چاہئے۔ اس سلسلے میں متعدد شہادتوں کا تذکرہ کر چکا ہوں، اسی کا نتیجہ تھا کہ جن سے نفلی عبادات کا ترک بالکلیہ ممکن نہ ہو سکتا تھا وہ اپنے اوقات خصوصاً اپنی راتوں کو چند حصوں پر تقسیم کر دیتے تھے۔ عمرو بن دینار جو سفیان وشعبہ وغیرہ کے استاذ اور ابن عباسؓ وابن عمرؓ کے شاگرد ہیں ان کے حال میں لکھا ہے کہ

> رات کو انھوں نے چند حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک ثلث تو نیند کے لئے تھا، دوسرے ثلث میں وہ حدیثیں یاد کرتے تھے اور تیسرے ثلث میں نمازیں پڑھتے تھے۔" (جامع ص ۱۰۷)

اور طلبِ حدیث کا دور جب گزر جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ حدیث کے ان حافظوں کو اب حدیث کے یاد کرنے کے لئے وقت دینے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ رات ان کی فارغ ہو جاتی تھی، البتہ دن کو شاگردوں کے سامنے اپنی یاد کی ہوئی حدیثوں کو دہراتے تھے اور اسی سے ان کی یاد تازہ رہتی تھی۔ بڑے بڑے حفاظ کا تو یہ حال تھا کہ ان کا حافظہ بھی غیر معمولی طور پر قوی تھا، اسی لئے اس قسم کے حضرات درس

حدیث کے وقت اپنے ہاتھ میں کتاب کبھی نہیں رکھتے۔ کتابوں میں پڑھئے اس قسم کے فقرے مثلاً

لَمْ یُرَ فِی یَدِ سُفْیَانَ بْنِ عُیَیْنَةَ وَالثَّوْرِی وَشُعْبَةَ وَوَکِیْعٍ کِتَابٌ قَطُّ

سفیان بن عیینہ اور سفیان ثوری اور شعبہ و وکیع کے ہاتھوں میں کتاب کبھی نہیں دیکھی گئی۔

اور

مَا رُؤِیَ لِوَکِیْعٍ کِتَابٌ قَطُّ وَلَا لِهُشَیْمٍ وَلَا لِحَمَّادٍ وَلَا لِمَعْمَرٍ۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۴۷۵)

نہ وکیع ہی کے ہاتھ میں کبھی کتاب دیکھی گئی اور نہ ہشیم کے ہاتھ میں نہ حماد کے ہاتھ میں اور نہ معمر کے ہاتھ میں۔

یہ تو غیر معمولی حافظہ رکھنے والے بزرگوں کی عام عادت تھی، باقی جن لوگوں کی قوت یادداشت ایسی نہ تھی پڑھانے کے وقت اپنے ہاتھوں میں وہ کتاب رکھتے تھے اور جن بیچاروں کو درس کا موقعہ میسر نہ آتا تو گزر چکا کہ مکتب خانوں کے بچوں کے سامنے یا عام غربا کے مجمع میں جا کر اپنی حدیثوں کو دہراتے تھے۔ بہرحال وکیع کے نظام الاوقات کا سب سے زیادہ عبرت انگیز جز، وہ ہے کہ سقوں کی گزرگاہ میں پہنچ کر ان کو قرآنی سورتیں یاد کراتے تھے۔ آج کسی مولوی کو کسی قصبہ یا شہر میں معمولی سا امتیاز بھی حاصل ہو جاتا ہے تو وہ بیچارہ خدا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستباز خادموں کو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ وکیع ہیں وہی وکیع، امام فن رجال یحییٰ بن معین جن کے متعلق کہتے تھے کہ میری آنکھوں نے ان سے بڑا آدمی نہیں دیکھا۔ یہی دعویٰ امام احمد بن حنبل کا بھی تھا کہ علم میں وکیع جیسا آدمی میری نظر سے نہیں گزرا۔ امام احمد کی طرف یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے:

مَا رَأَتْ عَیْنِی مِثْلَهُ قَطُّ یَحْفَظُ الْحَدِیْثَ جَیِّدًا وَیُذَاکِرُ بِالْفِقْهِ فَیُحْسِنُ مَعَ وَرَعٍ وَاجْتِهَادٍ وَلَا یَتَکَلَّمُ فِی اَحَدٍ۔

(خطیب ص ۴۷۷)

وکیع جیسے آدمی کو میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا، حدیثیں بھی ان کو خوب یاد تھیں اور فقہی مسائل پر خوبی کے ساتھ بحث کرتے تھے، (ان علمی فضائل کے ساتھ) ان میں پارسائی اور عبادت میں جد و جہد کی خصوصیت بھی پائی جاتی تھی، وہ کسی پر اعتراض اور نکتہ چینی بھی نہیں کرتے تھے۔

لیکن جو اپنے وقت کا سب سے بڑا امام فقہ میں بھی تھا اور حدیث میں بھی وہ بچیوں کو قرآن کی ابتدائی سورتوں کے سکھانے کو بھی اپنی زندگی کا ایک فرض قرار دیئے ہوئے تھا، ایسے ہی آدمی کے گھر میں یہ ہو سکتا تھا جیسا کہ ان کے صاحبزادے ابراہیم کا بیان ہے:

"میرے والد تہجد کی نماز کے لئے جس وقت اٹھتے تھے تو ان کے سارا گھر اس نماز کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا۔ حتی کہ گھر میں حبشن چھوکری تک تہجد پڑھتی تھی۔" (خطیب ج ۱۳ ص ۳۷۱)

بہرحال ان چیزوں کو کہاں تک لکھوں، غرض یہ تھی کہ صحاح ستہ کے مصنفین سے پہلے اور عہدِ صحابہؓ کے بعد حدیث کی حفاظت و اشاعت کا کام ڈیڑھ سو سال کے اس درمیانی وقفہ میں جن لوگوں کے سپرد رہا خود ان کا اور جس ماحول میں وہ تھے صحیح واقعات کی روشنی میں اس ماحول کا ایک سرسری اجمالی خاکہ بقدرِ ضرورت لوگوں کے سامنے آجائے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آپ کے سامنے اس وقت تک پیش کیا جا چکا ہے ان شاء اللہ اس مقصد کے لئے وہ کافی ہے، اب اسی کے ساتھ اور بھی چند چیزوں کو اپنے سامنے رکھ لیجئے، اگرچہ ضمناً ان کی طرف بھی اشارہ کرتا چلا آیا ہوں۔

حدیث کے سلسلہ میں تین ضروری مقدمات

(۱) یاد رکھنا چاہئے کہ واقعات کا یاد رکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ اقوال و ملفوظات کا۔ واقعات کی حالت تو یہ ہے کہ شاید ہی کوئی آدمی ہوگا جس کے حافظہ میں ہزارہا واقعات کی یاد تازہ نہ ہو، کم از کم وہی واقعات جو اس شخص کے ساتھ گزرے ہوں، ہوش سنبھالنے کے بعد صبح و شام لوگوں کے سامنے واقعات گزرتے رہتے ہیں اور وہ یاد رہتے ہیں، ان کے یاد کرنے کے لئے حافظہ پر زیادہ بار ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس فطری عام قاعدے کے ساتھ اس کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے جیسا کہ عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ حدیث صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظاتِ طیبہ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ آپؐ کو کرتے ہوئے جو کچھ دیکھا گیا یا آپؐ کے سامنے دوسروں نے جو کچھ کیا

اور آپ نے اس سے منع نہیں کیا، اصطلاحاً جس کا نام محدثین نے تقریر رکھا ہے، حدیث کا لفظ ان واقعات کو بھی حاوی ہے، اسی لئے جب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو اتنی حدیثیں یاد تھیں تو اس کا مطلب یہی نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ملفوظات اتنی تعداد میں ان کو یاد تھے بلکہ ملفوظات کے ساتھ بڑا حصہ ان حدیثوں میں افعال وتقریرات کا بھی ہوتا ہے۔

(۲) خود صحابہ میں بھی بجز معدودے چند حضرات کے جنہیں مکثرین کہتے ہیں، زیادہ تر اسی قسم کے حضرات ہیں جن کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد کا سو سے متجاوز ہونا بھی مشکل ہے اسی سے اندازہ کیجئے کہ سو یا سو سے کچھ اوپر حدیثوں کے روایت کرنے والے حضرات صحابہ میں بیس پچیس سے زیادہ نہیں ہیں، ورنہ ان کی عمومیت "اصحاب العشرات" (یعنی سو سے کم، نوے ۹۰، اسی ۸۰، ستر ۷۰، ساٹھ ۶۰، پچاس ۵۰ دس تک) میں شمار ہوتے ہیں، تاہم صحابۂ کرام کے عہد تک حدیثوں میں سند کا سوال چونکہ پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ بات فقط متن تک محدود تھی، نیز جن چیزوں کو وہ بیان کرتے تھے ان کے وہ خود ذاتی تجربہ کار اور دیکھنے والے تھے، اس لئے چند صحابی مثلاً ابو ہریرہ، عائشہ صدیقہ، انس بن مالک، ابن عمر وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حدیثوں کی تعداد کافی ہے۔ لیکن صحابہ کے بعد چونکہ سند کا یاد رکھنا بھی ضروری قرار دیا گیا اور جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے کڑی پر کڑی کا اضافہ سند میں ہوتا چلا جا رہا تھا، حافظہ پر بھی اس کی وجہ سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوئی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ صحابہ کے بعد والوں میں زمانے تک ہمیں اسی قسم کے حضرات ملتے ہیں جن کی حدیثوں کی تعداد محدود تھی، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابن شہاب زہری جیسے آدمی کی روایتوں کی مجموعی تعداد کو بتاتے ہوئے الذہبی نے لکھا ہے کہ

قَالَ اَبُوْدَاؤدَ حَدِيْثُهُ اَلْفَانِ وَمِائَتَانِ النِّصْفُ مِنْهَا مُسْنَدٌ۔

(تذکرہ ص ۱۰۳)

ابوداؤد کا بیان ہے کہ زہری کی روایتوں کی تعداد دو ہزار دو سو (۲۲۰۰) ہے جس میں مسند (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل سند کے ساتھ جو روایتیں منسوب ہیں) ان کی تعداد کل نصف ہے۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ ان کی مسند حدیثوں کی تعداد ایک ہزار ایک سو (۱۱۰۰) سے زیادہ نہ تھی

اور یہ حال جب زہری کی روایتوں کا ہے تو دوسروں کی روایتوں کو اسی پر قیاس کیجئے، زہری سے پہلے قاسم بن محمد جلیل القدر تابعی ہیں، لیکن ذہبی ہی نے ان کے حال میں لکھا ہے کہ

قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ كَانَ الْقَاسِمُ أَعْلَمَ أَهْلِ زَمَانِهٖ وَقَالَ عَلِيُّ بْنُ الْمَدِيْنِيِّ لَهٗ مِائَتَا حَدِيْثٍ (تذکرہ ج ۱ ص ۹۱)

ابن عیینہ کہتے تھے کہ قاسم اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم تھے، اور ابن مدینی کا بیان ہے کہ قاسم کی روایتوں کی تعداد کل دو سو ۲۰۰ ہے۔

اسی طرح بصرہ کے امام حدیث ثابت البنانی کی حدیثوں کی تعداد، ذہبی نے لکھا ہے کہ دو سو پچاس تھی (ج ۱ ص ۱۱۸) سلیمان تیمی کی روایتوں کی تعداد کل دو سو بتائی گئی ہے (ذہبی ج ۱ ص ۱۴۲) عمرو بن مرہ بھی کل دو سو ہی حدیثوں کے راوی تھے (ج ۱ ص ۱۱۵) یحییٰ بن سعید الانصاری کے پاس بھی صرف تین سو حدیثوں کا ذخیرہ تھا (ذہبی ج ۱ ص ۱۳۰) ایوب سختیانی کل آٹھ سو روایتوں کے راوی تھے (ج ۱ ص ۱۲۳)

میں نے تذکرۃ الحفاظ سے یہ چند مثالیں چن لی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے بعد شروع میں لوگوں کے پاس حدیثوں کی محدود تعداد تھی لیکن جوں جوں زمانہ آگے کی طرف بڑھتا گیا اس منتشر اور بکھرے ہوئے سرمایہ کو لوگوں نے سمیٹنا اور جمع کرنا شروع کیا۔ اور بعض لوگوں نے خاص قسم کی حدیثوں کو جمع کیا۔ مثلاً احکام یعنی فقہی مسائل جن حدیثوں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کے متعلق امام شافعی کا بیان ہے کہ

وَجَدْتُّ أَحَادِيْثَ الْأَحْكَامِ كُلَّهَا عِنْدَ مَالِكٍ سِوٰى ثَلَاثِيْنَ حَدِيْثًا وَجَدْتُّهَا كُلَّهَا عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ سِوٰى سِتَّةِ أَحَادِيْثَ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۲)

احکام جن سے اسلامی قوانین پیدا ہوتے ہیں، ان کی متعلقہ حدیثوں کا سارا ذخیرہ میں نے امام مالک کے پاس پایا بجز تیس ۳۰ حدیثوں کے، پھر ایسا ذخیرہ جس میں یہ تیس ۳۰ حدیثیں بھی شریک تھیں میں نے ابن عیینہ کے پاس پایا بجز چھ ۶ حدیثوں کے (کہ وہ ابن عیینہ کے پاس بھی نہ تھیں)۔

اسی طرح بعض حضرات نے کسی خاص علاقے کے راویوں کی حدیثیں جمع کیں، ذہبی نے علی بن مدینی کے حوالہ سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

دَارَ عِلْمُ الثِّقَاتِ عَلَى الزُّهْرِيِّ وَعَمْرِو بْنِ دِيْنَارٍ بِالْحِجَازِ وَقَتَادَةَ وَيَحْيَى بْنِ اَبِيْ كَثِيْرٍ بِالْبَصْرَةِ وَاَبِيْ اِسْحَاقَ وَالْاَعْمَشِ بِالْكُوْفَةِ يَعْنِيْ اَنَّ غَالِبَ الْحَدِيْثِ الصِّحَاحِ لَا تَخْرُجُ عَنْ هٰؤُلَاءِ السِّتَّةِ۔ (ج ۱ ص ۱۰۵)

معتبر راویوں کا علم ان چند بزرگوں پر گردش کرتا ہے یعنی حجاز کا علم زہری، عمرو بن دینار پر اور بصرہ کا علم قتادہ و یحییٰ بن کثیر پر، کوفہ کا ابو اسحاق و اعمش پر گردش کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح حدیثیں عموماً ان بزرگوں کے دائرۂ علم سے باہر نہیں ہیں۔

اسی طرح ابو داؤد الطیالسی کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد کہ

وَجَدْنَا الْحَدِيْثَ عِنْدَ اَرْبَعَةٍ اَلزُّهْرِيِّ وَقَتَادَةَ وَاَبِيْ اِسْحَاقَ وَالْاَعْمَشِ۔

میں نے حدیث کا ذخیرہ چار آدمیوں کے پاس پایا یعنی زہری، قتادہ اور ابو اسحاق و اعمش۔

ذہبی نے طیالسی کا یہ تخمینہ نقل کیا ہے کہ

وَلَمْ يَكُنْ عِنْدَ وَاحِدٍ مِّنْ هٰؤُلَاءِ اِلَّا اَلْفَيْنِ اَلْفَيْنِ۔ (ص ۱۰۸)

اور ان میں سے ہر ایک کے پاس دو دو ہزار سے زیادہ حدیثوں کا سرمایہ نہ تھا۔

مگر جیسے جیسے زمانہ آگے کی طرف بڑھتا گیا لوگوں میں ایک ہی حدیث کو مختلف راویوں سے سننے کا شوق بڑھتا چلا گیا۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اس زمانے میں واقعات کی تہ تک پہنچنے کیلئے کسی ایک اخبار میں کسی نیوز ایجنسی کی دی ہوئی خبر کا پڑھ لینا کافی نہیں ہوتا، کچھ اس قسم کا حال حدیث کے باب میں ان لوگوں کا ہو گیا تھا، اس مذاق میں لوگوں کی اولوالعزمیاں ترقی کر کے اس حد کو پہنچ چکی تھیں کہ بعض لوگ سو سو طریقوں سے جب تک کسی روایت کو سن نہیں لیتے، اپنے آپ کو اس روایت میں یتیم خیال کرتے تھے اور قاعدہ یہ بن گیا تھا کہ مختلف طریقوں سے جو حدیثیں سنی جاتی تھیں محض سند میں کسی ایک راوی کے بڑھ جانے یا متن میں کسی لفظ کے اضافے کے ساتھ ہی بجائے ایک حدیث کے وہی ایک حدیث دو حدیثیں بن جاتی تھیں میں کہہ چکا ہوں کہ اس طریقہ سے حدیثوں کی تعداد بڑھتے ہوئے لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ نیز حدیث کے لفظ کے نیچے صحابہ اور تابعین کے اقوال و فتاویٰ کو بھی آخر میں لوگ درج کرنے لگے۔ حدیثوں کے عددی اضافہ میں کچھ اس کو بھی دخل ہے

[illegible]

[illegible]

عہدِ صحابہ اور مصنفینِ صحاح کے درمیانی دور میں حفاظتِ حدیث کی شکلیں

حفظ اور کتابت

اب ان سارے معلومات اور مقدمات کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ مصنفین صحاح اور عہد صحابہؓ کے اس درمیانی وقفہ میں مان بھی لیا جائے کہ حدیثوں کی حفاظت کی ایک ہی شکل یعنی کتابت نہیں صرف حفظ ہی تھی تو جو ان کا ماحول تھا اور جس قسم کے ظاہری باطنی خصوصیات میں از سرتا بقدم وہ ڈوبے ہوئے تھے ان کے لحاظ سے حدیثوں کو زبانی یاد کر لینا یہ کام ان کے لئے کچھ بھی دشوار تھا، ایک ایسے بدترین ناموافق حالات جن میں پچھلی صدی ڈیڑھ صدی سے مسلمان گزر رہے ہیں، ان کی زندگی کا سارا نظام الٹ پلٹ ہو چکا ہے، قلوب پر دین کی گرفت روز بروز ڈھیلی پڑتی چلی جا رہی ہے لیکن بایں ہمہ حفظ بہ تکلف کے عام قانون کے تحت ہمارے اور آپ کے سامنے دس بیس ورق ہی نہیں بلکہ اول سے آخر تک الحمد سے والناس تک کے حافظِ قرآن ہزار ہا ہزار کی تعداد میں جب پیدا ہو رہے ہیں تو جس زمانہ کا نقشہ صفحات بالا میں آپ کے آگے رکھا گیا ہے، حدیثوں کے حفظ کا مسئلہ کیا کوئی بڑی بات تھی؟ جس کی دشواریوں کو محسوس کر کے یا کرا کے آج حدیثوں کے متعلق بدگمانیاں پھیلائی جا رہی ہیں، خصوصاً جب اسی کے ساتھ ان نکات کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے کہ ان محفوظ حدیثوں میں ملفوظاتِ نبویہ کے ساتھ ایک بڑا حصہ واقعات (یعنی افعال اور تقریرات) کا بھی شریک تھا۔ اور میرا تخمینہ یہ ہے کہ حدیث کے ان تینوں اجزاء میں دو تہائی حصہ ان ہی واقعات کا ہے بلکہ صحیح جستجو سے اگر کام لیا جائے تو شاید اس تخمینہ سے زیادہ بھی ہو، عرض کر چکا ہوں کہ واقعات کا یاد رکھنا آدمی کی قوتِ یادداشت کے لئے اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ ملفوظات اور اقوال کے یاد کرنے ہیں۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سے ناواقف ہیں ان کو حیرت ہوتی ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ خود ان ناموں کے یاد رکھنے میں حافظہ کو دوسری بہت سی چیزوں سے مدد ملتی ہے۔ فن کار ہی اس نکتہ کو سمجھ سکتے ہیں، مثلاً یوں سمجھئے کہ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں فلاں فلاں صحابی سے حدیثیں زیادہ مروی ہیں، اسی طرح علم حدیث اور اسماء الرجال سے جو اشتغال رکھتے ہیں وہ صحابیوں کے متعلق بھی جانتے ہیں کہ تابعین میں فلاں فلاں صحابی سے زیادہ خصوصیت تھی، اسی طرح درجہ بدرجہ نیچے اترتے ہوئے اساتذہ اور تلامذہ کے خصوصی تعلقات کا عام علم فن کے جاننے والوں کو پہلے ہی سے ہوتا ہے، پس اسماء تو یونہی یاد رہتے ہیں، حافظہ کو ہر حدیث کے متعلق اتنا کام کرنا پڑتا ہے کہ ان ناموں میں سے کس نام کا کس حدیث کی سند سے تعلق ہے، پس اس کو مستحضر رکھنا چاہئے سچ پوچھئے تو اس کی وجہ سے ناموں کے یاد کرنے میں بھی حافظہ کا کام آدھا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح متونِ حدیث کا حال ہے کہ اصل حدیث تو ایک ہی ہے، دوسرے طرق میں لفظ دو لفظ کا اضافہ ہوتا ہے اور اسی اضافہ کی وجہ سے حدیث کے نمبروں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں بھی حافظہ پر جو کچھ بار پڑتا ہے وہ لفظ دو لفظ ہی کے یاد کرنے کا پڑتا ہے۔ بہرحال اکثر ابواب کی حدیثوں کا یہی حال ہے کہ سند یا متن میں لفظ دو لفظ کو بدلتے چلے جائیے، حدیثوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی مسئلہ کے متعلق ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ابن راہویہ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑے پتہ کی بات لکھی ہے، بیان یہ کیا ہے کہ مشہور امام فن علل ابو حاتم رازی کی مجلس میں ابن راہویہ اور ان کی غیر معمولی قوتِ یادداشت کا ذکر ہو رہا تھا، ایک صاحب جن کا نام احمد بن سلمہ تھا، انہوں نے ابو حاتم سے کہا کہ ابن راہویہ صرف عام ابواب ہی کی حدیثیں نہیں بلکہ تفسیری روایتیں بھی شاگردوں کو زبانی بغیر کتاب سامنے رکھنے کے لکھوایا کرتے ہیں۔ ابو حاتم جو فن کے گُر سے واقف تھے، احمد سے یہ سن کر سنبھل گئے اور تعجب کے ساتھ کہنے لگے کہ

هٰذَا اَعْجَبُ لِاَنَّ ضَبْطَ الْاَحَادِيْثِ الْمُسْنَدَةِ اَسْهَلُ وَاَهْوَنُ مِنْ ضَبْطِ

(تفسیری روایات کا زبانی لکھوانا، بلاشبہ بہت زیادہ عجیب ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے والی

اَسَانِیدِ التَّفَاسِیرِ وَ اَلْفَاظِهَا (ج ٢ ص ٢١٣) — حدیثوں کا یاد رکھنا تفسیری روایتوں کی سندوں اور ان کے الفاظ کے یاد کرنے کے حساب سے بہت زیادہ آسان اور سہل ہے۔

سمجھا آپ نے ابو حاتم کیا کہہ رہے ہیں، قصہ یہ ہے کہ تفسیری روایات کے ذخیرے میں براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کا سرمایہ بہت کم پایا جاتا ہے بلکہ زیادہ تر وہ صحابہ اور صحابہ سے بھی زیادہ بہت زیادہ ان لوگوں کے اقوال اس ذخیرے میں شامل ہیں جو صحابہ کے بعد تھے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ صحابہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے زیادہ روایت کرنے والوں کی تعداد بھی محدود ہے۔ زیادہ تر روایتیں عموماً مکثرین صحابہ (ابو ہریرہؓ، عائشہ صدیقہؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ وغیرہم) حضرات سے مروی ہیں۔ اکثر حدیثوں کے لئے صحابہ کے طبقہ میں ان چند ناموں کا یاد کر لینا کافی ہے۔ پھر ان بزرگوں کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ یعنی حدیث کی سندوں کی آخری کڑیوں میں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اپنے اپنے استاذوں کے ساتھ خصوصی تعلقات کے لحاظ سے مشہور ہیں حدیث کا ابتدائی طالب العلم ان محدود شخصیتوں سے واقف ہوتا ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ ہزار ہا ہزار حدیثوں کی سندوں کے لئے چند محدود اسماء جن کی تعداد دو تین سو سے زیادہ نہ ہوگی، ان کو یاد رکھنا ان ساری سندوں کے رجال کا یاد رکھنا ہے اور متون میں بھی اختلاف زیادہ تر لفظ دو لفظ ہی کے حساب سے ہوتا ہے مگر تفسیری روایات کی سندیں بھی لامحدود اور ان کے متون کے الفاظ بھی زیادہ تر ایک دوسرے سے کم ملتے جلتے ہیں، اسی لئے تفسیری روایتوں کے یاد رکھنے اور زبانی بیان کرنے پر ابو حاتم کو تعجب ہوا اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ حدیثوں کی عددی کثرت کو دیکھ کر بھڑکنے اور بدکنے کی ضرورت نہیں، ان کا معاملہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ ان مہیب اور مدہش اعداد و شمار کو سن کر بہ ظاہر فن کے نہ جاننے والے باور کئے بیٹھے ہیں، آدمی کی قوت یادداشت اس قسم کے مؤثرات سے شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر امداد حاصل کرتی رہتی ہے۔

بات بہت طویل ہو گئی، حالانکہ کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ سو ڈیڑھ سو سال وقفہ کی جو درمیانی مدت ہے اس میں اگر حدیثوں کے قلمبند کرنے کا جیسا کہ عام طور پر پھیلا دیا گیا ہے رواج نہ بھی ہوا ہو

اور یاد کرنے والوں کی یاد ہی پر اس زمانے میں حدیثوں کے محفوظ رکھنے کا دارومدار رہا ہو تو واقعات اور حالات سے جو واقف ہیں، ان کے نزدیک ہلکی سے ہلکی بے اعتمادی کی وجہ محض یہ واقعہ نہیں ہو سکتا ہے بلکہ سچی اور ٹھوس بات یہ ہے کہ کتابت ہو یا حفظ، معلومات کے محفوظ کرنے کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ جیسے لکھ کر معلومات کو محفوظ کیا جاتا ہے اسی طرح یاد کر کے بھی چیزوں کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور رکھا جاتا ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت اس کی زندہ مثال آپ کے سامنے قرآن ہی موجود ہے۔ مکتوبہ قرآن میں قرآن کی کسی آیت یا سورت کو پڑھئے یا کسی حافظ سے اسی آیت یا سورت کو سنئے، کیا دونوں کے اعتماد میں کسی قسم کا فرق آپ پا سکتے ہیں؟

پس مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ان میں کون معلومات کے محفوظ کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے اور کون نہیں بن سکتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کتابت ہو یا حفظ و یادداشت دونوں میں سے جس کسی سے بھی کام لیا جائے، کام لینے والے پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان ذمہ داریوں کی جیسا کہ چاہئے اگر تکمیل کی گئی ہے اور حزم و احتیاط کے لحاظ سے جن باتوں کی نگرانی کی ضرورت ہے ان سے لاپرواہی نہیں اختیار کی گئی ہے تو ان میں جس ذریعہ سے بھی کام لیا جائے گا قدرتاً انسانی فطرت اس ذریعہ سے محفوظ کی ہوئی چیزوں کے متعلق اپنے اندر اعتماد کی کیفیت کو محسوس کرتی ہے خواہ یہ کتابت کا ذریعہ ہو یا یاد کرنے کا طریقہ، لیکن ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں اگر غفلت اور لاپرواہی برتی گئی ہو تو خود بخود اعتماد کی ضمانت مشتبہ ہو جاتی ہے، خواہ لکھنے سے کام لیا گیا ہو یا یاد کرنے سے، جو واقعہ ہے وہ یہی اور صرف یہی ہے۔ نہ سوچنے والوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے کہ ان حدیثوں کا کیا اعتبار جو کئی سو سال بعد قلمبند ہوئیں۔ اس عامیانہ نوغا میں اور جو غلطیاں ہیں ان کو تو جانے دیجئے، میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ انہوں نے یہ کیسے باور کر لیا ہے کہ قید کتابت میں آجانے کے بعد اشتباہات و شکوک کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں؟ کیسی عجیب بات ہے، ایک طرف اس کا ہنگامہ مچایا جاتا ہے کہ عالم معنی پر مظالم کے جو پہاڑ کاتبوں کے ہاتھوں سے ٹوٹے ہیں، عالم صورت پر یہ ظلم چنگیز خاں کے ہاتھوں بھی نہ ہوا تھا۔ عصر حاضر میں طباعت اور ٹائپ کی بھی بوقلموں

نغیر کے یہ قرار دیا کہ یہ لفظ "بعیر" کا ہے، اور شاگردوں کو مطلب یہ سمجھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو عمیر سے پوچھ رہے تھے کہ اونٹ کیا ہوا؟ ان ہی صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ دوسری حدیث جس میں ہے کہ لَا تصحبُ الملائِكَةُ رفقةً فیھَا جَرَسٌ جس کا مطلب یہ تھا کہ اونٹوں کے گلے میں گھنٹیاں ڈال دینے کی جو عادت عرب میں تھی اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ ملائکہ کی پسندیدگی سے وہ قافلہ محروم رہ جاتا ہے جس کے جانوروں کے گلے میں گھنٹی (جرس) ہو۔ محدث صاحب نے جرس "کو خرس" پڑھا اور فرمایا کہ ریچھ کو جو لوگ قافلہ کے ساتھ رکھتے ہیں ان کو مطلع کیا گیا ہے کہ ملائکہ کی پسندیدگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یا جس حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "البُزَاق" یعنی تھوک کو مسجد کی دیوار پر دیکھا، محدث صاحب نے فرمایا کہ "البُرَاق" کو دیکھا۔ اور سب سے زیادہ دلچسپ لطیفہ الحاکم نے اس سلسلہ میں مشہور محدث ابن خزیمہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ اثر جو کتابوں میں منقول ہے کہ تَوَضَّأَ فِي جَرِّ نَصْرَانِيَّةٍ (یعنی حضرت عمرؓ نے ایک عیسائی عورت کے گھڑے کے پانی سے وضو کیا) پڑھنے والے صاحب نے جرّ کے لفظ کو حِرّ پڑھا، اب کیا بتاؤں کہ انہوں نے کیا پڑھا، لغت میں دیکھ لیجئے کہ حِرّ کے کیا معنی ہیں[1]، دیکھا آپ نے بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ یہ ہے حال اس کتابت کا جس کے متعلق لوگوں نے غلط توقعات قائم کر لئے ہیں۔

لطف تو اس وقت آتا ہے جب پڑھنے والے اپنی غلط بینی یا غلط فہمی کی تصحیح و توجیہ شروع کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب جن کا نام محمد بن علی المذکر تھا، غالباً وعظ گوئی کا پیشہ کرتے تھے ایک حدیث پڑھی:

"قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَزْرَعْنَا تَزْدَادُ حِنًّا"

لوگ حیران ہوئے کہ مطلب کیا ہوا؟ الحاکم نے لکھا ہے کہ تب محدث صاحب نے "قص قصۃً طویلۃً" یعنی ایک طویل قصہ بیان کرنا شروع کیا کہ کسی علاقے کے لوگ تھے اپنی زرعی پیداواروں کا عشر اور

[1] عورت کی شرمگاہ ۱۲

صدقہ ادا نہیں کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کرتے ہوئے پہنچے کہ ہم لوگوں نے کھیتی کی لیکن سب کی سب "حنا" یعنی "مہندی" کا درخت بن گئی، اسی قول کو رسول اللہ نے گویا نقل کیا ہے۔ سیوطی نے تدریب[196] میں لکھا ہے کہ یہ دراصل مشہور حدیث

زُرْغِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا — ناغہ کرکر کے ملاقات کیا کرو اس سے محبت بڑھتی ہے۔

کی خرابی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی غلطیاں ان ہی لوگوں سے صادر ہوئی ہیں یا آئندہ صادر ہو سکتی ہیں جن کے متعلق حضرت عبداللہ بن المبارک نے فرمایا ہے کہ

لَمْ يَكُنِ الْحَدِيثُ بِشَغْلِهِمْ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص[149]) — حدیث کا فن ان کا پیشہ نہ تھا۔

لیکن بعض دفعہ تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسے لوگ جو فن کے ساتھ خاص تعلق رکھتے تھے مثلاً مصر کے قاضی ابن لہیعہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مشہور حدیث اِحْتَجَرَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چٹائی وغیرہ سے مسجد میں ایک جگہ گھیر لی تھی ابن لہیعہ نے بجائے اِحْتَجَرَ کے اس کو اِحْتَجَمَ پڑھا۔ یعنی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنا لگوایا۔ ابن صلاح نے لکھا ہے کہ اس غلطی کی وجہ یہ تھی کہ

اَخَذَهُ مِنْ كِتَابٍ بِغَيْرِ سَمَاعٍ (مقدمہ ص ۱۱۴) — ابن لہیعہ نے استاذ سے سنے بغیر اس حدیث کو کتاب میں دیکھ کر) روایت کرنا شروع کیا تھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حدیث مکتوبہ شکل میں ابن لہیعہ کے سامنے پیش ہوئی لیکن زبانی استاذ سے حدیث کے الفاظ ابن لہیعہ نے چونکہ نہیں سنے تھے اس لئے کتابت ان کو غلطی سے نہ بچا سکی، اور اس کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں محدثین نے جمع کی ہیں۔ بعض لوگوں نے اسی قسم کی غلطیوں کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں امام مسلم کی کتاب التمییز اور دارقطنی وابو احمد عسکری کی کتابوں کا لوگوں نے خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ ایک پر لطف قصہ اسی سلسلہ کا یہ بھی ہے کہ ایک محدث صاحب نے عام مجمع میں حدیث بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ لَعَنَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اَلَّذِیْنَ یُشَقِّقُوْنَ الْحَطَبَ۔ دراصل الحطب جس کے معنی لکڑی ہیں اس کی جگہ حدیث میں اَلْخُطَبَ کالفظ تھا، درحقیقت تقریر اور وعظ میں لفاظی سے کام لینے والوں کو خدا کی نگاہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردود ٹھیرایا تھا لیکن محدث صاحب نے گویا یہ پڑھا کہ لکڑی چیرنے والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔ لکھا ہے کہ وعظ سننے والوں میں ملاحوں کا بھی ایک گروہ تھا ان میں سے کچھ لوگ آگے بڑھے اور بولے کہ

فَکَیْفَ نَعْمَلُ وَالْحَاجَةُ مَاسَّةٌ۔ آخر ہم لوگ کیا کریں؟ ضرورت تو لکڑی چیرنے کی پڑا کرتی ہوتی ہے۔ (تدریب ص ۱۱۵)

یعنی بے چاروں کا روزگار ہی کشتی چلانے پر موقوف تھا اور کشتی ظاہر ہے کہ لکڑی چیرے بغیر کیسے بن سکتی ہے۔ لوگوں نے یہ نہیں لکھا کہ پھر محدث بیچارے نے اس کا کیا جواب دیا۔ تعجب ہے کہ ابن صلاح نے اس قصہ کو ابن شاہین جیسے آدمی کی طرف منسوب کیا ہے، اور صحیح بات بھی یہی ہے کہ وہ بیچارے کیا، اس قسم کی غلطیوں کا تجربہ اکثروں کو کرنا پڑتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کا قول سیوطی نے نقل کیا ہے کہ

وَمَنْ یَعْرِیْ عَنِ الْخَطَاءِ وَالتَّصْحِیْفِ (تدریب ۱۹۶) عام غلطی یا غلط خوانی سے کون محفوظ رہ سکتا ہے۔

اسی لئے میری غرض ان تصحیفی غلطیوں کے ذکر سے خود ان غلطیوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان حضرات سے میرا خطاب ہے جنھوں نے اس زمانے میں حفظ اور یادداشت کی تحقیر کرتے ہوئے "کتابت" کا اتنا ہنگامہ مچا رکھا ہے کہ میں نے جیسا کہ عرض کیا ان کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب ہو جانے کے بعد پھر شکوک و شبہات کی گویا گنجائش باقی ہی نہیں رہتی۔ حالانکہ دونوں باتیں غلط ہیں اور صحیح بات وہی ہے کہ چیزوں کے محفوظ کرنے کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں، کام لیتے ہوئے جن احتیاطوں کی ضرورت ہے اگر ان کی پابندی کی جائے گی تو دونوں ہی ذرائع قابل اعتماد ہیں اور ان احتیاطوں سے جب لاپروائی برتی جائے گی تو شک و شبہ کی گنجائش دونوں میں پیدا ہو سکتی ہے، محدثین اس کو خوب سمجھتے تھے کہ محض کسی چیز کا قید کتابت میں آجانا اس کو قبلِ

اعتماد بنا دینے کے لئے قطعاً کافی نہیں ہے۔ لکھنے کے بعد اسی لئے ہمیشہ اپنے شاگردوں کو شدید تاکید کیا کرتے تھے کہ اصل صحیح نسخے سے اس کو ملا لیا کریں، اس سلسلہ میں ان کے شدید تاکیدی الفاظ کتابوں میں منقول ہیں، پچھلے زمانے ہی میں نہیں بلکہ لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رض کی بہن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے صاحبزادے عروۃ بن الزبیر رض نے اپنے لڑکے ہشام بن عروہ رض سے پوچھا کہ جو حدیثیں میں نے بیان کیں تم نے ان کو لکھ لیا؟ ہشام کہتے کہ جی ہاں لکھ لیا۔ عروہ نے کہا اس کا اصل سے مقابلہ بھی کر لیا؟ ہشام نے کہا جی نہیں۔ یہ سن کر عروہ نے کہا کہ

لَمْ تَكْتُبْ (الکفایہ ص ۲۳۷) تم نے پھر گویا لکھا ہی نہیں۔

قریب قریب اسی کے دوسرے محدثین سے الفاظ اس باب میں منقول ہیں۔ اور یحییٰ بن ابی کثیر تو عموماً اپنے تلامذہ سے فرماتے کہ

مَنْ كَتَبَ وَلَمْ يُعَارِضْ كَمَنْ دَخَلَ الْخَلَاءَ وَلَمْ يَسْتَنْجِ (کفایہ ص ۲۳۷) جس نے لکھا لیکن اصل سے اس کا مقابلہ نہ کیا تو اس کی حالت اس شخص کے مانند ہے جو بیت الخلاء گیا اور استنجا کئے بغیر نکل آیا۔

محض کتابت کو حفاظتِ کاملہ کا ذریعہ سمجھنا نادانی ہے

اور ایک مقابلہ ہی کیا کتابتِ حدیث کی ذمہ داریوں کی وہ فہرست جو ہمارے محدثین نے بتلائی ہے کافی طویل ہے۔ انشاء اللہ اپنے موقعہ پر اس کی تفصیل کی جائے گی، اس وقت میرا خطاب صرف ان مسکینوں کی طرف ہے جنہوں نے کتابت کے متعلق کچھ یہ باور کر لیا ہے کہ کسی چیز کا مکتوب ہو جانا گویا معصوم ہو جانا ہے، نہ لکھنے والوں سے غلط نویسی اور بھول چوک ہو سکتی ہے اور نہ پڑھنے والے کبھی غلط پڑھ سکتے ہیں یا غلط سمجھ سکتے ہیں، اسی کے مقابلہ میں یاد کی ہوئی چیز کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اپنی اصلی حالت میں اس کا یاد رہ جانا گویا ناممکن ہے، پھر ان ہی مفروضات پر تیسرے فرض کی بنیاد کھڑی کی گئی کہ ابتدائی عہد میں حدیثوں کے چونکہ صرف زبانی یاد کرنے کا رواج تھا اور ان کے قلم بند کرنے کا خیال بعد کو کئی صدی کے گزرنے کے بعد پیدا ہوا۔ اس لئے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ حدیثوں کا موجودہ

[illegible]

کے لئے جوشِ عقیدت میں "حسنًا" کے لفظ کے بعد "علیہ السلام" کا اضافہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس غلطی میں مبتلا ہو جانے کی وجہ یہی تو ہوئی کہ لفظ صرف مکتوبہ شکل میں سامنے آیا ورنہ روایت کی راہ سے بھی یہی لفظ ان کے کان میں اگر پڑتا تو اولاً بجائے "حسن" کے ان کا کان اس لفظ کو "حُسن" کی شکل میں سنتا، پھر بھی کچھ کھٹکا دل میں رہ جاتا تو پوچھ سکتے تھے کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ استاذ سامنے ہوتا تو بتلا دیتا۔ لیکن صرف کتابت پر بھروسہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بیچارے امام حسن علیہ السلام کو ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ کے درمیان کھینچ کر وہ لے آئے۔

جیسا کہ آئندہ انشاء اللہ تفصیل سے یہ بتایا جائے گا کہ صحیح راہ روایتوں کی حفاظت کی یہی ہے کہ کتابت اور روایت دونوں طریقوں کو مسلسل جاری رکھا جائے تاکہ ایک کے نقص کی تکمیل دوسرے سے ہوتی رہے، اور محدثین نے یہی کیا بھی ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آج تو لوگ کتابت ہی کو سب کچھ سمجھ رہے ہیں اور روایت کی کوئی اہمیت دلوں میں باقی نہیں رہی ہے، لیکن یہ ان کا حال تھا جن بیچاروں کو اسی قسم کی چیزوں کے تجربہ کرنے کا ذاتی طور پر موقعہ نہیں ملا ہے، ورنہ محدثین اپنے طویل تجربوں کی بنیاد پر اس زمانے میں اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ کسی چیز کے متعلق ان دونوں ذرائع میں سے کسی ایک ہی کے ذریعہ کے اختیار کرنے کا موقعہ آ جائے تو وہ سمجھتے تھے کہ ہر لحاظ سے روایت کے طریقہ میں صحت کی توقع بہ نسبت کتابت کے زیادہ ہے۔

نقدِ رجال کے امام جلیل علی بن مدینی اسی اصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے کہ

حَافِظٌ مُتْقِنٌ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَصْلٍ غَیْرِ مُتْقِنٍ (کفایہ ص ۲۴۱)	حدیثوں کو زبانی یاد رکھنے والے جنہوں نے اتقان اور بیدار دماغی کے ساتھ یاد کیا ہو میرے نزدیک حدیث کے ایسے نسخے سے بہتر ہیں جن کے لکھنے میں زیادہ توجہ نہ کی گئی۔

حافظ کے ساتھ "متقن" کا لفظ ابن مدینی نے جو بڑھایا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ کسی چیز کے یاد کرنے میں جن احتیاطوں کی ضرورت ہے ان کی ذمہ داریوں کا محسوس کرنے والا ہو اور یاد کرتے وقت ان کا پورا پورا خیال رکھتا ہو، وہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں ایسا حافظ اور زبانی یاد رکھنے والا

میرے نزدیک اس کتاب اور نسخہ سے بہتر ہے جس کے لکھنے میں اتقان کا خیال نہ کیا گیا ہو یعنی لکھنے والے نے لاپروائیوں سے کام لیا ہو۔

خیال تو کیجئے یہ تو خیر حدیث کا معاملہ ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ روایت کس حد تک صحیح ہے کسی معمولی آدمی کا بیان ہوتا تو کم از کم میرے لئے اس کا باور کرنا آسان نہ تھا۔ بہرحال دار قطنی کی "کتاب التصحیف" سے سیوطی نے تدریب میں نقل کیا ہے کہ ایک مشہور عالم تفسیر پڑھا رہے تھے جب سورہ یوسف کی آیت جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ پر پہنچے جس کے معنی ہیں کہ حضرت یوسف نے اپنے بھائی کے سفری سامان میں شاہی پیمانے کو رکھوا دیا۔ لیکن مفسر صاحب نے اسی آیت کو تلاوت کرتے ہوئے پڑھا کہ جَعَلَ السَّفِينَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ یعنی بجائے شاہی پیمانے کے یہ مطلب ہوا کہ حضرت یوسف نے "کشتی" اپنے بھائی کے ساز و سامان میں رکھوادی۔ سننے والوں نے جنہیں قرآن زبانی یاد تھا اور نہ بھی یاد ہوتا تو ایسی فاحش غلطی پر کون صبر کر سکتا تھا۔ بہرحال جب پوچھا کہ لفظ السَّفِينَةَ نہیں بلکہ السِّقَايَةَ ہے تو ملاحظہ فرمایئے اس دیدہ دلیری کو، اللہ علم کے فتنے سے آدمی کو محفوظ رکھے کہ بجائے غلطی کو مان لینے کے فرماتے ہیں:

"کہ یہ عاصم کی قراءت ہوگی اور میرے بھائی قرآن کو ان کی قراءت پر نہیں پڑھتے ہیں"[1]

بظاہر اپنی غلطی کا ان کو احساس ہوا لیکن پڑھنے والوں کے سامنے رسوائی نہ ہو ایک بات بنادی گئی۔ اسی کتاب کے حوالہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ سورہ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ، جس کا نام سورہ فیل ہے، ان ہی صاحب نے پڑھاتے ہوئے الم تر کے شروع میں جو الم ہے، اس کو سورہ بقرہ کے ابتدائی حروف کی طرح الف لام میم ترکیف فعل ربک پڑھ دیا تھا۔[2]

آپ دیکھ رہے ہیں، خدانخواستہ اگر قرآن کے معاملہ میں صرف "کتابت" ہی پر بھروسہ کر لیا جاتا اور کتابت کے ساتھ ساتھ زبانی یاد کرنے کا دستور مسلمانوں میں شروع سے مروج نہ رہتا تو جس تر و تازہ حال میں اس وقت قرآن پڑھا جا رہا ہے کیا پڑھا جا سکتا تھا، علی الخصوص اسلام نے ابتدائی

---

[1] و [2] تدریب الراوی ص ۱۹۷۔۱۲

دنوں میں جب عربی حروف خصوصاً جن کی شکلیں باہم ملتی جلتی تھیں مثلاً ع ح خ د ذ ص ض وغیرہ میں نقاط کے ذریعہ امتیاز کا طریقہ بھی جاری نہ ہوا تھا، گو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حلقۂ خاص کے آدمی ابوالاسود دیلی[1] نے عہدِ صحابہ میں ہی نقاط کے ذریعہ ان مشتبہ حروف کی شناخت کا طریقہ ایجاد کرکے مسلمانوں میں پھیلا دیا۔ لیکن جب تک نقاط کا یہ طریقہ ایجاد نہ ہوا تھا ان مشتبہ حروف میں تمیز کے لئے لوگوں کو کتنی دشواریاں اٹھانی پڑتی تھیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی کوئی طریقہ ان حروف میں تمیز کا پایا جاتا تھا جسے رَقش کہتے تھے ابن عساکر اور مرزبانی کے حوالہ سے حضرت معاویہؓ کی روایت کتابوں میں جو نقل کی گئی ہے اسے ملاحظہ کیجئے (تدریب ص۱۵۲) لیکن پھر بھی کوئی کلی اطمینان بخش طریقہ ان حروف کی شناختِ صحیح کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں نہ تھا بلکہ لوگ اپنی ذاتی تجویزوں سے کام لیا کرتے تھے۔ الذہبی نے عبداللہ بن ادریس کے تذکرے میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ حدیث کی سند میں ابوالحوراء نام جب آیا تو اندیشہ اس کا ہوا کہ کہیں ابوالجوزاء نہ پڑھا جائے، اس لئے اپنے ذہنی اشارے کے لئے میں نے اس کے نیچے "حور عین" کا لفظ لکھ دیا[2]، جس سے معلوم ہوا کہ علاوہ نقاط کے بعض دوسرے

---

[1] دیلی کی وفات سنہ ۶۹ ہجری میں ہوئی ہے، اس لئے یہ کام سنہ ۶۹ھ سے بہت پہلے پورا ہو چکا تھا بعض لوگ حجاج کے سر اس کا سہرا باندھتے ہیں لیکن میرے نزدیک بنی امیہ کے سیاسی مکائد کا ایک جزیہ بھی ہے۔ ان ہی سیاسی اغراض کے تحت قرآن کا جامع حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مشہور کر دیا تھا حالانکہ واقعہ کی یہ قطعاً غلط تعبیر ہے۔ حضرت عثمانؓ کا کام قرآن کے متعلق صرف اس قدر ہے کہ لکھنے کی حد تک آپ نے سارے مسلمانوں کو قریشی لہجے کے مطابق شکل پر جمع کر دیا تھا ورنہ پڑھنے میں پھر بھی آزادی تھی اور وہ کسی کے بس کی بات تھی بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کو جامع الناس علی القرآن فی الکتابۃ" کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال میری تحقیق یہی ہے کہ نقطہ اندازی کے جس مسئلہ کو حجاج کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، روایت کی تنقیح و تحقیق سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ درحقیقت اس کے موجد یہی ابوالاسود دیلی تھے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خاص آدمی تھے۔ نحو کے ابتدائی کلیات ابوالاسود ہی نے حضرت علیؓ سے سیکھے تھے۔ ان امور کی تفصیل "تدوین قرآن" کی تاریخ میں ملے گی جسے لکھ چکا ہوں لیکن طبع نہیں ہوتی ہے۔ کچھ بھی ہو حجاج ہی کو اگر قرآنی حروف کے نقاط کا بانی مانا جائے تو جب بھی یہ کام عہد صحابہ ہی میں سمجھنا چاہئے کہ انجام پایا۔ حجاج کے زمانے میں بکثرت صحابہ موجود تھے۔"

[2] یہ عجیب بات ہے کہ ذہبی نے ابن ادریس کے اس قول کو نقل کرکے لکھ دیا ہے کہ قلت اہ لکن (باقی بر صفحہ آئندہ)

جانے لگے اور یہی نام ان کا مشہور ہو گیا (دیکھو معرفۃ علوم الحدیث الحاکم ص ۱۵۲) لیکن یہ غلطیاں تو حدیث میں اور حدیث میں بھی سند کے راویوں کے نام میں لوگوں میں لگی تھیں۔ حکیم الامت مرشد تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے وعظ میں ایک دفعہ بیان کیا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں سے کسی صاحب نے بغیر استاذ کے خود قرآن کی تلاوت کرنی چاہی، قرآن کھولا، پہلی سورت جس پر نظر پڑی اس کی ابتدا الٓمٓ سے ہوئی تھی، عربی خط میں یہ کچھ اس طرح لکھا ہوا تھا کہ تعلیم یافتہ صاحب نے اس کو "آلو" پڑھا، غالباً اس پر مسرور ہوئے ہوں گے کہ ہماری دینی کتاب نباتاتی حقائق سے لبریز ہے کھولنے کے ساتھ ہی کھانے کی ایک چیز سامنے آگئی۔ آگے خیال کر لیا ہوگا کہ اسی آلو کے بونے کاشت کرنے پکانے کے طریقوں پر بحث کی گئی ہوگی، افسوس ہوا ہوگا کہ ملاؤں نے اس بہترین کتاب کو صرف خشک دین اور جنت و دوزخ کے تذکروں کی یادداشت بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

گو بات بہت بڑھ رہی ہے لیکن کیا کیا جائے میں نے تو جو کچھ لکھا ہے ان مقالات اور مباحث کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو کتابت کو ہر مرض کی دوا یقین کرتے ہوئے اس پر واویلا مچا رہے ہیں کہ حدیثوں کو بجائے کتابت کے اتنے دنوں تک حفاظِ حدیث کے حافظوں کے سپرد کیوں کر دیا گیا؟ خود بھی سمجھے بیٹھے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی سمجھانا چاہتے ہیں کاش حدیثوں کے زبانی یاد کرنے کا یہ طریقہ ابتداءِ اسلام میں اگر جاری نہ ہوتا اور صرف کتابت پر بھروسہ کر لیا جاتا تو بدگمانیوں کے جو بھپھارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق ان کے دماغوں میں اٹھ اٹھ کر خفقان پیدا کرتے رہتے ہیں ان کی تولید اور پیدائش کی گنجائش ہی باقی نہ رہتی، اسی مفروضہ خود آفریدہ واقعہ کو بزرگوں پر لعن وطعن کا ذریعہ بھی بنا لیا گیا ہے اور اسی کو پیش کر کر کے "اسوۂ حسنہ نبویہ" جو مسلمانوں کی زندگی کے لئے شمع راہ کا کام دے رہا تھا، اس شمع ہی کو بجھا دینے کی کوششوں میں ایڑھی چوٹی کا زور خرچ کیا جا رہا ہے۔ صرف قرآن، قرآن کے سوا کچھ نہیں، اسی کا جھنڈا بلند کر دیا گیا ہے، کتابوں کے طومار کے سوا مختلف بھیسوں میں ماہوار رسالے نکالے جا رہے ہیں۔

اور قرآن بھی وہ جس کے پڑھنے والوں کو الٓمٓ کی جگہ اس میں "آلو" لکھا ہوا نظر آتا ہو آپ ان بافیدہ طامات کے کوہ پیکر گٹھوں کو دیکھئے تب معلوم ہوگا کہ میں نے تو ابھی کوئی پوٹلی بھی تیار نہیں کی ہے۔

خیر اب اس قصے کو ختم کیجئے، انصاف سے کام لینے والوں کے متعلق مجھے توقع ہے کہ اس سلسلہ میں واقعات کی جو روشنی مہیا کی گئی ہے، اس روشنی میں وہ اس نتیجہ تک پہنچ چکے ہوں گے کہ یاد کر کے کسی چیز کو محفوظ کرنا یا لکھ کر اس کو محفوظ کر دینا دونوں میں چنداں فرق نہیں ہے سب سے اچھا طریقہ تو یہی ہے کہ حفاظت کے ان دونوں ذرائع سے کام لیا جائے اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ قرآن ہی کی حد تک نہیں بلکہ حدیثوں کے متعلق بھی شروع ہی سے اسی طریقہ کو سارے اسلاف نے اختیار کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ لوگوں کو اس کا بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ حفاظت کے ان دونوں طریقوں میں سے کسی ایک ہی طریقہ کو کسی وجہ سے اگر اختیار کیا جائے یا دونوں میں سے کسی ایک ذریعہ سے کام لیا جائے تو ایسی صورت میں حفظ اور یاد کرنے کے تسلسل کو جاری کرنا، یعنی ہر پہلی نسل خود یاد کر کے آئندہ نسلوں کو یاد کراتی چلی جائے تو مختلف وجوہ سے کتابت اور قلم بندی کے لحاظ سے حفظ اور یاد کرنے کا یہ طریقہ زیادہ اسلم و احکم ہے چیزیں اپنی شکل و صورت، خط و خال کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اس اعتماد کی جتنی ضمانت اس طریقہ میں ہے، صرف کتابت میں اس اعتمادی اطمینان کو آدمی کی فطرت مشکل ہی سے پا سکتی ہے میری مذکورہ بالا گفتگو کا آخری خلاصہ یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ "وید" کے متعلق البیرونی کی اس تاریخی شہادت کو پیش کرتے ہوئے کہ ہندوستان میں جس وقت البیرونی آیا ہے، اس سے کچھ ہی دن پہلے کشمیر کے ایک پنڈت نے وید کے اشلوکوں کو قلم بند کیا تھا ورنہ اس سے پہلے خواہ جتنا زمانہ بھی گزرا ہو، اس کتاب کی حفاظت کا سارا دار و مدار یاد کرنے والے پنڈتوں اور برہمنوں کی یاد پر تھا میں نے عرض کیا تھا کہ وید پر اور جن پہلوؤں سے بھی نکتہ چینی کی جائے لیکن صرف اتنی بات کہ اتنے زمانے تک جو کتاب قیدِ کتابت میں نہ آسکی اس کے ماننے والوں کے اعتماد کو مضمحل

کرنے کے لئے قطعًا ناکافی ہے، آخر یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ جیسے قرآن کو زبانی یاد کرنے کا دستور تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال سے مسلمانوں میں مروج ہے، اسی طرح وید کو جن لوگوں نے خدا کی کتاب مانا تھا، ان میں بھی یہی دستور جاری تھا، کہہ چکا ہوں کہ واقعات سے یہی ثابت بھی ہوتا ہے کہ وید کے ماننے والوں نے اپنے دھرم اور دین کی بنیادی کتاب کی حفاظت و بقا کے تسلسل کو زبانی یاد کرنے ہی کے طریقے سے کم از کم ہزار پندرہ سو سال تک باقی رکھا اور کبھی ان کے قلب میں اس کا شبہ نہ ہوا کہ اتنی طویل مدت تک جو چیز مکتوبہ شکل میں نہیں رہی ہے اس کو دین کے جوہری حقائق اور اساسی عناصر کا سرچشمہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا یہی ایک واقعہ ان ساری نامسعود و نامبارک کوششوں کو غیر فطری ٹھہرانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ حدیثوں کے متعلق یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ صدی ڈیڑھ صدی تک وہ قلمبند نہ ہو سکیں بلکہ بجائے اس کے یاد کر کر کے یاد کرنے والوں نے اس کو محفوظ رکھا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک ان کو منتقل کیا۔ آخر فطرت کا اگر تقاضہ یہی ہوتا کہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے تو صدی ڈیڑھ صدی نہیں بلکہ کم از کم تیرہ چودہ صدیوں تک کتابی قالب سے آزاد رہنے والی کتاب "وید" کروڑہا کروڑ انسانوں کے اس اعتماد کے حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہو سکتی تھی جو مذہب کے آخری بنیادی اور اساسی کتاب پر اس کے ماننے والوں کو ہو سکتی ہے۔

خبر احاد کا درجہ

حدیث پر بلاشبہ مسلمان اعتماد کرتے چلے آئے ہیں اور جب تک مسلمان مسلمان ہیں انشاءاللہ یہ اعتماد ان میں باقی رہے گا لیکن کون نہیں جانتا کہ تواتر و توارث کی جس راہ سے منتقل ہو کر ہم تک قرآن پہنچا ہے، اسی راہ سے منتقل ہونے والی وہ ساری چیزیں جو مسلمانوں کو اپنے پیغمبر سے ملی ہیں، اعتماد راسخ کا جو مقام ان چیزوں کو مسلمانوں میں حاصل ہے بھلا اعتماد کی اس لازوال غیر متزلزل کیفیت سے ان چیزوں کے اعتماد کو کیا نسبت جن کے علم کا ذریعہ وہ حدیثیں ہیں جنہیں اصطلاحًا خبر احاد کہتے ہیں یعنی صحاح وغیرہ کتابوں کی عام حدیثوں کی جو نوعیت ہے اور اس وقت میری

بحث کا تعلق دراصل حدیثوں کے اسی ذخیرے سے ہے، آپ اصولِ فقہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، آپ کو قریب قریب یہی مضمون مختلف الفاظ میں ملے گا، مثلاً صاحب کشف بزدوی نے لکھا ہے کہ

مَنْ سَوَّاهُ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ الْمُتَوَاتِرَةِ فَقَدْ اَخْطَأَ فِيْ رَفْعِهٖ عَنْ مَنْزِلَتِهٖ وَ وَضْعِ الْاَعْلٰى عَنْ مَنْزِلَتِهٖ۔

(کشف ج ۲ ص ۳۴۲)

قرآن اور سنتِ متواترہ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو باتیں تواتر کی راہ سے منسوب ہیں) ان دونوں کے برابر (جو ان حدیثوں کو سمجھتا ہے جنہیں خبر احاد کہتے ہیں) اس نے دو غلطیوں کا ارتکاب کیا یعنی خبر احاد والی حدیثوں کا جو واقعی مقام اور مرتبہ ہے اس مرتبہ سے ان کو اس نے بلند کر دیا، یہ پہلی غلطی ہوئی اور دوسری غلطی یہ ہے کہ (کتاب و سنتِ متواترہ) کو ان کے مقام سے اس نے گرا دیا۔

بلکہ ایسی حدیثیں بھی جو اپنے بیان کرنے والوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے تواتر کے درجہ تک تو نہ پہنچی ہوں لیکن پھر بھی اگلی نسلوں تک انھیں عام شہرت حاصل رہی ہے، اصطلاحاً جس کا نام حنفیوں نے خبر مشہور رکھا ہے، ان تک کے متعلق شمس الائمہ سرخسی نے لکھا ہے کہ

اِنْ جَاحَدَهٗ لَايُكَفَّرُ بِالْاِتِّفَاقِ۔

(کشف ج ۲ ص ۳۶۸)

اس قسم کی مشہور حدیثوں کے منکر کو کافر نہیں ٹھیرایا جاسکتا، یعنی اس پر کفر کا فتویٰ اور یہ کہ دائرہ اسلام سے وہ خارج ہو گیا یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا

اور جب ان کا حال یہ ہے تو درجہ میں ان سے جو حدیثیں فروتر ہیں یعنی احاد خبریں، ظاہر ہے کہ ان کے ماننے نہ ماننے پر مسلمان ہونے نہ ہونے کا دارومدار کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے جو راہ نمایاں میسر آتی ہیں، خواہ بجائے خود وہ کتنی بھی قیمتی ہوں لیکن بایں ہمہ یہ مسلمہ ہے کہ

لَايُعَاقَبُ بِتَرْكِهَا لِاَنَّهَا لَيْسَتْ بِفَرِيْضَةٍ وَّلَا وَاجِبَةٍ۔

(کشف ج ۲ ص ۳۱۰)

ان کے چھوڑنے پر چھوڑنے والے کو سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ (جو احکام احاد خبروں سے پیدا ہوئے ہیں) وہ نہ فرض ہوتے ہیں اور نہ واجب۔

اور یہ حکم تو ان کا ہے جو ان حدیثوں کو مانتے ہیں لیکن ان پر عمل کی توفیق سے محروم ہیں باقی مسلمانوں میں ایک گروہ مثلاً معتزلہ وغیرہ جو یہ کہتے تھے کہ ایسی حدیثوں کا کیا اعتبار جن کی خبر معدودے چند آدمیوں نے دی ہو یعنی سرے سے خبر احاد کی افادیت کے جو منکر ہیں ان کے متعلق بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ صاحب کشف نے نقل کیا ہے کہ

نَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيْلِ (ج ۲ ص ۲۳)	سیدھی راہ سے وہ بھٹک گیا۔

درحقیقت ان پر وہی بات صادق آتی ہے جسے فخر الاسلام بزدوی نے اپنے بلیغ فقرے میں ادا کیا ہے کہ

هٰذَا رَجُلٌ سَفِيْهٌ لَمْ يَعْرِفْ نَفْسَهٗ وَلَا دِيْنَهٗ وَلَا دُنْيَاهُ وَلَا اُمَّهٗ وَلَا اَبَاهُ۔ (ص ۳۶۲)	یہ دراصل ایک بے وقوف آدمی ہے، اپنے آپ کو بھی یہ نہیں پہچانتا، نہ اپنے دین کو نہ دُنیا کو، نہ اپنی ماں کو نہ اپنے باپ کو۔[1]

بہر حال کچھ بھی ہو، میں کہنا چاہتا ہوں کہ محض زبانی یادداشت کی شکل میں رہنے کی وجہ

[1] یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ فخر الاسلام غصہ میں کچھ دشنام طرازی پر اتر آئے بلکہ واقعہ کے اظہار کی شکل ہی اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ مطلب ان کا یہ ہے کہ واقعیت پسندی میں بعضوں کا یہی مذاق حد جنون تک پہنچ جاتا ہے اور اسی لئے ان چیزوں کے سوا جنہیں ان کی آنکھوں نے دیکھا ہو، کانوں نے سنا ہو، الغرض اپنے حواس کے معلومات کے سوا دوسروں کی دی ہوئی خبر، صرف اس لئے کہ وہ خبر ہے اور ہر خبر میں سچ ہونے کے ساتھ ساتھ جھوٹ ہونے کی بھی چونکہ گنجائش ہوتی ہے اس لئے خبر سے کہتے ہیں کہ کسی واقعہ کا علم ہو ہی نہیں سکتا، خواہ خبر دینے والا کوئی ہو، کسی قسم کی خبر دے رہا ہو، کسی حال میں دے رہا ہو، اور اپنے اسی وسوسے کو یہ لوگ ایک قسم کا فلسفہ قرار دے کر ان حدیثوں کا بھی انکار کرتے ہیں جن میں ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل وغیرہ کی خبر دی جاتی ہے فخر الاسلام کا خطاب اسی قسم کے وسواسیوں سے ہے کہ دنیا کے معاملات کا تو ظاہر ہے کہ زیادہ تر خبروں ہی پر دارومدار ہے آج اگر اس اصول کو مان لیا جائے کہ خبروں سے واقعات کا علم نہیں حاصل ہو سکتا تو کیا کوئی بے چارہ تاجر تجارت کر سکتا ہے، خبر ہی سے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں چیزیں فلاں جگہ ملتی ہیں، خبر ہی سے اس کو واقفیت ہوتی ہے کہ مال اس کا روانہ ہو گیا ہے یا اسٹیشن پہنچ گیا ہے اور ایک یہی کیا زندگی کے سارے شعبوں کا یہی حال ہے اگر آدمی اس قدر شکی ہو جائے تو چپراسی کو اس کا افسر یہ حکم دے کر بھیجے کہ فلاں صاحب کو بلا لاؤ، چپراسی خبر دے کہ صاحب آپ کو بلاتے ہیں، اس خبر کو سن کر کہنے والا کہنے لگے کہ تو خبر دے رہا ہے خبر جھوٹی بھی ہوتی ہے اور سچی بھی، اس لئے مجھے تیری خبر سے کسی قسم کا علم حاصل نہ ہوا، یہ فرماتے ہوئے اگر افسر کے چپراسیوں کو جو واپس کرتا رہے گا (باقی بر صفحہ آئندہ)

سے جب دنیا کی کوئی منطق اعتماد کی اس چٹان کو ہلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی جو مذہب کے بنیادی حقائق اور اساسی عناصر پر انسانی فطرت عموماً رکھتی ہے تو بتایا جائے کہ حدیثوں کا عام ذخیرہ جس سے پیدا ہونے والے نتائج کی حیثیت مسلمانوں کی دینی زندگی کی تعمیر میں صرف ثانوی عناصر و اجزاء کی ہے، اس حد سے زیادہ محتاط طرزِ عمل پر لب کشائی اور انگشت نمائی کی جرأت محض اس غلط مفروضہ کی بنیاد پر کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ سو سوا سو سال یعنی وقفہ کی مذکورہ بالا مدت جو عہد صحابہ اور مصنفین صحاح کے درمیان گزری، اسی میں قلمبند کر کے حدیثوں کی حفاظت کا انتظام نہیں کیا گیا تھا، بلکہ حفظ اور یادداشت کے ذریعہ سے سینوں سے سینوں تک اس عرصے میں یہ حدیثیں منتقل ہوتی رہی ہیں، ان حدیثوں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معلومات کا جو سرمایہ اس وقت دنیا میں پایا جا رہا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیثوں سے روٹھنے والے ان معلومات کے قبول کرنے سے جو گریز کی راہ اختیار کرنے کی تدبیروں میں مصروف ہیں اور وقتاً فوقتاً طرح طرح کی بدگمانیاں اور تشکیکی شرارے معلومات کے اس مقدس سرمایہ کے متعلق بے اعتمادی

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) آپ ہی خیال کیجئے کہ پاگل خانے کی چار دیواری میں داخل ہونے سے کب تک بچارہ سکتا ہے دنیا کو جانے دیجئے آپ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آتے ہیں، گھڑے میں پانی ہے، پوچھتے ہیں کہ پانی پاک ہے ؟ موذن خبر دیتا ہے کہ جی ہاں پاک ہے۔ آپ خبر قرار دے کر اس کی خبر کو مسترد کر دیتے ہیں۔ آگے جانماز ہے، کیا پاک ہے؛ پھر وہی خبر آپ کو ملتی ہے کہ پاک ہے۔ امام آگے ہوتا ہے کہتا ہے کہ میں باوضو ہوں، میرے کپڑے پاک ہیں، لیکن آپ ہر خبر کو خبر ٹھیرا کر اس سے علم پانے سے انکار کریں گے تو کیا ایک وقت کی بھی نماز آپ پڑھ سکتے ہیں؟ فخر الاسلام نے آگے جو بات کہی ہے وہ یہی واقعہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کو باپ ماں کو ماں ظاہر ہے کہ خبر دینے والوں کی خبروں ہی کی بنا پر تو یقین کرتا ہے لیکن جن کے ہاں خبر سے علم پیدا ہی نہیں ہوتا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اپنے باپ اور ماں کو پہچاننے کے حق سے وہ محروم نہیں ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ خبریں کبھی جھوٹی بھی ہوتی ہیں لیکن جھوٹی اور سچی خبروں میں تمیز کا ایک قانون ہے۔ عوام ممکن ہے کہ اس قانون کی تفصیلات سے اس لئے واقف نہ ہوں کہ وہ زیادہ سوچ بچار سے کام نہیں لیتے، لیکن ہر ایک کی فطرت اس قانون کو پہچانتی ہے اور اسی کی راہ نمائی میں دین و دنیا کا کام چل رہا ہے۔ محدثین نے غور و خوض کے بعد اسی قانون کے تمام اجزاء اور عناصر کی تحلیل کی ہے۔ آئندہ اپنے موقعہ پر انشاء اللہ ان تفصیلات کا تذکرہ کیا جائے گا۔ ۱۲

واقعہ سے کوئی تعلق نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ بات اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی ہے خود سوچئے کہ ان حدیثوں کو مسترد کر دینے کا مطلب لیا ہوا؟ ایمانیوں کا وہی گروہ جن کی ایمانی قوتوں اور ان قوتوں کے آثار و نتائج کا تذکرہ ابھی ہم سے سن چکے ہیں۔ پیغمبر اور پیغمبر کے دین کے ان ہی وفا شعاروں کے متعلق وہ چاہتے ہیں کہ خدا کا پیغمبر ماننے کے باوجود اپنے اسی پیغمبر اور رسول کی طرف ان لوگوں نے جھوٹی باتیں قصداً منسوب کیں۔ اس کو بھی جانے دیجئے کہ پیغمبر کی طرف کسی جھوٹ کو منسوب کرنا خود اپنے اندر کن ہولناک نتائج کو پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔ ایک کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ پیغمبر کی طرف کسی بات کو منسوب کرنا در حقیقت یوں سمجھنا چاہئے کہ منسوب کرنے والا اس کا انتساب اس خدا کی طرف کر رہا ہے جس کی مرضی کی نمائندگی کرنے کے لئے پیغمبر اٹھایا اور بھیجا جاتا ہے۔ پھر کیا جن بزرگوں کی راہ سے ہم تک حدیثیں پہنچی ہیں، ان کو ہم اتنا بڑا مجرم ٹھہرالیں، جس سے بڑا مجرم قرآن کا فیصلہ ہے کہ کوئی دوسرا نہیں ہے، ایک سے زائد جگہوں پر فرمایا گیا ہے کہ اس سے بڑا ظالم اور کون ہے جو خدا پر افترا کرتا ہے اور خدا کی طرف جھوٹ بات منسوب کرتا ہے۔ اف جن کی زندگی از سرتا پا مجرمانہ ہے، کیا خدا کی شان ہے وہی اللہ کے دوستوں، رسول کے جانبازوں کو مجرمین کی اس جماعت میں شریک کرنے کی جسارت کر رہے ہیں جن سے بڑا مجرم قرآن کی رُو سے کوئی نہیں ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان بزرگوں کو مجرم ٹھہرانے کی اس مہم میں چاہتے ہیں کہ سارے مسلمانوں کو گھسیٹ لیں۔ بلاخوف تردید میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انکار حدیث کے فتنہ پردازوں کا آخری انجام یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے۔

حدیث اور رواۃ حدیث کے مقابلہ میں عصری ہنگامہ آرائیوں کا اگر یہ مطلب نہیں ہے بلکہ کہنے والے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دین کے "بینات"[1] کی حفاظت و اشاعت کی جو سرگرمیاں میرآئی

---

[1] بینات کی یہ اصطلاح قرآن سے ماخوذ ہے۔ دین کے ان عناصر و اجزاء کی یہ تعبیر ہے جن کا تعلق دین سے آدمی کے عقلی احساسات کے آگے اتنا واضح و بیّن اور کھلا ہوا ہو کہ سوچنے والے دین کو ان کے بغیر اور ان کے بغیر دین کو سوچ نہیں سکتے۔ توارث و تعامل کی پشت پناہی نسلاً بعد نسل مسلمانوں میں جو چیزیں آغاز اسلام سے منتقل ہوتی ہوئی ان متواترات کی شکل اختیار کر چکی ہیں جن کے انکار کی گنجائش آدمی کی فطرت میں نہیں رکھی دیانی بر عنوانی

ہیں چونکہ صحاح کی عام حدیثوں (یعنی اصطلاحاً جنہیں خبر احاد کہتے ہیں) ان کے ساتھ شروع ہی سے یہ سلوک اختیار نہیں کیا گیا، اس لئے ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج واحکام کو چاہا جاتا ہے کہ اعتماد و وثوق قطعیت کا وہ مقام حاصل نہ ہو جو دین کے بینات اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج واحکام کی خصوصیت ہے، اگر واقعی کہنے والے یہی کہنا چاہتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا منکر کون تھا مجھ ہی سے آپ سن چکے کہ ماننے والوں نے آج ہی کیا ہمیشہ سے یہی مانا ہے، اہمیت میں شرعی قوانین کے ان دونوں سرچشموں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے اس کا قائل ہی کون تھا جس کی تردید کی خواہ مخواہ زحمت اٹھائی جارہی ہے ملی ہوئی بات کو منوانے کے لئے بھلا ان بے ہنگام شورشوں کی کیا ضرورت تھی یہی نہیں بلکہ ان حدیثوں میں بھی کون قائل ہے کہ سب کا درجہ اعتماد میں برابر ہے، جن حدیثوں کی سند میں یعنی بیان کرنے والوں کے سلسلہ میں یا متن میں جہاں جہاں کوتاہیاں پائی گئی ہیں، ان کوتاہیوں سے کس زمانے میں چشم پوشی کی گئی ہے۔ بندگانِ خدا! آپ نے کیا نہیں سنا ہے کہ حدیثوں کے اسی ذخیرے میں صحیح حدیثوں کے ساتھ حسن اور ضعیف حدیثوں کی نشان دہی خود محدثین نے کی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان بزرگوں کے علمی مجاہدات اور جان پر کھیل کر جو معلومات انہوں نے فراہم کئے ہیں ان ہی مجاہدات اور معلومات کی روشنی میں ہم نے ان روایتوں کو پہچانا ہے اور پہچان سکتے ہیں جن کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب درست نہیں ہے۔ الغرض اس سلسلے میں کرنے کا کونسا کام تھا جو اٹھا رکھا گیا ہے۔ آپ اگر ان سے ناواقف ہیں تو آیئے اور مجھ سے اس داستان کی تفصیل سنئے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) گئی ہے، ان کے انکار کی جرأت اسی قسم کی جرأت ہے کہ کوئی یہ کہنے لگے کہ دنیا اسی وقت سے پائی جاتی ہے جب سے ہم اسے دیکھ رہے ہیں، باقی کہنے والے جو یہ کہتے ہیں اور خبر دیتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی دنیا موجود تھی آفتاب ماہتاب پائے جاتے تھے، یہ صرف خبر دینے والوں کی ایک تراشی ہوئی خبر ہے ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو یہی سمجھا جائے گا کہ انسانی فطرت اور اس کے قدرتی اقتضاؤں سے وہ محروم ہو چکا ہے، بالفاظ دیگر پاگل دیوانہ ہے، بہرحال دین اسلامی کے بینات مثلاً قرآن ہی کو لیجئے۔ کیا قرآن کو الگ کرکے کوئی اسلام کو سوچ سکتا ہے اور یہی حال اسلام کی ان ساری چیزوں کا ہے جو اسی راہ سے منتقل ہوتی ہوئی اگلوں سے پچھلوں میں آرہی ہیں جس راہ سے قرآن منتقل ہوتا ہوا آرہا ہے۔ بینات اور غیر بینات کے مباحث کی تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب تدوین فقہ۔ ۱۲

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہی میں مہیا ہو گئی اور کیسی سیاسی طاقت ؟ کل دس پندرہ سے بیس سال کے اندر بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کرۂ ارض کی سب سے بڑی قاہرہ حکومت وسلطنت اسلام کی حفاظت و بقا، تبلیغ واشاعت کو اپنا واحد نصب العین قرار دیتے ہوئے قائم ہو چکی تھی۔ آخر اسی دین اسلام کے بینات کے متعلق بقول ابن حزم دنیا کی سب سے بڑی طاقتور حکومت جب اس تماشے کو پیش کر چکی تھی کہ

وُلِّیَ عُمَرُ فَفُتِحَتْ بِلَادُ الفرسِ طُولًا وَعَرضًا وَفُتِحَتِ الشَّامُ كُلُّهَا وَالْجَزِيرَةُ وَمِصْرَ وَلَمْ يَبْقَ بَلَدٌ إِلَّا وَبُنِيَتْ فِيهِ الْمَسَاجِدُ وَنُسِخَتْ فِيهِ الْمَصَاحِفُ وَقَرَأَ أَئِمَّةُ الْقُرْآنِ وَعَلَّمَهُ الصِّبْيَانُ فِي الْمَكَاتِبِ شَرْقًا وَغَرْبًا وَبَقِيَ كَذٰلِكَ عَشَرَةَ أَعْوَامٍ وَأَشْهُرٍ

(ج ۲ ص ۶۷)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد خلافت کی باگ ہوئی ان کے زمانے میں ایران کا سارا علاقہ فتح ہوا، اسی طرح شام والجزیرہ (دجلہ و فرات کا درمیانی علاقہ) مصر، یہ سارے علاقے فتح ہوئے اور ان تمام ممالک میں ایسا کوئی ملک باقی نہ رہا جس میں مسجد نہ تعمیر ہوئی ہو، ہر ملک میں قرآن کے نسخے لکھے گئے، قرآن کے پڑھنے والوں نے انہیں پڑھا اور مکتب خانوں کے بچوں کو پڑھایا گیا، مشرق و مغرب ہر جگہ یہی کیا گیا۔ حضرت عمرؓ دس سال اور کچھ مہینے زندہ رہے اور ان ہی زمانے میں یہی حال ان سارے مقبوضہ علاقوں کا تھا۔

اسی دس سال کچھ مہینے کے اندر یہ ہوگیا جیسا کہ ابن حزم ہی نے لکھا ہے کہ

وَإِنْ لَمْ يَكُنْ عِنْدَ الْمُسْلِمِينَ إِذْ مَاتَ عُمَرُ مِائَةُ أَلْفِ مُصْحَفٍ مِنْ مِصْرَ إِلَى الْعِرَاقِ إِلَى الشَّامِ إِلَى الْيَمَنِ فَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ فَلَمْ يَكُنْ أَقَلَّ (۰۰)

جس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہوئی تو مصر سے لے کر عراق تک اور عراق سے شام تک، شام سے یمن تک قرآن کے نسخے جو پھیلے ہوئے تھے ان کی تعداد اگر ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔

لہ لڑکے تو لڑکے اسی سے اندازہ کیجیے کہ خراسان جیسے دور دراز مقام میں لکھا ہے کہ ابن عباس کے شاگرد ضحاک بن مزاحم کے مکتب خانوں میں ہزار ہا لڑکوں کے ساتھ ساٹھ سو لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ (ص ۴۰۰ مفتاح السعادۃ ج ۱) اور یہ حال اسلام کے ابتدائی عہد کا ہے۔ ۱۲

قرنِ اول میں حکومت کی طرف سے حفاظت واشاعتِ حدیث کا اہتمام نہ ہونا کوئی امرِ اتفاقی نہیں بلکہ مبنی بر مصلحت ہے

سوال یہی ہے کہ جس حکومت کی طاقت سے یہ کام قرآنی نسخوں کے پھیلانے میں لیا گیا تھا، ہی حکومت اگر چاہتی تو پچیس تیس ہزار حدیثوں کے اس مجموعہ کی حفاظت واشاعت کا انتظام سی پیمانے پر کیا وہ نہیں کر سکتی تھی، جس پیمانے پر قرآن کی حفاظت واشاعت کا فرض انجام دیا گیا س کے قلمرو کے ایک ایک قطعہ اور خطہ کی آمدنی سے لوگ فرعون اور نمرود کی شان وشوکت کو مہیا ر سکتے تھے۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ جس حکومت کے قبضے میں یہ سارے علاقے ہوں وہ کیا کچھ نہیں ر سکتی تھی، میں یہ مبالغہ نہیں کروں گا اگر کہوں کہ جس قاہرہ حکومت کی نصرت وتائید اسلامی دین کو اپنی تاریخ کے ابتدائی دنوں میں میسر آگئی تھی، سونے کے پتروں پر جواہرات کے حروف میں بھی ان حدیثوں کو وہی حکومت اگر لکھوانا چاہتی تو یقیناً لکھوا سکتی تھی۔ اسی الجزیرہ (عراق وعرب) کے حکمرانوں نے فرات ودجلہ کے کنارے سونے کی کتنی گائیں ڈھلوا ڈھلوا کر گڑوا دیں تھیں، یا مصر کے بادشاہوں نے جو کچھ کیا یا جو کچھ وہ کر سکتے تھے، اس کا اندازہ ان کی قبروں سے برآمد ہونے والی چیزوں سے ہو سکتا ہے، آخر مصر ہی کی تو آمدنی تھی، جس سے اسکندریہ میں جیسا کہ کہا جاتا ہے چھ لاکھ کتابوں کا کتب خانہ قائم کیا گیا تھا، پھر اس کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں کہ اسی آمدنی کی وارث حکومت کو پچیس تیس ہزار حدیثوں کے مجموعہ کے لکھوانے سے بھی معذور ومجبور قرار دیا جائے اور یہ حال تو خیر عہدِ صحابہ کا ہے۔ خود نبوت کا جو دَور تھا، مانا کہ اس وقت کی حکومت کے طول وعرض میں اتنا اضافہ نہ ہوا تھا لیکن جو حکومت اس وقت بھی قائم ہو چکی تھی جہاں ابن حزم، ی

کے الفاظ میں اس نے یہ کر کے دکھایا تھا:

اَلْاِسْلَامُ قَدِ انْتَشَرَ وَظَهَرَ فِیْ جَمِیْعِ جَزِیْرَةِ الْعَرَبِ مِنْ مُنْقَطَعِ الْبَحْرِ الْمَعْرُوْفِ بِبَحْرِ الْقُلْزُمِ مَارًّا اِلٰی سَوَاحِلِ الْیَمَنِ کُلِّهَا اِلٰی بَحْرِ فَارِسَ اِلٰی مُنْقَطَعِهٖ مَارًّا اِلَی الْفُرَاتِ ثُمَّ عَلٰی ضِفَّةِ الْفُرَاتِ اِلٰی مُنْقَطَعِ الشَّامِ اِلٰی بَحْرِ الْقُلْزُمِ وَفِیْ هٰذِهِ الْجَزِیْرَةِ مِنَ الْمُدُنِ وَالْقُرٰی مَالَا یَعْرِفُ عَدَدَهٗ اِلَّا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ کَالْیَمَنِ وَالْبَحْرَیْنِ وَعُمَّانَ وَنَجْدٍ وَجَبَلِ طَیٍّ وَبِلَادِ مُضَرَ وَرَبِیْعَةَ وَقُضَاعَةَ وَالطَّائِفِ وَمَکَّةَ وَکُلُّهُمْ قَدْ اَسْلَمُوْا، بَنَوُا الْمَسَاجِدَ لَیْسَ مِنْهَا مَدِیْنَةٌ وَلَا قَرْیَةٌ وَلَا حِلَّةُ الْاَعْرَابِ اِلَّا وَقَدْ قُرِیَٔ فِیْهَا الْقُرْاٰنُ فِی الصَّلَوَاتِ وَعُلِّمَهُ الصِّبْیَانُ وَالرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ۔

(ج ۲ ص ۶۶)

اسلام (عہد نبوت کے آخری زمانے میں) پھیل گیا اور سارا جزیرۂ عرب یعنی بحرِ قلزم سے جو خطۂ یمن کے ساحل سے گزر کر خلیج فارس کے آخری حدود تک پہنچتا ہے اور وہاں سے دریائے فرات پر آکر ختم ہوتا ہے، پھر فرات سے گزرتے ہوئے شام کے آخری حدود پہنچ کر بحرِ قلزم سے خطہ جو مل جاتا ہے اس سارے علاقے میں اسلام غالب آگیا. ظاہر ہے کہ عرب کے اس جزیرے میں شہر بھی تھے اور دوسری آبادیاں بھی تھیں، ایسی آبادیاں جن کی صحیح تعداد اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا مثلاً یمن، البحرین، عمان، نجد، جبل طے، مضر اور ربیعہ و قضاعہ کے علاقے، اسی طرح طائف کا شہر، مکہ کا شہر (عہد نبوت کے آخری عہد میں) ان علاقوں کے باشندے اسلام قبول کر چکے تھے اور مسجد تعمیر کر لیں تھیں، پھر ان میں کوئی شہر کوئی آبادی یا بدویوں کی فرودگاہ ایسی نہ رہی تھی جن میں نمازوں کے اندر قرآن نہ پڑھا جاتا تھا اور مکتب خانوں میں بچوں کو اسی طرح مردوں اور عورتوں کو قرآن نہ پڑھا دیا گیا تھا۔

کیا عہدِ نبوت کی اسی حکومت کے لئے یہ کوئی بڑا مسئلہ ہو سکتا تھا کہ قرآن اور قرآن کے ساتھ دین اسلام کے دوسرے بنیادی عناصر کی اشاعت عام میں اپنی جس طاقت کا مظاہرہ اس شکل میں جیسے اس نے کیا تھا کہ بقول ابنِ حزم:

"پانچ وقتوں کی نمازوں میں یہ کیفیت پیدا ہو گئی کہ مومن، ہو یا کافر کسی کے لئے اس شبہ کی گنجائش ان میں نہ چھوڑی گئی، ان میں ہر ایک جانتا ہے کہ ان نمازوں کو مقررہ اوقات پر پیغمبر اپنے

صحابیوں کے ساتھ پڑھتے رہتے اور جو بھی جہاں کہیں آپ کے دین میں داخل ہوئے وہ بھی ان نمازوں کو پڑھتے رہتے اور آج تک پڑھ رہے ہیں، بغیر کسی شک وشبہ کے اس یقین کو ہر ایک اپنے دل میں پاتا ہے کہ سندھ والے بھی ان نمازوں کو اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اندلس والے ان کو ادا کرتے ہیں، آرمینیہ کے باشندے ان ہی نمازوں کو پڑھتے ہیں جو یمن والے پڑھتے ہیں یہی حال رمضان کے روزوں کا ہے کہ کسی مومن کے لئے شک کی گنجائش باقی رہی اور نہ کافر کے لئے کہ رمضان میں آنحضرتؐ نے روزے رکھے اور جہاں کہیں جو لوگ بھی آپ کے دین میں داخل ہوئے وہ بھی ہر سال ان روزوں کو رکھتے ہیں، اسی طرح نسلاً بعد نسل رمضان کے روزوں کا یہ سلسلہ مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، یہی حال حج کا ہے کہ مومن ہو یا کافر سب جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی حج کیا اور اس کے مناسک کو ادا فرمایا اور ہر علاقہ کے مسلمان ہر سال ایک ہی مہینے میں اس کو ادا کرتے ہیں، الغرض یہ اور اسی قسم کی وہ ساری چیزیں جن کا قرآن میں مطالبہ کیا گیا ہے ان سب کا یہی حال ہے مثلاً زکوٰۃ کی فرضیت، مردار اور سور کی حرمت وغیرہ۔" (الملل والنحل ابن حزم ج ۲ ص ۶۸)

جس طاقت سے کام لے کر ان دینی عناصر کو قطعیت کا یہ رنگ بخشا گیا تھا، کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ قطعیت کے اسی رنگ کو، اسی طاقت اور قوت کو اگر خبر احاد والے احکام و مسائل میں بھی بھرنے کا ارادہ کیا جاتا تھا تو اس مقصد کی تکمیل سے اسی حکومت کو کون روک سکتا تھا، حکومت تو بہرحال حکومت ہی ہوتی ہے، ان ہی حدیثوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ معمولی انفرادی شخصیتوں نے پچھلے زمانے میں جب چاہا تو واقعۃً ان کو آب زر اور سونے کے پانی سے لکھوایا۔ مفتاح السعادۃ میں ابو محمد مزنی ایک عالم کے تذکرے میں لکھا ہے کہ

أَمَرَ بِكِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَبِصَحِيحِ الْبُخَارِيِّ فَكَتَبُوا لَهُ بِمَاءِ الذَّهَبِ مِنَ الْأَوَّلِ إِلَى الْآخِرِ (ج ۲ ص ۷)

کتاب اللہ یعنی قرآن مجید اور صحیح بخاری کے متعلق انہوں نے حکم دیا تو لوگوں نے آب زر سے دونوں کتابوں کو اول سے آخر تک لکھ دیا۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ اتفاقاً کتابوں میں اس قسم کے واقعہ کا ذکر آگیا ورنہ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہوگا اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ طلائی حروف کے قرآن کے نسخے آج بھی جس کا جی چاہے اوسط درجے کے جس اسلامی کتب خانے میں چاہے دیکھ سکتا ہے[۱]۔ قرآن کے لکھوانے میں جو جذبہ کارفرما رہا ہے حدیثوں کے متعلق کیوں سمجھا جائے کہ وہی جذبہ اثر انداز نہ ہوا ہوگا۔ خیال تو کیجیے تیسری صدی ہجری کا زمانہ ہے، ابو عبید نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الاموال" لکھی تھی جس میں "مالیات" کے متعلق عہد نبوت و عہد صحابہ کے آثار جمع کئے گئے ہیں، گو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متصل مسند حدیثوں ہی پر یہ کتاب مشتمل بھی نہیں ہے بلکہ حدیثوں کے ساتھ ساتھ صحابہ تابعین کے آثار اور فتوے سب ہی طرح کی چیزیں اس میں پائی جاتی ہیں، لیکن بایں ہمہ اندازہ کیجیے مسلمانوں کے جذبات کا، ابن عساکر کا بیان ہے کہ احمد بن مہدی بن رستم اصفہانی محدث المتوفی ۲۷۲ھ خود کہتے تھے کہ میں نے ابو عبید سے عرض کیا:

يَا اَبَا عُبَيْدٍ رَحِمَكَ اللّٰهُ اُرِيْدُ اَنْ اَكْتُبَ كِتَابَ الْاَمْوَالِ بِمَاءِ الذَّهَبِ	ابو عبید! اللہ اپنی رحمت آپ پر نازل کرے کہ ایسی کتاب آپ نے لکھی، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب الاموال کو آب زر سے لکھواؤں۔
(ج ۲ ص ۱۰۱)	

لیکن خود ابو عبید نے ابن رستم کو اس سے منع کیا اور کہا کہ حبر (مائل بسرخی سیاہی) سے لکھوانا بہتر ہوگا کیونکہ دیر تک اس کا اثر باقی رہتا ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ ابن رستم نے صرف ارادہ ہی کیا تھا میں سمجھتا ہوں کہ ابو عبید اگر نہ روک دیتے تو ضرور اپنے ارادے کو وہ پورا کر کے رہتے، آخر جس شخص کے متعلق ابن عساکر ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ ان کے پاس حدیث کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا آخر میں بیان کیا ہے کہ

[۱] صوبہ بہار کے ایک دور افتادہ گاؤں خضر چک میں مولویوں کے گھرانے میں ایک کتب خانے کے دیکھنے کا موقع مجھے ملا تھا، منجملہ دوسرے نوادر کے میں نے حدیث کی دعاؤں کی کتاب "حصن حصین" کا ایک نسخہ وہاں دیکھا تھا جس کی زمین نیلم کے پانی سے اودے رنگ سے تیار کی گئی تھی اور حروف اول سے آخر تک طلائی تھے۔ عنوانات اور فصول حل کردہ موتی کے پانی سے لکھے گئے تھے، غالباً ابھی وہ نسخہ خضر چک میں موجود ہوگا۔ ۱۲

[illegible]
[illegible]

[illegible] ([illegible])

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ([illegible])

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]	[illegible]

تھا، اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے جو اصمعی، ان کے شاگرد رشید کی اس ذاتی شہادت سے ثابت ہے یعنی اصمعی کا بیان ہے کہ

"میں دس سال تک ابوعمرو بن العلاء کے حلقہ میں بیٹھا ہوں لیکن کسی لغوی مسئلہ میں شعر کے پیش کرنے کی جب ضرورت ہوئی تو اس شخص نے کبھی اسلامی شاعر (یعنی عہدِ اسلام) کے کلام کو پیش نہیں کیا"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قبل اسلام کے جاہلی شعراء کا کلام ہی ابوعمرو کو اتنا محفوظ تھا کہ اسلامی شعراء کے کلام میں اس مسئلہ کے متعلق شہادت ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ کچھ بھی ہو، یہ ماننا پڑے گا کہ ابوعمرو کا مکان کوئی معمولی غریبوں کا جھونپڑا نہ ہوگا، بصرہ اور کوفہ میں مسلمانوں کی تعمیری ترقیوں کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس حیثیت کے آدمی ابوعمرو[1] تھے، ان کے کتب خانے کا یہ کمرہ کافی طول و عرض بھی رکھتا ہوگا اور بلندی بھی اس کی اسی نسبت سے ہوگی۔ یہ کمرہ نیچے سے اوپر چھت تک کتابوں سے پٹا ہوا تھا، خیال کرنا چاہئے کہ ان کتابوں کی اور جتنے اوراق پر وہ مشتمل ہوں گی ان کی کیا تعداد ہوگی۔ اندازہ میں انتہائی محتاط سے کیوں کام نہ لیا جائے پھر بھی وہ دس بیس کتابیں اور سو دو سو ورق تو کبھی نہیں ہو سکتے، بہرحال اتنا تو یقینی ہے کہ جتنے صفحات میں پچیس تیس ہزار حدیثوں کے متونِ سند کے ایک دو راوی کے ناموں کے ساتھ لکھے جا سکتے ہیں ان سے تو یقیناً ان کی مقدار زیادہ ہی ہوگی۔

میں پوچھتا ہوں کہ پہلی صدی ہجری میں بصرے کا ایک خوش باش شہری تو مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ مہیا کر سکتا ہو لیکن جس حکومت کا وہ ادنیٰ رعیت ہو، اس کو اتنا مجبور و معذور، بے دست و پا فرض کر لینا کس حد تک درست ہو سکتا ہے کہ جاہلی شعراء کے اشعار نہیں بلکہ جس پیغمبر کے صدقہ میں یہ حکومت قائم ہوئی تھی اس کے ملفوظات، گفتار و رفتار، سیرت و کردار کے متعلقہ معلومات کے قلمبند کرنے کا سامان نہیں کر سکتی تھی۔

---

[1] ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ابوعمرو کو پھولوں کا خاص شوق تھا، روزانہ گجرا خریدا جاتا تھا اور باسی پھولوں کو خشک کر کے منہ دھونے کی چیزوں میں کوٹ کر ملا دیا جاتا تھا گویا خوشبودار صابن بنا لیا جاتا تھا۔ ۱۲

اب میں کیا عرض کروں، ابوعمرو بن العلاء کی چھت سے لگی ہوئی ان کتابوں کی صحیح مقدار پر کمرے کی صحیح مقدار کے نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کہنے والے جو کچھ کہہ بھی سکتے ہیں، لیکن اسلام کی ان ہی ابتدائی صدیوں میں اسی حکومت کے ایک عام باشندے ابن عقدہ کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ

تَحَوَّلَ مَرَّةً وَكَانَتْ كُتُبُهٗ سِتُّ مِائَةِ جَمَلٍ — جہاں پہلے رہتے تھے وہاں سے جب ایک دفعہ منتقل ہوئے تو چھ سو اونٹوں پر ان کی کتابیں لدی ہوئی تھیں۔

(الیافعی ج ۱ ص ۳۱۱)

تیسری صدی کے ایک محدث ابن عقدہ جن کی وفات چوتھی صدی میں ہوئی ہے، یہ ان کے کتابی سرمایہ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر اونٹ نو من بوجھ لاد لیتا ہے، حساب کر لیجئے کہ ابن عقدہ کی ان کتابوں کا مجموعی وزن کتنا ہوا۔ گو مورخین نے تصریح تو نہیں کی ہے لیکن غالب قرینہ یہ ہے کہ اس کتابی سرمایہ میں زیادہ تر وہی چیزیں تھیں جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل خاندان، آپ کے اصحاب سے تعلق تھا، کیونکہ ابن عقدہ ان ہی چیزوں کے اپنے وقت میں بے نظیر عالم اور حافظ سمجھے جاتے تھے اور اس کو بھی جانے دیجئے، زمانہ چونکہ آگے بڑھ گیا ہے اس لئے گفتگو کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے، لیکن ابوقلابہ کا نام حدیثوں کی سند میں آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ ان کی وفات ہی ہوئی ہے ۱۰۴ھ میں۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ پہلی صدی ہجری کے علماء میں ہیں، سنئے ان کی کتابوں کی مقدار، الذہبی نے نقل کیا ہے:۔

مَاتَ اَبُوْ قِلَابَةَ بِالشَّامِ فَاَوْصٰى بِكُتُبِهٖ لِاَيُّوْبَ السَّخْتِيَانِيِّ فَجِيْءَ بِهَا فِيْ عِدْلِ رَاحِلَةٍ — ابوقلابہ کا جب انتقال ہوا تو وفات سے پہلے اپنی کتابوں کے متعلق انہوں نے وصیت کی تھی کہ ایوب سختیانی (ان کے شاگرد تھے) ان ہی کے سپرد کر دی جائیں۔ جب ایوب کے پاس آئیں تو ایک اونٹ کا نصف بار تھیں۔

(تذکرہ ج ۱ ص ۸۸)

ساڑھے چار من تو ان کتابوں کا وزن ہونا چاہئے، آئندہ بھی کسی موقعہ پر ابوقلابہ کی کتابوں کا ذکر آئے گا، جہاں بتایا جائے گا کہ زیادہ تر ان کی یہ کتابیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں ہی پر مشتمل تھیں۔

اور قصہ کچھ اسی پر کیا ختم ہو جاتا ہے؟ ابو قلابہ تو بہر حال تابعی ہیں، لیکن ابن عباسؓ تو تابعی نہیں ہیں، ان کے مشہور مولیٰ (آزاد کردہ غلام) کُرَیب بن ابی مسلم کا یہ بیان طبقات ابن سعد میں پڑھیے، موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں:

وَضَعَ عِنْدَنَا كُرَيْبُ بْنُ اَبِىْ مُسْلِمٍ مَوْلٰى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ حِمْلَ بَعِيْرٍ مِّنْ كُتُبِ ابْنِ عَبَّاسٍ (ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۶)	ہمارے پاس عبداللہ بن عباس کے مولیٰ کریب نے ابن عباسؓ کی کتابیں رکھوائی تھیں جو ایک بار شتر تھیں۔

ابن عباس کی ان کتابوں کا انشاء اللہ آگے بھی ذکر آئے گا، اس وقت تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس حکومت کی رعایا کے افراد ایک ایک بار شتر لکھوا سکتے تھے خود اس حکومت کے امکانات کا اس باب میں لوگوں کو اندازہ کرنا چاہئے۔ عہدِ نبوتؐ اور عہدِ صحابہؓ کے متعلق جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ عہدِ جاہلیت سے چونکہ یہ زمانہ بہت زیادہ قریب تھا، اس لئے نوشت و خواند کے ساز و سامان کا اس وقت یہ سہولت میسر آنا آسان نہ تھا، ہم اس کے متعلق پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ جاہلیت کے لفظ کا عوام جو یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ نوشت و خواند سے عرب کے باشندے اسلام سے پہلے قطعاً ناآشنا تھے، یہ صحیح نہیں ہے جاہلیت قرآن کی ایک اصطلاح ہے، ایک سے زائد مقامات پر قرآن نے اپنی اس اصطلاحِ خاص کا تذکرہ کیا ہے، قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص قسم کے خیالات و عقائد، عادات و اطوار کی تعبیر جاہلیت کے لفظ سے کی گئی ہے ورنہ جہاں تک عرب جاہلیت کے حالات سے پتہ چلتا ہے نوشت و خواند میں اس ملک کے باشندوں کی اسلام سے پہلے اگر بالکلیہ نہیں تو قریب قریب وہی حالت معلوم ہوتی ہے جو اس زمانے کے عام متمدن ممالک (ایران روم مصر وغیرہ) کی تھی[1] بعضوں میں غلط فہمیاں تدوینِ قرآن کی ان روایتوں سے پیدا ہوئیں جن میں بیان کیا گیا ہے

[1] یعنی لازمی تعلیم اس زمانے میں جہاں تک تاریخی روایات کا اقتضاء ہے کہیں نہیں تھی، البتہ چین شاید اس حکم سے مستثنیٰ ہو، دوسری تیسری صدی ہجری کے ان سیاحوں نے جو چین پہنچے ہیں ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے لازمی تعلیم کا انتظام اس ملک میں اس وقت جاری تھا۔ بہر حال چین کے سوا ہر ملک میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص طبقہ پایا جاتا تھا، اکثریت اس ہنر سے بیگانہ تھی۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

کہ شروع میں قرآن اونٹ کی ہڈیوں یا کھجور کے عسیب یا لخاف (پتھر) یا ادم (چمڑے) وغیرہ پر لکھا جاتا تھا، سمجھ لیا گیا ہے کہ نوشت وخواند کے ساز وسامان کی کمی کا یہ نتیجہ تھا، حالانکہ پہلے ان الفاظ ہی کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ ان سے واقعی مقصد کیا تھا؟ لوگوں نے دماغ پر اتنا زور دینا بھی گوارا نہ کیا کہ بن گھڑے پتھر یا گری پڑی ہڈیوں پر لکھنے کی شکل ہی کیا ہو سکتی ہے یا کھجور کی شاخ اور اس درخت کے پتوں میں اتنی وسعت کب ہوتی ہے کہ اس پر کچھ لکھا جا سکے، بس کہہ دیا گیا اور لوگوں نے مان لیا، آگے بڑھ گئے. حالانکہ لغت کی کتابوں کا مطالعہ ذرا توجہ سے اگر کیا جاتا تو

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

اور یہی حال عرب کا بھی تھا کہ اکثریت یقیناً نوشت وخواند سے ناواقف تھی لیکن ہر شہر میں کچھ لوگ پائے جاتے تھے جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے. صرف قرآنی وحی کی کتابت کے لئے صحابیوں میں ۴۳ بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے ان کے سوا تلاش اور تتبع سے اس وقت بھی سینکڑوں آدمی کا نام بتایا جا سکتا ہے، ان امور کی تفصیل آپکو میری تدوین قرآن میں ملے گی. جس میں دکھایا گیا ہے کہ عرب ایام جاہلیت میں کتابوں سے بالکلیہ مفلس نہ تھا، یمن وغیرہ میں مختلف خاندانوں میں کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق پائے جاتے تھے. عیسائیوں کے گرجے عرب میں جہاں کہیں تھے ان میں پتہ چلتا ہے کہ ۲۷ کتابیں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں، یہی حال عرب کے یہودیوں کا بھی تھا، مدینہ منورہ، خیبر وغیرہ جہاں کہیں وہ تھے، یہودی مذہب کی کتابوں کا ذخیرہ بھی وہاں پایا جاتا تھا، جن کا ذکر بہ کثرت کتابوں میں کیا گیا ہے. عرب کے یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا عام جاہلی خاندانوں میں "مجلہ لقمان" نامی کتاب کا پتہ چلتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ کتاب پیش بھی ہوئی تھی، ایرانیوں کے شاہنامہ کا عربی ترجمہ کہتے ہیں کہ لایا گیا تھا بلکہ نضر بن الحارث جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایرانی شاہنامہ کو لکھ کر حیرہ سے لایا تھا، اسی کے متعلق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام سے بھی اسی قسم کا تاریخی لٹریچر وہ کہ لایا کرتا تھا، ممکن ہے کہ رومیوں کی تاریخ کا کچھ ہو، ان روایات پر اگر بھروسہ کیا جائے جو در منثور وغیرہ میں سیوطی نے نقل کی ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب کے بازاروں میں یہودی کتابوں کی تجارت بھی کرتے تھے، قرآن میں بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ان ہی یہودیوں کے متعلق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کا عربی میں ترجمہ کر کر کے عربوں میں اس کی اشاعت کرتے تھے. اور یہ تو بخاری میں بھی ہے کہ ورقہ بن نوفل مکہ میں تورات وانجیل کا ترجمہ عربی میں کرتے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ جاہلیت کا جو ماحول جاہلیت کے لفظ سے سمجھ لیا جاتا ہے، یہ درست نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی قسم کا علمی ماحول عرب بھی رکھتا تھا، ابن ابی اصیبعہ کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حارث بن کلدہ باشندۂ طائف نے ایران کی مشہور طبی درسگاہ جندسابور میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی میں ایک طبی کتاب بھی اس نے لکھی تھی. خود عربوں کے قصائد بھی مکتوبہ شکل میں پائے جاتے تھے. ۱۲

معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ سارے الفاظ اصطلاحی ہیں، ان چیزوں کی تعبیر ان الفاظ سے کی گئی ہے جو خاص کر کے لکھنے ہی کے لئے مصنوعی تدبیروں سے اس زمانے میں بنائی جاتی تھیں، آپ ہی سے میں پوچھتا ہوں کہ اسکولوں میں لوگ پتھر پر لکھتے ہیں، اس بیان میں اور اس میں کہ سلیٹ پر لکھتے ہیں، کیا کوئی معمولی فرق ہے، لکڑی پر لکھنا اور تختی پر لکھنا، کیا دونوں ایک ہی بات ہے۔ درحقیقت ہڈیاں ہوں یا لخاف (پتھر) یا کھجور کی شاخ عسیب، عربی زبان کے جو الفاظ اس موقعہ پر استعمال کئے گئے ہیں، ان سے یہ قطعاً عام چیزیں مقصود نہیں ہیں، بلکہ سلیٹ کے لفظ سے جیسے لکھنے کی چیز سمجھی جاتی ہے اگرچہ وہ پتھر ہی سے تیار ہوتی ہے، اسی طرح ان الفاظ سے خاص چیزیں مقصود تھیں، نیز دو دو تین تین آیتیں جو نازل ہوتی رہتی تھیں جن کا تعلق مختلف سورتوں سے ہوتا تھا، ان آیتوں کو ابتدائی یادداشت کے طور ایسی چیزوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھوایا کرتے تھے جو نسبتاً کتابت کی دوسری چیزوں کے لحاظ سے زیادہ پائیدار تھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ سامانِ کتابت کی کمی اور قلت کی وجہ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور مجھے اپنے اس خیال پر اصرار ہے کہ ان چیزوں کا انتخاب قرآن کی نجماً نجماً نازل ہونے والی آیتوں کو قلمبند کر لینے کے لئے اختیار نہیں کیا گیا تھا، بلکہ واقعہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے گویا یہ خیال کرنا چاہئے کہ شعراء کا جیسے یہ عام قاعدہ ہے کہ مصرعے اور اشعار جیسے جیسے تیار ہوتے جاتے ہیں، ان کو چھوٹے چھوٹے پرزوں پر پہلے لکھ لیتے ہیں، اور بعد کو پوری غزل کے تیار ہو جانے کے بعد کسی بڑے کاغذ پر سب کو ایک جگہ جمع کر کے نقل کرتے ہیں، کچھ یہی صورت ان قرآنی آیتوں کی کتابت کی تھی جو تھوڑی تھوڑی مقدار میں نازل ہوتی رہتی تھیں، فرق صرف یہ تھا کہ شاعر اپنی ابتدائی یادداشت کے لئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاغذ ہی کے استعمال کرتا ہے اور قرآنی آیات کی اہمیت کی وجہ سے بجائے کمزور چیزوں کے پرزوں کے ایسی چیزوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے استعمال کئے گئے تھے جو نسبتاً زیادہ مستحکم اور زیادہ پائدار تھیں مثلاً پتھر، ہڈی، کھجور کی شاخ سے لکھنے ہی کے لئے یہ ٹکڑے یا رقعے بنائے جاتے تھے اسی لئے چوبیس پچیس سال بعد عہدِ صدیقی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لکھوائی ہوئی ساری ابتدائی

[illegible]

بھی یقین ملنے کہ ایک مجموعہ کیا ایسے سینکڑوں مجموعے لکھوانے کے لئے کافی ہو سکتا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹھ دس سال کے بعد ہی کیا مصر اسلامی محروسہ میں شریک نہیں ہو چکا تھا۔ مصر اور مصر کے مشہور کاغذ بردی یا پیپرس کے تاریخی تعلقات سے جو واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ حدیثوں کے لکھوانے کے لئے اس کاغذ کی جتنی بڑی مقدار حکومت چاہتی، مصر سے فراہم کر سکتی تھی۔[1]

بہرحال بات ذرا طویل ہو گئی لیکن کیا کیا جائے غلط فہمیوں کی گتھیاں بھی تو کافی دراز اور لمبی ہیں، گرہوں پر گرہیں پڑتی چلی گئی ہیں جب تک ساری گرہوں کو صبر سے کام لیتے ہوئے کھول نہ لیا جائے، جس واقعہ کو پیش کرنا ہے شاید آسانی سے لوگوں کے دماغ میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ دینِ اسلامی کے لحاظ سے جن امور کی حیثیت البینات کی نظر آتی ہے، ان کی حفاظت و اشاعت، تبلیغ و نگرانی میں غیر معمولی اہتمام شروع ہی سے جو کیا گیا اور یہ کیفیت

---

[1] اس مصری کاغذ کی تاریخی تفصیل پر مستقل مضمون ہمارے مرحوم رفیق مولوی جمیل الرحمن غفر اللہ لہ نے ایک مقالہ کی شکل میں جامعہ عثمانیہ کے تحقیقی مجلہ میں شائع کرایا تھا جو پُر مغز معلومات سے معمور ہے، یہ کاغذ مصر میں کب سے بن رہا تھا، کیسے بنتا تھا، اس کی خصوصیت کیا ہوتی تھی، مصر کے سوا اور دوسرے ممالک میں بھی یہ صنعت پائی جاتی تھی، یہ سارے مباحث آپ کو اس مقالے میں ملیں گے۔ مسلمانوں نے مختلف مقامات میں مختلف ملکوں سے اس صنعت کو حاصل کیا۔ لکھا ہے کہ ۳۰۰ھ ہجری میں قطن (روئی) سے کاغذ بنانے کا کارخانہ یوسف بن عمرو نے مکہ میں جاری کیا۔ اسی طرح موسیٰ بن نصیر نے مغرب کے علاقہ میں کتان وغیرہ سے کاغذ بنانے کا طریقہ مروج کیا، ریشم سے بھی کاغذ بنایا جاتا تھا، انہی دنوں میں ایسے چکنے کاغذ تیار ہونے لگے تھے لکھا ہے کہ جس میں آدمی کو اپنا چہرہ تک نظر آ سکتا تھا۔ (دیکھو وفیات الاسلاف للشہاب المرجانی ص ۳۲۷) مسلمانوں نے کاغذ کی طرف اتنی توجہ کی کہ بہت جلد ملک کاغذ سے بھر گیا، سلیمان بن عبد الملک کے زمانے تک کاغذ کی اتنی کثرت ہو چکی تھی کہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے لئے الگ الگ مراسلہ دفاتر سے جاری کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے اس کو اسراف قرار دیا اور حکم دیا کہ ہر چیز کے لئے الگ الگ مراسلے کی ضرورت نہیں بلکہ چند ضرورتوں کا ذکر ایک ہی مراسلہ میں ممکن ہو تو خواہ مخواہ کاغذ ضائع نہ کیا جائے۔ نیز آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ خوش خطی کے لئے موٹے موٹے حروف کا لکھنا غیر ضروری ہے، باریک حروف سے کام نکل سکتا ہے تو اسی سے کام لیا جائے۔ ۱۲

اس غیر بیناتی حصہ میں جو نظر نہیں آتی ہے جس کا عام حدیثوں (یعنی خبر آحاد) سے تعلق ہے تو یہ نہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے اور نہ قرن اول کے مسلمانوں کی بے اعتنائی اور بے توجہی کا العیاذ باللہ اسے نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسباب حفاظت مثلاً کتابت و اشاعت وغیرہ کے سازوسامان کی ابتداء اسلام میں کمی تھی، بلکہ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے میرا دعویٰ ہے کہ ہوا نہیں بلکہ کیا گیا ہے، قصداً و ارادۃً کیا گیا ہے، ایسی صورتیں اور ایسے حالات جان بوجھ کر اختیار کئے گئے جن کا لازمی نتیجہ وہی نکل سکتا تھا جو نکل آیا، یعنی دین کے "بینات" کی حیثیت تو یہ ہوگئی ہے کہ ان کا انکار خود دین کا انکار ہے، گویا کسی کل کے ان اجزا کا انکار ہے، جن کے نکل جانے کے بعد کل کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے، یوں سمجھنا چاہئے کہ جسدِ انسانی کے ساتھ جیسے ان اجزا کا تعلق ہے جن کو نکال لینے کے بعد آدمی زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور ان ہی کے مقابلہ میں وہ چیزیں جو مذکورہ بالا حدیثوں سے پیدا ہوتی ہیں گو دینی زندگی کی تعمیر میں ان سے بھی کام لیا جاتا ہے لیکن حیثیت ان کی ایسے اجزا کی ہے جن کے نکل جانے کے بعد بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آدمی دین سے نکل گیا، گویا جو نسبت جسدِ انسانی سے ان اجزا کی ہے جن کے کٹ جانے اور نکل جانے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے یہ کہنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو اپنی تیسیری اور سہولت پسندانہ خصوصیتوں پر جو ناز ہے[1]، اور یہ سمجھا جاتا ہے اور سمجھا رہا ہے کہ کسی دین میں وہ سہولتیں نسلِ انسانی کو نہیں عطا کی گئی ہیں جن کی آسانیوں سے اس آخری دین میں بنی آدم کو سرفراز کیا گیا ہے، سچ پوچھئے تو سہولتوں کے ان ہی ابواب میں ایک بہت بڑا اساسی اور اصولی باب وہ امتیاز بھی ہے جو دینِ اسلامی کے بیناتی اور غیر بیناتی حصہ میں قصداً و ارادۃً پیدا کیا گیا ہے۔ ابتدا ہی سے ایک ایسا محتاط حکیمانہ طرزِ عمل دین کے ان دونوں شعبوں کے متعلق اختیار کیا گیا، کہ علاوہ بیناتی حصہ کے جو چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کے چوبیس گھنٹوں

---

[1] مسند احمد میں اس روایت کا ذکر کرتے ہوئے جس میں ہے کہ حبشیوں کے حربی رقص کا تماشا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عائشہ صدیقہؓ کو دکھا رہے تھے تو اس میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لِتَعْلَمَ يَهُوْدُ اَنَّ فِىْ دِيْنِنَا فُسْحَةً (یہود کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے دین میں کتنی وسعت و فراخی ہے۔ ۱۲

(در منثور ج ۱ ص ۱۹۳)

کو نبوتِ کبریٰ کے ان مقدس نمونوں سے معمور کھیں جنہیں محبوبیتِ حق کی آسمانی سند حاصل ہے تو ان کے لئے بھی انتہائی سیر چشمی کے ساتھ راہیں بالکل کھلی رکھی گئی تھیں۔ یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے کہ صرف دینی مشاغل اور مذہبی کاروبار ہی کی حد تک نہیں بلکہ سونے میں جاگنے میں، اٹھنے میں، بیٹھنے میں، کھانے میں پینے میں، الغرض زندگی کے ہر شعبہ میں ان ہی نمونوں کے مطابق جینے والے چاہیں تو جی سکتے ہیں اور مرنے والے چاہیں تو مر سکتے ہیں، جن سے بہتر نمونے ارتقاء وعروج کیلئے انسانیت کے آگے نہ ان سے پہلے رکھے گئے اور نہ ان کے بعد پیش ہوئے یا پیش ہو سکتے ہیں۔

اور جہاں ایجابی وسعت دامانیوں کا یہ حال ہے وہیں ان بے چاروں کے لئے جو ان نمونوں کی پیروی سے محروم رہ جانے والے تھے، ان کے لئے یہ کتنی عظیم اور وسیع سلبی سہولت ہے کہ نہ دینی زندگی ہی کے ان نتائج سے ان کو محروم ٹھیرایا گیا ہے جن کا استحقاق مذہب کے بنیاتی حصہ کی تعمیل سے ہر تعمیل کرنے والے کو حاصل ہو جاتا ہے اور نہ ان لوگوں کو بغاوت کے جرم کے مجرم ہونے کا موقعہ دیا گیا ہے جو بدبختی سے ان معلومات ہی کے انکار پر آمادہ ہو جائیں جن سے قدرت کے ان محبوب نمونوں کا علم حاصل ہوتا ہے، اف اگر معلومات کے اس حصہ کو بھی "بینات" ہی کی شکل عطا کر دی جاتی اور چاہا جاتا تو عرض کر چکا ہوں کہ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، "بینات" کو بینات بنانے میں جس قوت سے کام لیا گیا تھا، کونسی چیز مانع ہوتی اگر اس قوت سے کام لے کر ان معلومات کو بھی "بینات" کے قالب میں ڈھال دیا جاتا لیکن سوچئے تو سہی کہ ان نمونوں کی روشنی میں چلنے سے محروم رہ جانے والوں کا انجام اس کے بعد کیا ہوتا۔ خود ان نمونوں کی روشنی میں چلنے سے محروم رہ جانا یہی محرومی کیا کم ہے اور چونکہ ایسی صورت میں دین کے "بینات" سے کترانے اور ہٹنے کے بھی یہ مجرم بن جاتے تو ان خمیازوں سے ان کو کون بچا سکتا تھا جو اس جرم کے لازمی نتائج ہیں، لیکن آپ سن چکے ہیں کہ ان معلومات کی جو موجودہ کیفیت ہے، یعنی خبر آحاد کی شکل میں ان کا ہونا محض اسی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ ان سے پیدا ہونے والے نتائج کا تارک ہی نہیں بلکہ سرے سے ان معلومات کے انکار کرنے والوں کو بھی دین کے دائرہ سے باہر کرنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ دینی زندگی کے ان ثمرات ونتائج

سے بھی ان کو محروم نہیں ٹھہرایا گیا ہے جن کی توقع ایک مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے آنے والی زندگی میں رکھتا ہے، علماء نے تصریح کی ہے کہ

وَ اَفْعَالُہٗ خَارِجَ الصَّلٰوۃِ مِنَ الْمَشْیِ وَاللُّبْسِ وَالْاَکْلِ فَاِنَّ الْعَبْدَ لَا یُطَالَبُ بِاِقَامَتِھَا وَلَا یَاْثَمُ بِتَرْکِھَا وَلَا یَصِیْرُ مُسِیْئًا۔

(کشف بزدوی ج ۲ ص ۳۱۰)

نماز سے باہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے افعال مثلاً آپ کی رفتار آپ کے لباس آپ کے کھانے کے طریقے، تو بندوں سے نہ ان امور کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے اور نہ ان امور کے چھوڑنے والے گنہگار ٹھہرائے جائیں گے نہ ان کو برائی کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔

اور اسی قسم کی چیزیں نہیں بلکہ اسی کتاب میں ہے کہ یہی حکم ان چیزوں کا بھی ہے جن کا نماز ہی سے تعلق کیوں نہ ہو مثلاً

تَطْوِیْلُ الصَّلٰوۃِ فِیْ حَالَۃِ الْقِیَامِ وَ الرُّکُوْعِ وَالسُّجُوْدِ۔

نماز کے قیام و رکوع و سجود میں دیر تک مشغولیت اکا یہی حال ہے)۔

حتیٰ کہ جن سنتوں کا نام سنن الہدیٰ رکھا گیا ہے مشہور اصولی امام ابوالیسر بزدوی کے حوالہ سے صاحب کشف نے ان کا فتویٰ نقل کیا ہے یعنی یہ فرمانے کے بعد کہ

کُلُّ نَفْلٍ وَاظَبَ عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِثْلَ التَّشَھُّدِ فِی الصَّلٰوۃِ وَالسُّنَنِ الرَّوَاتِبِ فَحُکْمُھَا اَنْ یُّنْدَبَ اِلٰی تَحْصِیْلِھَا وَیُلَامَ عَلٰی تَرْکِھَا مَعَ اِثْمٍ یَسِیْرٍ۔

ہر ایسی نفلی عبادت جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باضابطہ پابندی فرماتے تھے مثلاً نماز میں تشہد (یعنی التحیات) اور فرض نمازوں کے بعد جو سنتیں پڑھی جاتی ہیں جنہیں سنن رواتب کہتے ہیں تو ان چیزوں کا بھی حکم یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی تعمیل پر آمادہ تو کرنا چاہئے اور چھوڑنے والوں پر ملامت و نفرت بھی کی جائے گی بتھوڑا سا گناہ کا پہلو بھی اس میں پیدا ہوتا ہے۔

جس کا مطلب یہی ہے کہ دنیا میں اسلامی حکومت ایسوں پر تعزیری کارروائی نہیں کر سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں ایسے آدمی پر ملامت کی جائے اور اس کے طرزِ عمل کو موجب

نفرین ٹھہرایا جائے، رہا آخرت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، صدر الاسلام ابو الیسر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا بہت گناہ اس کو ہوگا لیکن خود یہ گناہ کیا نتیجہ پیدا کرے گا، گو انہوں نے اس کی تعیین نہیں کی ہے لیکن بعض روایتوں کی بنیاد پر فقہاء کا خیال ہے کہ

حِرْمَانُ الشَّفَاعَةِ فِي الْعُقْبٰى (کشف ج ۲ ص ۳۰۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے آخرت میں محرومی کے انجام کو اس کا یہ گناہ اس کے سامنے لائے گا۔ لیکن یہ تو "سنن الھدیٰ" کے ترک کا نتیجہ ہو سکتا ہے، باقی

كُلُّ نَفْلٍ لَمْ يُوَاظِبْ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ تَرَكَهُ فِي حَالَةٍ كَالطَّهَارَةِ بِكُلِّ صَلٰوةٍ وَتَكْرَارِ الْغَسْلِ فِي أَعْضَاءِ الْوُضُوْءِ وَالتَّرْتِيْبِ فِي الْوُضُوْءِ فَإِنَّهُ يُنْدَبُ إِلَى تَحْصِيْلِهِ وَلٰكِنْ لَا يُلَامُ عَلٰى تَرْكِهِ وَلَا يَلْحَقُ بِتَرْكِهِ وِزْرٌ۔ (ج ۲ ص ۳۰۸)

ہر ایسا نفلی فعل جس کی باضابطہ پابندی رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی بلکہ کبھی کبھی اسے چھوڑ بھی دیتے تھے مثلاً ہر نماز کے لئے تازہ وضو، یا وضو میں ہر ہر عضو کو بار بار دھونا یعنی بجائے تین دفعہ کے ایک ہی دفعہ دھولیا جائے) اور وضو کرنے میں اعضاء کی ترتیب (یعنی پہلے منہ پھر کہنی تک ہاتھ پھر مسح پھر پاؤں دھونا) تو اس قسم کے امور کی تعمیل چاہئے تو یہی کہ لوگ کریں، لیکن ان کے چھوڑنے پر نہ وہ ملامت اور نفرت ہی کے مستحق ہیں اور نہ اس کی باز پرس کا باران پر عائد ہوگا۔

بہرحال ان حدیثوں سے جو عام احکام و نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا یہی حال ہے، البتہ بعض ایسی چیزیں جن میں اپنے خصوصی حالات کی وجہ سے خاص قوت پیدا ہوگئی ہے، اگرچہ تواتر کے درجہ تک پہنچ کر "بینات" کا رنگ ان میں نہ پیدا ہوا ہو، مثلاً صاحب کشف نے امام محمد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

مَا كَانَ مِنْ أَعْلَامِ الدِّيْنِ فَالْإِصْرَارُ عَلٰى تَرْكِهَا اسْتِخْفَافٌ بِالدِّيْنِ (ص ۳۱۰)

ایسے امور جن کا شمار دین اسلامی کی نشانیوں میں کیا جاتا ہے تو ان کے چھوڑنے پر اصرار اور حقیقت دین کے وزن کو سبک کرنا (اور اس کی اہمیت کو گھٹانا) ہے

مثال میں لوگ اذان یا اقامت یا عیدین کی نماز کو پیش کرتے ہیں کہ گو ان کا شمار فرائض و واجبات میں نہیں ہے اور سنن ہی میں ان کو داخل سمجھا جاتا ہے مگر پھر بھی فتوی یہی دیا گیا ہے، امام محمدؒ ہی سے منقول ہے کہ

إِذَا أَصَرَّ أَهْلُ مِصْرٍ عَلَىٰ تَرْكِ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ أُمِرُوْا بِهِمَا فَإِنْ أَبَوْا قُوْتِلُوْا عَلَىٰ ذٰلِكَ۔

اگر کسی شہر کے باشندے اذان یا اقامت کے چھوڑنے پر اصرار کرنے لگیں تو ان کو ان اعمال کی بجاآوری کا حکم دیا جائے گا، اگر اس حکم کی تعمیل سے وہ انکار کریں تو پھر ان سے لڑائی کی جائے۔

مگر ذرا ان دقیقہ سنجیوں کا اندازہ کیجئے کہ لوگ ان افعال کے صرف ترک پر نہیں، بلکہ ترک پر اصرار اور حکم دینے کے بعد اس حکم کے ماننے سے انکار پر حکم دیا گیا ہے کہ ان سے لڑائی کی جائے، یعنی فوجی طاقت حکومت ان کے تعمیل کرانے پر استعمال کرے، لیکن فوج کس قسم کے آلات استعمال کرے، لکھا ہے کہ قاضی ابو یوسف کا فتوی تھا کہ ہتھیار سے فوج ان پر حملہ نہ کرے بلکہ عام تادیبی کارروائیاں کی جائیں، البتہ امام محمد کہتے تھے کہ ہتھیار کی قوت ایسے موقعہ پر استعمال کرنی چاہئے۔ قاضی ابو یوسف اس کے جواب میں کہتے تھے کہ

اَلْمُقَاتَلَةُ بِالسِّلَاحِ عِنْدَ تَرْكِ الْفَرَائِضِ وَالْوَاجِبَاتِ وَاَمَّا السُّنَنُ فَاِنَّمَا يُؤَدَّبُوْنَ عَلٰى تَرْكِهَا وَلَا يُقَاتَلُوْنَ عَلٰى ذٰلِكَ لِيَظْهَرَ الْفَرْقُ بَيْنَ الْوَاجِبِ وَغَيْرِهٖ۔ (ص ۳۱۰)

ہتھیار سے فوجی کارروائی فرائض اور واجبات کے ترک پر کی جائے گی، باقی جو باتیں سنت سمجھی جاتی ہیں تو ان کے چھوڑنے والوں کے خلاف صرف تادیبی کارروائی کی جائے گی، سنت کے ترک پر فوجی کارروائی نہ کی جائیگی تاکہ فرض و واجب اور جو چیزیں واجب و فرض نہیں ہیں، دونوں میں فرق واضح ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ بعض چیزیں گو ثابت ہیں وہ حدیثوں ہی سے اور گو تواتر کے درجہ تک وہ نہ پہنچی ہوں لیکن دوسرے حالات نے ان میں کافی قوت پیدا کر دی ہو، جیسے زانی کی سزا رجم یا موزوں

پر مسح اگرچہ ان کے منکر کو بھی کافر نہیں قرار دیا جا سکتا۔

وَلٰكِنْ يُخْشٰى عَلَيْهِ الْاِثْمُ — مگر گناہ کا اندیشہ اس کے متعلق ضرور کیا جائے گا۔

مگر ایسی چیزیں بہت تھوڑی ہیں، باقی ان کے سوا حدیثوں کا جو عام ذخیرہ ہے، شمس الائمہ سرخسی نے مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

مِثْلَ الْاَخْبَارِ الَّتِي اخْتَلَفَ فِيهَا الْفُقَهَاءُ فِيْ بَابِ الْاَحْكَامِ۔ — مثلاً وہ ساری حدیثیں جن کا احکام سے تعلق ہے اور فقہاء کا جن کے متعلق اختلاف ہے۔

مثلاً آمین، رفع یدین اور اسی قسم کے مباحث کی متعلقہ حدیثیں سو ترک تو ترک شمس الائمہ نے فتویٰ نقل کیا ہے:

لَا يُخْشٰى عَلٰى جَاحِدِهٖ الْمَاْثَمُ — ان حدیثوں کے انکار کرنے والوں کو بھی گنہگار ہونے کا ڈر نہیں ہے۔

شمس الائمہ کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں ایک فریق دوسرے فریق کی تائیدی حدیثوں کو جو مسترد کر دیتا ہے تو اس کی وجہ سے یہ الزام قائم کر کے کہ وہ پیغمبر کی حدیثوں کا انکار کر رہا ہے اس کو گنہگار ٹھہرانا قطعاً بے معنی ہے بلکہ ان ہی اختلافی مسائل کی طرف اشارہ کر کے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تو یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ

اِنَّ اَكْثَرَ صُوَرِ الْخِلَافِ بَيْنَ الْفُقَهَاءِ لَاسِيَّمَا فِي الْمَسَائِلِ الَّتِيْ ظَهَرَ فِيْهَا اَقْوَالُ الصَّحَابَةِ فِي الْجَانِبَيْنِ كَتَكْبِيْرَاتِ الْعِيْدَيْنِ وَتَكْبِيْرَاتِ التَّشْرِيْقِ وَنِكَاحِ الْمُحْرِمِ وَتَشَهُّدِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَابْنِ مَسْعُوْدٍ وَالْاِخْفَاءِ وَالْجَهْرِ بِالْبَسْمَلَةِ وَالتَّامِيْنِ وَالْاِشْفَاعِ وَالْاِيْتَارِ — فقہاء اسلام کا جن مسائل میں نقطۂ نظر کا اختلاف پایا جاتا ہے ان کی اکثر صورتیں خصوصاً جن مسائل میں صحابہؓ کے اقوال ہر فریق کی تائید میں ملتے ہیں، مثلاً عیدین کی نماز تکبیروں کی تعداد کا اختلاف، یا تشریق کی تکبیریں، یا مُحرِم (یعنی حج کا احرام باندھے ہوئے جو ہو) اس کے نکاح کے جواز و عدم جواز میں جو اختلاف ہے، اسی طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم کو آہستہ (نمازوں میں) پڑھا جائے یا زور سے، یا آمین کے آہستہ

فِي الْإِقَامَةِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ إِنَّمَا هُوَ تَرْجِيْحُ أَحَدِ الْقَوْلَيْنِ وَكَانَ السَّلَفُ لَا يَخْتَلِفُوْنَ فِي أَصْلِ الْمَشْرُوْعِيَّةِ وَإِنَّمَا كَانَ خِلَافُهُمْ فِي أَوْلَى الْأَمْرَيْنِ وَنَظِيْرُهٗ اخْتِلَافُ الْقُرَّاءِ فِي وُجُوْهِ الْقِرَاءَاتِ۔

(انصاف ص ۸۸)

کہنے یا زور سے کہنے میں، یا اقامت کے کلمات دو دو دفعہ کہے جائیں یا ایک ایک دفعہ، الغرض یہ یا اسی قسم کے دوسرے اختلافات اسی نوعیت کے جو ہیں، تو ان میں اختلاف کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک پہلو کو دوسرے پہلو پر صرف ترجیح دی جاتی ہے (یعنی سمجھا جاتا ہے کہ بہتر اس میں فلاں پہلو ہے) ورنہ سلف کا اس میں اختلاف نہ تھا کہ ان اختلافی پہلوؤں میں سے کوئی پہلو شریعت کے دائرے سے قطعاً خارج ہے بلکہ مشروعیت (یعنی شرعاً دونوں جائز ہیں) اس پر سب کا اتفاق تھا، ان اختلافات کی نوعیت وہی ہے جو قرآنی آیات کی قرات میں قرّاء کے اختلافات کا حال ہے۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ صرف گنہگار ہی قرار دینا نہیں بلکہ ان مسائل میں کسی فریق کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ اپنے مخالف کو برسر غلطی سمجھے، جیسے قرآن کی مختلف متواتر قراءتوں میں سے کسی قرات کے قاری کو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح قرآن نہیں پڑھ رہا ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ صحابہؓ میں بھی اس قسم کے اختلافات موجود تھے، باوجود اس کے جب ان میں ہر ایک علی الہدیٰ اور برسرحق یقین کیا جاتا ہے تو ان کے بعد ان ہی اختلافات کی بنیاد پر کسی ایک فریق کو برسر غلطی قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک مسلک دوسرے مسلک کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے جو تم دیکھتے ہو کہ سلف ان اختلافی مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مسلک کے متعلق اس قسم کے الفاظ لکھا کرتے تھے یعنی

هٰذَا أَحْوَطُ هٰذَا هُوَ الْمُخْتَارُ، وَهٰذَا أَحَبُّ إِلَيَّ وَمَا بَلَغَنَا إِلَّا ذٰلِكَ۔

یہی پہلو احتیاط سے زیادہ قریب ہے، یہی بات پسندیدہ ہے، یہ پہلو مجھے زیادہ مرغوب ہے یا یہ کہ نہیں پہنچی مجھ تک مگر یہی بات۔

سلف کی کتابوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں:

وَهٰذَا اَكْثَرُ فِي الْمَبْسُوطِ وَاٰثَارِ مُحَمَّدٍ وَكَلَامِ الشَّافِعِيِّ۔ (انصاف ص ۸۹)

(مختلف پہلوؤں میں سے کسی مسئلہ کے متعلق کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہوئے مذکورہ بالا نوعیت کے الفاظ) مبسوط اور کتاب الآثار مصنفہ امام محمد (شاگرد ابو حنیفہ) اور امام شافعی کے کلام میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کے کسی گوشہ کو نبوت کی پرچھائیوں اور رسالت کی تجلیوں سے جو خالی رکھنا نہیں چاہتے، دین کے ان دیوانوں، شمع نبوت کے ان پروانوں کے قرار و سکون کے لئے ایک طرف اگر اتنے عظیم و وسیع پیمانے پر انتظام کر دیا گیا ہے جس کا تجربہ کسی پیغمبر کی امت کو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا اور پیغمبر ہی کیا سچ تو یہ ہے کہ پچھلی نسلوں کے لئے اتنے ہمہ گیر ہمہ جہتی معلومات اگلوں کی کسی چھوٹی یا بڑی شخصیت کے متعلق پیش کرنے سے انسانیت کی پوری تاریخ قاصر ہے لیکن جہاں یہ کیا گیا ہے وہیں ان کوتاہ نصیبوں کو بھی مایوس نہیں کیا گیا جن کا سعادت کی اس لازوال دولت میں کوئی حصہ نہ تھا، یا تھا تو بہت کم تھا۔

مولانا انور شاہ کشمیری کا قول

درس بخاری کی املائی تقریر (فیض الباری مطبوعہ مصر) میں اسی مسئلہ کے متعلق حضرت الاستاذ الامام مولانا السید انور شاہ کشمیری قدس سرہ کا یہ فقرہ جو نقل کیا گیا ہے:

اِنْ جُمِعَ الْاَحَادِيْثُ فِيْ عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِنْ كَانَ اَحْسَنَ فِيْ بَادِيَ الرَّاْيِ اِلَّا اَنَّ الْمَرْضِيَّ عِنْدَ ذٰلِكَ كَانَ لَا تُدَوَّنُ الْاَحَادِيْثُ مِثْلَ تَدْوِيْنِ الْقُرْاٰنِ وَلَا يُحْفَظُ حِفْظَهٗ (ج ۱ ص ۲۰۸)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں حدیثیں اگر جمع ہو جاتیں تو گو بظاہر یہ زیادہ اچھی بات نظر آتی ہے لیکن درحقیقت مقصد ہی یہ تھا کہ حدیثوں کی تدوین ہی اس طریقہ سے نہ ہو جیسے قرآن کی تدوین پر غیر معمولی توجہ صرف کی گئی اور قرآن کی حفاظت میں جو دلچسپی لی گئی یہ کیفیت حدیث کی تدوین میں نہ پیدا کی جائے۔

سچ پوچھئے تو اسی اجمال کی یہ تفصیلات تھیں جو اس وقت تک آپ کے سامنے پیش کی گئیں، شاہ صاحب نے اس کے بعد فرمایا کہ دین میں عام حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج کی جو ثانوی حیثیت ہے اس کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ کسی حادثہ کا یہ اتفاقی نتیجہ ہے بلکہ شروع ہی سے ارادہ ہی یہ کیا گیا کہ حدیثوں کا یہ سرمایہ

لَا تَنْتَهِي فِي الْحَتْمِ نِهَايَةً وَلَا تَبلغ فِي الْاهْتِمَامِ بِأَلْفَاظِهَا مَبْلَغُهَا بَلْ تَبْقَى فِي مَرْتَبَةٍ ثَانِيَةٍ يَمْشِي فِيهَا الْإِجْتِهَادُ وَتَحَصُّصُ الْعُلَمَاءِ وَغَوْرُ الْفُقَهَاءِ وَبَحْثُ الْمُحَدِّثِيْن.

قطعیت اور یقینی ہونے میں قرآن کے برابر نہ ہو جائے اور نہ اس کے ساتھ وہ سرگرمی دکھائی جائے (جو قرآن کی تدوین میں دکھائی گئی بلکہ قصداً و ارادةً حدیثوں کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ قرآن کے مقابلہ میں) ان کا درجہ دوسرا ہو گیا۔ ایسا دوسرا درجہ جس کی وجہ سے ان کے متعلق علماء کے اجتہاد اور تحقیق و تدقیق کی، فقہاء کی فکر و نظر اور محدثین کی تلاش و جستجو کی گنجائش ان میں پیدا ہو گئی۔

اور یہ کس لئے کیا گیا، شاہ صاحب اسی کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

لِيَنْفَسِحَ عَلَيْهِمْ اَمْرُ الدِّيْنِ وَ يَتَوَسَّعَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ۔

تاکہ مسلمانوں پر ان کا دین زیادہ کشادہ ہو اور ہر طرح سے سہولتیں اس باب میں ان کو میسر آجائیں۔

اور آخر میں وہی بات کہ عام لوگوں کے لئے دین کو آسان بنانے کی یہی شکل تھی، اسی کی طرف شاہ صاحب مرحوم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

صَدَقَ حَيْثُ قَالَ إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ۔

سچ فرمایا گیا کہ الدین صرف سہولت اور آسانی ہے۔

کتابت و قلتِ رواۃِ حدیث سے متعلقہ

بعض اعتراضات کا جواب

جیسا کہ مسلسل عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ امت کو اپنے پیغمبر سے جو دین ملا ہے اس کا ایک حصہ تعامل و توارث کی قوت کی پشت پناہی میں نسلاً بعد نسل بغیر کسی انقطاع کے اگلی نسلوں سے

پچھلی نسلوں میں تواتر و توارث کے قانون کے تحت اس طریقہ سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے کہ اس کے متعلق اس قسم کا شبہ یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پہنچایا ہوا ہے یا نہیں، اسی قسم کا شبہ ہے کہ کسی کو خود پیغمبر ہی کے متعلق یہ مالیخولیا ہو جائے کہ واقع میں اس نام کے کوئی آدمی تھے بھی یا نہیں، یا تھے تو رسالت کا انہوں نے دعوی بھی کیا تھا یا نہیں. ظاہر ہے کہ جنونی اختلال سے پہلے اس قسم کے شکوک کی کسی صحیح دماغ میں قطعاً گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن اور قرآن کے عملی مطالبات کے تشکیلات اور اس نوعیت کی چیزوں کا یہی حال ہے، یا بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق اس قسم کی ناقابل تزلزل یقین و قطعیت کا دعوی تو نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے متعلق شک اندازی بھی آسان نہیں ہے، حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مسح خفین یعنی موزے پر وضو میں مسح کے متعلق اس قسم کے الفاظ جو منقول ہیں:

أَخَافُ الْكُفْرَ عَلَىٰ مُنْكِرِ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ۔	خفین (یعنی موزے) پر مسح کے انکار کرنے والوں پر مجھے کفر کا اندیشہ ہے۔

یا امام صاحب ہی نے اسی کے متعلق ایک دفعہ یہ بھی کہا کہ

لَمْ أَقُلْ بِالْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ حَتّٰى جَاءَنِيْ مِثْلَ ضَوْءِ الصُّبْحِ۔	خفین (موزے) پر مسح کرنے کا فتوی اس وقت دیا، جب صبح کی روشنی کی شکل میں یہ مسئلہ میرے سامنے آگیا۔

اور اس کی وجہ وہی ہے کہ گو قرآن میں ارجل یعنی "پاؤں" کے دھونے کا مطالبہ کیا گیا ہے جس کا بظاہر مطلب یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ براہِ راست وضو میں پاؤں کو دھونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ بجائے دھونے کے خود پاؤں کو نہیں بلکہ موزہ (خفین) جو پاؤں پر چڑھا ہوا اسی کو کافی قرار دینا قرآنی مطالبہ میں گویا ایک طرح سے ترمیم کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ قرآنی مطالبہ میں ہلکی سی ترمیم بھی کسی ایسی ہی چیز سے ممکن ہو سکتی ہے جو قطعیت اور یقین آفرینی میں قرآن کے مساوی ہو۔ امام صاحب کی پریشانی کا منشاء اس مسئلہ میں واقعہ کی یہی صورت تھی، لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ

قَدْ ثَبَتَ مِنْ سَبْعِيْنَ صَحَابِیًّا (عرف شذی ص ۳۶) (مسح خفین) ستر صحابیوں (کی روایتوں) سے ثابت ہوئی تب امام کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

بہرحال دین کے ان بینات یا بینات کے قریب قریب جو چیزیں ہیں، ان کے سوا دین ہی کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جسے گو منسوب کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن شروع میں پیغمبر کی طرف منسوب کر کے ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ حتیٰ کہ بسا اوقات صحابہؓ کے طبقہ میں یا ان کے بعد بھی ایک دو آدمی سے زیادہ اور کسی سے وہ نہیں سنی گئی ہیں، اصطلاحاً ان ہی چیزوں کا نام خبر آحاد رکھ دیا گیا ہے، سوال یہی ہے کہ جب ان کا بھی دین ہی سے تعلق تھا وہ بھی پیغمبر ہی کی عطا کی ہوئی چیزیں تھیں یعنی قرآنی حکم

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ رسول نے جو کچھ تمہیں دیا اسے لیا کرو اور جس سے روکا اس سے رک جاؤ۔

کے ذیل سے ان کو خارج نہیں کیا جا سکتا ہے تو اسلام کے ابتدائی ایام ہی میں بھی چند خاص افراد تک ان کی رعایت کیوں محدود رہی؟

آغازِ اسلام میں خاص افراد تک روایتوں کے محدود رہنے کی حکمت

علامہ ابوبکر جصاص نے اپنی تفسیر میں اس سوال کو اٹھایا ہے اور خود ہی پھر اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہی بات یعنی چند خاص افراد ہی تک ان روایتوں کا محدود رہنا، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق تبلیغ عام کی کوشش نہیں کی، وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کی اشاعت عمومی رنگ میں فرمائی ہو لیکن بیان کرنے والے اس کے ایک دو آدمی ہوں اس موقعہ پر رویتِ ہلال (چاند دیکھنے) کے مسئلہ کا ذکر کیا ہے، اپنے مطلب کو اسی مثال سے واضح کرتے ہوئے وہی فرماتے ہیں:

"یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک بڑا مجمع چاند کو ڈھونڈ رہا ہو اور آسمان میں کسی قسم کی علت

(یعنی گرد و غبار وغیرہ) بھی نہ ہو اور چاند کے ڈھونڈھنے والوں میں ہر ایک چاہ رہا ہے کہ چاند پر اس کی نظر پڑ جائے، ہر ایک کو اسی کی لَو لگی ہوئی ہے مگر باوجود اس کے صرف چند آدمی اکے دکے تو چاند کو دیکھ پائیں لیکن دوسرے لوگ جن کی آنکھیں صاف ستھری، بھلی چنگی تھیں ان کی نظر چاند پر نہ پڑے (ایسا نہیں ہو سکتا)"۔ (ج ۱ ص ۲۰۲)

ایسی صورت میں جصاص کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ

"یہ چند اکے دکے جنھوں نے چاند دیکھنے کا دعویٰ (اس بھرے مجمع میں) ان عام نہ دیکھنے والوں کے مقابلہ میں جو کیا ہے قطعاً کسی نہ کسی غلطی کا شکار ہیں، یا یہ ہوا ہے کہ خیالی چاند کو انہوں نے چاند سمجھ لیا ہے، یا اگر یہ نہیں ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں"۔

علامہ کا مقصد یہ ہے کہ جیسے رؤیت ہلال کے مسئلہ میں یہی فیصلہ عقل کا ایک فطری فیصلہ ہوگا، بجنسہ اسی طرح ایسی بات جس کی عام اشاعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لوگوں میں کی گئی ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسی عام پھیلائی ہوئی خبر کو صرف ایک دو آدمی ہی بیان کریں، وہ لکھتے ہیں کہ

غَيْرُ جَائِزٍ عَلَيْهَا تَرْكُ النَّقْلِ وَ الِاقْتِصَارُ عَلَىٰ مَا يَنْقُلُهُ الْوَاحِدُ بَعْدَ الْوَاحِدِ۔	اس قسم کی خبر کے متعلق یہ جائز نہ ہوگا کہ عام لوگوں نے اس کی اشاعت و نقل ترک کر دی ہو اور ایک سے ایک اس کو روایت کرے۔

پس معلوم ہوا کہ خبر الواحد بعد الواحد کی راہ سے جو چیزیں امت تک منتقل ہوئی ہیں، ان میں حقیقت خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حزم و عمل کو اس میں دخل ہے۔ عام اشاعت و تبلیغ ان چیزوں سے اس لئے نہیں کرنا چاہتے تھے کہ عوام سے عمومی طور پر عمومیت کا رنگ پیدا کر دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ جو کیفیت اس وقت ان میں پائی جاتی ہے، یہ باقی نہ رہتی، بلکہ عمومی تبلیغ کی وجہ سے بجائے ایک دو کے ان کے بیان کرنے والوں کی تعداد ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کے برابر ہو جاتی،

جن کی تعمیل کا مطالبہ ہر مسلمان سے کیا گیا ہے جو قطعًا خلاف مقصود بات ہوتی۔

اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاط اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ تراویح کی نماز دو تین دن پڑھنے کے بعد آپ نے ترک فرمادی، اور ترک کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا تھا کہ "مجھے ڈر ہوا کہ کہیں فرضیت کی شکل یہ نماز نہ اختیار کرلے" حج کے متعلق پوچھنے والے نے پوچھا کہ کیا ہر سال مسلمانوں پر حج فرض کیا گیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سوال پر خاموش ہو گئے لیکن پوچھنے والے صاحب نے دوسری دفعہ تیسری دفعہ جب سوال کو دہرایا، تب آپ نے یہ کہتے ہوئے کہ ہر سال فرض نہیں ہے، آگے اسی طریقہ تبلیغ کی خصوصیتوں کا اظہار، ان الفاظ میں فرمایا کہ

"جن باتوں کو میں چھوڑ دیا کروں تم لوگ بھی ان کو چھوڑ دو"

بعض روایتوں میں ہے کہ اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

"میں اگر ہاں کہہ دیتا تو پھر ہر سال حج مسلمانوں پر فرض ہو جاتا اور وہ تمہارے بس کی بات نہ تھی۔ دیکھو! تم سے پہلے قومیں اسی کثرتِ سوال اور پوچھ گچھ کے ہاتھوں تباہ ہوئیں"

خود قرآن ہی میں مسلمانوں کو منع کیا گیا تھا کہ ایسی باتیں نہ پوچھا کریں جو اگر بتادی جائیں تو تمہیں ناگوار معلوم ہوں گی اور آخر میں اعلان کر دیا گیا، قرآن میں اعلان کرایا گیا کہ

عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (مائدہ)	معاف کرچکا ہے اللہ ان باتوں کو، قطعًا اللہ بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان دشواری میں نہ مبتلا ہو جائیں، اسی لئے بہت سی باتوں سے قصدًا خاموشی اختیار کی گئی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت حدیث کی کتابوں میں پائی جاتی ہے یعنی فرماتے کہ

اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَحَرَّمَ	بے شک اللہ نے تم پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں تو انہیں کھونا مت اور اسی نے کچھ حدود مقرر کئے ہیں ان کو پھاند نا مت اور اسی نے

أَشْيَاءَ فَلَا تَقْرَبُوْهَا وَتَرَكَ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْهَا۔ (جمع الفوائد بحوالہ رزین)

کچھ چیزیں تم پر حرام کی ہیں تو ان کے نزدیک بھی نہ جاؤ، اور اسی اللہ نے کچھ چیزیں چھوڑ بھی دی ہیں یعنی ان کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے اور ایسا بھول کر نہیں کیا ہے تو ان کو کرید نا مت۔

اور بعض باتوں کا اس سلسلہ میں ذکر بھی فرماتے تو خاص لوگوں سے فرماتے، ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو طرح کی باتیں یاد کی ہیں جنہیں لوگوں میں میں نے پھیلادی ہیں وہ صرف ایک قسم کی چیز ہے۔ عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ساری باتوں کو میں لوگوں سے اس لئے نہیں بیان کرتا کہ جو نہیں جانتے ہیں وہ خواہ مخواہ میری مخالفت کریں گے۔ (جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۸)

حذیفہ بن یمانؓ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی تھے جن سے آپؐ نے بہت سی باتیں فرمائی تھیں جو دوسروں کو معلوم نہ تھیں، خصوصاً آئندہ پیش آنے والے حوادث وواقعات کا خصوصی علم حذیفہؓ کے پاس تھا، بکثرت حدیثوں میں اس کا ذکر آتا ہے کہ کسی صحابی سے آپؐ نے حدیث بیان کی، صحابی نے اجازت چاہی کہ لوگوں میں اس کی اشاعت کروں، آپؐ نے منع کر دیا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ، ابوہریرہؓ اور بھی دوسرے صحابیوں سے اس قسم کی روایتیں نقل کی گئی ہیں اور عام صحاح کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں بلکہ متعدد اصحاب مثلاً زبیر بن العوام، سعد بن ابی وقاص، حذیفہ بن ارقم وغیرہ سے ایسی روایتیں کتابوں میں جو پائی جاتی ہیں کہ لوگوں نے ان بزرگوں سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں بیان کرتے؟ تو فرماتے کہ حدیثیں تو ہم نے بھی سنی ہیں، ہم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارک میں سالہا سال تک رہے لیکن خوف معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے جس کی سزا سخت ہے، صحابہؓ کے ان اقوال سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ان معلومات کی عام اشاعت کے مشغلہ میں مصروف ہو کر خواہ مخواہ اس خطرے کو کیوں خریدیں جس سے بڑا ایمانی خطرہ مشکل ہی سے کوئی ہو سکتا ہے، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کے انتساب کا جرم۔ عرض کر چکا ہوں کہ یہ افترا علی اللہ، خدا پر جھوٹ باندھنے

کی ایک شکل ہے، اور جس کے مرتکب کو قرآن میں سب سے بڑا ظالم ٹھہرایا گیا ہے۔ صرف خود ہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس قسم کی حدیثوں کی عام اشاعت سے صحابہؓ اپنے زمانے میں منع کیا کرتے تھے، ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیح مسلم میں یہ روایت منقول ہے کہ لوگوں کو اس کی تاکید کیا کرتے تھے کہ عام لوگوں کی سمجھ سے جو باتیں باہر ہوں ان کا ان سے ذکر نہ کرنا چاہئے، ورنہ بعضوں کو فتنہ میں یہی باتیں مبتلا کردیں گی (مسلم) حضرت علیؓ کا تو یہ قول مشہور ہی ہے یعنی

حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ اَتُحِبُّوْنَ اَنْ يُّكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ (بخاری وغیرہ)	عام لوگوں سے وہی باتیں بیان کیا کرو جنھیں وہ جانتے پہچانتے ہوں کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اللہ کے رسول کو جھٹلا دیا جائے۔

دارمی نے حضرت علیؓ کے خطبہ کا ایک حصہ نقل کیا ہے جس کا ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ

اِنَّ الْفَقِيْهَ حَقَّ الْفَقِيْهِ مَنْ لَمْ يُقَنِّطِ النَّاسَ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔	سب سے بڑا سمجھ والا آدمی وہی ہے جو عام لوگوں کو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ کرے۔

خود بخاری وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی تاکیدی لہجہ میں صحابہؓ کو حکم دیا کرتے تھے:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔ (بخاری ومسلم)	آسانی اختیار کیا کرو، دشواری میں لوگوں کو مبتلا نہ کرنا خوشخبریاں سنایا کرو (ایسی باتیں نہ کیا کرو) جن سے لوگوں میں نفرت پیدا ہو اور وہ بھاگ جائیں۔

سہیل بن حنیف صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف منسوب کرکے ان الفاظ کو بیان کرتے تھے کہ عام لوگوں کو خطاب کرکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

"لوگو! اپنے اوپر سختی نہ کیا کرو، تم سے پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ اپنے اوپر انہوں نے سختیاں کیں، ان لوگوں کی بچی کھچی یادگاریں اب بھی تم لوگوں کو کلیساؤں اور زیارات (عیسائیوں کی خانقاہوں) میں مل سکتی ہیں"۔ (جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۰ بحوالہ طبرانی فی الکبیر والاوسط)

بہرحال علامہ ابوبکر جصاص نے نکتہ کی بات جو سمجھی ہے یعنی ایسی ساری روایتیں جن کے

بیان کرنے والے اسلام کے ابتدائی دور (عہد صحابہ و تابعین) میں گنتی کے چند آدمی بلکہ بسا اوقات ایک ہی آدمی ہیں، اصطلاحاً جن روایات کا نام خبر آحاد ہے، یا جصاص نے "خبر الواحد بعد الواحد" کے الفاظ سے جن کی تعبیر کی ہے، اپنی کتاب "الرسالہ" میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے علم الخاصہ من خبر الخاصہ (الرسالہ ۲۱) یا "خبر الواحد عن الواحد حتی ینتہی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (یعنی ایک سے ایک سے سنتا تا اینکہ اسی طرح یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو) وغیرہ الفاظ سے ان کو موسوم کیا ہے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا وہی حصہ ہے جس کی عام اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لئے ان کا ذکر بھی عام لوگوں سے نہیں بلکہ خاص خاص صحابیوں سے فرمایا گیا۔

بہرحال دین کے بیناتی و غیر بیناتی حصوں میں مطالبہ اور گرفت کی قوت و ضعف کے لحاظ سے مدارج و مراتب کے جس فرق کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کرنا چاہتے تھے اس کی یہ پہلی تدبیر تھی جو اختیار کی گئی تھی، یعنی بیناتی حصہ کی تو عام اشاعت کا عام انتظام کیا گیا اور اسی کے مقابلہ میں غیر بیناتی چیزوں کے متعلق اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ ان میں عمومیت کا وہ رنگ نہ پیدا ہو جو ان کو بیناتی عناصر و اجزاء کے ساتھ مشتبہ کر دے۔

لیکن مراتب کے اس فرق کو پیدا کرنے میں نبوت کی اور نبوت کے بعد نبوت کے کاموں کی تکمیل کرنے والے بزرگوں یعنی خلفائے راشدین کی نگرانیاں کیا اسی حد تک محدود تھیں، واقعات سب ہی کو معلوم ہیں، لیکن ان کے اسباب کیا تھے تفصیل کے ساتھ لوگوں نے اس کے سمجھنے کی کوشش جیسی کرنی چاہئے شاید نہیں کی۔

ممانعتِ تحریرِ حدیث کی روایت خود تحریرِ حدیث پر دلالت کرتی ہے،

آخر میں پوچھتا ہوں کہ حدیث کے متعلق بے اعتمادی پھیلانے والوں کی طرف سے پہلی بات جو یہ پیش ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حدیثیں لکھی نہیں گئیں بلکہ لکھنے کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت کر دی تھی، میرا اشارہ صحیح مسلم کی اس مشہور حدیث کی طرف ہے یعنی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ شَيْئًا فَلْيَمْحُهُ۔ (۲)

جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہے تو چاہئے کہ اس کو مٹا دے۔

مگر میں کہتا ہوں کہ دوسری کوئی روایت اگر نہ بھی ہوتی صرف یہی ایک حدیث اور اس حدیث کے یہی الفاظ بھی ہوتے تو اسی کو عہد نبوت میں کتابتِ حدیث کا وثیقہ بنایا جاسکتا ہے یعنی اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو آنحضرتؐ کی زندگی ہی میں آپ ہی کے زمانہ میں صحابہؓ قلمبند کرنے لگے تھے، آخر خود غور کیجئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ "من کتب عنی غیر القرآن (جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہے) کیا اپنے الفاظ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اطلاع نہیں دے رہے ہیں کہ بعض لوگوں نے قرآن کے سوا بھی حدیثوں کو لکھنا شروع کیا تھا، خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے عہدِ نبوت میں حدیث کے عدم کتابت کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں، یہ تو الگ بات ہے مگر حدیث عہد نبوت میں بھی لکھی جاچکی تھی اس کی شہادت تو بہر حال اس سے فراہم ہوتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عدم کتابت کے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے صرف حدیث کے اتنے الفاظ کافی نہیں ہیں بلکہ دعوی کرنے والوں پر اس کا بار ثبوت ہے کہ پیغمبر کے اس حکم کی صحابہ نے تعمیل بھی کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پیغمبر کے حکم کی صحابہ تعمیل نہ کرتے تو اور کون کرتا لیکن کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جس حدیث کو آپ لوگ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش فرما رہے ہیں، اس میں تو اس کا ذکر نہیں ہے یعنی اس میں یہ نہیں ہے کہ حضورؐ کے اس ارشاد کے بعد لوگ لکھنے سے رک گئے اور جن کے پاس حدیثوں کا جو لکھا ہوا سرمایہ تھا اسے انہوں نے مٹا دیا یا ضائع کر دیا، البتہ صحابہ کے عام حالات کی بنیاد پر یہ استنباطی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کو جب حکم دیا گیا تھا تو اس حکم کی تعمیل چونکہ انہوں نے ضرور کی ہوگی اس لئے ماننا چاہئے کہ اس حکم کے بعد حدیثوں کی کتابت کا سلسلہ بھی رک گیا اور جو کچھ لکھا گیا تھا اسے ضائع کر دیا گیا۔ پس اصل حدیث کے ساتھ جب تک اس بیرونی اضافے کو نہ جوڑا جائے آپ کا دعوی ثابت نہیں ہوتا اور سچ تو یہ ہے کہ اس

خارجی اضافے کے بعد بھی جو کچھ آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کا اثبات مشکل ہے۔ آخر زیادہ سے زیادہ کہنے والے یہی تو کہہ سکتے ہیں کہ صحابہ کی تعمیلی جذبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا چاہئے کہ لکھنے کے بعد جن جن لوگوں کو اپنی مکتوبہ حدیثوں کے مٹانے یا ضائع کرنے کا موقعہ ملا انہوں نے ضائع کر دیا ہوگا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ہر ایک کو اس کا موقعہ ضرور ہی ملا ہوگا۔ آخر ان ہی لکھنے والوں میں جن کی وفات ہو چکی ہوگی، اگر کوئی مسودہ ان کے گھر پڑا رہ گیا ہو یا وفات ہی نہیں تبدیل مقام مثلاً مکہ سے مدینہ ہجرت کر جانے کی وجہ سے یہ ہو سکتا ہے کہ بعضوں کی رسائی اپنے لکھے ہوئے مسودات تک آسان نہ ہو، اسی قسم کے دوسرے موانع بھی پیش آسکتے ہیں اور یہ ساری باتیں اس وقت ہیں جب یہ مان لیا جائے کہ جن لوگوں کو یہ حکم دیا گیا تھا ان میں ہر ایک تک نبوت کا یہ ارشاد پہنچ بھی گیا اور جن تک پہنچا انہوں نے یقین بھی کر لیا ہو کہ اس حکم کی تعمیل واجب ہے، حالانکہ اس کا ثابت کرنا بھی آسان نہیں ہے۔[1]

مذکورہ ارشاد نبوی کی حقیقت

اور سچ تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا حکم کیوں دیا گیا تھا، جہاں تک میں جانتا ہوں عموماً اس کے تفصیلات پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ ایک عام غلط فہمی جو پھیلی ہوئی ہے کہ عہد نبوت

---

[1] آخر لکھے ہوئے الفاظ کے مٹانے ہی کا تو وہ قصہ ہے جس کا صلح حدیبیہ کے صلح نامے کے سلسلہ میں ذکر کیا جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے الفاظ حضرت علیؓ لکھ لیتے ہیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی حضرت علی کو حکم دیتے ہیں کہ ان الفاظ کو مٹا دو مگر حضرت علیؓ تعمیل سے قطعی طور پر اپنے آپ کو معذور بتاتے ہیں اور ان مکتوبہ الفاظ کے مٹانے کے حکم کی حضرت علی تعمیل نہیں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کا تعمیل حکم سے گریز یا انکار کسی سرکشی اور بغاوت پر مبنی نہ تھا بلکہ اس انکار میں تعمیل کا ایسا عمیق جذبہ پوشیدہ تھا جس پر ہزاروں تعمیلی جذبات قربان کر دیئے جاسکتے ہیں۔ یہ تو موقعہ اور محل کی بات ہوتی ہے، بسا اوقات انکار ہزارہا اقرار پر بھاری ہو جاتا ہے، حکم دینے والے اور جنہیں حکم دیا گیا جس حال میں دیا گیا اور جس چیز کا حکم دیا گیا ہو ان ساری خصوصیتوں کو پیش نظر رکھ کر ایسے موقعہ پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ بعض صحابہ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اشاعتِ عام کا رنگ ان حدیثوں میں نہ پیدا ہو اس لئے مکتوبہ حدیثوں کے مٹانے کا حضورؐ نے حکم دیا ہے، چونکہ میری مکتوبہ حدیثوں سے اشاعتِ عام کی کیفیت پیدا نہ ہوگی۔ اس لئے میں نہ مٹاؤں تو کیا حرج ہے۔ بہر حال سب سے بڑی دلیل جو مخالفین حدیث کی طرف سے حدیثوں کی بنیاد کو متزلزل کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کتنے گوناگوں احتمالات سے وہ بھری ہوئی ہے۔ ۱۲

جو جاہلیت سے بالکل متصل عہد تھا اس میں نوشت و خواند، کتابت کے ساز و سامان کی بھی عرب میں بہت کمی تھی اور ایسے لوگ جو لکھنا جانتے ہوں صحابہ میں محض گنتی کے چند آدمی تھے مان ہی عام سطحی معلومات سے متاثر طبائع نے سمجھ لیا کہ عہد نبوت میں حدیثیں اگر کچھ لکھی بھی گئی ہوں گی تو ان کے لکھنے والے گنے چنے چند صحابی ہی ہوں گے، حالانکہ جہاں تک واقعات اور روایات کا تعلق ہے واقعہ کی صورت حال اس سے بالکل مختلف معلوم ہوتی ہے۔

نوشت و خواند اور اس کے جاننے والوں کے قحط و قلت کی غلط فہمیوں کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا اس کتاب میں بھی اور دوسری کتابوں میں بھی ان کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا ہوں، اسی کتاب میں کسی جگہ اس کی بحث آچکی ہے۔ غالباً ناظرین کے دماغ میں ابھی وہ معلومات تازہ ہوں گے اس لئے ان سے قطع نظر کرتے ہوئے میں آپ کے سامنے بعض نئی روایتیں اسی سلسلہ کی پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ اس موقعہ پر عموماً یہ جو سمجھ لیا گیا ہے یا اب بھی سمجھ لیا جاتا ہے کہ حدیثوں کی کتابت کا تعلق محض معدودے چند محدود افراد تک ہوگا، معلومات سے کتنی ناواقفیت پر یہ خیال مبنی ہے، سنئے مجمع الزوائد میں ہیثمی نے اس کی تصریح کرتے ہوئے کہ اس روایت کے بیان کرنے والے سب صحیح بخاری کے راوی ہیں، یہ ہیثمی کے بجنسہ الفاظ اس روایت کے راویوں کے متعلق ہیں۔ بہر حال عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کی یہ روایت ہے، میں بجنسہٖ ان کے الفاظ ہی نقل کر دیتا ہوں:

قَالَ كَانَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاسٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ وَاَنَا مَعَهُمْ وَاَنَا اَصْغَرُ الْقَوْمِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ فَلَمَّا خَرَجَ الْقَوْمُ قُلْتُ كَيْفَ	عبداللہ بن عمرو بن عاص صحابی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آپ کے صحابیوں میں سے کچھ حضرات تھے، میں بھی ان ہی میں تھا اور ان سب سے عمر میں چھوٹا میں ہی تھا (اسی مجلس میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جان بوجھ کر جو میری طرف جھوٹ کو منسوب کر کے بیان کرتا ہے اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

يُحَدِّثُوْنَ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ سَمِعْتُمْ مَا قَالَ وَاَنْتُمْ تَنْهَمِكُوْنَ فِي الْحَدِيْثِ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضَحِكُوْا وَقَالُوْا يَا ابْنَ اَخِيْنَا اِنَّ كُلَّ مَا سَمِعْنَا مِنْهُ عِنْدَنَا فِيْ كِتَابٍ.

(رواه الطبرانی (مجمع الزوائد)

(عبداللہ کہتے ہیں کہ) مجلس مبارک سے لوگ جب باہر نکل آئے تو میں نے کہا کہ آپ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے باتیں بیان کرتے ہیں ایسا کیوں کرتے ہیں جب رسول اللہ سے سن چکے کہ آپ نے اس کے متعلق کیا فرمایا حالانکہ آپ لوگ رسول اللہ کی طرف منسوب کر کر کے باتیں بکثرت بیان کرتے ہیں؟ (عبداللہ کہتے ہیں کہ) میری بات سن کر (سننے والے صحابہ) ہنسنے لگے اور بولے کہ میرے بھائی کے بیٹے! ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنا ہے وہ سب کتاب میں ہے یعنی نوشتہ اور لکھا ہوا ہے۔

مذکورہ بالا روایت کے الفاظ ہی میں نے پیش کر دیئے ہیں، کیا اس سے حسب ذیل نتائج نہیں پیدا ہوتے؟

۱۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب عبداللہ بن عمرو بن العاص کمسن[1] تھے۔

۲۔ عبداللہ بن عمرو کی کمسنی کے زمانہ میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو صحابہ لکھ لیا کرتے تھے۔ کُلُّ مَا سَمِعْنَا مِنْهُ عِنْدَنَا فِيْ كِتَابٍ میں کُلّ کا لفظ خاص طور پر لائق توجہ ہے۔

پس اگر یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر سنی ہوئی بات کو ایک دو آدمی نہیں بلکہ عموماً سننے والے لکھ لیا کرتے تھے اور ان کے اس طریقہ کار کو اسی حال پر چھوڑ دیا جاتا تو مذہب کے ساتھ انسانی نفسیات کا جو تعلق ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوچنا چاہئے کہ بالآخر اس کا نتیجہ کیا ہوتا، غور کرنا چاہئے کہ ان نتائج میں جو ان حدیثوں سے پیدا ہوتے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ عام کی راہ سے مسلمانوں میں جن چیزوں کی اشاعت فرما رہے تھے ان دونوں سے پیدا ہونے والے نتائج میں کیا کوئی فرق باقی رہ سکتا تھا؟

---

[1] اگرچہ بالاتفاق لوگوں نے لکھا ہے کہ اپنے باپ عمرو بن العاص سے پہلے بیعت اسلام کے شرف سے مشرف ہونے کا موقعہ ان کو ملا لیکن پھر بھی ان کی عمر کا حساب کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد یہ مدینہ منورہ ہی پہنچ کر مسلمان ہوئے ہیں۔ ۱۲

کثرت سے ان کے مکتوبہ مجموعے تیار ہو جائیں گے تو بتدریج ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام ونتائج میں اور قرآنی آیات سے پیدا ہونے والے احکام ونتائج میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا، انسانی فطرت اور اس فطرت کے خصوصیات پر جس کی نظر ہے وہ بھی بآسانی اس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے ، پھر پیغمبر کی نظر تو پیغمبر ہی کی نظر تھی جن سے زیادہ بنی آدم کی فطرت کا پہچاننے والا اور کون ہو سکتا ہے.
باقی یہ کہنا جیسا کہ بعضوں نے حدیثوں کی کتابت کی ممانعت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن میں اور حدیثوں میں خلط ملط ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت کر دی مگر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہر لکھی ہوئی چیز کو صحابہ یا ان کے بعد مسلمان قرآن کیوں سمجھ لیتے ۔ آخر جس وقت قرآن نازل ہو ہو کر لکھا جا رہا تھا اسی زمانہ میں تورات وانجیل کے بیسیوں نسخے عرب ہی میں موجود تھے، ان سے اختلاط کا شبہ کیوں نہ ہوا نہ صرف توراۃ وانجیل بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ عرب ہی میں لقمان کا مجلہ بھی مکتوبہ شکل میں پایا جاتا تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسیوں خطوط لکھوائے اور لکھواتے رہتے تھے بس یہ سمجھ لینا کہ محض مکتوب ہو جانے کی وجہ سے لوگ غیر قرآنی چیزوں کو قرآن سمجھ لیتے، کم از کم میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی ۔

بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ ان دو چیزوں میں یعنی عمومی اشاعت جن چیزوں کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے ان میں اور جن چیزوں کے متعلق اشاعتِ عام کا یہ طریقہ نہیں اختیار فرمایا جاتا تھا ان دونوں کے نتائج واحکام میں فرق پیدا کرنے کی یہی صورت تھی مگر لوگوں نے ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کر لیا تھا یعنی جیسے نازل ہونے کے ساتھ قرآن لکھ لیا جاتا تھا اسی طرح سننے کے ساتھ حدیثوں کو بھی لکھنے لگے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت فرما دی، گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلامی دین کے ان دونوں سرچشموں میں اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج واحکام کے مطالبہ کی قوت وضعف کا جو فرق آج سارے جہان کے مسلمانوں کا مانا ہوا اور مسلمہ مسئلہ ہے اس فرق کو باقی رکھنے کی کوشش میں یہ پہلا تاریخی اقدام تھا جو نبوت ہی کے عہد میں خود

بارگاہِ رسالت کی طرف سے اختیار کیا گیا۔ واقعہ کی جو اصل صورت ہے وہ تو یہی تھی باقی اس زمانے کے قیل شناسوں کا ایک گروہ اسی قسم کی روایتوں سے جو نتیجہ نکالنا چاہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء مبارک یہ تھا کہ آپ کی حدیثوں سے مسلمان اپنی دینی زندگی میں مستفید نہ ہوں، اسی لئے لکھنے والوں کو حدیثوں کے لکھنے سے روک دیا گیا تھا اور جو لکھ چکے تھے ان کو حکم دیا گیا کہ ان مکتوبہ حدیثوں کو ضائع کردیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ بدبختوں کی اس ٹولی نے تیرہ سو سال بعد ان روایتوں سے آخر یہ نتیجہ کیسے پیدا کرلیا۔ دور کیوں جائیے اسی روایت میں جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کی تعمیل میں صحابہ نے اپنے لکھے ہوئے مسودوں کو نذر آتش کردیا، اس کے آخر میں ہے کہ

فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ فَنَتَحَدَّثُ عَنْكَ قَالَ تَحَدَّثُوْا عَنِّيْ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذِبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔	تب ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کی طرف منسوب کرکے ہم زبان سے بھی نہ بیان کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہماری طرف منسوب کرکے زبان سے بیان کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور جان بوجھ کر جھوٹ کو میری طرف منسوب کرکے جو بیان کرے گا چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ وہ جہنم کو بنالے۔

سوال یہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اگر یہی منشاء ہوتا جو کوتاہ نصیبوں کی یہ جماعت کہتی ہے تو صحابہ کے اس سوال پر کہ آپ کی حدیثیں کیا زبانی بھی لوگوں سے ہم بیان نہ کریں بظاہر ہے کہ اس کے جواب میں بجائے یہ فرمانے کے کہ "ہاں! مجھ سے حدیثیں بیان کیا کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے" یہ کہنا چاہئے تھا کہ "نہیں ہرگز ہرگز نہیں" بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ لکھنے کی ممانعت جو اس زمانہ میں کی گئی، اگر اس کی غرض یہی تھی کہ مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے استفادہ کا موقعہ نہ ملے تو بجائے اس مشہور حدیث کے جس کا آخر میں یہاں بھی تذکرہ کیا گیا ہے یعنی وہی مَنْ كَذِبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (جو جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کو منسوب کرے گا اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے) بجائے اس کے جھوٹ ہو یا سچ ہر قسم کی بات کو آپ کی طرف منسوب کرکے بیان کرنے کی ممانعت فرمادیتے بلکہ منکرین حدیث جس لب ولہجہ میں گفتگو

کر رہے ہیں اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں سے بجائے کسی فائدے کے مسلمان طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ خاکم بدہن العیاذ باللہ اگر پیغمبر کی گفتار و رفتار سیرت و کردار کے یہی نتائج تھے اور جیسا کہ ان دیوانوں کا بیان ہے کہ ان ہی خطرات کو محسوس کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیثوں کی کتابت سے صحابہ کو روک دیا تھا، تو پھر اب میں کیا کہوں بعض روایتوں سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط منسوب کرنے کی وجہ سے حکم دیا گیا تھا کہ اس کو قتل کر دیا جائے اس سزا کو صرف انہی لوگوں کی حد تک محدود نہ ہونا چاہئے تھا بلکہ جب پیغمبر کی باتوں سے مسلمانوں کو نقصان ہی پہنچنے والا تھا، تو غلط ہی نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح باتوں کو بھی منسوب کر کے بیان کرنے والوں کو اگر یہ نہیں تو کم از کم کسی نہ کسی سزا کا مستوجب قرار دینا چاہئے تھا۔ سو سزا تو سزا مضمون کے ابتدائی اوراق میں متعدد روایتیں گزر چکی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کو دوسروں تک پہنچانے والوں کو دعائیں دی گئی ہیں، آرزو کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کے چہروں کو تر و تازہ شاداب و بشاش رکھے۔

صرف یہی نہیں کہ زبانی بیان کرنے والوں کی ہمت افزائیاں مختلف الفاظ میں فرمائی گئی ہیں بلکہ جیسے مذکورہ بالا بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کے قلم بند کرنے کی ممانعت کی گئی تھی، اسی طرح روایتوں ہی سے یہ بھی ثابت ہے کہ ایک سے زیادہ صحابیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کے حدیثوں کے لکھنے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔ اجازت ہی نہیں بلکہ بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کے بھول جانے کی شکایت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بعض صحابیوں نے کی تو آپ نے ان کو ہدایت کی کہ اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو (ترمذی) بعضوں میں یہ بھی ہے کہ قَیِّدُوا الْعِلْمَ بِالْکِتَابِ[1] (علم کو لکھ کر مقید کرو) اور میں تو کہتا ہوں کہ کتابت کے متعلق مذکورہ بالا روایتوں کے متعلق تو کچھ گفتگو کی سنداً گنجائش بھی ہے، لیکن صحیح حدیثوں سے جب یہ

---

[1] پہلی روایت ترمذی کی ہے لیکن روایت کی صحت پر ترمذی نے شبہ کا اظہار کیا ہے۔ دوسری روایت کا ذکر ابن عبدالبر نے اپنی مسلسل سند کے ساتھ کیا ہے بہ ظاہر اس روایت کی سند میں کوئی قابل اعتراض راوی نہیں معلوم ہوتا۔ (دیکھو جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۲)

ثابت ہے کہ حدیثوں کے بھول جانے کی شکایت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابیوں نے کی تو بعض دعائی تدبیروں سے ان کے حافظہ کو قوی کر دیا گیا[1] سوال یہ ہے کہ جب یہی مقصود تھا کہ کسی طرح امت میں آپ کی حدیثوں کا ذکر نہ پہنچنے پائے۔ لکھنے سے ممانعت کی بھی یہی غرض اگر تھی تو ان صاحب کے حافظہ کو بجائے قوی کرنے کے چاہیئے تھا کہ اور کمزور کر دیا جاتا تاکہ کوئی بات ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کو یاد نہ رہتی، خود بخود روایتوں کی منتقلی کا دروازہ اس تدبیر سے بند ہو جاتا۔

کتابتِ حدیث کی روایات و دلائل

یہ کتنی بڑی علمی خیانت ہے کہ حدیثوں کو مضمحل کرنے کے لئے تو اس زمانے کے بے باکوں کا طبقہ انتہائی فراخ دلی سے کام لیتا ہے، کمزور سی کمزور روایت سے ان کا کام چلتا ہو تو اس کے پیش کرنے سے وہ نہیں چوکتا اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ روایتوں کے متعلق بے اعتباری پھیلانے کے لئے لوگوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ان کی پیش کردہ روایتوں پر جو بہر حال روایتیں ہی ہیں ان پر اعتماد کیا جائے اس غیر منطقی طرزِ عمل کی وہی بتائیں کہ کیا توجیہ کر سکتے ہیں۔ حالانکہ دیانت و امانت کا اقتضا تو یہ تھا کہ جب روایتوں ہی سے کام لیا جا رہا ہے تو ساری روایتوں کو پیش نظر رکھ کر نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی آخر یہ بھی کوئی صحیح تحقیق و تلاش کا طریقہ ہوا کہ پہلے ایک نصب العین طے کر لیا جاتا ہے اور اس کے بعد روایتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس مفروضہ نصب العین کی تائید جن روایتوں سے ہوتی ہو اُن کو تو اُچھال اُچھال کر آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے اور جن سے اس طے شدہ نصب العین پر زد پڑتی ہو اُن سے گزرنے والے آنکھیں میچ میچ کر گزر جاتے ہیں آخر اسی قصہ میں دیکھئے حدیثوں کے لکھنے کی پیغمبر نے ممانعت کر دی تھی۔ اس کا ذکر تو بڑے زور شور سے کیا جاتا ہے لیکن جن روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر ہی نے حدیثوں کے لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی ان کے ذکر سے خاموشی

---

[1] میرا اشارہ حضرت ابوہریرہؓ کی اس مشہور روایت کی طرف ہے جس میں انھوں نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضور ہی کے حکم سے میں نے چادر بچھائی پھر اس کو سینے سے لگایا جس کے بعد بھولنے کی کمزوری کا مجھ سے ازالہ ہو گیا یہ روایت صحاح کی عام کتابوں اور بخاری وغیرہ میں پائی جاتی ہے ۱۲

اختیار کرلی جاتی ہے حالانکہ سنداً دونوں قسم کی روایتوں میں کسی قسم کا کوئی تفاوت نہیں ہے بلکہ اگر اسناد کا صحیح علم ان مسکینوں کو ہوتا تو شاید وہ اجازت والی روایتوں کو ممانعت کی روایتوں سے زیادہ قوی پا سکتے تھے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ پہلے اجازت دی گئی اور بعد کو ممانعت کی گئی کیوں کہ اجازت کی روایتوں میں بعض روایتوں کا تعلق حجۃ الوداع سے ہے، یعنی آخری حج جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اس میں جو خطبہ ارشاد ہوا گزر چکا کہ ابو شاہ یمنی کی درخواست پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اُکْتُبُوا لِاَبِیْ شَاہٍ — ابو شاہ کے لئے خطبہ کو لکھ دو۔

بہر حال ساری روایتوں کے جمع کرنے سے واقعہ کی صحیح شکل میرے سامنے تو یہی آتی ہے کہ ابتدا میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لکھنا شروع کیا، اور لکھنے میں اتنے مبالغہ سے کام لینا شروع کیا کہ جو کچھ سنتے تھے سب ہی کو لکھ لیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن عمرو بن عاص نے اس وقت جب ان کا شمار اصغر القوم میں تھا یعنی صحابیوں میں سب سے چھوٹے تھے انھوں نے صحابیوں کو اسی حال میں پایا تھا جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ صورت حال ایسی تھی کہ اس کی اگر خبر نہ لی جاتی تو جن روایتوں میں عمومیت اور استفاضہ کا رنگ پیدا کرنا مقصود نہ تھا ان میں یقیناً یہی غیر مطلوبہ کیفیت پیدا ہو جاتی۔ لازمی نتیجہ جس کا یہ تھا کہ آئندہ دین کے ان دونوں سرچشموں میں کوئی فرق باقی نہ رہتا جن میں چاہا جاتا تھا اور یہی چاہئے بھی تھا کہ فرق باقی رہے، اسی لئے فرمایا گیا کہ اَکِتَابٌ مَعَ کِتَابِ اللّٰہِ یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ ایک اور کتاب کو بھی کیا وہی اہمیت دینا چاہتے ہو؟ عام صحابہ ان نتائج کا اندازہ نہ کر سکتے تھے جن پر نبوت ہی کی نظر پہنچ سکتی تھی۔ اس کے بعد مَنْ کَتَبَ عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْاٰنِ فَلْیَمْحُہٗ (جس نے قرآن کے سوا مجھ سے کچھ لکھا ہے اس کو محو کردے یعنی مٹادے) کا اعلان کیا گیا اور اگر وہ روایت صحیح ہے کہ صحابہ نے اپنے مکتوبہ مجموعوں کو ایک میدان میں جمع کر کے سب کو نذر آتش کر دیا تو سمجھا جائے گا کہ اسی محو کرنے کے حکم کی یہ تعمیلی شکل تھی اور اس تدبیر سے اس خطرے کا ازالہ ہو گیا جو عہد نبوت میں حدیثوں کی مختلف

کتابوں اور مجموعوں کے تیار ہونے سے پیدا ہو سکتا تھا اور یوں عمومی طور پر حدیثوں کے لکھنے کا رواج صحابہ میں جو پھیل گیا تھا وہ مسدود ہو گیا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابتِ حدیث کی ممانعت کے اس عام اعلان سے اس خطرے کا تو دروازہ بند ہو گیا مگر احساسات کے جن نازک تاثرات کا تجربہ آدمی کی فطرت کے متعلق ہوتا رہتا ہے پھر وہی تجربہ سامنے آیا۔ گویا خطرے کے ازالہ کی اسی شکل نے ایک دوسرے خطرے کے سوراخ کو پیدا کر دیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وہی عبداللہ بن عمرو بن عاص صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنھوں نے بیان کیا تھا کہ ان صحابیوں نے جن میں سب سے میں چھوٹا اور کم سن تھا انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میرے بھائی کے بچے! ہم جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتے ہیں وہ سب ہمارے پاس لکھا ہوا ہے۔" میں نے عرض کیا تھا کہ یہی صورت حال اس زمانہ میں پیدا ہو گئی تھی جس کا انسداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث کی ممانعت سے فرمانا چاہا تھا۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص کو اپنے بڑوں سے جہاں یہ معلوم ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لوگ لکھا کرتے ہیں، وہیں کم عمری اور کم سنی کی وجہ سے وہ ممانعت کے حکم سے واقف نہ ہو سکے کیونکہ جہاں تک قرائن و قیاسات سے معلوم ہوتا ہے مدینہ منورہ میں ممانعت کا اعلان جس وقت کیا گیا تھا عبداللہ ابن عمرو اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ہجرت کے وقت بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین ہی سال کے تھے۔ لیکن مان لیجئے کہ وہی روایت صحیح ہو جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے جس سال مدینہ تشریف لائے ہیں عبداللہ کی عمر سات سال کی تھی، ہجرت کے کچھ ہی دن بعد یہ اپنے والد عمرو بن عاص سے پہلے ہی مدینہ منورہ آ کر مسلمان ہو گئے تھے شاید اس وقت یہ آٹھ نو سال کے ہوں گے اس عمر کے بچوں کا ایسے اعلانوں سے ناواقف رہ جانا کچھ تعجب نہیں ہے، یا مان لیجئے کہ ان کو بھی کتابتِ حدیث کی ممانعت کا علم ہو چکا تھا۔ مگر انہوں نے خود سمجھ لیا، یا جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے پر ان کو معلوم ہوا کہ ممانعت کا تعلق عمومی رواج سے ہے،

یہ مقصد نہیں، ہے کہ بالکلیہ قطعی طور پر حدیثوں کا لکھنا گناہ ٹھہرا دیا گیا ہے۔ کچھ بھی ہوا ہو، ہوا یہ کہ جب عبداللہ سن رشد کو پہنچے اور نوعمری میں مدینہ منورہ آجانے کی وجہ سے ان کو نوشت وخواند میں مہارت حاصل کرنے کا کافی موقعہ مل گیا، کیونکہ یہی وہ زمانہ تھا جس میں مسلمان بچوں کی نوشت وخواند کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص توجہ تھی. قیدیوں تک کا فدیہ یہ مقرر کر دیا تھا کہ مدینہ کے دس بچوں کو جو لکھنا سکھا دے گا، آزاد کر دیا جائے گا۔ بہرحال حضرت عبداللہ بن عمرو نے صرف یہی نہیں کہ عربی خط میں کمال پیدا کیا بلکہ مدینہ منورہ کے یہودیوں سے سریانی اور عبرانی زبان اور ان زبانوں کے خطوط کے سیکھ لینے کا جو موقعہ میسر آگیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ایک سے زائد آدمیوں سے ابن سعد وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عمرو سریانی زبان جانتے تھے اور اس زبان کی کتابیں پڑھا کرتے تھے. حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ان کے ایک خواب کا ذکر کیا ہے یعنی انہوں نے دیکھا کہ میرے ایک ہاتھ میں شہد ہے اور دوسرے میں گھی ہے کبھی میں اس ہاتھ کو چاٹتا ہوں اور کبھی اس کو۔ اس خواب کا وہی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو تعبیر بتاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

تَقْرَأُ الْكِتَابَيْنِ التَّوْرَاةَ وَالْقُرْآنَ (ج ۱۳ ص ۱۱۲) تم دونوں کتابیں یعنی تورات وقرآن کو پڑھوگے۔

راوی نے اس کے بعد بیان کیا ہے کہ وَكَانَ يَقْرَأُهُمَا یعنی یہ واقعہ بھی تھا کہ عبداللہ دونوں کتابیں پڑھا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں تورات وغیرہ کے پڑھنے کی صلاحیت وہ اپنے اندر پیدا کر چکے تھے[1] اسی کے ساتھ جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے کہ نوجوانی

[1] بعضوں کا خیال ہے کہ عہد فاروقی کے فتوحات کے بعد شام ومصر پہنچنے کے بعد عبداللہ بن عمرو نے سریانی وعبرانی زبانیں سیکھی تھیں لیکن میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔ مدینہ منورہ ہی میں ان چیزوں کا سیکھ لینا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے آخر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہودیوں کے بیت المدارس میں ان کے خط اور زبان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے کیا نہیں سیکھا تھا، پھر حضرت عبداللہ کے لئے کیا چیز مانع ہو سکتی تھی، باقی توراۃ وقرآن دونوں کا پڑھنا یہ بھی ان کے ساتھ مختص نہیں ہے حضرت عبداللہ بن سلام بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ایک دن تورات اور ایک دن قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے (دیکھو ذہبی تذکرۃ الحفاظ) طبقات ابن سعد میں ابوالجلد الجونی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات کو ختم کرنے کا قاعدہ (باقی برصفحہ آئندہ)

[illegible]

[illegible]

اس قصہ کا ذکر علاوہ بخاری کے مختلف کتابوں میں خود ان کے حوالہ سے بھی اور دوسروں کے حوالہ سے پایا جاتا ہے اس وقت آپ کے سامنے ان تمام روایتوں میں سے سنن ابوداؤد جو ظاہر ہے صحاح میں شمار ہوتی ہے اور ابن سعد یا جامع ابن عبدالبر وغیرہ کی روایتوں پر اس روایت کو ترجیح حاصل ہونی چاہئے۔ بہرحال ابوداؤد کی روایت کا حاصل یہ ہے کہ خود عبداللہ بن عمرو بیان کرتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنا کرتا تھا اسے لکھتا جاتا تھا، کہتے ہیں میرے اس طرز عمل کی خبر جب قریش کو ہوئی، بظاہر اس لفظ سے اشارہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی طرف کیا، کیونکہ وہ خود قریشی تھے، یہ پتہ نہ چلا کہ یہ کون صاحب تھے، کوئی بھی ہوں لیکن تھے قریشی، عبداللہ کہتے ہیں کہ جب ان کو اس کی خبر ہوئی کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ہر بات کو لکھ لیا کرتا ہوں تو انہوں نے مجھے منع کیا۔ بس ان ہی الفاظ کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ منع کرتے ہوئے ان ہی صاحب نے مجھ سے کہا کہ

تَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَشَرٌ يَتَكَلَّمُ فِي الرِّضَاءِ وَالْغَضَبِ۔	تم ہر چیز کو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے ہو، لکھ لیا کرتے ہو، رسول اللہ آدمی ہیں آپ غصہ کی حالت میں بھی بولتے ہیں اور خوشی کی حالت میں بھی۔

گو حضرت عبداللہ بن عمرو کی یہ حدیث اور اس حدیث کے الفاظ عام طور پر مشہور ہیں عموماً لوگ سنتے پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ ذرا ٹھہرنے اور سوچنے کا مقام تھا۔

پہلا سوال تو یہی ہوتا ہے کہ جن قریشی صاحب نے عبداللہ کو ٹوکا تھا اگر حضرت عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرنے کے بعد لکھ رہے تھے تو ان کے ٹوکنے پر آسانی جواب دے سکتے تھے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے بجائے اس کے ان کا خاموش ہو جانا، بلکہ آگے جو الفاظ ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ فامسکت (یعنی ٹوکنے پر عبداللہ کہتے ہیں کہ میں لکھنے سے رک گیا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا حالانکہ اگر پہلے سے

اجازت یافتہ ہوتے تو اس کی بھی ضرورت نہ تھی اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک کسی وجہ سے کتابتِ حدیث کی ممانعت کی خبر نہ پہنچ سکی تھی۔ اب اس میں ان کی کمسنی کو دخل ہو یا کوئی اور وجہ ہو، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کمسنی کے زمانہ میں جب وہ اصغر القوم تھے، اپنے سے بڑی عمر والے صحابیوں سے ان کو یہ خبر ملی تھی کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ لوگ سنتے ہیں اُسے لکھ لیتے ہیں۔ خود اسی خیال میں رہے بلکہ ان کی طبیعت کا جو انداز تھا خصوصاً عنفوانِ شباب میں دین کا نشہ ان پر جو چڑھ گیا تھا خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اتارنے سے بھی جو نہیں اترتا تھا[1]۔ میں جب اس کو سوچتا ہوں تو خیال گزرتا ہے کہ ان کے لکھنے پڑھنے کے جوش میں بھی کہیں اس خبر کو دخل نہ ہو، جو اپنے بڑوں سے انھوں نے سنی تھی، یعنی ان کو یہی خیال آیا ہو کہ جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں لکھا کرتے ہیں تو میں بھی کیوں لکھنا سیکھ کر اس سعادت کا حصہ دار نہ بن جاؤں۔ بلکہ اسی روایت کے بعض طریقوں میں یہ لفظ بھی بڑھا ہوا جو ملتا ہے یعنی عبداللہ کہتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اس لئے لکھا کرتا تھا تاکہ ان کو زبانی یاد کرلوں یعنی کہتے تھے کہ "ارید حفظه" (مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۲) اس سے ان کی بلند ہمتی اور شدتِ ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ ان بزرگوں میں یہ کسی نے نہیں کہا تھا کہ ہم لوگ جو کچھ لکھتے ہیں اسے زبانی

---

[1] عام کتابوں میں تو صرف اسی قدر ہے کہ رات کی شب بیداری، دن کے روزوں اور تلاوت قرآن ہی کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہتے تھے کہ اتنا زیادہ بار اپنے اوپر نہ ڈالا کرو، تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے لیکن وہ یہی کہتے جاتے تھے کہ یا رسول اللہ میری جوانی کا زمانہ ہے شباب کی قوت ہے میں سب برداشت کرلوں گا لیکن بعض روایتوں میں خصوصاً مسند احمد میں یہ بھی ہے کہ مدینہ پہنچ کر جب یہ جوان ہوئے تو ان کے والد عمرو بن عاص نے ایک اونچے گھرانے کی خاتون جو قریش خاندان کی تھیں ان سے نکاح کر دیا۔ تین چار دن بعد عمرو بن عاص ان کے والد دلہن کے کمرے میں گئے پوچھا کہ اپنے دولہے کو تم نے کیسا پایا۔ ممکن ہے عمرو بن عاص کو بیٹے کے طرزِ عمل سے شبہ ہوا ہو اسی لئے خود دلہن سے جاکر پوچھا بے چاری نے کہا کہ بڑے اچھے شوہر ہیں آج تک اس کی خبر نہ لی کہ میں کہاں رہتی ہوں اور کس بستر پر سوتی ہوں۔ عمرو بن عاص کو بھی بیٹے سے یہی توقع تھی۔ باہر نکل کر جتنا کوئی باپ کسی جوان بیٹے کو کہہ سکتا ہے سب کچھ کہہ ڈالا لیکن دیکھا کہ یوں یہ لڑکا نہ ملنے گا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کا حال عمرو بن عاص نے پہنچایا۔ آپ نے بلاکر ان کو سمجھانا شروع کیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ کیفیت نہیں ہے، انھوں نے شاید یہ خیال کرلیا کہ حدیثوں کی کتابت کی ممانعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو ہوئی ہے اس کی وجہ یہی ہے، انھوں نے عبداللہ بن عمرو کو ٹوکتے ہوئے اسی وجہ کا ذکر کیا جو اُن کی سمجھ میں آئی تھی اور گو جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا اُن کی یہ غلطی معمولی غلطی نہ تھی لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، آج جب کہ حدیث کے سارے دفتر ہی کو بھسم کردینے کا مشورہ ان ہی روایتوں سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو ہو کر دینے والے دے رہے ہیں ان کے لحاظ سے یقیناً ان کی غلطی کا وزن کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

انکارِ حدیث کی نبوی پیشین گوئی

آج تو جو کچھ کہا جارہا ہے، سچ پوچھئے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ مشہور پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے جو صحاح کی مختلف کتابوں میں پائی جاتی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ

اَلَا هَلْ عَسٰى رَجُلٌ يَبْلُغُهُ الْحَدِيْثُ عَنِّيْ وَهُوَ مُتَّكِئٌ عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ فَيَقُوْلُ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهِ حَلَالًا اسْتَحْلَلْنَاهُ وَمَا وَجَدْنَا فِيْهِ حَرَامًا حَرَّمْنَاهُ اَلَا وَاِنِّيْ اُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ۔ (ابوداؤد ترمذی وغیرہ)

خبردار! قریب ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کسی شخص کو میری حدیث پہنچے گی اور وہ اپنے چھپر کھٹ یا کرسی پر بیٹھا ہے (تو میری حدیث سن کر) وہ کہے گا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن ہے پس قرآن میں جن چیزوں کو ہم حلال پائیں گے ان ہی کو حلال سمجھیں گے اور جن چیزوں کو اس میں حرام پائیں گے انھیں ہم حرام سمجھیں گے (یہ کرسی نشین کی بات ہوئی اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ) خبردار! مجھے کتاب یعنی قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس جیسی چیز بھی قرآن کے ساتھ دی گئی ہے۔

اور یہ سب کس بنیاد پر کیا جارہا ہے، ممکن ہے محرکات اُس کے کچھ اور ہوں لیکن استدلال میں ان ہی تحدیدی روایتوں کو پیش کرتے ہیں، جن کا مقصد یہ قطعاً نہ تھا کہ قرآن کے سوا اپنی دینی زندگی کی تعمیر میں مسلمان اور کسی چیز سے قطعاً استفادہ نہ کریں بلکہ جیسا کہ بار بار عرض کرچکا ہوں کہ عمومی اشاعت کی راہ سے امت میں جن چیزوں کا منتقل کرنا مقصود تھا، محض ان سے الگ کرنے کے لئے عام

حدیثوں کے متعلق یہ خاص طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ اب عمومی اشاعت کی راہ سے جو چیزیں بھی پیغمبر کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں تک پہنچیں گی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ جس پیغمبر کو خدا کا سچا پیغمبر مان کر قرآن پر اعتماد کیا جا رہا ہے، اسی پیغمبر کی طرف منسوب ہونے والی ان باتوں کو مسترد کر دیا جائے جو اسی تواتر و توارث کی راہ سے مسلمانوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں جس راہ سے پیغمبر کی طرف منسوب ہو کر قرآن پہنچا ہے چونکہ یہ مسئلہ "تدوینِ حدیث" سے زیادہ "تدوینِ فقہ" سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کی پوری بحث تو اسی کتاب میں پڑھنی چاہئے لیکن یہاں بھی میں پوچھتا ہوں کہ قرآن کے سوا تواتر و توارث کی راہوں سے جو چیزیں ہم تک پہنچی ہیں ان کو اگر مسترد کر دیا جائے گا تو قرآن کے کسی ایک مطالبہ پر بھی عمل ممکن ہے؟ میں نے خود نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کا قول تدوینِ فقہ میں نقل کیا ہے کہ کوئی نماز تک نہیں پڑھ سکے گا، یہ بھی نہیں جانا جا سکتا کہ ظہر کی کتنی رکعتیں ہیں اور عصر کی کتنی؟ بلکہ یہ بھی نہیں کہ ہر رکعت میں ایک سجدہ کرنا چاہیئے یا دو، یا سجدہ ہی کیسے کرنا چاہئے اور یہی حال تقریباً سارے قرآنی مطالبات کا ہے۔

حکم تحریرِ حدیث اور عصمتِ نبوی ؑ

پس عام حدیثوں کی کتابت ہو یا روایت، ان کے متعلق تحدیدی روایتوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ ان کے مطالبوں کی گرفت میں اتنی سختی نہ پیدا ہو، جو صرف ان ہی مطالبوں کی خصوصیت ہو سکتی ہے جن کا انتساب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر قسم کے شکوک و شبہات سے قطعاً پاک ہے لیکن سمجھنے والوں نے ان روایتوں سے یہ سمجھ لیا کہ خدا کی کتاب کے سوا ان ساری چیزوں کا مسترد کرنا مقصود ہے جو پیغمبر کی طرف منسوب ہیں اور جب عہدِ نبوت میں بعضوں کو یہ غلط فہمی لگ گئی کہ رضا کے حال کی چیزیں تو صحیح ہیں لیکن غصہ کے وقت کی جو باتیں پیغمبر کے منہ سے نکلتی ہیں ان کا غلطیوں سے پاک ہونا ضروری نہیں اور اپنے اسی غلط خیال میں مبتلا ہونے کے ساتھ یہ بھی چاہا کہ دوسروں کو بھی اسی غلط خیال میں مبتلا کر دیں یعنی عبداللہ بن عمرو کو یہی سمجھاتے ہوئے حدیث کے لکھنے سے منع کر دیا۔ حضرت عبداللہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگ قریش کی

بزرگی اور خوردی کا خیال کر کے اس وقت تو قلم ہاتھ سے انہوں نے رکھ دیا لیکن اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کا اظہار کیا۔ کتنی شدید بنیادی غلطی میں ٹوکنے والے یہ صحابی مبتلا تھے۔ ہم کو اور آپ کو اس کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن جو دنیا کے اغلاط ہی کی تصحیح کے لئے بھیجا گیا تھا، صلوات اللہ علیہ وسلامہٗ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سننے کے ساتھ ہی آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا جس کی زندگی کا ایک ایک پہلو رہتی دنیا تک پیدا ہونے والے انسانوں مردوں اور عورتوں سب ہی کے لئے اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہے، اگر اس کی زندگی کے کسی پہلو میں ایک غلطی بھی رہ جائے گی تو وہ ایک غلطی نہ ہو گی بلکہ کروڑہا کروڑ بے شمار انسانوں کی غلطی بن جائے گی۔ ان صحابی صاحب کو اس کا اندازہ نہ ہوا،

لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ تمہارے لئے رسول اللہؐ میں بہت اچھا نمونہ ہے۔

کا اعلان جس ذات گرامی کے متعلق قرآن میں کیا گیا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ قدرت اس کی زندگی کے کسی پہلو میں کسی غلطی کو باقی رکھ سکتی ہے[1]۔ اسی لئے تو یہ طے شدہ فیصلہ سلف سے لے کر خلف تک کا ہے کہ پیغمبر کی ذات معصوم ہوتی ہے۔

بہر حال حضرت عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ سمع مبارک میں جس وقت میرے الفاظ پہنچے اور معلوم ہوا کہ کتابت حدیث سے روکتے ہوئے ایسی بات مجھ سے کہی گئی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ پیغمبرؐ غصہ میں جو کچھ بولتے یا کرتے ہیں ان کا صحیح ہونا ضروری نہیں ہے، میں نے دیکھا کہ آنحضرت

---

[1] حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز بانی دار العلوم دیوبند نے اس کی کتنی اچھی مثال دی ہے کہ سلوانے والا، درزی سے مثلاً قمیص سلوانا چاہتا ہے، نمونہ کے لئے تمام قمیصوں میں جو بہتر قمیص ہوتی ہے، اس کو درزی کے حوالہ کر کے ہدایت کرتا ہے کہ بس اسی نمونے پر ساری قمیصوں کو تراش کر کے سی دو۔ اب اگر فرض کیجئے کہ نمونے ہی کی اس قمیص میں کوئی سقم یا خرابی ہو گی تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ ساری قمیصیں جو اس نمونے پر تراشی جائینگی خراب ہو کر رہ جائیں گی۔ پیغمبر کو بھی خدا نمونہ بنا کر پیدا کرتا ہے۔ بندوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی اپنی زندگیوں کو اسی نمونے پر ڈھالتے چلے جائیں جو جس قدر اس نمونے سے قریب تر ہو گا خدا کے نزدیک وہی سب سے زیادہ پسندیدہ قرار پائے گا۔ پھر کیا یہ غیر ممکن ہے کہ غیر محدود طاقت وقدرت رکھتے ہوئے خدا کسی ایسے نمونے کو پیدا نہیں کر سکتا جس میں غلطی کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ ۱۲

صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیاں اٹھیں جن کا رُخ دہن مبارک کی طرف تھا۔ عبداللہ بن عمرو کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

فَاَوْمَا بِاِصْبَعِہٖ اِلٰی فِیْہِ — پس اشارہ کیا اپنی انگلی سے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) اپنے دہن مبارک کی طرف۔

اور وہی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کی طرف سے اس خطرے کے انسداد کے لئے کہ عام حدیثوں کے مطالبہ کی قوت قرآنی مطالبہ کی قوت کے برابر نہ ہوجائے چند دن پہلے یہ منادی کرائی گئی تھی کہ قرآن کے سوا جس کسی نے مجھ سے (یعنی میری طرف منسوب کرکے) جو کچھ لکھا ہے چاہئے کہ اسے محو کردے، اسی پیغمبر کو دیکھا جارہا ہے کہ ایک دوسرے خطرے کے انسداد کے لئے عبداللہ بن عمرو کو فرمارہے ہیں:

اُکْتُبْ — تم (قرآن کے سوا بھی میری باتیں) لکھا کرو۔

اور جس خطرے کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا اور اندیشہ کیا بلکہ مبتلا ہونے والے اس خطرے میں کلی طور پر نہیں تو کم از کم غصہ کی حالت کی باتوں کے متعلق اس غلط فہمی کے شکار ہوچکے تھے کہ ان کا غلطیوں سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے، اس خطرے کا ازالہ کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہورہا ہے اور کتنے تاکیدی الفاظ میں ارشاد ہورہا ہے پہلے قسم کھائی جاتی ہے یعنی فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ (قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے) فرماتے ہوئے اصل غلطی کا ازالہ ان الفاظ میں فرمایا جاتا ہے یعنی دہن مبارک کی طرف انگلیاں اٹھی ہوئی ہیں اور کہا جارہا ہے:

لَا یَخْرُجُ مِنْہُ اِلَّا حَقٌّ۔ (ابو داؤد وغیرہ) — نہیں نکلتا ہے اس سے (یعنی دہن مبارک سے) مگر صرف سچی بات۔

نبوت کے جو مذاق شناس نہ تھے ان کو پہلے حکم میں جس کی عام منادی کی گئی تھی یعنی حدیثوں کی کتابت کی ممانعت والے حکم میں، اور آج جو عبداللہ بن عمرو کو اُکْتُبْ (لکھا کرو) کے لفظ سے ان ہی حدیثوں کے لکھنے کی جو اجازت مرحمت فرمائی جارہی ہے دونوں میں وہی منفی و مثبت حکم والا تضاد نظر آیا

[illegible]

اس وقت تک کھلی ہوئی ہے، انشاء اللہ قیامت تک کھلی رہے گی جو چاہتے ہیں کہ ممکنہ حد تک پیغمبر کی زندگی اور اس زندگی کے نمونوں کے مطابق جینے کا اگر موقعہ ملے تو اس میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔[۱]

یہی "کج دار و مریز" ہی کی تو پیغمبرانہ حکمتِ عملی تھی اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، آپ کے خلفاء برحق نے بھی اسی حکمت کی نگہداشت میں پورا زور صرف کر دیا اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ان شاہبازوں کی بلند پروازیوں کے لئے جہاں تک وہ پہنچ سکتے تھے کہیں رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی، یحببکم اللہ (خدا تم کو اپنا محبوب بنالے گا) کا اعلان قرآن میں ہر اس شخص کے لئے کر دیا گیا تھا جو پیغمبر کے نقش قدم پر قدم رکھتا ہوا جہاں تک بڑھ سکتا ہو، بڑھتا چلا جائے پھر بڑھنے والے بڑھتے چلے گئے اور جن حدیثوں کا ہر شخص تک پہنچانا مقصود نہ تھا، ان کی روشنی ان لوگوں تک پہنچتی رہی جو دین کے اسی نفلی[۲] حصہ سے اس مقام تک پہنچتے رہے جس کے متعلق یہ بشارت سنائی گئی ہے کہ پہنچنے کے بعد جو بندہ اور مخلوق ہے وہ عروج اور ارتقار کی اس کیفیت کو پاتا ہے جس کی تعبیر خالق ہی کے الفاظ میں یہ سنائی گئی ہے کہ

كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ	میں اس بندے کی شنوائی بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے
الَّذِي يَبْصُرُ بِهِ وَيَدُهُ الَّذِي يَبْطِشُ	اور اس کی بینائی جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ جن
بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا (صحاح بخاری وغیرہ)	سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں جن سے وہ چلتا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ "طبیعت ہی جن کی ادھر نہیں آتی" یہ خیر بجائے خود ان غریبوں کی مستقل بدبختی ہے مگر سوچئے تو سہی کہ ان حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ میں عمومیت کی

[۱] حضرت بایزید بسطامیؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ عمر بھر خربوزہ آپ نے اس لئے نہیں کھایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اس کو کھاتے تھے اس کی ان کو تحقیق نہ ہو سکی ۱۲۔

[۲] میرا اشارہ اس مشہور روایت کی طرف ہے جس میں آیا ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ "بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا ہے ہوتا چلا جاتا ہے تا آنکہ میں اس بندے کو چاہنے لگتا ہوں"۔ اسی کے بعد اس حدیث قدسی میں وہ بشارت سنائی گئی ہے جسے میں نے بجنسہ عربی الفاظ میں درج کر دیا ہے۔ ۱۲

کیفیت پیدا کرنے کے اگر ان کے مطالبوں کو بھی ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک کر کے اسی طرح قطعی اور یقینی بن جانے کا موقعہ دے دیا جاتا، جیسے دین ہی کے ایک شعبہ میں اسی رنگ کو پیدا کیا گیا ہے تو سچ "پر طبیعت ادھر نہیں آتی" کی معذرت کو معصیت بلکہ تمرد و بغاوت بن جانے سے کون روک سکتا تھا، آج تو ان کی یہ معذرت اسی لئے معذرت ہے کہ جن چیزوں کی طرف ان کی طبیعت نہیں جاتی، ان کے مطالبہ میں اتنی قوت ہی نہیں ہے جو معذرت کو معصیت اور بغاوت بنا دیتی ہے اور کیا اس طول کلامی کے بعد بھی مزید ضرورت اس کی باقی رہ گئی ہے کہ میں لوگوں کو پھر یہ سمجھاؤں کہ یہ سارا کرشمہ اسی تکیج دلدو مریزکی حکمت عملی اور ان نازک تدبیروں کا نتیجہ ہے جن کے حدود کی پوری پوری نگرانی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشینوں نے فرمائی۔

بہر حال عبداللہ بن عمرؓ ایک خوش قسمت آدمی تھے، اگر ٹوکنے والے صاحب ان کو مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ نہ ٹوکتے، بلکہ صرف اتنا کہہ دیتے کہ میاں! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لکھتے ہو، کیا اس کا علم تمہیں نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت کردی گئی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر اتنی سی سیدھی سادی صاف بات وہ کہہ دیتے اور ان کے دماغ نے پیغمبر کے حکم کا جو فلسفہ پیدا کیا تھا یعنی بشری اغلاط کی گنجائش، انہوں نے یہ باور کر لیا تھا کہ اس حکم کے دینے کی یہی وجہ ہے۔ قریشی صاحب اپنے اس خود تراشیدہ فلسفہ کا اگر ذکر نہ کرتے تو عبداللہ کو اتفاقاً جس سعادت سے بہرہ اندوزی کا موقعہ مل گیا، شاید نہ ملتا۔ گویا اس فلسفہ کے شر سے خیر کا ایک پہلو یہ پیدا ہو گیا، اور یہی کیا اگر اس زمانہ میں پیدا ہو کر اس فلسفہ کی بنیاد ہی کے کھو دینے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو موقعہ نہ مل جاتا تو صرف قرآن کی ایسی آیتوں سے مثلاً

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ	پیغمبر نہیں بولتے "الہویٰ" (یعنی اپنی ذاتی خواہش سے)، نہیں ہے وہ
هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۔	(یعنی پیغمبر کا بول) مگر وحی، جس کی وحی ان پر کی جاتی ہے۔

وغیرہ سے مغالطہ کی ان گتھیوں کا سلجھانا کیا آسان تھا، جن میں دعوائے اسلام کے باوجود اس زمانے

میں حدیثوں کی ان ہی تحدیدی روایتوں کی بنیاد پر لوگ الجھ الجھ کر بھڑ بھڑا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کا تعلق بھی صرف قرآن سے ہے اسی لئے وہ پیغمبر کو صرف قرآن کی حد تک پیغمبر مانتے ہیں۔ قرآن سے الگ کر لینے کے بعد العیاذ باللہ پیغمبر کی زندگی میں اور جو پیغمبر نہیں ہیں ان کی زندگی میں ان برکندہ باد آنکھوں کے نزدیک کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے، مگر بحمد اللہ اس فلسفہ کے شر نے ایک ایسے خیر کو پیدا کیا جس نے ثابت کر دیا کہ مذکورہ بالا قرآنی آیت کا واقعی مطلب بھی وہی ہے جو اس کے ظاہر الفاظ سے سمجھا جا رہا ہے یعنی قرآن ہی نہیں بلکہ نطق اور گفتگو جو بھی پیغمبر کی زبان سے نکلتی ہے اس کا قطعًا الھوٰی (پیغمبر کی ذاتی خواہش) سے تعلق نہیں ہے بلکہ قرآنی نطق ہو یا غیر قرآنی نطق پیغمبر کا ہر نطق اور ان کی ہر گفتگو وحی ہے جو ان پر خدا کی طرف سے کی جاتی ہے۔ آیت کے الفاظ سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے اور حضرت عبداللہ کو سمجھاتے ہوئے قسم کھا کر دہنِ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس سے بھی اسی مفہوم کی مزید تائید اور تاکید ہو گئی، اور محقق ہو گیا کہ پیغمبر کی زندگی ہر حال میں اسوہ اور نمونہ ہے اور ان کی زبان کا ہر بول ذاتی فکر و نظر یا خواہش کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ سب وحی ہے خواہ خوشی کے عال میں بات کی گئی ہو یا غصہ کی حالت میں۔ سچ پوچھیے تو اس قرآنی نص کی بنیاد پر پیغمبر کی معصوم زندگی کا ہر پہلو مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے روشنی کا مینار ہے، فرق آئندہ صرف ان ذرائع کی قوت و ضعف سے پیدا ہوتا ہے جن کی راہ سے امت میں پیغمبر کی زندگی، زندگی کے آثار گفتار و رفتار کے متعلقہ معلومات پہنچے ہیں، ان ہی کی قوت و ضعف کے ساتھ ان احکام و نتائج کی گرفت اور مطالبوں کی قوت و ضعف کا مسئلہ وابستہ ہے جو ان معلومات سے نکلتے ہیں یا نکل سکتے ہیں۔

قرآن کو کافی سمجھنے کا مغالطہ،
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ایک خاتون کا سبق آموز واقعہ

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک خاتون صاحبہ پہنچیں اور حدیثوں میں عورتوں کو وشم یعنی گودنا گدانے سے جو منع کیا گیا ہے اس کا اور اسی قسم کی چند

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

اس لحاظ سے قرآنی اور غیر قرآنی مطالبات میں خود ہی سوچنا چاہئے کہ کیا فرق ہے۔ ہاں پیغمبر کی عطا کی ہوئی چیزوں میں امتیاز درحقیقت ان راہوں کے فرق سے پیدا ہوتا ہے جن سے گزر کر امت تک وہ چیزیں پہنچی ہیں، اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ توارث و تواتر کی عمومیتِ عامّہ کی راہ سے جو چیزیں پہنچی ہیں خود ان کی اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کی قوت مطالبہ اور گرفت میں ایک ہوگی خواہ قرآن کے نام سے وہ پہنچی ہوں یا یہ نام ان کو نہ دیا گیا ہو، بلکہ اس راہ سے ان چیزوں کا پہنچنا یہی دلیل ہے اس بات کی کہ ہر ایک سے چونکہ ان کا مطالبہ مقصود تھا اسی لئے ان کے پہنچانے میں ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں کہ پیغمبر کی طرف ان کے انتساب میں قطعاً کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، بخلاف ان چیزوں کے جو امت میں خبر الواحد بعد الواحد کی خصوصی راہوں سے پہنچی ہیں، اس نوعیت کے ساتھ ان کی منتقلی ہی دلیل ہے اس بات کی کہ پیغمبر ان کو پہنچانا تو چاہتے تھے لیکن ہر شخص تک اس طریقہ سے ان چیزوں کا پہنچانا مقصود نہ تھا کہ ان سے گریز قطعی طور پر اللہ اور اس کے رسول سے گریز کی شکل اختیار کرکے بھاگنے والوں کو معصیت اور بغاوت کا مجرم ٹھہرا دے۔

حجیتِ حدیث کے چند قرآنی دلائل

فلسفہ کے اس شر سے خیر کا یہ پہلو جو پیدا ہوا وہ تو اتنا اہم ہے کہ رہتی دنیا تک اسی سے قرآن کے اجمالی آیات کا مطلب معین کیا جائے گا، یعنی مذکورہ بالا آیات مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى یا مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کے سوا قرآن ہی میں بار بار پلٹ پلٹ کر اسی قسم کی آیتوں کا جو اعادہ کیا گیا ہے مثلاً قطعی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى	پس کچھ بھی نہیں تیرے رب کی قسم ہے وہ ہرگز ایمان نہ
يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ	لائیں گے جب تک تجھے (اے پیغمبر) ان تمام باتوں میں
لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ	حکم اور فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں جو ان کے باہمی جھگڑوں
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ	میں پیدا ہوئی ہیں، پھر اپنے اندر کسی قسم کی تنگی اس فیصلہ

يُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔	کے متعلق نہ پائیں جو تم نے کر دیا ہو، اور کلیۃً اس فیصلہ کے
(النساء)	آگے جھک جائیں۔

یا ارشاد ہوا ہے:

مَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ	نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو مگر اسی لئے کہ اس کی
بِإِذْنِ اللّٰهِ ۔	فرماں برداری کی جائے۔

یا دھمکایا گیا ہے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ	پس چاہئے کہ جو پیغمبر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں
أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ	وہ ڈریں اس بات سے کہ کسی آزمائش اور فتنہ میں نہ وہ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ (نور)	مبتلا ہو جائیں یا ان کو دکھ بھرا عذاب پکڑ لے۔

یا صلائے عام دیا گیا ہے کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ	تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہت اچھا نمونہ ہے،
حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ	جو اللہ کی اور پچھلے دن کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کو
الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا ۔	بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

یہ یا اسی نوعیت کی دوسری آیتیں جن سے خواص کیا عوام مسلمین بھی شاید ناواقف نہیں ہیں، اب ان اطلاقی آیات پر تحدید عائد کرنے کی راہ ہی کیا باقی رہی، صاف معلوم ہو گیا کہ پیغمبرؐ کی زندگی کے مثبت و منفی، ایجابی و سلبی، غرض ہر پہلو میں مسلمانوں کے لئے نمونہ ہے، رضا، اور غضب کی تقسیم کرنے والے دراصل اپنے ایمان کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔

أَعَاذَنَا اللّٰهُ وَالْمُسْلِمِينَ

مِنْ هٰذِهِ

الْهَفَوَاتِ.

تاریخ تدوین حدیث

آنحضرتؐ کے دور میں تدوین حدیث

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ معلومات کے حفظ و نگہداشت اور ان پر اعتماد کیلئے خواہ مخواہ نہ سوچنے والوں نے کتابت کے طریقہ کو غیر معمولی جو اہمیت دے رکھی ہے اور اس کے مقابلہ میں زبانی یاد کرنے کے طریقہ کو اس سلسلہ میں بے قیمت ٹھہرانے پر غل غپاڑہ مچایا جا رہا ہے۔ یہ دونوں ناسمجھی کی باتیں ہیں۔ علم کی حفاظت کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں، ہر ذریعہ اعتماد کے لئے ذمہ داریاں کو ان لوگوں پر عائد کرتا ہے جو اس سے کام لینا چاہتے ہیں اور ان ذمہ داریوں کی تکمیل خود بخود آدمی کی فطرت کو اعتماد پر مجبور کر دیتی ہے اور جیسے یہ انسانی فطرت کا ایک طبعی قانون ہے، اسی طرح ان ذمہ داریوں سے لا پروائی ہر حال میں اشتباہ اور بدگمانیوں کی گنجائش پیدا کر دیتی ہے، خواہ کتابت کے ذریعہ کو اختیار کیا جائے، یا زبانی یادداشت کے طریقے کو، تاہم عصر حاضر کے نابالغ عقول کے طفلانہ تقاضوں کی تسکین کا ایک ذریعہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی کتاب بھی بن گئی ہے آج کل کے متکلمین اسلام نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، کچھ بھی ہو ایک پہلو نفع کا اس واقعہ میں یہ بھی نکل آیا ہے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ بعض کتابوں مثلاً مستدرک حاکم اور البغوی کی کتاب میں یہ روایت جو پائی جاتی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا لکھا ہوا ایک مجموعہ تھا جس کے متعلق وہ بیان کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پیش کی ہوئی کتاب ہے، اس روایت کا میں ذکر کر چکا ہوں، ہو سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی اسی اجازت کو دیکھ کر حضرت انسؓ کے دل میں بھی ان کی ریس کا جذبہ پیدا ہوا ہو۔ بہرحال حضرت انسؓ کے حالات میں لکھا ہے کہ دس سال کی عمر میں ان کی والدہ ام سلیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں یہ کہتے ہوئے پیش کیا تھا کہ

هٰذَا ابْنِیْ وَهُوَ غُلَامٌ کَاتِبٌ ۔ یہ میرا لڑکا ہے اور ایسا لڑکا ہے جو کاتب ہے یعنی لکھنے سے واقف ہے۔

(ابن سعد ص ۱۲ ج ۷، قسم اول)

حضرت انسؓ چونکہ آخر وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، خود فرماتے تھے، نو سال تک حضورؐ کی خدمت میں رہا گویا وہ اور عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ ہجولی تھے۔ لکھنا بھی آتا ہی تھا اور پھر بارگاہِ نبوت میں رسوخ کا حال یہ تھا کہ بسا اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یَا بُنَیَّ (میرے بیٹے) کے لفظ سے پکارتے تھے، ایسے چہیتے خادم کی بات کا ٹال دینا اور وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بامروت طبیعت سے آسان نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ ان ہی وجوہ سے ان کو بھی حدیثوں کے قلمبند کرنے کی اجازت مل گئی کیونکہ ایک آدمی کے لکھنے سے ظاہر ہے کہ عمومیت کا وہ رنگ کیسے پیدا ہو سکتا تھا جو قرآن کے صحیفوں کی عام اشاعت سے پیدا ہو چکا تھا، کچھ ایسا خیال بھی ہوتا ہے کہ گو حضرت انسؓ بچپن ہی سے لکھنا جانتے تھے اور کاتب ہو چکے تھے، مگر ظاہر ہے کہ کہاں عبداللہ بن عمروؓ کی مہارت و حذاقت، بھلا جس شخص نے عربی چھوڑ سریانی اور عبرانی خطوط اور زبان کو بھی سیکھ لیا ہو، ان کا مقابلہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا کر سکتے تھے، حضرت انسؓ جو یہ کہتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس نسخہ کو پیش بھی کر لیا تھا اس کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو غالباً مشورہ دیا ہو گا کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے مجھے سنا بھی دو، عبداللہ بن عمروؓ کے نسخے کے متعلق پیش کرنے کا ذکر کسی روایت میں نہیں آیا ہے، شاید ان کی تحریری حذاقت پر اعتماد تھا، اور ان پر اعتماد نہ کیا جاتا تو کس پر کیا جاتا۔ آئندہ یعنی عہدِ نبوت کے بعد ان دونوں کتابوں کی حیثیت کیا رہی، اس تفصیل کا ذکر انشاء اللہ اپنے مقام پر کیا جائے گا، اس وقت تو عہدِ نبوت تک کے واقعات کا صرف ذکر مقصود ہے۔

بہرحال عام حدیثوں کے متعلق "کج دار و مریز" کی مذکورہ بالا حکمت عملی یعنی جو پانا چاہیں، ان تک پہنچ بھی جائے لیکن اس طور پر نہ پہنچے کہ ان حدیثوں کے مطالبات کی قوت عمومی راہ سے

منتقل ہونے والے دینی عناصر کے برابر ہو جائے انتہائی نزاکتوں کے ساتھ اس حکمت عملی کی نگرانی کرتے ہوئے ایک خاص حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ان حدیثوں کو چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے جو آج خبر آحاد کی شکلوں میں پائی جاتی ہیں۔ گویا سمجھنا چاہیئے کہ علاوہ ان خطوط، معاہدے نامے یا مختلف اقوام و افراد کے نام ہدایت نامے یا صدقات وغیرہ کے تحریری ضابطے جن کے چند نسخوں کا اب تک پتہ چلا ہے یا حجۃ الوداع کے خطبہ کو ابو شاہ یمنی کے لئے لکھوا کر عطا فرمانے کا جو حکم دیا گیا تھا جن کا تفصیلی ذکر کر چکا ہوں، ان متفرق چیزوں کے سوا حدیث کی بھی دو کتابیں (یعنی عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ والا نسخہ اور دوسری کتاب حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالی عنہ والی) ان دو کتابوں کے سوا اب تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے کہ واقعہ تحریق (جلانے) کے بعد صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کی حدیثوں کو کتابی شکل دی ہو یا ان کو قلمبند کیا ہو ممکن ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو آئندہ شاید اس سلسلہ میں کوئی اور نئی چیز ہاتھ آئے۔ کچھ بھی ہو، حدیثوں کے ان انفرادی نسخوں سے وہ حکمت عملی متاثر نہیں ہو سکتی تھی جو اپنی عام حدیثوں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی تھی جیسے ان مکتوبہ خطوط و معاہدات وغیرہ میں بھی محض قلمبند ہو جانے کی وجہ سے وہ کیفیت نہ پیدا ہوئی اور نہ پیدا ہو سکتی تھی جو مثلاً قرآن میں پیدا ہو چکی تھی، کیونکہ عمومیت یا استفاضۂ عام، شہرت بین الانام کا تعلق کتابت سے نہیں بلکہ تعدد و کثرت سے ہے، ایک خط اگر لکھا گیا تو ظاہر ہے کہ وہ ایک ہی خط کی شکل میں رہ گیا بھلا وہ قرآن کے ان نسخوں کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا جو گھر گھر میں پھیلا ہوا تھا۔ مشہور حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن فرما رہے تھے کہ مسلمانوں سے آخر یہ علم اٹھ جائے گا یعنی پیغمبرؐ سے جو جدید علم مسلمانوں کو میسر آیا ہے اس کا چرچا باقی نہ رہے گا کہتے ہیں کہ ایک صحابی جن کا نام زیاد بن لبید انصاریؓ تھا، انہوں نے عرض کیا کہ اب یہ علم کیسے مٹ سکتا ہے، قرآن کی اشاعت جس وسیع پیمانے پر اس وقت تک ہو چکی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے زیاد نے اس وقت عرض کیا تھا کہ

كَيْفَ يُرْفَعُ الْعِلْمُ مِنَّا وَبَيْنَ أَظْهُرِنَا كِتَابُ اللهِ وَقَدْ تَعَلَّمْنَا مَا فِيْهِ وَعَلَّمْنَاهُ نِسَاءَنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَخَدَمَنَا (مجمع الزوائد جز ۲)

ہم لوگوں میں سے علم کیسے اٹھ جائے گا، کہ ایک ہمارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے، اس کتاب میں جو کچھ ہے اسے ہم نے خود سیکھا ہے اور اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو، اپنے خادموں کو سکھایا ہے۔

الفاظ کے تھوڑے ردّ و بدل سے ترمذی وغیرہ صحاح کی کتابوں میں بھی یہ روایت پائی جاتی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ عورتوں، بچوں، حتیٰ کہ خادم و ملازمین تک کو اس زمانے میں جب یہ کتاب پڑھائی جا چکی تھی تو اس عمومیت و استفاضہ کا مقابلہ بھلا وہ مکتوبہ سرمائے کیا کر سکتے تھے جو اکّے دکّے گنتی کے چند آدمیوں کے پاس موجود تھے۔

یہی بات تو یہ ہے کہ دین کے جس حصہ کی تبلیغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمومی رنگ میں فرمائی تھی، جس کی بدولت آئندہ ہر زمانے میں ان کی حیثیت ان امور کی ہو گئی جن کا علم تواتر و توارث و تعامل کی شکل میں اس وقت تک منتقل ہوتا ہوا مسلمانوں کی اگلی نسلوں سے پچھلی نسلوں تک پہنچ رہا ہے، اسلامی دین کے ان قطعی اور یقینی عناصر و اجزا کے متعلق علم و یقین کی جو کیفیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والے صحابیوں کی تھی، قطعاً یہی کیفیت اس علم کی بھی ہے جو ان ہی امور کے متعلق مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ تواتر کی راہ سے پیدا ہونے والے علم میں اور وہ علم جو مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے، دونوں میں قطعیت اور یقین کے لحاظ سے کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا، میں پوچھتا ہوں جن لوگوں نے مثلاً لندن کو دیکھا ہے اور اس شہر کے متعلق مشاہدے نے جس یقین کو پیدا کیا ہے، اس یقین میں اور ان لوگوں کے یقین میں جنہوں نے لندن کو خود نہیں دیکھا ہے مگر تواتر کی راہ سے اس بات کا یقین ان میں پیدا ہوا ہے کہ دنیا کے شہروں میں ایک شہر لندن بھی ہے، اس حد تک یعنی لندن کا وجود یقینی ہے، کیا ان دونوں یقینوں میں کسی قسم کا فرق پیدا کیا جا سکتا ہے؟ بلاشبہ جن لوگوں نے لندن کو نہیں دیکھا ہے، محض اس لئے ان کے یقین میں شک اور احتمال اسی

قسم کا شک اور احتمال ہوگا جیسے ان لوگوں کے متعلق جو لندن جا چکے ہیں وہاں رہ چکے ہیں، ان کے متعلق شبہ پیدا کرنے والا یہ شبہ پیدا کرے کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا سب خواب کی حالت میں دیکھا تھا، یا آنکھ کا دھوکہ تھا جو لندن کی شکل میں ان کے سامنے آیا تھا واقع میں کچھ نہ تھا ظاہر ہے کہ اس قسم کے احتمالات وہی لوگ پیدا کر سکتے ہیں جن کی عقل کسی بیماری کی وجہ سے اپنے فطری حدود سے ہٹ گئی ہو۔ فخر الاسلام بزدوی نے اسی لئے شریعت کے اس حصہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو تواتر کی راہ سے مسلمانوں میں منتقل ہوتا ہوا چلا آرہا ہے، یہ الفاظ لکھے ہیں کہ

حَتّٰی صَارَ کَالْمُعَایَنِ الْمَسْمُوْعِ ۔ (ج ۲ ص ۳۶۰)

ان کی حالت ایسی ہے جیسے خود کسی معائنہ کی ہوئی یا براہ راست سنی ہوئی شئے کی ہو سکتی ہے۔

ان کا دعوی ہے کہ یہ حال صرف قرآن ہی کا نہیں ہے بلکہ قرآن کے ساتھ انہوں نے اسی راہ سے منتقل ہونے والی بہت سی چیزوں کو گنواتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

مِثْلَ نَقْلِ الْقُرْاٰنِ وَالصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ وَاَعْدَادِ الرَّکَعَاتِ وَمَقَادِیْرِ الزَّکٰوۃِ وَمَا اَشْبَہَ ذٰلِکَ ۔ (ج ۲ ص ۳۶۱)

جیسے قرآن کے منتقل ہونے کا حال ہے اور یہی حال پانچوں وقتوں کی نمازوں کا، نمازوں کی رکعتوں کا، زکوٰۃ کی مقررہ مقداروں کا اور ان ساری چیزوں کا ہے جو اسی راہ سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ صحابہ جو عہدِ نبوت میں موجود تھے، شریعت کے اس حصہ کے متعلق ان کے یقین کی جو نوعیت تھی، یہی نوعیت اس یقین کی مسلسل باقی رہی ہے، اس لئے ان امور کے لحاظ سے سارے مسلمان برابر ہیں خواہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، یا اس کے بعد پیدا ہوئے، علامہ ابو زید دبوسی نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تقویم میں لکھا ہے:

وَمَتٰی ارْتَفَعَتِ الشُّبْهَۃُ ضَاھٰی

(تواتر کی وجہ سے) جب شبہ باقی نہ رہا تو اس راہ سے جتنی

المُتَّصِلُ مِنْهُ بِكَ الحاسّة سمعك۔
(کشف ج ۲ ص ۳۶۲)

چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منتقل ہوکر تم تک پہنچی ہیں ان کی حالت ایسی ہوگئی کہ براہِ راست اپنے کان سے تم نے ان کو سُنا ہو۔

اسی طرح صاحب مسلم کے ان الفاظ کے تحت یعنی

إِنَّ التَّوَاتُرَ لَيْسَ مِنْ مَبَاحِثِ عِلْمِ الْإِسْنَادِ۔

تواتر کا تعلق ان مباحث سے نہیں ہے جن میں روایت کی سند سے بحث کی جاتی ہے۔

حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم نے بھی لکھا ہے کہ

بَلِ التَّوَاتُرُ كَالْمُشَافَهَةِ فِي إِفَادَةِ الْعِلْمِ۔
(فواتح الرحموت ج ۲ ص ۱۱۹ مطبوعہ مصر)

یقین آفرینی میں تواتر کا حال وہی ہے جو حال مشاہدہ کا اس سلسلہ میں ہے۔

پھر مولانا نے ایک دلچسپ مثال سے اس کو سمجھانا چاہا ہے یعنی بخاری میں بعض روایتوں کو ثلاثیاتِ بخاری کہتے ہیں، یہ ان روایتوں کا نام ہے جن میں امام بخاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کل تین آدمی کا واسطہ واقع ہوتا ہے۔ مولانا بحر العلوم نے ان ہی ثلاثیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بخاری کے بعد تو ان کی کتاب متواتر ہوگئی اس لئے بخاری کے بعد آئندہ صحیح بخاری کے ان سارے ثلاثیات کی حیثیت ہر مسلمان کے لئے رباعیات کی ہوگئی ہے،

مولانا کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

وَمِنْ ثَمَّةَ كَانَ ثُلَاثِيَّاتُ الْبُخَارِيِّ رُبَاعِيَّاتٍ لَنَا لِأَنَّ صَحِيحَهُ مُتَوَاتِرٌ عَنْهُ فَكَأَنَّا سَمِعْنَا مِنَ الْبُخَارِيِّ فَلَمْ يَزِدْ إِلَّا وَاسِطَةٌ وَهِيَ نَفْسُهُ۔

اسی بنیاد پر سمجھنا چاہئے کہ بخاری کے ثلاثیات (یعنی تین واسطوں والی روایتیں) ہمارے لئے رباعیات کی حیثیت رکھتی ہیں (یعنی چار واسطوں والی روایتوں کی حیثیت اُن کی ہوگئی) وجہ یہ ہے کہ امام بخاری کی کتاب (صحیح بخاری) امام بخاری کے لحاظ سے تو متواترہ ہوچکی ہے پس گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم نے اس کتاب کو براہِ راست امام بخاری ہی سے سنا ہے اس لئے ثلاثیات کے متعلق صرف ایک ہی واسطہ کا تو اضافہ ہوا یعنی خود امام بخاری کی ذات سے چوتھے

واسطے کی حیثیت اختیار کرلی۔ (فواتح ج ۲ ص ۱۱۱)

بہر حال شروع ہی سے اس کا باضابطہ نظم کر دیا گیا تھا کہ دین کے ایک حصہ کی حیثیت تو ایسی ہو جائے جس کے علم میں قیامت تک پیدا ہونے والے مسلمانوں کے اعتقاد کا حال قدرتی طور پر ایک ہو جائے۔ قرآن اور ایسی ساری چیزیں جو اسی راہ سے مسلمانوں میں پیغمبر کے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ جس رنگ میں قرآن منتقل ہوتا چلا آرہا ہے ان کی یہی کیفیت ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دین کے اس حصہ کو اسی حال میں چھوڑ کر رفیق اعلیٰ کی طرف تشریف لے گئے اور بحمد اللہ اس وقت دین کا یہ حصہ اسی رنگ میں مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے آئندہ بھی خدا سے امید ہے کہ اس کی اس کیفیت کی حفاظت فرماتا رہے گا۔ دین کے اس حصہ کے علم و یقین میں اشتباہ و اضمحلال کے پیدا ہونے کی وہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ خدانخواستہ مسلمانوں کو تاریخ کے آئندہ زمانہ میں محکومیت کی کسی ایسی ملعون کیفیت میں اپنے کرتوں کی بدولت مبتلا ہونا پڑے، جیسے یہود وغیرہ گزشتہ ملعون قوموں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ غیر قوموں کو ان پر مسلط کیا گیا اور یہ تسلط اتنا سخت تھا کہ اپنے دین کے نام لینے کی بھی اجازت محکومیت کی حالت میں ان کو نہیں دی جاتی تھی، ان کی کتابیں غائب ہوگئیں، ان کے علماء چن چن کر قتل کر دیئے گئے، کوشش کی گئی کہ آئندہ ان کی پیدا ہونے والی نسلوں کے کانوں میں دین موسیٰ اور اس کی کسی بات کی کوئی بھنک بھی نہ پڑنے پائے، صدیاں اسی حال پر گزر گئیں، جو جانتے تھے وہ مر گئے اور جو زندہ رہے انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ ان کے آباؤ اجداد کا کوئی دین بھی تھا یا اللہ کے کسی برگزیدہ رسول کی وہ بھی امت ہیں، ان کے رسول کی بھی کوئی کتاب تھی؟ یہودیوں کی تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعات سے ان کو تاریخ کے طویل ادوار میں دوچار ہونا پڑا ظاہر ہے کہ یہ ایسی جگر خراش روح فرسا شکل حق تعالیٰ کے عتاب کی ہے کہ خدا کے غصہ کی اس آگ میں جو کچھ بھی جل جائے اس پر متعجب نہ ہونا چاہئے تاہم بے چارے یہودیوں کو جب کبھی سر اٹھانے کا موقعہ ملا، ادھر ادھر سے ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پھر اپنے گمشدہ دین کو کسی راہ سے جیسا کہ ان کا خیال ہے اپنا لینے میں وہ کامیاب ہوئے لیکن پھر بھی درمیان میں ایسی تاریکیوں میں ان کو گھرنا

[illegible]

آتی ہے لیکن واقعہ کا اظہار کیسے نہ کروں بہ نسبت دوسروں کے یہ حال زیادہ تراکتا جانے کی اسی کیفیت سے پیدا ہوا ہے جو دین کے متعلق خود مسلمانوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر بدقسمتی سے پیدا ہو گیا ہے اور آہ! کہ اس وقت تک بجائے گھٹنے کے عملی طور پر[1] اس کیفیت میں کمی تو کیا پیدا ہوتی بظاہر شدت ہی پیدا ہوتی چلی جارہی ہے۔

خیر میں کدھر نکل گیا، آئندہ کیا ہونے والا ہے، علیم و خبیر ہی اسے جان سکتا ہے اور اس وقت مستقبل کے متعلق مجھے کچھ لکھنا بھی نہیں ہے بلکہ اس وقت تک جن حالات سے گزرتے ہوئے موجودہ نسلوں تک دین پہنچا ہے میری بحث کا دائرہ اسی حد تک محدود ہے۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم امت میں دین کو جس حال میں چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے، اس وقت ایک حصہ کی حالت تو وہی تھی جسے تبلیغِ عام کی راہ سے ایک ایسا قالب عطا کر دیا گیا تھا کہ اس کی یافت میں اگلوں پچھلوں کی حالت کا ایک ہو جانا ناگزیر تھا۔ بحمد اللہ ہزار سال کے بعد بھی چند صدیاں گزر چکی ہیں، اس وقت تک دین کا یہ حصہ اسی حال میں موجود ہے۔ اور دوسرا حصہ دین ہی کا تھا جس کے متعلق اگلوں اور پچھلوں کو تو کیا برابر کیا جاتا خود عہدِ نبوت میں جو موجود تھے ان لوگوں میں بھی اس کی اشاعت عمومی شکل میں اسی لئے نہیں کی گئی تھی کہ اس میں قصداً و ارادۃً اس رنگ کو چاہا جاتا تھا کہ نہ پیدا ہو، جو دین کے پہلے حصہ میں اور اس حصہ کے مطالبہ میں یا اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔

---

[1] "عملی طور پر" کا اضافہ میں نے جس لئے کیا ہے، ہر مسلمان جو اپنے حال سے واقف ہے غالباً اس اضافہ کی ضرورت تسلیم کرلے گا بعض علاقوں میں جہاں غیر قوموں سے مسلمانوں کو کشمکش کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے، وہاں دیکھا جا رہا ہے کہ دین کی طرف واپسی کا چرچا زبانوں پر کچھ دنوں سے ذرا زیادہ چڑھ گیا ہے۔ لیکن جس سے معاملہ ہے کاش! بجائے "سمیع و علیم" ہونے کے وہ صرف "سمیع" ہی ہوتا تو امید کی جاسکتی تھی کہ صرف سنا کر اس کو منا لینے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن سننے کے ساتھ جو دیکھتا بھی ہے اور ہر چیز جس حال میں ہے اس کو جانتا بھی ہے اس کے سامنے اس قسم کے چرچے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ ہم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ رَبَّنَا تُبْ عَلَيْنَا وَارْحَمْنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبَّنَا وَلَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۱۲

آنحضرتؐ سے روایت کرنے والوں کی تعداد

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے ہیں دین کا یہ ثانی الذکر حصہ کچھ تو مذکورۂ بالا کتابی شکل میں افراد کے پاس تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اس کی تعداد بہت محدود تھی اور زیادہ تر یہ ان لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا جن کے دل و دماغ کی تربیت دنیا کے سب سے بڑے معلمِ اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ طیبہ میں ہوئی تھی اور جن واقعات کے تجربے و مشاہدہ کا موقعہ صحبتِ نبوت میں ان کو ملا تھا، ان ہی کا تذکرہ دوسروں سے وہ کرتے تھے بعض لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ دین کا یہ حصہ جن لوگوں میں پھیلا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تھے ان کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر تھی۔ اصابہ میں علی بن زرعۃ الرازی کے حوالہ سے یہ مشہور قول منقول ہے کہ

تُوُفِّیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَنْ رَّاٰہُ وَسَمِعَ مِنْہُ زِیَادَۃٌ عَلٰی مِائَۃِ اَلْفِ اِنْسَانٍ مِّنْ رَّجُلٍ وَّامْرَءَۃٍ کُلُّھُمْ قَدْ رَوٰی عَنْہُ سِمَاعًا اَوْ رُؤْیَۃً۔[1] (اصابہ ج ۶ ص ۳۰)

وفات پائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں کہ جن لوگوں نے آپ کو دیکھا تھا اور آپ سے آپ کی باتیں سنی تھیں ان کی تعداد ایک لاکھ انسانوں سے زیادہ تھی جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں یہ ایک لاکھ سے زیادہ تعداد والی جماعت وہ ہے جس نے سن کر یا دیکھ کر آپ سے ان میں ہر ایک نے روایت کی ہے۔

---

[1] لیکن الخطیب نے خود ابوزرعہ رازی سے اپنی متصل سند کے ساتھ اس قول کو جو نقل کیا ہے اس میں بجائے ایک لاکھ کے ایک لاکھ چودہ ہزار ان صحابیوں کی تعداد بتائی گئی ہے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتار یا رفتار کے متعلق کسی قسم کا علم لوگوں تک پہنچایا ہے۔ ابوزرعہ سے پوچھا بھی گیا تھا کہ اتنی بڑی تعداد ان صحابیوں کی کیسے ہو سکتی ہے۔ آخر اتنے آدمیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں کیسے سنیں اور آپ کو کہاں دیکھا۔ اس کے جواب میں ابوزرعہ نے کہا کہ مدینہ والے [illegible] کے والے اور ان دو شہروں کے بیچ میں جو لوگ آباد تھے اسی طرح عام اعراب و صحرا کے باشندے جو خدمت مبارک میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ نیز حجۃ الوداع میں آپ کے ساتھ جو شریک تھے اور عرفات کے میدان میں جن لوگوں نے آپؐ کی باتیں سنیں یا آپؐ کو کچھ کرتے دیکھا (تدریب الراوی ص ۲۰۶)۔ اسی کتاب میں سیوطی نے رافعی کا قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ساٹھ ہزار مسلمان آپ کے بعد عرب میں موجود تھے جن میں تیس ہزار مدینہ میں اور تیس ہزار مختلف عربی قبائل میں پھیلے ہوئے تھے مگر خود اس تخمینہ کی وجہ معلوم نہیں ہوئی (باقی بر صفحہ آئندہ)

لیکن اس سلسلہ میں جن بزرگوں کے معلومات حدیث کی کتابوں میں جمع ہوسکے ہیں یا اس وقت جن کے معلومات تک رسائی ممکن ہے غالباً ان کی تعداد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الحاکم نے لکھا ہے کہ

قَدْ رَوٰی عَنْهُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الصَّحَابَةِ أَرْبَعَةُ الْاٰفِ رَجُلٍ وَّامْرَأَةٍ (مدخل ص ۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کی جماعت میں روایت کرنے والوں کی تعداد چار ہزار ہے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روپوشی یعنی وفات کے بعد دین کا یہی حال تھا اس کے بعد کیا ہوا؟ اب کچھ قصہ اس کا سنئے :۔

عہدِ صدیقی اور حدیث

ابوبکر صدیق رضی کی خلافت کا زمانہ اگرچہ مدتاً ایک مختصر زمانہ ہے، کُل ڈھائی سال حکمرانی کا ان کو ملا اور وہ بھی ایسے حال میں کہ اچانک مختلف قسم کے فتنے اور فساد خود عرب میں بھی پھوٹ پڑے اور عرب سے باہر بھی ایسی تیاریاں تھیں جن کی طرف توجہ ضروری تھی، تاہم ان ہی حالات میں حدیث کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تین اصولی اقدامات کا کتابوں میں تذکرہ کیا جاتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے :۔

حضرت ابوبکر رضؓ نے پانسو حدیثیں قلمبند کیں

جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اگرچہ بظاہر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت زیادہ تجلد اور صبر و ثبات استقلال و استقامت کا اظہار کیا لیکن درحقیقت یہ ان کا ظاہر حال تھا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ حضور کے بعد ابوبکر پر ان کی زندگی دوبھر ہوگئی تھی، عبداللہ بن عمر اور زیاد بن حنظلہ کے حوالہ سے ابن اثیر وغیرہ نے یہ قول نقل کیا ہے کہ

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) بخاری کی اس روایت کا لوگ اکثر تذکرہ کرتے ہیں جس میں کعب بن مالک جن کے ساتھ تبوک کی مہم میں بچھڑ جانے کی وجہ سے بڑا قصہ پیش آیا۔ وہ اپنا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے کہ لوگوں کی اتنی کثرت تھی کہ ایک دیوان (دفتر) میں ان کے نام کا احاطہ نہیں کیا گیا تھا یا نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی فرمایا کہ وَاَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ كَثِيْرٌ لَا يَجْمَعُهُمْ كِتَابٌ حَافِظٌ يَعْنِي الدِّيْوَانَ۔ یہ حضرت کعب کے اصلی الفاظ ہیں لیکن اس سے بھی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ سیوطی وغیرہ نے لکھا ہے کہ صحابہ کے حالات پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں دس ہزار سے زیادہ تعداد نہیں پائی جاتی، حالانکہ لکھنے والوں نے سب ہی کا تذکرہ کیا ہے یعنی جن لوگوں کا انتقال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوگیا تھا یا جو آپ کے سامنے پیدا ہو چکے تھے لیکن کمسن اور چھوٹے تھے۔

كَانَ سَبَبُ مَوْتِ أَبِي بَكْرٍ الْكَمَدُ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (اسد الغابہ ج ۳ ص۲۲۴) ابوبکر کی موت کی وجہ وہ اندرونی سوز و غم تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ان میں پیدا ہو گیا تھا۔

ایک ایسا جان لیوا اور جاں گداز غم جو آخر موت ہی پر منتج ہوا، شاید اسی اندرونی خلش اور سوزش کی تسکین کی یہ تدبیر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سمجھ میں آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو معلومات ان کے دماغ میں تھے ان کو قلمبند کر کے اپنا جی بہلائیں مشاغل کے اس ہجوم اور کثرت کے باوجود جن میں خلافت کے بعد وہ گھر گئے تھے، اتنا وقت انھوں نے نکال لیا کہ دس بیس نہیں بلکہ پانسو حدیثوں کا ایک مجموعہ جو قریب قریب موطا امام مالک کی مرفوع حدیثوں کی تعداد کے مساوی ہے[۱]۔ اپنے قلم سے لکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے تیار کر لیا۔ الذہبی نے ام المومنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

جَمَعَ أَبِي الْحَدِيْثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ خَمْسُ مِائَةِ حَدِيْثٍ (ص۵) جمع کیا میرے والد (ابوبکرؓ) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو اور یہ پانسو حدیثیں تھیں۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ جس کام کو سو سال بعد حضرت امام مالکؒ نے موطا کی شکل میں انجام دیا۔ یہی کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ایک ایسی صورت میں انجام پا چکا تھا جس سے زیادہ بہتر صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تدوینِ حدیث کے سلسلہ میں سوچی نہیں جا سکتی جو کہتے ہیں کہ ابتداءِ اسلام میں حدیثوں کو قلم بند نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں کاغذ دستیاب نہیں ہوتا تھا، یا لکھنے والے میسر نہیں آتے تھے یا جہاد وغیرہ کے مشاغل کی وجہ سے اس قسم کے علمی کام کے لئے مواقع نہیں تھے، ان سارے احتمالات کا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے عملی جواب دیا جا چکا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کفِ افسوس ملنے والے آج تدوینِ حدیث کی

---

[۱] موطا کے مختلف نسخے پائے جاتے ہیں جو حدیثوں کے تعداد کی کمی و بیشی کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں شاہ ولی اللہ نے مسوّی شرح موطا میں ابوبکر ابہری کے حوالہ سے جو قول نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موطا میں مسند مرفوع حدیثیں چھ سو ہیں لیکن ابن حزم کا قول شاہ صاحب ہی نے نقل کیا ہے کہ شمار کردم آنچہ در موطا است پس یافتم از مسند پانصد و چند حدیث ص۱ مسوّی شرح موطا۔

عام تاریخ پڑھ کر جو کفِ افسوس مل رہے ہیں ان کی آرزو ایسی شکل میں پوری ہو چکی تھی جس سے بہتر شکل سوچی نہیں جا سکتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے دینی اور سیاسی جانشین کے براہِ راست قلم کا لکھا ہوا حدیثوں کا یہ نسخہ حکومت کی طرف سے مسلمانوں میں اگر شائع ہو جاتا تو خیال کیجئے کہ آج پیغمبر کی ان حدیثوں کے متعلق کیا کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی تھی، الغرض آرزو کرنے والے حدیثوں کے متعلق جو کچھ آرزو اس زمانے میں کر رہے ہیں، ان کی وہی آرزو واقعہ کا قالب اختیار کر چکی تھی۔

جنھوں نے پیغمبر کے دین کے مصالح کو نہیں سمجھا ہے ان کے لئے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام کتنا بڑا مبارک اور ضروری اقدام قرار دیا جا سکتا ہے لیکن خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مصلحتوں کے پیشِ نظر دین کے اس حصہ کی اشاعت میں پوری کوشش اس پہلو پر صرف فرمائی تھی کہ عمومیت کا رنگ اس میں نہ پیدا ہو کیا ان پیغمبرانہ مصلحتوں پر پانی نہ پھر جاتا، اگر لکھنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اپنی حکومت کی طرف سے عام مسلمانوں میں اس کو شائع بھی فرما دیتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ع

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

اس جذبہ کی تائید تھوڑی دیر کے لئے ان کو عقل سے مل گئی۔ خیال آیا ہوگا کہ پیغمبر نے بھی تو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بعض لوگوں کو حدیثوں کے لکھنے کی اجازت دے دی تھی پھر میں بھی اگر کچھ لکھ رہا ہوں تو اجازت کے اس دائرے سے باہر تو میرا یہ کام نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنے اس جذباتی فیصلہ کے وقت شاید ادھر ان کا دھیان نہ گیا کہ جن لوگوں کو کتابتِ حدیث کی انفرادی اجازت بارگاہِ نبوت سے ملی تھی ان میں کوئی ابوبکر بھی نہ تھا اور نہ ان میں نبی کا کوئی جانشین اور مسلمانوں کا دینی و سیاسی امیر تھا اور نہ ان میں کوئی ایسی ہستی تھی جس کا کام حکومت کا کام سمجھا جا سکتا تھا۔

اسی روایت میں صدیقہ رضؓ کے بعض الفاظ جن کا ابھی ذکر آ رہا ہے، ان سے جو یہ معلوم ہوتا ہے

کہ لکھنے کے بعد بجائے عام اشاعت کے اس نسخہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے عائشہ صدیقہؓ کو رکھنے کے لئے دے دیا تھا، میں تو ان الفاظ سے یہ سمجھتا ہوں کہ کسی فوری جذبہ سے مغلوب ہو کر اس کام کو گو ابوبکر صدیق کر گزرے تھے لیکن ظاہر ہے کہ وہ ابوبکر صدیقؓ ہی کیوں ہوتے اور نبی کی جانشینی کے لئے ان کا انتخاب ہی کیوں ہوتا اگر اس مصلحت سے وہ قطعی طور پر خالی الذہن ہو کر اپنے اس کام کو اسی طرح بڑا کام تصور فرما لیتے جیسے اس زمانے کے آرزو کرنے والے سوچ رہے ہیں ان کا تو یہ حال ہے کہ آج یورپ یا امریکہ میں ابوبکر صدیق کے اس نسخہ کا اگر پتہ چل جائے تو اس کو اپنی ایک بڑی کامیابی قرار دے کر شاید آسمانوں کو سر پر اٹھالیں۔

اپنے ذخیرۂ حدیث کو جلا کر حضرت ابوبکرؓ نے سنتِ نبویؐ اور مصلحتِ پیمبری کی تجدید کی

لیکن یہ حال تو ان کا ہے جنھوں نے نہ پیغمبر کو دیکھا نہ پیغمبر کی صحبت سے استفادہ کا موقعہ ان کو ملا مگر جو زندگی کے ہر شعبہ میں نبی کا ثانی سمجھا جاتا تھا دیکھئے ہو ان کا کیا حال ہے، ان ہی کی صاحبزادی ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ جن کے پاس یہ "صدیقی نسخہ" حدیثوں کا رکھوایا گیا تھا، ان ہی کی زبانی سنئے وہ کیا فرماتی ہیں۔ اسی روایت کے آخر میں ہے:۔

فَبَاتَ لَيْلَةً يَتَقَلَّبُ كَثِيرًا۔ پھر ایک شب میں (دیکھا گیا) کہ وہ یعنی حضرت ابوبکرؓ بہت زیادہ کروٹیں بدل رہے ہیں۔

تم تو اس پر خوش ہو کہ ابتداء اسلام ہی میں حکومت کی طرف سے نبی کے بعد ہی خود پیغمبر کے خلیفہ نے حدیثوں کا مجموعہ جمع کر لیا گویا سارے شکوک و شبہات جو آج حدیثوں کے متعلق دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہو گیا تم اس لئے خوشی سے پھولے نہیں سماتے اچھل رہے ہو کہ بڑا کام ہو گیا، لیکن خود جس نے اس بڑے کام کو انجام دیا تھا وہ یہی سوچ کر کہ ایسا کیوں ہو گیا کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا ہے، نیند آنکھوں سے اُڑ گئی ہے۔ آخر عائشہ صدیقہؓ سے نہ رہا گیا باپ کی اس غیر معمولی بے چینی کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں، سرہانے تشریف لائیں خود فرماتی ہیں کہ

فغمنی (والد کی اس حالت نے مجھے غم میں مبتلا کر دیا) اور عرض کیا کہ

أَتَتَقَلَّبُ لِشَكْوَىٰ أَوْ بِشَيْءٍ — آپ یہ کروٹیں کیا کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے بدل رہے ہیں یا

بَلَغَكَ۔ — کوئی خبر آپ تک پہنچی ہے (جسے سن کر آپ بےچین ہو رہے ہیں)۔

ابوبکر ایک قطعی فیصلہ پر پہنچ چکے تھے، اسی لئے کسی دوسرے سے حتیٰ کہ ام المؤمنین جیسی صاحبزادی سے بھی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی مشورہ اس باب میں سنیں، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوچھتی رہیں لیکن ادھر سے کوئی جواب نہ ملا، عائشہ صدیقہ رض فرماتی ہیں کہ

فَلَمَّا أَصْبَحَ قَالَ أَيْ بُنَيَّةُ هَلُمِّي — جب صبح ہوئی تو (حضرت ابوبکر رض نے) فرمایا بیٹی ان حدیثوں

الْأَحَادِيثَ الَّتِي عِنْدَكِ۔ — کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں۔

کچھ نہیں معلوم کہ جن حدیثوں کو اتنی محنت اور کاوش سے لکھا ہے ان کو کیا کریں گے مگر حکم تھا لا کر عائشہ صدیقہ نے کتاب حاضر کر دی اس کے بعد کیا ہوا ان ہی سے سنئے فرماتی ہیں،

فَدَعَا بِنَارٍ فَحَرَّقَهَا۔ — پھر آگ منگوائی اور اس نسخہ کو جلا دیا۔

اور اب صدیقہ کی سمجھ میں آیا کہ رات بھر والد بےچینی کے ساتھ کروٹیں جو بدل رہے تھے اس کا اصلی راز کیا تھا۔ سب سے بڑی کامیابی ابوبکر کو نظر آگئی کہ ان کی بہت بڑی ناکامی ہوگی اگر دنیا میں ان کے ہاتھ کی یہ لکھی ہوئی کتاب باقی رہ گئی جو نہیں جانتے ہیں وہ کیا سمجھتے ہیں اور جو جانتا تھا اس نے کیا سمجھا، باپ بیٹی کی آئندہ گفتگو سے اس کا اندازہ کیجئے۔ صدیقہ فرماتی ہیں جب والد نے کتب میں آگ لگا دی اور اس کو جلا دیا تب میں نے عرض کیا کہ

لِمَ أَحْرَقْتَهَا۔ — آپ نے اسے کیوں جلا دیا۔

یہی سننے کی بات ہے جو جواب میں حضرت ابوبکر رض نے فرمائی کہ

خَشِيتُ أَنْ أَمُوتَ وَهِيَ عِنْدِي — مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ میں مر جاؤں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے

فَيَكُونَ فِيهَا أَحَادِيثُ عَنْ رَجُلٍ — پاس رہ جائے (بایں طور) کہ اس مجموعے میں ایسے شخص کی بھی

قَدِ ائْتَمَنْتُهُ وَوَثِقْتُهُ وَلَمْ يَكُنْ — حدیثیں ہوں جس کی امانت پر میں نے بھروسہ کیا اور اس کے

[illegible]

میں درج نہیں کیا تھا، ان کا یہی حال تھا مگر سوچنا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے خلیفہ اور دینی و سیاسی جانشین کی حکومت کی طرف سے جو کتاب مرتب کرائی گئی ہو اس میں مندرج ہو جانے کے بعد کیا ان حدیثوں کا یہی حال جس کا باقی رکھنا مقصود تھا باقی رہ سکتا تھا، ابوبکر صدیقؓ کی وہ کتاب آج مسلمانوں میں ہوتی تب بتلایا جا سکتا تھا کہ اس کتاب کی حدیثوں کے ساتھ اور ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام و قوانین کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت اور گرویدگی کا کیا حال ہے۔

فَأكُونُ قَدْ نَقَلْتُ ذَاكَ فَهٰذَا — جو اس نے (حدیث بیان کرنے والے نے) مجھ سے بیان کیا بات ویسی نہ ہو اور

لَا يَصِحُّ۔ — میں نے (اپنے مجموعہ) میں اسے نقل کر دیا ایسا کرنا درست نہ ہوگا۔

ان الفاظ کا کم از کم میری سمجھ میں یہی مطلب آیا ہے بلکہ شاید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے سوا کسی دوسرے مطلب کی گنجائش بھی ان الفاظ میں مجھے نظر نہیں آتی اوروں سے بھی میری یہی استدعا ہے کہ ان الفاظ کا کوئی دوسرا مطلب ان کے ذہن میں پہلے سے اگر موجود ہو یا غور کرنے سے اب معلوم ہوتا ہو مجھے مطلع فرما سکتے ہیں کیونکہ اس کا احتمال ہی نہیں ہے کہ شبہ کی وجہ سے حضرت ابوبکر نے ان حدیثوں کو قابل قبول نہ قرار دیا ہو کیونکہ ان کا مسلک اگر یہی ہوتا تو شروع ہی سے ان حدیثوں کے جمع کرنے کا ارادہ چاہیئے تھا کہ نہ فرماتے۔ آخر یہ احتمال کہ باوجود سچ بولنے کے ہر وہ شخص جو معصوم نہیں ہے اس کی خبر میں صدق کے ساتھ کذب اور سچ کے ساتھ جھوٹ ہونے کا بھی اندیشہ کیا جا سکتا ہے، یہ اندیشہ تو لکھنے سے پہلے ان ساری روایتوں کے متعلق پیدا ہو سکتا تھا جنہیں دوسروں سے سن کر انھوں نے اپنے اس مجموعہ میں درج کیا تھا لیکن باوجود اس اندیشہ کے جب ان حدیثوں کو لکھ چکے تو لکھنے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ مزید کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اضافہ اگر ہوا تھا تو اسی امر کا کہ ان کے قلم بند کر دینے کے بعد وہ شبہ جس کا ہر حدیث کے ساتھ احتمال لگا ہوا تھا وہ ختم ہو جائے گا بلکہ خلافت کی طرف سے اگر اس کی اشاعت نہ بھی کرتے گھر ہی میں رکھے رہتے مگر ان کے بعد لوگوں کو یہی کتاب ملتی تو ظاہر ہے کہ ابوبکر کی طرف منسوب ہو جانا ہی اس شبہ کے ازالہ کے لئے کافی ہوتا بلکہ

ان کے الفاظ "خَشِيْتُ اَنْ اَمُوْتَ وَهِيَ عِنْدِيْ" (مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ میں مرجاؤں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے پاس رہ جائے) ان الفاظ سے تو اسی کی تائید ہوتی ہے کہ اشاعت بھی ان کی زندگی میں اس کتاب کی اگر نہ کی جاتی جب بھی ان کے پاس سے اس کتاب کا نکلنا یہی اس نوعیت اور اس کیفیت کو بدل دینے کے لئے ان کے نزدیک کافی ہوتا جس کو قصداً ان حدیثوں میں باقی رکھنا پیغمبر کا مقصود تھا سچی بات تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کا مسلک اگر یہی ہوتا کہ خبر احاد میں چونکہ غلطی کا احتمال ہوتا ہے اس لئے چاہئے کہ اپنی دینی زندگی میں مسلمان اس سے قطعًا استفادہ نہ کریں اور اسی وجہ سے اپنی اس کتاب کو انھوں نے اگر نذر آتش کیا تھا تو چاہئے تھا کہ کبھی ایک دو آدمیوں کی روایتوں پر وہ بھروسہ نہ کرتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ پیش ہونے پر اسی کے مطابق صرف فیصلہ ہی نہیں بلکہ ضرورت کے وقت لوگوں سے اسی قسم کی حدیثوں کی جستجو اور تلاش بتایا گیا ہے کہ ان کا یہ ایک عام دستور العمل تھا۔ آخر طبقات ابن سعد میں حضرت ابوبکرؓ کی طرف اس اصول کو جو منسوب کیا گیا ہے کہ

اَنَّ اَبَابَكْرٍ اِذَا نَزَلَتْ بِهٖ قَضِيَّةٌ لَمْ يَجِدْ لَهَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اَصْلًا وَلَا فِي السُّنَّةِ اَثَرًا فَقَالَ اَجْتَهِدُ بِرَأْيِيْ فَاِنْ يَّكُنْ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ وَاِنْ يَّكُنْ خَطَأً فَمِنِّيْ وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ۔ (ج ۳ ص ۱۳۶)	حضرت ابوبکر کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی صورت حال ان کے سامنے ایسی پیش ہوتی جس کے متعلق نہ کتاب اللہ ہی میں کوئی اصل ملتی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں اس کے متعلق کسی اثر کا پتہ چلتا تو فرماتے کہ اپنی رائے سے اب میں اجتہاد کرتا ہوں میرا یہ اجتہادی نتیجہ اگر درست ہوا تو یہ اللہ کی طرف سے (توفیق) ہوگی اور اگر غلط ہوا تو اس کی ذمہ داری میری طرف عائد ہوگی۔ میں خدا سے اس غلطی کے متعلق معافی چاہتا ہوں۔

یہ کسی معمولی آدمی کا نہیں بلکہ ابن سیرین جیسے محقق صادق کا بیان ہے جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی نیا مقدمہ پیش آتا تو پہلے قرآن میں اس کی اصل تلاش کرتے اس میں نہ ملتا تو سنت یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل میں کوئی

اثر اور نمونہ مل سکتا ہے تو اس کو ڈھونڈھتے، جب ان دونوں میں کوئی چیز نہ ملتی تو پھر خود اجتہاد فرماتے۔ یہی میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ قرآن میں جب کوئی اصل نہ ملتی تو سنت میں اثر تلاش کرنے کا کیا طریقہ تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی کتاب ایسی اس وقت تو موجود نہ تھی جس سے مدد لی جا سکتی تھی۔ یہی کیا جا سکتا تھا اور کیا جاتا تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے متعلق حضرت ابوبکر کے پاس جو معلومات تھے ان میں ڈھونڈتے اپنے پاس نہ ہوتا تو دوسروں سے پوچھتے متعدد واقعات میں انھوں نے یہی کیا بھی تھا جس کا کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے وہی جدّہ (دادی) کی میراث کا مسئلہ ہے کون نہیں جانتا کہ خود حضرت ابوبکر کے پاس اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا، الذہبی میں ہے کہ

ثُمَّ سَأَلَ النَّاسَ (تذکرہ ص ۳) تب حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں سے دریافت کیا۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں کوئی فیصلہ کیا ہو اور کسی کو معلوم ہو تو بتائیں تب حضرت مغیرہ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس فیصلہ کا اس مسئلہ کے متعلق ان کے پاس علم تھا اس کو پیش کیا جو ظاہر ہے کہ ایک خبر تھی، صدق وکذب کا احتمال اس میں بھی تھا جیسا کہ لکھا ہے زیادہ اطمینان حاصل کرنے کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ کوئی اور صاحب بھی اس فیصلہ کی شہادت دے سکتے ہیں۔ محمد بن مسلمہ نے جب تائید کی تو اسی حدیث کے مطابق حضرت ابوبکر نے فیصلہ کر دیا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک آدمی کی خبر ہو یا دو کی غلطی کا احتمال دونوں میں رہتا ہے۔ البتہ دوسرے آدمی کی تائید سے اس احتمال میں کچھ کمی ضرور ہو جاتی ہے جیسے عدالت کے مقدمات میں بھی یہی کیا جاتا ہے کہ بجائے ایک گواہ کے دو گواہوں کے بیان پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہی حضرت ابوبکرؓ نے بھی کیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق لکھا ہے کہ بجائے اس کے مقدمات ہی کے سلسلہ میں مزید اطمینان کا جو طریقہ ہے یعنی قسم کھلوانا یا حلف لینا اس پر عمل کرتے تھے[1]۔ حالانکہ جب آدمی جھوٹ بول سکتا ہے اور بولتا ہے تو کیا جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا اور سکتا کیا معنی

---

[1] ذہبی نے خود حضرت والا کا قول نقل کیا ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست کوئی بات جب میں سنتا تو جتنی توفیق ہوتی اس پر عمل کرتا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث جب دوسرے سے سنتا تو قسم لے کر اطمینان حاصل کرتا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰)۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَتَى	میں پہنچا جیسا لباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیب تن فرمایا کرتے
أَهْلَ بَيْتٍ مِّنَ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ إِنَّ	تھے اور گھر والوں سے اس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِي	نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جس گھر میں چاہو تم جھانک سکتے ہو تب
أَيَّ بَيْتٍ شِئْتَ اسْتَطْلَعْتَ فَقَالُوْا	لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عہد ہم سے لیا
عَهْدُنَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ	ہے (اسے ہم جانتے ہیں) کبھی آپ بے شرمی کی باتوں کا حکم نہیں
وَسَلَّمَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَوَاحِشِ فَأَعَدُّوْا	دیتے، پھر ان ہی لوگوں نے اس کے لئے ایک گھر خالی کر دیا اور
لَهُ بَيْتًا وَأَرْسَلُوْا رَسُوْلًا إِلَى رَسُوْلِ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی بھیجا اور جو بات اس
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرُوْهُ	شخص نے کہی تھی اس کے متعلق دریافت کیا۔ آنحضرت صلی اللہ
فَقَالَ لِأَبِي بَكْرٍ وَّعُمَرَ انْطَلِقَا إِلَيْهِ	علیہ وسلم کو اس شخص کی غلط بیانی کا جب علم ہوا تو آپؐ نے
فَإِنْ وَجَدْتُمَاهُ حَيًّا فَاقْتُلَاهُ ثُمَّ	ابوبکر و عمر کو حکم دیا کہ اس شخص کے پاس جاؤ، اگر اس کو زندہ
حَرِّقَاهُ النَّارَ۔ (جمع الفوائد ص ۲۷)	پاؤ تو قتل کر دینا اور آگ میں جلا دینا۔[1]

آگے بیان کیا گیا ہے کہ ان حضرات کے پہنچنے سے پہلے اس شخص کو سانپ نے ڈس لیا، جب تک یہ لوگ پہنچے وہ مر چکا تھا، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بطور پیشین گوئی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ اصابہ میں ہے کہ بھیجتے ہوئے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں خیال کرتا ہوں تم دونوں اس شخص کو نہ پا سکوگے۔ (اصابہ ج ۱ ص ۲۴۸)

بہرحال اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے والے کو حکومت چاہے تو قتل تک کی سزا دے سکتی ہے اور بعد کو سلاطینِ اسلام نے اس قسم کے زنادقہ کو یہی سزا دی بھی ہے جس کا ذکر انشاء اللہ اپنے موقعہ پر آئے گا۔

[1] حافظ ابن حجر نے اصابہ میں بھی اس روایت کو الفاظ کے معمولی رد و بدل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اصابہ والی روایت میں ہے کہ اس شخص نے آکر لوگوں سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نکاح فلاں عورت سے کر دیا ہے اسی طرح بجائے حضرت ابوبکر و عمر کے اصابہ والی روایت میں ہے کہ حضرت علی و مقداد کو رسول اللہ نے اس شخص کو قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا ۱۲

تحقیقِ حدیث کے لئے اصولِ شہادت کی بنیاد حضرت ابوبکرؓ نے رکھی

پس اصلی کام دین کے اس حصے کے متعلق وہی "کج دارمریز" کے اصول کی نگرانی تھی ایک طرف تو حضرت ابوبکرؓ نے اس خطرے کے انسداد کے لئے کہ دین کے اس حصے میں عمومیت کا رنگ نہ پیدا ہوجائے جس کی عمومی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی تھی اپنے لکھے ہوئے مجموعہ کو ضائع بھی فرمادیا، لیکن اسی کے ساتھ آپ نے خبروں کی تحقیق وتنقید کے عام اصول کے سوا حضرت مغیرہ کے بیان کرنے پر جو یہ فرمایا کہ هل معك غيرك (کیا تمہارے ساتھ اس خبر میں کوئی دوسرا آدمی بھی شریک ہے) اگرچہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا تو صحیح نہ ہوگا کہ جیسے فصلِ خصومات کے لئے کم ازکم شہادت کا نصاب دو ہے، اسی طرح اس نوعیت کی حدیثوں پر اعتماد کرنے کے لئے کم ازکم دو راویوں کا ہونا ضروری ہے کیونکہ دین کے اس حصّہ پر اعتماد کرنے کے لئے اس کو قانونی نصاب کی شکل اگر دے دی جائے گی تو ثابت کرنا پڑے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس نوعیت کی حدیثوں کی تبلیغ کم ازکم دو آدمیوں کو ضرور فرماتے تھے حالانکہ یہ قطعاً غیر ضروری ہے، ایک ذخیرہ روایات کا پایا جاتا ہے جن کے متعلق خود صحابی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا ذکر اور کسی سے نہ کیا تھا۔ نیز دنیا کے عام کاروبار میں جیسے اس وقت تک دیکھا جارہا ہے عہدِ نبوت میں بھی بقول حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہی دستور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً ضرورتوں کے لئے ایک ہی آدمی کو روانہ فرمایا کرتے تھے لیکن یہ کبھی نہیں سُنا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے اس آدمی پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہو کہ

اَنْتَ وَاحِدٌ وَلَيْسَ لَكَ اَنْ تَاْخُذَ مِنَّا مَالَمْ نَسْمَعْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّهٗ بَعَثَكُمْ عَلَيْنَا۔ (الرسالہ ص ۱۱۰)	تم تنہا اکیلے آدمی ہو اس لئے تمہیں اس کا حق نہیں ہے کہ ہم سے کچھ اس وقت تک وصول کرو جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم یہ نہ سن لیں کہ ہم لوگوں سے (صدقہ وغیرہ وصول کرنے کیلئے) تم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے۔

خود ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعدد روایتیں ایسی مروی ہیں جن کے تنہا وہی راوی ہیں خصوصاً وراثت انبیاء والی روایت،" اور پیغمبر کے مدفون ہونے کی جگہ وہی ہوتی ہے جہاں ان کی وفات واقع ہو"، ان دونوں حدیثوں کے وہ تنہا راوی ہیں اور ایک وہی کیا آپ کے بعد خلفاء اور دوسرے صحابہ صرف ایک صحابی کے بیان پر بھروسہ کرکے حدیثوں کو عموماً مانتے رہے ہیں اس کے متعلق واقعات کی اتنی کثرت ہے کہ ان کو ایک جگہ اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب ان سے تیار ہو سکتی ہے۔ الخطیب نے اپنی کتاب کفایہ میں لکھا ہے کہ ان روایتوں کو مستقل کتاب کی شکل میں انہوں نے جمع کر دیا ہے۔

بہر حال جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قسم لینا مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی نہ کہ اعتماد کی شرط تھی، بجنسہ یہی حال حضرت ابوبکر کے اس طرز عمل کا ہے کہ اعتماد میں زیادہ قوت پیدا ہو جائے اس لئے آپ نے چاہا کہ کوئی اور صاحب بھی جانتے ہوں تو بیان کریں، اتفاقاً محمد بن مسلمہ بھی اس روایت کے جاننے والے نکل آئے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ اگر محمد بن مسلمہ کی تائید نہ ملتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت مغیرہ کے بیان کو مسترد فرما دیتے۔

تاہم ان کے اس طرز عمل سے یہ سبق مسلمانوں کو ضرور ملا کہ دین کا یہی حصہ کیوں نہ ہو یعنی خبر الخاصہ بالواحد بعد الواحد کی راہ سے جو پہنچایا گیا ہے اس کے رد و قبول میں لاپروائی سے کام نہ لینا چاہئے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کے بیان کرنے کے بعد بھی مزید تائید کا انھوں نے مطالبہ کیا تو جو صحابی نہیں ہیں خود سمجھنا چاہئے کہ ان کی روایتوں کے قبول کرنے میں مسلمانوں کو کس درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اور غالباً مزید اطمینان کیلئے شاید یہ سبق بھی اپنے اس طریقۂ کار سے وہ دینا چاہتے تھے کیونکہ ان کے بعد ہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کو دیکھتے ہیں کہ اسی سنت صدیقی کی پیروی کرتے ہوئے بعض صحابیوں کی روایت پر مزید تائید کا آپ نے بھی مطالبہ فرمایا بلکہ اپنی خاص فطرت کے لحاظ سے اس مطالبہ میں کچھ شدت کی راہ بھی اختیار کی۔[1]

[1] میرا اشارہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس مشہور دلچسپ روایت کی طرف ہے۔ (باقی برصفحہ آئندہ)

اس طرح سچ پوچھئے تو خبر احاد کے متعلق اس طرزِ عمل کی بنیاد سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس دن رکھ دی تھی جس دن مغیرہ کی روایت کو سن کر آپ نے مزید

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) جو نسائی کے سوا صحاح ستہ کی ہر کتاب میں پائی جاتی ہے حاصل جس کا یہی ہے کہ ابو موسیٰ اشعری حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے کے لئے حاضر ہوئے۔ آپ اندر تھے۔ جیسا کہ اسلامی دستور ہے کہ اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ باہر ہی سے حضرت عمر کو سلام کیا لیکن جواب نہ آیا۔ دوسری دفعہ تیسری دفعہ بھی جب ان کو جواب نہ ملا تو لوٹ گئے۔ ان کا لوٹنا تھا کہ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اپنا آدمی یہ ہدایت کر کے روانہ کیا کہ ابو موسیٰ کو بلا کر لے آؤ۔ جب وہ آئے تو فرمایا تم نے جو کچھ آج کیا ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تعلیم تم نے پائی ہے؟ حضرت ابو موسیٰؓ نے کہا ہاں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اجازت تین دفعہ لی جائے نہ ملے تو آدمی واپس لوٹ جائے اسی پر میں نے عمل کیا۔ حضرت عمرؓ نے ذرا آنکھ نکالتے ہوئے فرمایا لتقیمن علیہ بینۃ (تم کو اس پر شہادت پیش کرنی پڑے گی) بعض روایتوں میں ہے کہ اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ لافعلن (میں تمہارے ساتھ کچھ کروں گا) گویا دھمکی کی ایک شکل تھی بعضوں میں ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ

إِنْ كَانَ هٰذَا شَيْئًا حَفِظْتَهُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَا وَإِلَّا لَأَجْعَلَنَّكَ عِظَةً (جمع الفوائد بحوالہ خمسہ ص ۱۴۴)

اگر یہ کوئی ایسی بات ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر تم نے یاد کر لیا ہے تو خیر ورنہ تم کو میں دوسروں کے لئے باعث عبرت بناؤں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریقۂ گفتگو کے اس خاص انداز سے ابو موسیٰ کچھ گھبرا سے گئے۔ انصار کا ایک مجمع کہیں قریب میں تھا اسی مجمع میں پریشان حال پہنچے۔ سید القراء حضرت ابی بن کعب اس جماعت میں سب سے بڑے تھے۔ ان ہی سے یہ دریافت کرتے ہوئے کہ آپ لوگوں میں کوئی صاحب ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سنا ہو اور حضرت عمرؓ نے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا تھا اس کا بھی اظہار کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے جو مذاق شناس تھے وہ ان کے اس طرزِ عمل کو سن کر ہنس پڑے لیکن حضرت ابیؓ نے ان لوگوں کو جھڑکتے ہوئے کہا کہ یہ بیچارے تو پریشان ہیں اور تم لوگ ہنستے ہو۔ پھر کہا کہ اس حدیث سے تو غالباً ہم انصار میں جو سب سے عمر میں چھوٹا ہے وہ بھی واقف ہوگا۔ ابو سعید خدریؓ سب سے عمر میں چھوٹے تھے، ان ہی کو حکم دیا گیا، ابو موسیٰ کے ساتھ گئے اور ان کے بیان کی حضرت عمرؓ کے سامنے توثیق کی۔ بہر حال یہ قصہ تو ختم ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو موسیٰؓ کو خوف زدہ پا کر کچھ حضرت ابی بن کعبؓ کو خیال آیا۔ اسی وقت یا اس کے کچھ دیر کے بعد وہ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

شہادت کا مطالبہ فرمایا پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہدِ خلافت میں وقتاً فوقتاً اس بنیاد کو زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش کرتے رہے، ابوموسیٰ ہی کے ساتھ نہیں بلکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) يَا ابْنَ الْخَطَّابِ فَلَا تَكُونَنَّ عَذَابًا عَلَىٰ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

یعنی اے ابن الخطاب (خدا نے تم کو مسلمانوں کا امیر بنا دیا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے لئے تم عذاب نہ ہو۔

ابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس شکایت کو سن کر جو واقعہ تھا اس کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا کہ

سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ إِنَّمَا سَمِعْتُ شَيْئًا فَأَحْبَبْتُ أَنْ أَتَثَبَّتَ۔

سبحان اللہ سبحان اللہ میں نے ایک بات سنی میں نے یہ چاہا کہ پایۂ ثبوت تک وہی بات پہنچائی جائے۔

بعض روایتوں میں اتنا اور اضافہ ہے کہ اسی کے ساتھ حضرت عمرؓ نے ابوسعید خدری کی مزید تائید کے بعد ابوموسیٰ کو خطاب کرکے فرمایا تھا کہ

أَمَا إِنِّي لَمْ أَتَّهِمْكَ وَلٰكِنْ خَشِيتُ أَنْ يَتَقَوَّلَ النَّاسُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ غلط بیانی کے ساتھ تم کو میں متہم نہیں کرتا لیکن مجھے اس کا اندیشہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی باتیں لوگ منسوب کرنے لگیں۔

اور بات درحقیقت یہی تھی یہ نہ تھا کہ تنہا ابوموسیٰ کی روایت پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعتماد نہ تھا ان کے حالات میں پڑھئے خدا جانے اس نوعیت کی حدیثوں میں یعنی صرف ایک صاحب کے بیان پر ان ہی حضرت عمرؓ نے کتنی دفعہ اعتماد کیا ہے، لیکن اس وقت ذرا سختی دکھا کر جہاں تک میرا خیال ہے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے صحابی جیسے ابوموسیٰ تھے ان کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے تو جو صحابی نہیں ہیں ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ پیغمبر کی طرف لاپرواہی کے ساتھ باتوں کے منسوب کرنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ محدثین میں بعد کو "شواہد و متابعات" کا جو ذوق پیدا ہوا یعنی ایک ہی حدیث کو حد تک جتنے زیادہ طریقوں سے مل سکتی ہو ان طریقوں کے تلاش کرنے اور جمع کرنے میں عجیب و غریب والہانہ جذبات کا ظہور ان سے جو ہوا ہے کچھ تفصیل اس کی بھی گزر چکی ہے اور آئندہ بھی اپنے اپنے موقعہ پر ان کوششوں کا ذکر انشاء اللہ آئے گا۔ خصوصاً امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں کی روایتوں کا جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا منجملہ دوسرے امتیازات کے ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے یعنی شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں عموماً ان دونوں کتابوں کی روایتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

"طرق متعددہ دارد کہ یکے گواہِ دیگر تواند بود و ہر یکے متماسک بود" (مکتوبات شاہ ولی اللہ ص ۲۱)

اور اسی چیز نے منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ان دونوں کتابوں کے درجہ کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ حدیثوں کا کوئی مجموعہ ان کے ہم پلہ باقی نہیں رہا ہے ۱۲

کہ اوروں کے ساتھ بھی حضرت عمرؓ نے کئی دفعہ اسی طرزِ عمل کو دہرایا۔ [1]

الغرض تدوینِ حدیث کی تاریخ میں "شواہد و متابعات" کا جو دیوانِ رفیع بعد کو قائم ہوا سچ پوچھئے تو وہ اسی صدیقی بنیاد پر اس کی تعمیر کھڑی کی گئی۔ الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت

---

[1] اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پرلطف قصہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مکان کا ہے جو مسجد نبوی سے متصل تھا بیان یہ کیا جاتا ہے کہ مدینہ کی آبادی عہدِ فاروقی میں جب بہت زیادہ بڑھ گئی اور مسجد نبوی میں تنگی محسوس ہونے لگی تو اطراف و جوانب کے مکانات کو حضرت عمرؓ نے بیت المال سے خرید خرید کر مسجد کے ساتھ ملانا شروع کیا۔ آخر میں حضرت عباسؓ کا مکان رہ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو بھی حکم دیا کہ فروخت کر دیجئے لیکن وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچا تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکم کی وجہ سے وہ اڑ گئے گو حضرت عمرؓ مختلف قسم کی رعایتوں کا ان کے ساتھ وعدے کرتے رہے لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے۔ آخر ایک دن طے ہوا کہ اس قصے کو پنچایت میں دے دیا جائے۔ ابی بن کعب سید القراء صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دونوں نے حکم تسلیم کر لیا۔ قصہ ان کے پاس پیش ہوا۔ ابی نے دونوں کے بیانات کو سن کر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر کا حکم داؤد علیہ السلام کو جب ہوا اور تعمیر میں جب وہ مشغول ہوئے تو کسی آدمی کا مکان درمیان میں کچھ ایسا حائل ہوا کہ اس مکان کا نقشہ اس سے بگڑتا تھا (یعنی مربع یا چاروں سمت برابر ہو) اس میں نقص پیدا ہوتا تھا۔ اس شخص سے حضرت داؤدؑ نے کہا کہ فروخت کر دو مگر وہ راضی نہ ہوا آخر حضرت داؤدؑ نے دل میں طے کیا کہ (بزورِ حکومت) اس پر قبضہ کر دوں گا۔ حق تعالیٰ کو ان کا یہ ارادہ ناگوار گزرا وحی ہوئی کہ داؤد میں نے تم کو حکم دیا کہ میری یاد کے لئے گھر بناؤ سو تم نے ارادہ کیا کہ غصب اور زبردستی چھینی ہوئی زمین کو اس مکان میں شریک کرو، مگر میری شان یہ نہیں ہے کہ میرے گھر میں منصوبہ زبردستی چھینی ہوئی چیز داخل ہو۔ اس ارادے کی تم کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ اس کی تعمیر تم پوری نہ کر سکو گے تب داؤدؑ نے کہا کہ پروردگار! میں نہیں تو اس کی تکمیل میرے فرزند کے ہاتھوں کرا دی جائے۔ ارشاد ہوا کہ ہاں! یہ ہو گا۔ حضرت ابیؓ نے یہ حدیث جو سنائی تو حضرت عمرؓ بے اختیار ہو گئے اور اُبی کے دامن کو پکڑ کر فرمانے لگے کہ میں تو تمہارے پاس اس لئے آیا تھا کہ سہولت پیدا کرو گے تم نے تو اور بھی زیادہ سخت بات پیش کر دی اور کہا کہ تم کو اپنے اس بیان کی تائید میں شہادت پیش کرنی پڑے گی۔ دونوں مسجد آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کا ایک مجمع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا جس میں حضرت ابوذر بھی تھے۔ اُبی نے مجمع کی طرف خطاب کر کے کہا کہ میں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ بیت المقدس کی تعمیر کے اس قصہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے اگر سنا ہو تو بیان کرے۔ حضرت ابوذرؓ کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سنا ہے تب حضرت ابیؓ نے کہا کہ عمرؓ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں مجھے متہم کرتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا خدا کی قسم میں نے تم کو متہم نہیں ٹھہرایا لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں (باقی برصفحہ آئندہ)

ابو موسیٰ اشعری کے مذکورہ بالا قصہ کو درج کرنے کے بعد بالکل صحیح لکھا ہے کہ

وَفِیْ ذٰلِكَ حَضٌّ عَلٰی تَكْثِیْرِ طُرُقِ الْحَدِیْثِ۔ ص۳ — یعنی حدیثوں کے طرق میں بعد کو جس کثرت کا خیال لوگوں کو ہوا اس پر لوگوں کو (حضرت عمرؓ) ہی کے طرزِ عمل نے آمادہ کیا۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ بنیاد اس کی تو ابوبکر صدیق رکھ چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے اس بنیاد کے استحکام و استواری میں مدد ملی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آج دین کے اس حصہ کی کیفیت تیرہ سو سال بعد تک مسلمانوں میں اپنی خاص خصوصیتوں کے ساتھ جو موجود ہے یعنی ایک طرف مسلمانوں نے اس حصہ کو دین کے بیناتی حصہ کے برابر نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ مدارج و مراتب کے اس فرق کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی، جسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قصداً وارادۃً اس حصہ میں پیدا کرنا چاہا تھا اسی طرح ہر زمانے میں اس کا

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) عام طور پر پھیل جائیں یعنی وہی مطلب کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں عمومیت کا رنگ اگر ان حدیثوں میں پیدا کر دیا جائے گا جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی اور انفرادی راہوں سے پہنچائی ہیں تو آنحضرتؐ کا جو منشاء مبارک ہے وہ جاتا رہے گا۔ حضرت ابی یہ سن کر مطمئن ہو گئے۔ اور جب حضرت عباسؓ کو بھی محسوس ہوا کہ حکم کی راہ سے میرے گھر پر قبضہ کرنے سے عمر مایوس ہو چکے تو حاضر ہو کر فرمایا کو عمر لو! اب اس مکان کو مسلمانوں کے لئے میں خیرات کرتا ہوں اور ان کی مسجد میں اس کا اضافہ کر کے گنجائش پیدا کرتا ہوں۔ (ابن سعد ج ۴ ص ۱۴)

مسجدِ نبوی کے پاس حضرت عباسؓ کے اسی مکان کا ایک اور دلچسپ قصہ ہے۔ بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ اس کا ذکر کر دوں، ابن سعد ہی میں ہے کہ اسی مکان کے چھت میں ایک پرنالہ تھا۔ جمعہ کی نماز کے لئے کپڑے بدل کر حضرت عمرؓ خلافت کے زمانہ میں مسجد جا رہے تھے اس دن مرغی کے بچے حضرت عباسؓ کے لئے ذبح کئے گئے تھے اس بچے کے گوشت وغیرہ کے دھونے کا خون اور آلائش چھت سے کسی نے بہا دیا۔ اسی وقت حضرت عمر پرنالے کے پاس سے گزر رہے تھے، سارا پانی ان کے جسم پر گرا، اس وقت ایسا غضب طاری ہوا کہ آدمی بلوا کر خود اپنے ہاتھ سے اس پرنالے کو آپ نے اکھڑوا دیا۔ حضرت عباسؓ کو جب خبر ہوئی تو اور کچھ نہ بولے صرف اتنا فرمایا کہ اس پرنالے کو براہِ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ نصب کیا تھا۔ یہ سننا تھا کہ عمرؓ بے چین ہو گئے اور قسم دے کر حضرت عباسؓ کو آمادہ کیا کہ عمرؓ کے کندھے پر چڑھ کر اس نالی کو اسی جگہ پر نصب کر دیں جہاں پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اس کو نصب کیا تھا۔ آخر یہی کیا گیا۔ (ابن سعد ج ۴ ص ۱۳) ۱۲

بھی خیال کیا گیا کہ ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردی جائے محض منسوب ہو جانے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہو جاتی بلکہ چھان بین، تحقیق و تلاش تنقید و تجسس کی کوششوں میں مسلمان ابتداء اسلام سے اس وقت تک مشغول ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کسی خاص علاقہ یا ملک میں جہل کے پھیل جانے کی وجہ سے کچھ دن کے لئے بے تمیزیاں پھیل گئی ہوں۔

تدوینِ حدیث کی تاریخ میں حضرت ابوبکرؓ کی ایک اور اہم خدمت

لیکن حضرت ابوبکرؓ کا کام تدوینِ حدیث کے سلسلے میں صرف ان ہی دو خدمات تک محدود نہیں ہے افسوس ہے کہ کتابوں میں ان کی اس خدمت کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن شاید اس کی اہمیت کا اندازہ جیسا کہ چاہئے تھا لوگوں کو نہ ہوا۔ بات میں ممکن ہو کچھ طوالت پیدا ہو، لیکن کیا کیا جائے مجھ سے پہلے کام لینے والوں نے اختصار سے کام لیا میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن اہمیت کے مستحق تاریخ کے یہ وثائق تھے ان کی اہمیت کا اندازہ اچھے اچھوں کو نہ ہو سکا۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بجائے عمومی اشاعت کے دین کے اس حصہ کے متعلق یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا کہ پہنچانے کی حد تک تو وہ پہنچا دیا جاتا لیکن عموماً ہر شخص تک پہنچ جائے اس کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ جیسا کہ بتایا گیا اسی سے مسلمانوں کی دینی زندگی میں اس حصہ کے لحاظ سے سہولتیں پیدا ہوئیں جو ان سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی راہ کھلی ہوئی ہے لیکن محروموں کی محرومی میں اس لئے اضافہ نہیں ہوتا کہ اس حصہ کے مطالبہ و گرفت میں وہ نوعیت نہیں پیدا ہوتی جو قرآنی حصہ کی خصوصیت ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ایک دوسرا نتیجہ یعنی ان روایتوں کے جاننے والوں اور جو ان سے ناواقف تھے ان دونوں طبقوں میں اختلاف کا پیدا ہو جانا واقفیت اور عدم واقفیت کی وجہ سے ناگزیر تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے حضرت عمرؓ ہی کے متعلق دو قصے اس سلسلہ میں گزر چکے معمولی آدمی نہیں حضرت عمرؓ جیسی شخصیت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثوں یعنی استیذان (اجازت) کے خاص طریقے اور بیت المقدس والی مسجد کے اس قصے سے جس کا ذکر میں نے حاشیہ

میں کیا ہے آپ سن چکے وہ ناواقف تھے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر دوسرے صحابیوں سے فرمایا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ دین کے اس حصہ کو جس طریقہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا تھا ایسی صورت میں بعضوں کا اس سے واقف ہونا اور بعضوں کا ناواقف رہ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہو سکتی، خصوصاً جن لوگوں کو معاشی یا اسی قسم کے دوسرے کاروبار کی وجہ سے چوبیس گھنٹہ کی حاضرباشی کا دربار نبوت میں موقعہ میسر نہ تھا، استیذان والی روایت میں خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعتراف کرنا پڑا،

خَفِيَ عَلَيَّ هٰذَا مِنْ أَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلْهَانِيْ عَنْهُ الصَّفْقُ فِي الْأَسْوَاقِ (جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۲۴)

یعنی یہ روایت مجھ سے جو مخفی رہی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بازاروں کے کاروبار کی مشغولیت نے اس کا موقعہ میرے لئے نہیں رکھا تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی کثرت روایت کی وجہ بیان کرتے ہوئے بھی یہی کہتے تھے کہ

إِنَّ إِخْوَانِيْ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ كَانَ يُشْغِلُهُمُ الصَّفْقُ فِي الْأَسْوَاقِ وَكُنْتُ أَلْزَمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مِلْءِ بَطْنِيْ۔

میرے دوسرے مہاجر بھائیوں کو بازار کے کاروبار نے اپنے ساتھ مشغول رکھا مگر میں تو صرف پیٹ پر رسول اللہ کے آستانے پر پڑا ہوا تھا۔

غالباً ابوہریرہؓ کی اس پوری روایت کا ذکر کہیں پہلے بھی آچکا ہے حاصل اس کا یہی تھا کہ مہاجرین تو بازار کے کاروبار میں عموماً مشغول رہتے تھے اور انصار کو اپنے باغوں اور کھیتوں کی وجہ سے زیادہ فرصت میسر نہیں آتی تھی البتہ یہ فقیر ابوہریرہ صرف پیٹ پر پیغمبر کے آستانے پر پڑا ہوا تھا اسی کا نتیجہ یہ ہوا جیسا کہ خود ان کا بیان ہے کہ فَأَشْهَدُ إِذَا غَابُوْا وَأَحْفَظُ إِذَا نَسُوْا (میں اس وقت حاضر رہتا تھا جس وقت یہ لوگ غائب رہتے تھے اور جن باتوں کو دوسرے بھول جاتے تھے مجھے حاضرباشی کی وجہ سے یاد رہ جاتی تھیں، کیونکہ بار بار سننے کا موقعہ ملتا تھا۔)

اگرچہ یہ باتیں کس نوعیت کی ہوتی تھیں اس کا اندازہ حضرت عمرؓ والی ان ہی دونوں روایتوں سے ہو سکتا ہے۔ استیذان اصولی طور پر ایک قرآنی قانون ہے، قرآن ہی میں حکم دیا گیا ہے کہ کسی

دوسرے گھر میں بے دھڑک بغیر اجازت مسلمانوں کو گھسنا نہ چاہیئے بلکہ صاحب خانہ کو مانوس بناکر اور سلام کلام کرکے داخل ہونا چاہیئے قرآنی قانون ہونے کی وجہ سے اس کی تبلیغ عام ہو چکی تھی، باقی سلام کتنی دفعہ کرنا چاہیئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر عمومی طریقہ سے لوگوں کو تعلیم دی تھی کہ تین دفعہ سلام کرنے کے بعد بھی جواب نہ ملے تو پلٹ جانا چاہیئے۔ بس یہی تین دفعہ سلام کرنا اس کی عمومی اشاعت مسلمانوں میں ضروری نہ تھی۔ پس استیذان یعنی کسی گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلبی کے وقت سلام کرنے کا جو قرآنی حکم ہے اسی حکم کی یہ تفصیل کہ تین دفعہ سلام کیا جائے یہ ایسا مسئلہ تھا جو عمومی اشاعت پانے والے مسائل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا اسی طرح بیت المقدس کے متعلق حضرت داودؑ کا قصہ۔ سو ظاہر ہے کہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ ہر تاریخی واقعہ کی تبلیغ ہر شخص تک کھلی ہوئی بات ہے کہ فرائض نبوت میں داخل نہیں ہے بقول ابوبکر الجصاص۔

لَيْسَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوْقِيْفُهُمْ عَلَى الْأَفْضَلِ مِمَّا خَيَّرَهُمْ فِيْهِ۔ (تفسیر جصاص ج ا ص ۲۰۴)	یعنی جن امور میں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے ان کے اس پہلوے امت کے ہر فرد کو آگاہ کرنا جو بہتر اور افضل ہو، یہ پیغمبر کے لئے ضروری نہیں ہے۔

اسی لئے بعضوں تک پیغمبر کی اس قسم کی باتیں پہنچیں اور بعضوں تک نہ پہنچیں۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی کہ مسلمانوں کی سہولت اور آسانی کے لحاظ سے اس کی جو بھی قیمت ہو لیکن جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہو جانا اس کا ایک لازمی و ناگزیر نتیجہ تھا۔ اسی کے ساتھ شرعی قوانینِ منصوصہ کی محدودیت اور قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے ساتھ پیش آنے والے حوادث و واقعات کی لامحدودیت نے اس ضرورت کو جو پیدا کیا تھا کہ شرعی کلیات کو پیشِ نظر رکھ کر شریعت کے ان ہی محدود قوانین کی روشنی میں نت نئی پیش آنے والی صورتوں کے لئے احکام پیدا کئے جائیں جس کا اصطلاحی نام تفقہ ہے۔ دین اور وہ بھی دینِ اسلامی جو مدعی ہے کہ ہر وہ شخص جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوٰی نبوت و رسالت کے بعد انسان بن کر زمین کے کرّے پر قیامت تک پیدا ہوتا رہے گا اس کے لئے یہ آخری قانون ہے، ایک ایسے عالمگیر

وسیع دینی آئین کے لئے تفقہ کے اس باب کا کھلا رکھنا کس حد تک ضروری ہے اس کا اندازہ آپ کو عام دنیاوی قوانین کے ماہرین کے بیانوں سے ہو سکتا ہے۔ حالانکہ کسی محدود علاقے کے لئے محدود زمانے میں حکومتیں ان قوانین کو بناتی ہیں، لیکن باوجود اس کے جیسا کہ سرسائمنڈ نے اپنی مشہور کتاب "اصولِ قانون" میں لکھا ہے :-

"بہرحال کسی ملک کے ججوں کے اختیار تمیزی کے بغیر صرف قانون سے انفصالِ مقدمات ناممکن ہے۔" (مترجمہ دار الترجمہ سرکار عالی ص۲۴)

تفصیل کے لئے تو دیکھئے میری کتاب "تدوینِ فقہ" یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ "تفقہ" کی اسی ناگزیر صورتِ حال سے اختلافات کا پیدا ہو جانا لابدی تھا اور وہ پیدا ہوا۔ مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کا ایک بڑا حصہ عموماً ان ہی دونوں باتوں یعنی احاد خبروں کی واقفیت و عدم واقفیت پر مبنی ہے یا اس کا تعلق اجتہادی نقاطِ نظر سے ہے جن کا پیدا ہو جانا اجتہادی کوششوں میں قدرتی امر ہے اور خواہ ان اختلافات کے متعلق نہ جاننے والوں میں جس قسم کے خیالات بھی پھیلے ہوئے ہوں[1]

---

[1] میرا اشارہ اس عام چرچے کی طرف ہے جو مسلمانوں کے متعلق پھیلا ہوا ہے کہ بدترین قسم کی فرقہ بندیوں میں یہ قوم مبتلا ہے غیر تو غیر اپنوں کو بھی اس پر بسا اوقات چھاتی پیٹتے دیکھا گیا ہے لیکن جو اصل واقعہ ہے اسے اپنی مختلف کتابوں مقالات و مضامین میں بہ تفصیل بیان کر چکا ہوں، مکتبہ ندوۃ المصنفین نے "مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ" کے نام سے خاکسار کا اسی سلسلہ میں ایک رسالہ بھی الگ شائع کر دیا ہے۔ حاصل یہی ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فوج در فوج دنیا کی قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں تو اس میں شک نہیں کچھ دن کے لئے جیسا کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے نت نئے خیالات و عقائد کے رکھنے والے فرقے پیدا ہو گئے تھے ان میں بعض فرقوں کی بنیاد تو سیاسی اختلافات پر مبنی تھی اور ایسے فرقے بھی تھے جو درحقیقت اپنے قدیم موروثی دین اور دھرم کے جراثیم کو بھی اپنے ساتھ لائے، شعوری یا غیر شعوری طور پر شروع میں یہ چاہا گیا کہ اسلامی تعلیمات اور ان کے موروثی خیالات میں تطابق و مصالحت پیدا کی جائے اسی غیر محمود کوشش نے جہاں تک میرے معلومات کا اقتضاء ہے ان مختلف فرقوں کو اسلام میں پیدا کر دیا تھا لیکن جوں جوں آئندہ نسلوں کے قدم حقیقی اسلام میں راسخ ہوتے چلے گئے آبائی موثرات کا دباؤ ڈھیلا پڑتا گیا، صحیح اسلام جوں جوں نومسلموں کے سامنے بے نقاب ہوتا چلا گیا، اپنے آبائی خیالات سے ان کا تعلق کمزور ہوتا رہا تا ایں کہ چوتھی پانچویں صدی ہجری تک پہنچتے ہوئے بتدریج یہ رنگ اتنا گھٹا کہ یہ سارے فرقے خود بخود مضمحل ہو کر ناپید ہو گئے صرف مسلمانوں کی مذہبی تاریخوں میں لوگ ان فرقوں کا (باقی بر صفحہ آئندہ)

مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ان ہی اختلافات کے سلسلے میں یہ عجیب و غریب صورتِ حال جو نظر آ رہی ہے کہ مسلمانوں کی قوم حالانکہ دنیا کے مختلف اقالیم و ممالک میں کروڑہا کروڑ کی تعداد میں پھیلی ہوئی ہے۔ تخمینہ کرنے والے افراد کے نزدیک چالیس سے ستر کروڑ افرادِ انسانی پر یہ قوم مشتمل ہے جن میں مختلف زبانوں کے بولنے والی سیکڑوں نسلیں بنی آدم کی شریک ہیں۔ ان میں گورے، کالے زرد، گندمی الغرض ہر رنگ اور ہر شکل کے لوگ ہیں لیکن بایں ہمہ بجز شیعہ و خوارج جن کی اقلیت اتنی ناقابلِ لحاظ اقلیت ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے مقابلہ میں گویا ان کا وجود عدم سمجھنا چاہئے کہ برابر ہے۔ بہرحال یہ ساری عظیم اکثریت اہلِ سنت والجماعت کے ایک ہی فرقہ کی شکل میں جو پائی جاتی ہے، لوگ اس کو کیوں نہیں سوچتے کہ اختلافات کے ان دو مستقل آتش فشاں پہاڑوں پر جس قوم کی دینی زندگی کی تعمیر کھڑی کی گئی ہے، اسی دین میں وحدت و یگانگت کا یہ حیرت انگیز مدھش مگر ساتھ ہی دلکش روح پرور رنگ کیسے پیدا ہو گیا، کیا یہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے لوگوں کا

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) نام لکھتے ہیں لیکن دنیا سے ان کا وجود معدوم ہو چکا ہے معمولی چھوٹے تا پرساں حال فرقوں ہی کا یہ انجام نہیں ہوا بلکہ بعض بڑے منہ زور، صاحب السیف والقلم فرقے مثلاً معتزلہ تک کا یہ حال ہے کہ اس وقت اس فرقے کے کسی آدمی کا ملنا تو دور کی بات ہے، کتب خانوں میں اس مذہب کے عقائد و خیالات کی کوئی خالص کتاب بھی نہیں پائی جاتی لغت یا تفسیر وغیرہ کے سلسلے میں گنتی کی چند کتابیں ہیں ان میں کچھ ان کے خیالات ملتے ہیں یا اہلِ سنت نے تردید کے لئے ان کے مسلمات کا اپنی کتابوں میں جو ذکر کیا ہے اس سے کچھ ان کے خصوصیات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ باقی حنفی، شافعی، مالکی و حنبلی فقہ کے یہ چار مکاتبِ خیال بلاشبہ مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے اختلافات پر فرقہ بندی کے اختلافات کا اطلاق قطعاً غلط ہے آخر جب ان میں ہر مکتبِ خیال کے لوگ دوسرے مکتبِ خیال کے ائمہ و اکابر کا اسی قدر احترام کرتے ہیں جتنا اپنے بزرگوں کا تو پھر ان میں کسی ایک جماعت کے دین کو دوسری جماعت کے دین سے جدا کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، یہی نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، ازدواجی تعلقات رکھتے ہیں۔ بلکہ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کے لوگ دوسری جماعت کے پیروں کے ہاتھ پر بیعت تک کرتے ہیں۔ حضرت غوث پاک شیخ عبدالقادرؒ کا وجود اس کی سب سے بڑی تاریخی مثال [illegible] حضرتِ والا حنبلی مسلک کے پابند تھے لیکن ایسا کون سا مسلمان ہے جو آپ کو سید الاولیا نہیں ملتا۔ واقعی فرقہ کا اطلاق صرف شیعوں پر یا خوارج پر ہو سکتا ہے سو خوارج کا وجود گروہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے قابلِ ذکر نہیں ہے۔ شیعہ فرقہ کے مسلمانوں کی تعداد اس میں شک نہیں کہ خوارج سے زیادہ ہے لیکن اہلِ سنت کی اکثریت کثیرہ عظیمہ کے مقابلہ میں سچ پوچھئے تو ان کی تعداد بھی سمندر میں چند تنکوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

مطالعہ اگر صحیح ہوتا تو ان کے سامنے ان سارے انتظامات اور استقرائی و احتیاطی تدبیروں کا نقشہ آ جاتا جو شروع ہی سے اس راہ میں اختیار کئے گئے۔ عہدِ نبوت میں تو اختلافات کے پیدا ہونے کی گنجائش ہی کیا تھی، پیغمبر کا وجود قولِ فیصل تھا جو براہِ راست خدا سے علم پا رہے تھے، ہر اختلاف کا فیصلہ پیغمبر کی طرف رجوع کرنے کے ساتھ ہی ہو جاتا تھا۔ قرآن ہی میں بار بار مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ ہر اختلاف میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ تاہم ایک چیز اس زمانے میں بھی پیدا ہو چکی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسی کو اصلاح کا ذریعہ بنایا تھا۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اختلافاتِ باہمی سے مسلمانوں کو جو منع کیا گیا ہے، ہمیں سوچنا چاہئے کہ واقعی اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا ہر مسلمان کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہی معلومات اپنے پاس رکھے جو دوسرے رکھتے ہیں، یا یہ کہ ہر مسلمان وہی بات سوچے جو دوسرے سوچتے ہیں، مگر غور کرنا چاہئے کہ کیا یہ ممکن بھی ہے؟ خصوصاً دین کے اس ثانوی حصہ کو جب پیغمبر اس طریقے سے پہنچا رہے تھے کہ اور تو اور ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے مقربینِ بارگاہ کو بھی بسا اوقات اس سلسلے میں اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا ایسی صورت میں یہ خیال کہ معلومات کے اختلاف سے جو اختلاف قدرتاً پیدا ہوتا یا ہو سکتا تھا اس سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے خود ہی سوچئے کہ اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اسی طرح جب تفقہ کا باب کھولا گیا تھا اور عرض کر چکا کہ عملی طور پر کوئی دنیوی قانون بھی اس کے بغیر چل نہیں سکتا تو قیامت تک کے لئے ساری دنیا کے لئے جو دینی دستور دیا گیا تھا وہ اس دروازے کے بند کرنے کے بعد نت نئی روزانہ پیش آنے والی صورتوں اور ضرورتوں کی تکمیل کی ضمانت کیسے رکھ سکتا تھا اور "تفقہ" کے دروازے کو کھلا رکھنے کے بعد یہ توقع کیا پوری ہونے والی توقع ہو سکتی ہے کہ شرعی کلیات اور نصوص کو پیش نظر رکھ کر نئے پیش آنے والے حوادث کے متعلق حکم پیدا کرنے والے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ تک پہنچیں گے۔

میرے نزدیک تو اختلاف سے ممانعت کا اگر یہی مطلب لیا جائے گا تو دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سارے انسانوں کو حکم دیا جائے کہ اپنے چہروں کے رنگ کو ایک کر دو

اپنے قدموں کو برابر کرلو، ہر شخص ایک ہی قسم کی آواز منہ سے نکالے، الغرض جو کچھ ایک کے پاس ہے ضروری قرار دیا جائے کہ وہی سب کچھ دوسرے کے پاس بھی ہو اور وجہ یہ بیان کی جائے ان ہی چیزوں کے اختلاف سے لوگوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ حکم ہمیشہ ان ہی چیزوں کا دیا جاتا ہے یا دیا جاسکتا ہے جو آدمی کے اختیاری حدود میں ہوں۔ بھلا غریب آدمی کے بس میں ہے کہ اپنے چہروں کے رنگ و روغن شکل و صورت، قد و قامت، چال ڈھال وغیرہ قدرتی اختلافات اور انفرادی خصوصیتوں کو مٹا کر ایک کردے اور جیسے یہ اس کے بس کی بات نہیں یقین کیجئے کہ ذہنی اور دماغی یا باطنی خصائل و عوائد کے فطری اختلافات جن کی وجہ سے فکری اختلافات پیدا ہوتے ہیں، ان اختلافات کو بھی آدمی اپنی قدرت اور اپنے ارادے سے مٹا نہیں سکتا۔ پس یہ کہنا کہ تفقہ میں ہر مسلمان فقیہ کو اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ جس نتیجہ تک شرعی قوانین کی روشنی میں دوسرے پہنچیں اسی نتیجہ تک وہ بھی پہنچے اور یہ باور کیا جائے یا کرایا جائے کہ اس حکم کی تعمیل سے قاصر رہنے والے قرآن کے ان مطالبوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں جن میں مسلمانوں کو تفرق و اختلاف سے بچنے کی شدید تاکیدیں کی گئی ہیں اور عذاب عظیم کی دھمکیاں دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ نہ ہوگا، مسلمانوں کی تاریخ کے سارے روشن اوراق یقیناً اس کے بعد اچانک سیاہ پڑ جائیں گے۔ میں اوروں کے متعلق تو نہیں کہتا کہ اس سلسلے میں ان کے خیالات کیا ہیں لیکن جہاں تک اپنی ناقص غور و فکر سے کام لینے کے بعد جس نتیجہ تک پہنچا ہوں اسے پیش کر دیتا ہوں۔

میں تو یہی سمجھتا ہوں اختلاف و تفرق سے جن آیتوں میں مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے اگر ان کا مطلب یہی لیا جائے گا تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ اسی قسم کا مطالبہ ہوگا کہ کالے رنگ والوں کو حکم دیا جائے کہ اپنے چہروں کو گورا بنالیں ورنہ عذاب عظیم کے وہ مستحق ہوں گے میرے نزدیک تو دونوں مطالبوں میں اصولاً کسی قسم کا فرق نہیں ہے پس سوچنے کی بات یہی ہے کہ قرآن جس اختلاف سے منع کر رہا ہے وہ ہے کیا؟ یقیناً یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہوسکتی جس کی تعمیل انسانی دسترس سے باہر ہو آخر لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی وسعت اور گنجائش ہی کو دیکھ کر مطالبہ کیا جاتا ہے یہ بھی تو قرآن

[illegible]

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (آل عمران)

اور نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جو ایک دوسرے سے جدا جدا ہوئے اور مختلف ہوئے بعد اس حالت کے ان کے پاس "بینات" آچکے تھے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں اِخْتَلَفُوا سے پہلے "تَفَرَّقُوا" کا لفظ ہے جس سے اشارہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں بظاہر اسی طرف کیا گیا ہے کہ لوگ دراصل تفرق کو پیدا کرنا چاہتے ہیں یعنی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنا چاہتے ہیں، تب اس جدائی کا ذریعہ مذہب کے اختلافات کو بنا لیتے ہیں حالانکہ "البینات" ان کے پاس موجود رہتا ہے۔

اسی آیت کو پیش نظر رکھ کر اسلام کا نقطۂ نظر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دین کے جس حصہ کی حیثیت "بینات" کی ہو یعنی دین سے جس کا تعلق بالکل واضح اور روشن ہو، مثلاً وہ ساری چیزیں جو عمومیت کی راہ سے منتقل ہوتی ہوئی مسلمانوں میں چلی آرہی ہیں اسلام کے ساتھ ان کا تعلق اتنا واضح اتنا بیّن اور کھلا ہوا ہے کہ جو اسلام اور ان چیزوں کو جانتا ہے خواہ مسلمان ہو یا نہ ہو شاید اسلام کا ان کے بغیر وہ تصور ہی نہیں کر سکتا مثلاً قرآن یا حج یا نماز، رمضان کے روزے وغیرہ ان کا یہی حال ہے۔

بہر حال ان ہی "البینات" پر متفق و متحد ہو جانے کے بعد ہدایت کی گئی ہے کہ دین کے "غیر بیناتی" حصہ کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں کی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنے کی حرکت جدا کرنے والوں کو عذابِ عظیم کی مستحق بنا دیتی ہے۔ حاصل یہی ہوا کہ قدرتی طور پر جن اختلافات کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے ان سے نہیں منع کیا گیا ہے اور نہ ان سے منع کیا جا سکتا ہے کہ اختیاری حدود میں وہ داخل ہی نہیں ہیں بلکہ ان ناگزیر قدرتی اختلافات کو چاہئے کہ باہم ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے ممانعت کا حقیقی رُخ انسان کے اسی ارادی فعل کی طرف ہو سکتا ہے اور اسی کی طرف اس کا رخ ہے بھی۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ عہدِ نبوت میں ان قدرتی اختلافات کے پیدا ہونے کی گنجائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مبارکہ کی وجہ سے تھی ہی نہیں، تاہم اس وقت بھی اختلاف کی

ایک صورت سامنے آہی گئی یعنی زبانوں کا دستور رہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے کیوں نہ ہوں لیکن ان لوگوں میں بھی تھوڑا بہت لہجہ، طریقہ ادا، تلفظ وغیرہ کے اختلافات پیدا ہی ہو جاتے ہیں کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر بارہ میل پر زبانوں کے ان اختلافات کا تجربہ کیا گیا ہے ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو، لیکن اس مشاہدے کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں مذکورہ بالا اختلافات کو ہر جگہ لوگوں نے پایا ہے، ہماری اردو زبان ہی کو دیکھ لیجئے، شمال و جنوب، مشرق و مغرب کے اکثر ہندوستانی علاقوں میں یہ بولی جاتی ہے لیکن باوجود ایک زبان ہونے کے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جنوبی ہند کے اردو بولنے والے ایک ہی لفظ کو اس طریقہ سے ادا کرتے ہیں کہ شمالی ہند والے اگر چاہیں بھی تو اس طریقے سے اس لفظ کا تلفظ نہیں کر سکتے اور یہی حال مختلف صوبجاتی مقامی اختلافات کا ہے۔ عربی زبان جس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا یہ زبان سارے عرب کی تھی۔ لیکن عرب کے مختلف علاقوں کے باشندوں کی زبان میں بھی وہ سارے اختلافات پائے جاتے تھے، جن سے کوئی زبان بچی ہوئی نہیں ہے۔ حجاز، یمن، نجد یا مختلف قبائل قریش، بنی تمیم، قحطانی، غیر قحطانی قبائل کے اندر اس قسم کے کافی لسانی اختلافات پائے جاتے تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جیسی جلیل ہستی جن کی ساری زندگی قریش میں بلکہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں گزری۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان کو قرآن پڑھایا تھا، لیکن نسلاً و اصلاً یہ ذیلی تھے اس لئے حتّٰی کا تلفظ آخر عمر تک وہ عتّٰی کرتے رہے۔ مسند احمد میں ہے کہ مشہور حدیث جس میں ہے کہ توراۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو صفات بیان کئے گئے ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ آپ دنیا سے اس وقت تک تشریف نہ لے جائیں گے جب تک ملت عوجاء (ٹیڑھی ملت) سیدھی نہ ہو جائے۔ جس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ لوگ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندھی آنکھوں اور بہرے کانوں اور جن قلوب پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں ان کو اسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے کھول دیں گے۔ عربی میں اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حَتّٰی یُقِیْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ یَّقُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَیَفْتَحُ بِهَا

اَعْیُنًا عُمْیًا وَاٰذَانًا صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا۔ حضرت عطاء فرماتے تھے کہ میں نے کعب احبار سے جو توراۃ کے مستند عالم اس زمانے میں سمجھے جاتے تھے ان سے پوچھا کہ آپ کا علم ان الفاظ کے متعلق کیا ہے یعنی تورات میں یہ الفاظ کیا پائے جاتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ کعب نے اس کی تصدیق کی صرف فرق یہ نظر آیا کہ

اَنَّ کَعْبًا یَقُوْلُ بِلُغَتِہٖ اَعْیُنًا عُمُوْمِی اٰذَانًا صُمُوْمِی وَقُلُوْبًا غُلُوْفِی۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۴۴، ۱۷) یعنی کعب بجائے اعینا عمیا کے اعینا عمومی اور اذانا صما کے اذانا صمومی اور قلوبا غلفا کے قلوبا غلوفی کے ساتھ ان الفاظ کا اپنی لغت کی وجہ سے تلفظ کرتے تھے۔

درحقیقت یہ زبان کا اختلاف نہیں ہے بلکہ لہجہ کا اختلاف ہے جس کی تعبیر عطاء نے "لغت" کے لفظ سے کی ہے۔ کعب یمن کے رہنے والے تھے۔ حجازی لہجہ اور یمنی لہجہ کے فرق کا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے "عمیا" کو کھینچ کر یمنی "عموما" اور "صما" کو "صموما" "غلفا" کو "غلوفا" بنا دیتے تھے۔

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن حجاز سے نکل کر جب عرب کے دوسرے علاقے اور قبائل میں پہنچا تو تلفظ و لہجہ اور اسی قسم کے لسانی اختلافات جن کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا، نمودار ہوئے۔ غیر اصولی اختلافات کے متعلق چاہیئے کہ باہمی رواداری اور ان اختلافات کے برداشت کرنے کی صلاحیت مسلمان اپنے اندر پیدا کریں۔ لب و لہجہ کے ان ہی اختلافات کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے عہد مبارک ہی میں عملی طور پر مسلمانوں کی تربیت کا موقعہ مل گیا، بڑے عجیب و غریب دلچسپ اور سبق آموز واقعات اس سلسلہ میں پیش آئے۔ قدرتی ناگزیر اختلافات کو ارادی مخالفت و مخاصمت اور تفرق و جدائی کا ذریعہ بنا لینا اس بدعادت کے جاہل عرب میں عموماً عادی تھے، معمولی ناقابل لحاظ اسی نوعیت کے غیر اہم اختلافات کی بدولت خدا جانے کتنی خونریزیاں ان میں ہو چکی تھیں، کسی قسم کا اختلاف ہو ان کے لئے ناقابل برداشت تھا بلکہ ان میں جو زیادہ ذکی الحس صاحب عزم و ارادہ ہوتے تھے وہی ان اختلافات کے قصوں کو آگے بڑھانے اور ان کی آگ کو ہوا دینے میں سب سے آگے آگے نظر آتے تھے۔ آج کل بھی جیسے دیکھا جاتا ہے کہ اسی قسم کے قدرتی اختلافات

مثلاً رنگ و نسل کے اختلافات یا وہمی و فرضی بنیادوں پر جو اختلافات مبنی ہیں مثلاً وطن[1] اور زبان کے اختلافات ان میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے اور فتنہ و فساد کی آگ کا ایندھن ان ہی معصوم اختلافات کی لکڑیوں کو بنانے والے زیادہ تر وہی ہوتے ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کے قومی احساسات زیادہ بیدار اور زندہ ہیں، وہی قوم کے لیڈر بن کر قوم کو جنگ و جدال، قتل و قتال کی جہنم میں جھونکتے رہتے ہیں۔

خیر اس عام قصہ کو چھوڑیئے میں عرب کا ذکر کر رہا تھا۔ ہوا یہ کہ جب قرآن کے پڑھنے میں اس قسم کے اختلافات عہدِ نبوت میں رونما ہوئے تو شروع میں بڑی گڑبڑ پیدا ہوئی۔ اسی سلسلے میں خود حضرت عمرؓ بعد کو اپنا یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ

"ہشام بن حکیم نماز میں سورۂ فرقان پڑھ رہے تھے میں نے جو کان لگایا تو سنا کہ بہت سے حروف کو وہ اس طریقہ سے ادا کر رہے ہیں جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھایا تھا۔ اس حال کو دیکھ کر میرا جی تو چاہا کہ نماز ہی میں اچھل کر اس شخص کو دبوچ لوں[2]۔ لیکن پھر ٹھہر گیا (یعنی نماز میں مشغولیت کی وجہ سے اتنی دیر کے لئے ٹھہر گیا) جب ہشام نے سلام پھیرا تو میں نے معاً اپنی چادر اس کے گلے میں ڈالی اور پوچھنے لگا کہ تجھے اس طریقہ سے قرآن کس نے

[1] ظاہر ہے کہ چہروں پر مڑھی ہوئی کھال کا رنگین یا بے رنگ ہونا یا کسی شخص کا بجائے زید کے مثلاً بکر کے خاندان میں پیدا ہو جانا یہ اس کے اختیار کی بات نہیں ہوتی۔ اسی طرح زمین کا کرہ جو واقعی میں مٹی کا ایک واحد بسیط کرہ ہے ملکوں اور اقلیموں میں اسی خاکی کرے کی تقسیم ظاہر ہے کہ ایک فرضی اور وہمی تقسیم ہے۔ کسی دریا یا پہاڑ یا اسی قسم کی چیز کو سرحد قرار دے کر فرض کر لیا جاتا ہے کہ زمین کا جو حصہ اس پہاڑ یا دریا کے اس پار ہے وہ اس حصہ سے جدا ہو گیا جو اس پار ہے، پہاڑ یا دریا کا وجود تو واقعی ہوتا ہے لیکن یہ کہنا کہ اسی پر فلاں ملک ختم ہو جاتا ہے ایک فرضی بات کے سوا اور کیا ہے۔ اسی طرح الفاظ اور معانی میں کھلی ہوئی بات ہے کہ کوئی واقعی تعلق نہیں ہوتا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پانی کو پانی کہا جائے گا۔ فرض کیجئے کہ اسی پانی کا نام کوئی آگ رکھ دے تو واقعہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ آخر کہنے والے اسی ٹھنڈک پہنچانے والے پانی کو جل بھی تو کہتے ہیں مگر لوگوں نے ان ہی مفروضہ اصطلاحات کو اس زمانہ میں شدید قومی کینوں اور عداوتوں کی بنیاد بنا کر جو کچھ کیا اور اس وقت تک کر رہے ہیں وہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہے۔

[2] میں نے یہ ترجمہ حضرت عمرؓ کے الفاظ "فکِدْتُ اَنْ اُسَاوِرَہٗ" کا کیا ہے۔ (دیکھو جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۴۴)

پڑھایا ہے جو اس وقت تم کو میں نے پڑھتے سُنا۔ ہشام نے جواب میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پڑھایا ہے۔"

میں نے ہشام سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے بھی یہی سورہ پڑھی ہے آپؐ نے قطعاً اس طریقہ سے مجھے نہیں پڑھایا جس طرح تم پڑھ رہے تھے۔ یہ گفتگو تو ان دونوں کے درمیان ہوئی۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اس حال میں کھینچتے ہوئے اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر کیا اور عرض کرنے لگا کہ یا رسول اللہ میں نے سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے اس شخص کو پایا، ایسے حروف کے ساتھ یہ پڑھ رہا تھا جن کے ساتھ آپ نے یہی سورہ مجھے نہیں پڑھائی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گفتگو سن کر پہلے تو مجھے حکم دیا کہ اَرْسِلْہُ (تم اس کو یعنی ہشام کو چھوڑ دو) اس کے بعد ہشام کی طرف خطاب کر کے فرمانے لگے کہ

"ہشام تم سناؤ کیا پڑھ رہے تھے؟"

حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ جس طریقہ سے نماز میں ہشام اس سورہ کو پڑھ رہے تھے، ان ہی حروف کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنانا شروع کیا۔ جب ان کا پڑھنا ختم ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہشام کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں

هٰكَذَا اُنْزِلَتْ — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

پھر میری طرف (یعنی حضرت عمرؓ) کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ

"عمر! اب تم پڑھو۔"

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حسبِ ارشاد میں نے بھی ان ہی حروف کے ساتھ جن کے ساتھ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا پڑھنا شروع کیا جب میرا پڑھنا ختم ہو گیا تو دیکھا کہ میری قراءۃ کی طرف بھی اشارہ کر کے فرما رہے ہیں:

هٰكَذَا اُنْزِلَتْ — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد فرمایا کہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۔ — یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے تو چاہئے کہ تمہارے لئے جو آسان ہو ان ہی حروف کے ساتھ اس کو پڑھو۔

یہ روایت صحاح ستہ کی کل کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ شارحین حدیث نے "سبعہ احرف" کی شرح میں بہت کچھ لکھا ہے حالانکہ میرے خیال میں بات وہی تھی کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے اس زبان کے الفاظ کو مختلف لہجوں میں ادا کرتے ہیں اور بھی کچھ اسی نوعیت کے اختلافات ہر زبان میں عموماً ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ جس کی زبان جس تلفظ اور جس طریقہ کی عادی ہے اسی کے ساتھ قرآن کو پڑھے۔ میرے نزدیک ان بزرگوں کی رائے اس باب میں بالکل صحیح ہے کہ "سبعہ" (سات) کے عربی لفظ سے خاص سات کا عدد مقصود نہیں ہے بلکہ عربی محاورے میں "تعدد" کے اظہار کا یہ عام طریقہ تھا جیسے اردو میں "بیسیوں" وغیرہ کے الفاظ سے بیس کا خاص عدد بولنے والے کا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ کثرت کا اظہار اس سے کیا جاتا ہے، اور عربی زبان کا یہ ایک عام محاورہ ہے۔ خیر اس وقت میرے سامنے اس حدیث کی شرح ہے بھی نہیں بلکہ دکھانا یہ چاہتا تھا کہ عرب جو اس قسم کے اختلافات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی کے برداشت کی صلاحیت پیدا کرنے کا موقعہ قرآن کے ان ہی قرآنی اختلافات کی وجہ سے مل گیا۔ کبھی کبھی یہ دکھانے کے لئے کہ قریشی لہجہ کے سوا دوسرے لہجہ اور الفاظ کے تلفظ کے دوسرے طریقے اسی طرح صحیح ہیں جیسے قریشی لہجہ و تلفظ صحیح ہے، باوجود قریشی ہونے کے کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی قرآن کو دوسرے قبائل کے لہجہ میں پڑھ دیا کرتے تھے مثلاً روایتوں میں آیا ہے کہ سورۂ رحمٰن کی آیت "عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ" کی جو آیت ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا گیا کہ اسی کو "عَلٰى رَفَارِفَ خُضْرٍ وَّعَبَاقِرِيٍّ حِسَانٍ" کی شکل میں ادا کر رہے ہیں، یہ وہی صورت ہے کہ "عمیا" کو کعب احبار "عموفا" اور "صما" کو "صمومی"، "غلفا" کو "غلوفا" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے۔

تکذیب سے کیا نسبت[1]؟ گویا ایمان و اسلام کا سارا سرمایہ اسی حسی ذکاوت پر قریب تھا کہ قربان ہو جائے جو موروثی طور پر ان میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے پہلے پائی جاتی تھی اور قریب تھا کیا معنی؟ وہ تو کہتے ہیں کہ سب کچھ کھو چکا تھا سارا سرمایہ ایمان کا اسی آگ کے شعلوں میں بھسم ہو چکا تھا وہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ یہ فوری کیفیت ان میں اس وقت پیدا ہوئی جب العالمین کی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ کھڑے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت اُبی کا قصہ گویا یوں سمجھئے کہ اسی وقت ختم ہو چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس کیفیت کو تاڑ لیا یا کشفاً آپ پر ان کے قلب کی حالت کھل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے کسی فہمائش کے جو آپ کا عام قاعدہ تھا محسوس فرمایا کہ اس وقت اس بیچارے کا کام فہمائش سے نہ چلے گا اور آخری اقتداری تدبیر جو پیغمبروں کو قدرت کی طرف سے مرحمت ہوتی ہے اسی اقتداری تدبیر سے آپ نے کام لینا ضروری خیال کیا۔ حضرت اُبی کہتے ہیں کہ میرے اس حال کو محسوس کر کے

ضَرَبَ فِیْ صَدْرِیْ — دو ہتھڑ میرے سینہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مارا۔

یہ روحانی تربیت کے سلسلہ میں توجہ کی ایک شکل[2] ہے، توجہ اور وہ بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہ مطلب میں نے معانی حدیث کے سب سے بڑے مستند شارح علامہ طیبی کے خیال کے مطابق بیان کیا ہے بعض لوگ جو عربی محاوروں سے ناواقف ہیں زبردستی ان الفاظ کے معانی کو توڑنے مروڑنے کی غیر ضروری کوشش اس لئے کرتے ہیں تاکہ حضرت اُبی کا دامن ایسے سخت الزام سے پاک رہے اولاً وہ عربی محاورے کی رو سے درست نہیں ہے نیز اس قصے سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کو بھی ان کا پیدا کیا ہوا مطلب مضمحل کر دیتا ہے۔ حضرت ابی کا جب وہ حال باقی نہ رہا تو اب ان پر الزام ہی کیا رہ جاتا ہے کتنے صحابی ہیں جو کفر کی بدترین حالتوں سے نجات یاب ہوئے کیا اس لئے کہ وہ صحابی ہیں ان واقعات کا انکار کر دیا جائے۔

[2] فتوحات مکیہ میں شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے "توجہ" کی مختلف قسموں کو بتاتے ہوئے "توجہ بالید" یعنی ہاتھ سے توجہ دینا اس کو بھی توجہ کی ایک قسم قرار دی ہے، ابی بن کعب کی اس روایت کے سوا حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ کا جو حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر وہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس کمزوری کا اظہار کیا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ بالید ہی سے کام لیا یعنی ان کی پیٹھ کو دونوں ہاتھوں سے آپ نے ٹھونک کر فرمایا کہ اب بیٹھے رہو بیان کیا گیا ہے کہ اس نبوی توجہ کے بعد گھوڑے پر سوار ہونے کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پیٹھ پر کوئی میخ ٹھونک دی گئی ہے۔

کی توجہ کارگر نہ ہوتی تو اور ہوتا کیا۔ ابی کہتے ہیں :

خففتُ عرقًا وکانّما انظرُ الی اللہِ تعالیٰ فرقًا (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم وغیرہ) — (میں اس توجہ کے بعد) پسینے سے شرابور ہوگیا اور گویا ایسا معلوم ہوا کہ خوف سے میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔

ایک شر تھا جس سے حضرت ابی کے لئے ایک ایسا خیر پیدا ہوا کہ شاید اگر یہ حالت ان پر طاری نہ ہوتی تو اس کا موقعہ ان کو مشکل ہی سے میسر آسکتا تھا، پیغمبر کی توجہ نے خدا کو ان کے سامنے بے حجاب کر دیا، سارے مقامات طے ہوگئے۔

کچھ بھی ہو میں تو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ قرآن میں مسلمانوں کو باہمی اختلاف سے جو منع کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب سمجھ لینا کہ جو اختلافات قدرتی واقعات کے لازمی نتائج ہیں ان اختلافات سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے صحیح نہیں ہے بلکہ جیسا کہ عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کا ذریعہ ان اختلافات کو بنانا اسی عادتِ بد کا انسداد مقصود ہے، مطالبہ کی کوئی بات اگر ہوسکتی ہے تو یہی ہو بھی سکتی ہے کہ یہی چیز آدمی کے اختیار کی ہے ورنہ غیر اختیاری امور کے مطالبہ کے معنی ہی کیا ہوسکتے ہیں اور اگر یہ مطلب نہیں ہے تو قرآن کی ان آیتوں کے پڑھنے والے اس کا کیا جواب سوچا کرتے ہیں جب ان کے سامنے ابتداء سے آخر تک مسلمانوں کی ساری تاریخ جس میں عہد صحابہ بھی شریک ہے اور اختلافات سے معمور اور بھری نظر آتی ہے کیا یہ ہوسکتا ہے کہ اول سے آخر تک بہرے اور اندھے بن کر سارے مسلمان قرآن کے ایک ایسے قانون کو مسلسل انتہائی لاپروائیوں کے ساتھ توڑتے رہے جس کا بار بار مختلف الفاظ میں اس کتاب میں اعادہ کیا گیا ہے۔ مالکم کیف تحکمون۔

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں قرآنی قرأت کے اختلافات کی ایک ایسی قدرتی صورت سامنے آگئی کہ مسئلہ اختلاف میں جو مطلوب تھا اس کو غیر مطلوب سے الگ کر کے دکھانے کا موقعہ عملاً آپ کو مل گیا جس کا عملی درس مختلف شکلوں میں صحابہ کو آپ دیتے رہے :

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے ہیں کہ میرے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی، ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ وہ قرآن کو کچھ ایسے طریقے سے پڑھ رہا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو میں نے پڑھتے ہوئے نہیں سنا تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جو کچھ اس سے میں نے سنا تھا بیان کیا۔ ابن مسعود کہتے ہیں کہ جس وقت اس قصہ کو خدمت مبارک میں عرض کر رہا تھا، میں نے آنحضرتؐ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار محسوس کئے اسی مکدر چہرے کے ساتھ آپ نے ہم دونوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ

اِقْرَأْ فَکِلَاکُمَا مُحْسِنٌ — دونوں جس طرح پڑھتے ہو پڑھتے رہو، تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو۔

ابن مسعودؓ کی اس روایت کے آخر میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمُ اخْتَلَفُوْا فَھَلَکُوْا۔ (جمع الفوائد) — آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف مت کیا کرو تم سے پہلے بھی لوگوں نے اختلاف کیا تب وہ تباہ ہو گئے۔

آپ دیکھ رہے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کو، دیکھ رہے ہیں، دونوں کی قرأتوں میں جو اختلافات تھے ان کو باقی رکھتے ہوئے، دونوں کو سراہتے ہوئے ہر ایک کی تحسین کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں کہ "آپس میں اختلاف نہ کیا کرو" کیا یہ سوچنے کی بات نہ تھی کہ اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے اس حکم کی تعمیل کی یعنی لَا تَخْتَلِفُوْا (آپس میں اختلاف نہ کیا کرو) کی تعمیل کی ممکنہ شکل کیا ہو سکتی ہے؟ ممکن ہے کہ لکھنے والوں نے نہ لکھا ہو لیکن بحمد اللہ عملاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاءِ مبارک کو مسلمان ہمیشہ سمجھتے چلے آئے ہیں اور سمجھانے والے مسلمانوں کو اس سلسلہ میں جو اصل واقعہ ہے اس کو سمجھاتے رہے ہیں۔

میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ ذکر کر رہا تھا کہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں ان کی تیسری اہم خدمت یہی تھی کہ اختصاصی راہوں سے حدیثوں کا جو ذخیرہ مختلف افراد میں پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے علم و عدم علم کے اختلاف کا جو ایک بڑا خطرناک پہلو پیدا ہو سکتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں جہاں تک میرا خیال ہے قرآنی اختلافات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو عملی نمونے ان کے سامنے پیش ہوئے تھے ان ہی کو پیشِ نظر رکھ کر اختلاف کے اس خطرے کے انسداد کی پوری کوشش کی۔

حدیث سے متعلق عہدِ صدیقی کا ایک اہم وثیقہ اور اس پر مبسوط بحث

ہوا یہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان دونوں راہوں سے یعنی خبر آحاد کے معلومات میں کمی وبیشی یا ان کے متعلق علم وعدم علم کی وجہ سے نیز رہتی دنیا تک تفقہ کی راہ دینی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے جو کھولی گئی تھی اس راہ میں نتائج ونظریات کے اختلاف کی وجہ سے قدرتی اختلاف کی جن شکلوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا، ان کی پیدائش کا سلسلہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانے میں شروع ہوگیا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ابن ابی ملیکہ کے حوالہ سے الذہبی نے جو یہ روایت نقل کی ہے کہ

اِنَّ الصِّدِّیْقَ جَمَعَ النَّاسَ بَعْدَ وَفَاۃِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّکُمْ تُحَدِّثُوْنَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحَادِیْثَ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْھَا وَالنَّاسُ بَعْدَکُمْ اَشَدُّ اخْتِلَافًا فَلَا تُحَدِّثُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ شَیْئًا فَمَنْ سَأَلَکُمْ فَقُوْلُوْا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ کِتَابُ اللّٰہِ فَاسْتَحِلُّوْا حَلَالَہٗ وَحَرِّمُوْا حَرَامَہٗ۔ (تذکرۃ الحفاظ الذہبی ج ۱)	حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتے ہو، جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے پس چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے کوئی بات نہ بیان کیا کرو، پھر تم سے اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (اشتراک کا نقطہ) اللہ کی کتاب ہے پس چاہئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں عہدِ صدیقی کا یہ وثیقہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے خصوصًا اس کی اہمیت اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ یہ حکم کسی وقتی تاثر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ روایت کے الفاظ سے جیسا کہ معلوم ہو رہا ہے صدیقِ اکبر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی باضابطہ ایک مجلس منعقد کی اور اس مجلس میں انہوں نے اپنی اس تجویز کو پیش کیا ہے لیکن

اس کا کیا مطلب ہے؟

مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ تجویز کے واقعی اگر یہی الفاظ تھے جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں تو ہر پڑھنے والا ان سے اسی نتیجہ تک پہنچے گا کہ حدیثوں کی روایت کے سلسلے کو حضرت ابوبکرؓ چاہتے تھے کہ ہمیشہ کے لئے روک دیا جائے۔

فَلَا تُحَدِّثُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ شَيْئًا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کسی قسم کی کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔

سے زیادہ واضح تعبیر اس مقصد کی اور کیا ہو سکتی ہے؟

مگر سوال یہ ہے کہ واقعی ان کا اگر یہی مطلب تھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی اس تجویز کو مسلمانوں نے قطعی طور پر مسترد کر دیا نہ صرف پچھلے ہی زمانے میں بلکہ صحابہ بھی ہمیشہ حدیثوں کی روایت میں مشغول رہے اور دوسروں کو کیا کہا جائے اس تجویز کا علم تو ہم تک ایک ہی روایت اور سند کی راہ سے پہنچا ہے لیکن بیسیوں روایتیں دلالت کرتی ہیں کہ ابوبکر صدیق رضؓ خود اپنی تجویز کی مخالفت کرتے رہے ازالۃ الخفاء میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا تخمینہ ہے کہ

نزدیک بصد[1] و پنجاہ حدیث از مرویات او در دست محدثین باقی ماندہ است (ج ۲ ص ۲۰۴)

تقریباً ایک سو پچاس حدیثیں حضرت ابوبکر کی روایت کی ہوئیں محدثین کے ہاتھوں میں باقی رہ گئی ہیں۔

[1] شاہ صاحب قدس اللہ سرہ نے یہ سوال اٹھا کر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طویل صحبت پیغمبرؐ کے ساتھ ان کے گوناگوں تعلقات وغیرہ امور کے لحاظ سے مذکورہ بالا تعداد حدیثوں کی بہت تھوڑی معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ خود ہی جواب دیا ہے کہ حدیثوں کی روایت کا زیادہ تر موقعہ صحابیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ملا۔ بیچارے حضرت ابوبکر کو چونکہ آنحضرتؐ کے بعد دنیا میں رہنے ہی کا زیادہ موقعہ نہ ملا اور جو ملا بھی سو خلافت اور اس زمانے کی سیاسی پیچیدگیوں کی نذر ہو گیا۔ نیز ان کے زمانے میں ایسے لوگ جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں حاضری کی سعادت میسر نہیں آئی تھی بہت کم مدینہ پہنچے تھے، صحابہ زیادہ تر ان ہی لوگوں سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے، ورنہ خود خود شرف صحبت سے فیض یاب تھے "محتاج نشدند در بسیارے از احادیث توسط وے بلکہ اکثر آں حدیث از زبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شنیدہ بودند" (ج ۲ ص ۲۴) نیز ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ حدیثوں کے بیان کرنے کی ضرورت واقعات و حوادث کے پیش آنے کے وقت ہوتی تھی ابوبکر صدیق رضؓ کو اتنی تھوڑی مدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملی کہ وقائع ان کے سامنے کم پیش آئے۔

ابن جوزی نے ایک سو بیالیس ۱۴۲ حدیثوں کا ذکر بقی بن مخلد کی مسند کے حوالہ سے کیا ہے (دیکھو تلقیح ص ۱۸۵) کچھ بھی ہو مذکورہ بالا تجویز والی ایک روایت کے مقابلہ میں سوڈیڑھ سو روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ بلکہ متعدد روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دوسروں سے صدیق اکبرؓ پوچھتے تھے کہ کوئی حدیث پیش آنے والے واقعہ کے متعلق ان کو معلوم ہو تو بیان کریں۔ مجھ ہی سے کچھ دیر پہلے یہ سن چکے کہ میراث جدہ میں حضرت ابوبکرؓ نے صحابیوں سے پوچھا کہ اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا علم کسی کے پاس ہو تو بیان کرے۔

سوال یہی ہے کہ پھر آخر ان کی اس تجویز کا واقعی مقصد کیا تھا، قطع نظر ان باتوں کے کہ نہ عام مسلمانوں ہی نے ان کی اس تجویز پر عمل کیا اور نہ صحابہ نے ان کے اس حکم پر پرواہ کی بلکہ خود ان کا طرز عمل ان کی اس تجویز کے خلاف ہی نظر آتا ہے۔ اصولی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس چیز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو منع نہیں کیا تھا بلکہ گزر چکا کہ تکثیر سے روکتے ہوئے لوگوں کو اس کے عمل پر آمادہ فرمایا تھا یعنی کثرت اشاعت سے روکتے ہوئے حدیثوں کی روایت کرنے والوں کی ہمت افزائیاں کی گئی ہیں جن پر تفصیلی بحث گزر چکی۔

بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ کسی روایت کے چند الفاظ کو لے کر اس پر اس لئے اصرار کرنا کہ اپنی خواہش کی ان سے تائید ہوتی ہے، نہ یہ دین ہی کا اقتضا ہے، اور نہ علمی دیانت داری میں اس قسم کی خیانتوں کی گنجائش ہے۔ حقیقت جوئی یا واقعہ کی تحقیق کا طریقہ یہ نہیں ہے بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے خود تراشیدہ اوہام یا من مانے خیالات کو دوسروں پر خواہ مخواہ مسلط کرنے کی یہ ایک غلط اور مجرمانہ تدبیر ہے۔

آئیے اب اس روایت کے سارے الفاظ کا مطالعہ دوسرے واقعات کی روشنی میں کیجئے پہلے اس کو دیکھئے کہ مجلس میں، اپنی تجویز کو رکھنے سے پہلے تمہیدی تقریر حضرت ابوبکرؓ نے جو فرمائی تھی اس کے الفاظ کیا تھے؛

إِنَّكُمْ تُحَدِّثُونَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَادِيْثَ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهَا وَالنَّاسُ بَعْدَكُمْ اَشَدُّ اخْتِلَافًا۔

تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتے ہو، جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔

میرے خیال میں حضرت ابو بکرؓ کے یہ الفاظ معمولی الفاظ نہیں ہیں بلکہ ناگزیر قدرتی اختلافات کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں میں ارادی و اختیاری مخالفتوں کے طوفان جو اٹھائے گئے ان ہی اختلافات کی طویل تاریخ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ دوسرا حادثہ تھا جس سے مسلمان دوچار ہوئے تھے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پہلا حادثہ تو اس سلسلہ کا وہی تھا جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی قرآن کے قرأتی اختلافات سے قریب تھا کہ پھوٹ پڑے، اور قریب تھا کیا معنی؟ جن واقعات کا ذکر کر چکا ہوں، ان کو دیکھتے ہوئے تو کہا جا سکتا ہے کہ فتنہ کی آگ بھڑک چکی تھی، اور آپ نے دیکھا کتنی بڑی بڑی ہستیاں اس مغالطہ کی شکار ہو چکی تھیں، بلکہ بعضوں کا تو ایمان ہی خطرے میں آچکا تھا وہ تو نبوت کا مبارک عہد تھا، سر اٹھانے کے ساتھ ہی نبوت کی طاقت سے فساد کے شعلوں کو دبا دیا گیا میں تو سمجھتا ہوں کہ

اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ لَيْسَ مِنْهَا اِلَّا شَافٍ كَافٍ (مشکوٰۃ بحوالہ ابو داؤد و مسند النسائی)

اتارا گیا ہے قرآن سات حرفوں پر نہیں ہے ان حروف میں کوئی حرف مگر سب کے سب شفا بخش اور کافی ہیں۔

کے مسلسل اعلانات کے ساتھ ساتھ عملی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرأت قرآن کے قدرتی اختلافات کی برداشت کرنے کی صلاحیت و عادت صحابہ میں اگر پیدا نہ کر دیتے، تو مسلمانوں کی ارادی مخالفتوں کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت شاید یہی اختلاف حاصل کر لیتا کیونکہ براہِ راست اس کا تعلق قرآن سے تھا۔ اختلاف پسند جھگڑالو طبائع کے لئے قرآن کا لفظ ایک ایسی طاقت کی حیثیت رکھتا تھا کہ چاہنے والے جتنا چاہتے اسے بڑھا سکتے تھے لیکن فتنہ کی اس آگ کو چونکہ ابتداء ہی میں نبوت کی قوت بجھا چکی تھی، کریدنے والوں نے گو پچھلی صدیوں میں کرید کرید کر اس کو بھڑکانے کی کوششیں کیں لیکن رائے عامہ نے ان اغوائی کوششوں کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔ کم از کم میں نہیں جانتا کہ قرأتِ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اٹھنے والے یہ کہتے ہوئے جو اٹھے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی زندگی جس کے صدیوں سے وہ پابند چلے آرہے ہیں غیر مسنون زندگی ہے، پھر اس غیر مسنون زندگی کو مسنون زندگی بنانے کے لئے اسی خبرالخاصہ، یا خبرالواحد بعدالواحد والی حدیثوں کے ذخیروں سے ان بزرگوں نے چن چن کران ہی حدیثوں کا انتخاب کیا جو ابتدا ر اسلام ہی سے ناگزیر قدرتی اختلافات کے رنگ سے رنگین تھے، وہ خود بھی جانتے تھے یا ان کو جاننا چاہئے تھا کہ اختلافات کی یہ صورت کوئی نئی بات نہیں ہے نیز آگاہ کرنے والے ہر زمانہ میں جیسے مسلمانوں کو آگاہ کرتے چلے آئے تھے ہندوستانی مسلمانوں پر بھی جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا تھا جس میں ان کو چونکانے والے یہ کہہ کہہ کر نہ چونکاتے رہے ہوں کہ ان اختلافات کی حیثیت وہ حیثیت نہیں ہے جو کفر و اسلام بلکہ طاعت وعصیان کے اختلافات کی ہوتی ہے۔ خود حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ ضریحہٗ جن کی طرف منسوب کرنے والے یہ چاہتے ہیں کہ اسی غلط تحریک کی قیادت اور اولیت کو منسوب کر دیں وہی ایک جگہ نہیں بلکہ اپنی مختلف کتابوں میں صاف صاف لفظوں میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ ان اختلافات کی ہر صورت اور ہر شکل صحیح اور درست ہے صرف ان ہی مسائل اور نتائج کی حد تک شاہ صاحب کا یہ فیصلہ محدود نہ تھا، جن کا تعلق تفقہ اور اجتہاد سے تھا۔ میں نے اپنی کتاب "تدوینِ فقہ" میں فقہی واجتہادی اختلافات کے متعلق شاہ صاحب کے اقوال مختلف کتابوں سے نقل کرکے ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں، اور صحیح محل ان کے ذکر کا وہی کتاب تھی بھی، بہرحال ان ہی اجتہادی مسائل کی حد تک نہیں بلکہ خبر احاد والی حدیثوں کی بنیاد پر جو اختلافات پیدا ہوگئے ہیں، ان کے متعلق بھی شاہ ولی اللہؒ اس قسم کی عبارتیں چھوڑ کر دنیا سے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ روانہ ہوئے تھے مجھے خیال آتا ہے کہ اسی کتاب میں کسی موقعہ پر شاہ صاحب کے اس قول کو ان کی کتاب الانصاف سے میں نقل کر چکا ہوں جس کا حاصل یہ ہے کہ

"ایسے اختلافی مسائل جن میں صحابہ کے اقوال ہر پہلو کی تائید میں ملتے ہیں مثلاً عیدین وتشریق کی تکبیریں، محرم کا (بحالت احرام حج) نکاح کرنے کا حکم، یا تشہد (التحیات) کے کلمات جو ابن مسعودؓ

اور ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں یا آمین یا بسم اللہ کو آہستہ یا زور سے پکار کر کہنا یا نماز کی اقامت میں بجائے دو دو دفعہ کے ایک ایک دفعہ اقامت کے کلمات کو ادا کرنا یہ اور اس قسم کی ساری باتوں میں اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی صورت یہ سمجھی جاتی ہے کہ شریعت کے مطابق ہے اور اس کی مخالف شکل غیر شرعی شکل ہے بلکہ سلف کا اختلاف اگر تھا بھی تو اس میں تھا کہ ان دو مختلف صورتوں میں اولیٰ اور بہتر شکل کیا ہے ورنہ دونوں شکلوں کو شرعی شکل قرار دینے پر سب ہی متفق تھے۔ (انصاف ص ۸۹)

اسی موقعہ پر شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہی وجہ تو ہے کہ ہر مسلک کے فقیہوں کے فتووں اور ہر مسلک کے قاضیوں کے فیصلوں کی سب ہی تصحیح کرتے ہیں، بہ ضرورت ایک امام کے مسلک کو ترک کر کے دوسرے امام کے مسلک کے اختیار کرنے کی مسلمانوں کو جو اجازت دی گئی ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ فقہ کے سارے اختلافی مسائل کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ شریعت کے دائرہ سے کوئی باہر نہیں ہے۔

اور ایک شاہ ولی اللہ صاحب کیا؟ اسلام کے جلیل القدر ائمہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی، امام احمد بن حنبل، ان سارے بزرگوں کے اقوال اسی نقطۂ نظر کی تائید میں کتابوں میں موجود ہیں، ان ائمہ سے پہلے تبع تابعین بھی ہمیشہ مسلمانوں کو یہی سمجھاتے رہے۔ چونکہ زیادہ تر ان اقوال کا تعلق ان اختلافات سے ہے جن کا اجتہاد و تفقہ کے نتائج سے تعلق ہے اس لئے بجائے تدوینِ حدیث کے جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کے ذکر کا موزوں مقام وہی کتاب تھی۔ لیکن خبر احاد کی حدیثوں سے اختلافات کے متعلق یہی شاہ ولی اللہ تنہا آدمی نہیں ہیں ان سے پہلے بھی علماء اور ائمہ نے اسی نقطۂ نظر کا اظہار ان اختلافات کے متعلق بھی کیا ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ان مسائل میں بہتر شکل کیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے زیادہ مطابق صورت اس مسئلہ میں کیا ہو سکتی ہے؟ ابوبکر الجصاص نے خبر الواحد بعد الواحد کے اختلافات کا تذکرہ کر کے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ

"ان حدیثوں کی بنیاد پر مسائل کی جتنی شکلیں پیدا ہوتی ہیں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ

ان میں جس شکل کو چاہیں اختیار کریں فقہاء اور ائمہ میں یہ اختلاف صرف اس میں ہے کہ ان شکلوں میں افضل و بہتر شکل کیا ہے" (تفسیر جصاص ج ۱ ص ۲۰۴)

بلکہ الجصاص اور ان کے سوا معتبر علماء کا ایک گروہ وہ بھی ہے جو خبر احاد کی ان اختلافی روایتوں کے متعلق ایک خیال یہ بھی رکھتا ہے کہ

"مختلف روایتوں کا یہ مطلب سمجھا جائے گا کہ یہ بتانے کے لئے کہ مسلمان ان شکلوں اور پہلوؤں میں سے جس شکل اور جس پہلو کو چاہیں اختیار کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب ہی کر کے دکھایا ہو تاکہ معلوم رہے کہ ساری صورتیں جائز ہیں۔ (تفسیر جصاص ج ۱ ص ۲۰۴)

ائمہ میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ان اختلافی آثار و روایات کے متعلق زیادہ تر یہی تھا (جس کی تفصیل تدوین فقہ میں ملے گی کیونکہ امام کی اہمیت فقہ کے باب میں زیادہ تر ان کے اسی رجحان کی وجہ سے ہے)۔

یہی نہیں بلکہ براہ راست جن لوگوں کی دینی و علمی تربیت صحابۂ کرام کے زیر سایہ ہوئی تھی اپنے زمانے میں ان کی طرف سے بھی بار بار اسی نقطۂ نظر کا اعلان ہوتا رہا۔ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھائی محمد بن ابی بکر کے صاحبزادے قاسم بن محمد کا شمار مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ میں ہے وہ بچپن ہی میں اپنی پھوپھی ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آغوش تربیت میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے آ گئے تھے۔ اجتہادی مسائل کے اختلافات کے متعلق ان کے اور عمر بن عبد العزیزؒ کے جو اقوال کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان دونوں حضرات میں جو گفتگو ان اختلافات کے متعلق ہوئی اور آخر میں دونوں نے ان اختلافات کے ہر پہلو کے جواز پر جو اتفاق فرمایا، بقدر ضرورت ان سارے قصوں کو اپنی کتاب "تدوین فقہ" میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے میں نے بیان کیا ہے[1]، یہی نہیں کہ

---

[1] حافظ ابو عمر بن عبد البر نے اپنی متصل سند کے ساتھ رجاء بن جمیل کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ عمر بن عبد العزیز خلیفہ اور قاسم بن محمد دونوں حضرات جمع ہوئے اور حدیثوں کا تذکرہ شروع ہوا۔ عمر بن عبد العزیز کو دیکھا جا رہا تھا کہ قاسم جس حدیث کا تذکرہ کرتے عمر بن عبد العزیز اس کے مقابلہ میں ایسی روایت پیش کر دیتے جس کا مفہوم قاسم کی پیش کردہ روایت کے مخالف ہوتا آخر دیر تک جب گفتگو اسی رنگ میں ہوتی رہی تو عمر بن عبد العزیز نے محسوس کیا کہ قاسم بن محمد (باقی بر صفحۂ آئندہ)

صرف اجتہادی وفقہی نتائج ہی کی حد تک ان بزرگوں کا یہی نقطۂ نظر تھا بلکہ خبر احاد والی حدیثوں سے جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں ان کے متعلق بھی اس کا اندازہ حافظ ابو عمرو بن عبد البر کی اس روایت سے ہو سکتا ہے جس کا ذکر اپنی کتاب جامع بیان العلم میں متصل سند کے ساتھ انھوں نے کیا ہے یعنی اسامہ بن زید کہتے ہیں :-

سَأَلْتُ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ عَنِ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ فِيمَا لَمْ تَجْهَرْ فِيهِ فَقَالَ إِنْ قَرَأْتَ فَلَكَ فِي رِجَالٍ مِّنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُسْوَةٌ وَإِذَا لَمْ تَقْرَأْ فَلَكَ فِي رِجَالٍ مِّنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُسْوَةٌ۔

میں نے قاسم بن محمد سے پوچھا کہ جن فرض نمازوں میں زور سے قرأت نہیں کی جاتی ان میں امام کے پیچھے پڑھنے (یعنی سورۂ فاتحہ کے پڑھنے) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اس پر قاسم بن محمد نے فرمایا کہ اگر تم پڑھو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں تمہارے لئے نمونہ ہے اور نہ پڑھو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں ہی میں اس کا نمونہ تمہارے لئے موجود ہے۔

(جامع ج ۲ ص ۸۰)

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) ان کے طریقۂ کار سے کچھ گرانی محسوس کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر عمر بن عبد العزیز نے قاسم سے کہنا شروع کیا، آپ اس کی گرانی کیوں محسوس کر رہے ہیں۔ آخر میں عمر بن عبد العزیز کا اس باب میں جو خیال تھا اسی کو ان الفاظ میں ظاہر فرمانے لگے :

"صحابہ کی روایتوں میں جو اختلافات پائے جا رہے ہیں میں سچ کہتا ہوں کہ ان اختلافات کے معاوضہ میں سرخ اونٹوں سے میں اتنا خوش نہیں ہو سکتا جتنا کہ ان اختلافی روایات سے خوش ہوں"

"سرخ اونٹ" ایک عربی محاورہ تھا انمول جس کی قیمت کا مقابلہ کوئی دوسری چیز نہ کر سکے اسے عرب "سرخ اونٹ" کہتے تھے کیونکہ سرخ اونٹ سے زیادہ قیمتی چیز عربوں کی نگاہ میں کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عمر بن عبد العزیز رح کی اسی گفتگو ہی کا شاید یہ اثر تھا کہ بعد کو قاسم بن محمد مختلف جلسوں میں فرمایا کرتے تھے کہ عمر بن عبد العزیز رح کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں روایات کا اختلاف اگر نہ ہوتا تو میرے نزدیک یہ کوئی خوشگوار بات نہ ہوتی"۔ آج ان ہی اختلافات کا نتیجہ ہے کہ لوگ اس تنگی میں نہیں ہیں جو ایک ہی قول یا روایت کی وجہ سے پیدا ہو جاتی۔ اب تو آزادی سے ان بزرگوں کے مختلف اقوال میں سے جس قول پر بھی عمل میسر آجائے وہ کامیاب ہے۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۸۰)

جاننے والے جانتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کی قرأۃ کے مسئلہ میں جو اختلافات ہیں ان اختلافات کا تعلق تفقہ و اجتہاد سے نہیں بلکہ خبر احاد کی حدیثوں کے اسی ذخیرے سے ہے جس میں امام کے پیچھے پڑھنے اور نہ پڑھنے دونوں طرح کی ایسی حدیثیں ملتی ہیں جنھیں روایت کرنے والوں نے قولاً و فعلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے، بلکہ اگر میں یہ دعویٰ کروں تو اس کی مشکل ہی سے تردید ہو سکتی ہے کہ خبر احاد کی روایتوں سے جتنے اختلافات پیدا ہوئے ہیں، ان میں قرأت خلف الامام کا مسئلہ غالباً سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے نہ صرف پچھلی صدیوں میں بلکہ عہد صحابہ میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ خصوصی طور پر بحث و تمحیص کا مرکز یہ مسئلہ بنا ہوا تھا مگر اس سلسلہ میں ایسے شدید "خلافیہ" کے متعلق بھی ہمارے پاس اتنا واضح اور صاف تاریخی فیصلہ جب موجود ہے تو نسبتاً ان ہی حدیثوں کی بنیاد پر جن اختلافات کی اہمیت بہت کم ہے ان کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ حدیثوں ہی کی بنیاد پر سہی، جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی نوعیت ایسے حلال و حرام امور کی ہے جن پر حرمت و حلت کا حکم شریعت کے اس حصہ کے نصوص پر مبنی ہے جس کی تعبیر قرآن نے "البینات" سے کی ہے۔

امام مصر لیث بن سعد جن کے حالات کا تذکرہ کسی موقعہ پر گزر چکا ہے، ان کے حوالے سے یحیٰی بن سعید القطان نے یہ کتنی پختہ بات نقل کی ہے یعنی لیث کہا کرتے تھے:-

مَا بَرِحَ أُولُو الْفَتْوٰى يُفْتُوْنَ فَيُحِلُّ هٰذَا وَيُحَرِّمُ هٰذَا فَلَا يَرَى الْمُحَرِّمُ اَنَّ الْمُحِلَّ هَلَكَ لِتَحْلِيْلِهٖ وَلَا يَرَى الْمُحِلُّ اَنَّ الْمُحَرِّمَ هَلَكَ لِتَحْرِيْمِهٖ۔	فتویٰ دینے والے لوگ ہمیشہ سے فتویٰ دیتے ہوئے اگرچہ کسی چیز کو حلال اور کسی چیز کو حرام ٹھہراتے چلے آرہے ہیں لیکن ان فتویٰ دینے والوں میں سے کسی کو نہیں پایا گیا کہ حرام قرار دینے والے یہ سمجھتے ہوں کہ حلال ٹھہرانے والے تباہ ہو گئے (یعنی دین سے خارج ہو کر نجات سے محروم ہو گئے) اسی طرح حلال ٹھہرانے والوں نے کبھی یہ نہ سمجھا کہ اسی مسئلہ کے متعلق حرمت کا فتوے دینے والے ہلاک و تباہ ہو گئے۔
(جامع بیان العلم ج ۲ ص ۸۰)	

اور سچ پوچھئے تو کتابوں میں اگرچہ اس قسم کے اختلافی نتائج پر بھی حلال و حرام کے الفاظ کا اطلاق

کر دیا جاتا ہے لیکن یہ صرف خطرناک قسم کی غلطی ہی نہیں بلکہ میرے نزدیک تو بڑی جسارت ہوگی، اگر حرام و حلال کے الفاظ کا وہی مطلب یہاں بھی سمجھا جائے جو شریعت کے "بیناتی" حصہ میں حلال و حرام کے الفاظ کا مطلب ہوتا ہے، آخر اتنی بات تو تقریباً ہر عامی مسلمان بھی جانتا ہوگا کہ جس چیز کو "البینات" کے نصوصِ صریحہ میں مثلاً حرام قرار دیا گیا ہے اس کی حرمت کا انکار کر کے جو اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دے گا، یا برعکس اس کے "البینات" میں جو چیزیں حلال ٹھہرائی گئی ہیں ان کو حرام قرار دینے والے، دونوں کا اسلام سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا وہ گناہ کے نہیں بلکہ جرمِ بغاوت کے مجرم بن جاتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے منکر کا جو انجام ہوگا وہی انجام اس قسم کے باغیوں کے سامنے بھی آئے گا۔

پھر کیا کسی حدیث کی بنیاد پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اگر کسی چیز کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے، اور حنفی مذہب میں بجائے حلت کے اسی چیز کی حرمت کے پہلو کو ترجیح دی گئی ہو، کیا حلت و حرمت کے یہ اختلافات جو خبر احاد کی حدیثوں پر مبنی ہیں، محض ان کی بنیاد پر مجال ہے کسی حنفی کی جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اس کا بھی اندیشہ کر سکتا ہے کہ اس فتوے کی وجہ سے فضل و قرب کے مدارج و مراتب میں ان کے کسی قسم کی کوئی کمی ہوگئی ہے، یقیناً نہ کوئی حنفی یہ تصور کر سکتا ہے اور نہ کرتا ہے اسی طرح میں نہیں جانتا کہ باوجود ان تمام اختلافات کے حضرت امام ابوحنیفہ کے لئے رحمۃ اللہ علیہ یا دعاءِ خیر کرنے سے کسی شافعی کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہو۔ فقہی مسائل کے اختلافات کی کیا نوعیت ہے اور خود ائمۂ اجتہاد و تفقہ سے ان اختلافات کے متعلق جو باتیں کتابوں میں ملتی ہیں میں نے کتاب "تدوینِ فقہ" میں سب کو سمیٹ کر ایک ہی جگہ پر جمع کر دیا ہے یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی معلومات کے تازہ کرنے کے لئے اس کا مشورہ ضرور دوں گا کہ ناظرین "تدوینِ فقہ" کے اس حصہ کا اس موقعہ پر مطالعہ کر لیں[1]۔

---

[1] "تدوینِ فقہ" میں علاوہ ائمہ اربعہ دوسرے ائمہ اجتہاد کے اقوال بھی آپ کو ملیں گے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کہنے والے یہ جو کہتے ہیں کہ ائمہ نے یا علماء نے اختلاف کیا بجائے اس کے یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ علماء نے وسعتِ نظر سے کام لیا۔ اُمت کے لئے سہولت بہم پہنچائی ہے، امام احمد بن حنبل سے پوچھنے والے نے (باقی برصفحہ آئندہ)

میں ذکر مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے اس حادثہ کا کر رہا تھا جس میں زوالِ حکومت کے بعد اچانک اس ملک کے مسلمان مبتلا ہو گئے تھے وہی حادثہ جس میں دیکھا گیا تھا کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں نے رزمگاہوں کا قالب اختیار کر لیا، نماز کی صفیں نماز کی صفیں نہیں بلکہ باضابطہ جنگ کی صفیں بن گئی تھیں جو نماز نہیں پڑھتے تھے ان کو نہیں بلکہ نماز پڑھنے والوں کو نمازوں ہی کے پڑھنے والے اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹک رہے تھے۔ آپس میں لاٹھیاں اور جوتے صرف اس لئے چل رہے تھے کہ رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ بھی تم نے کیوں نہیں اٹھلیا، یا امام ولا الضالین پر جب پہنچا تو اس پر نہیں کہ تم نے آمین کیوں نہ کہی کیونکہ آمین تو سب ہی کہتے ہیں، جھگڑا اس پر تھا کہ صرف خدا ہی کو تم نے آمین کا یہ لفظ کیوں سنایا، خدا کے بندے جو تمہارے دائیں بائیں کھڑے تھے ان کو بھی اس لفظ کے سننے کا موقعہ کیوں نہ دیا۔ مسلمانوں ہی کا ایک گروہ دوسرے گروہ کو مسلمانوں ہی کی مسجدوں سے نکال رہا تھا، اس لئے نکال رہا تھا کہ امام نماز میں قرآن کے جس حصہ کو پڑھتا ہے

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) جب پوچھا اور کہا کہ کیا آپ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں جس کا وضو آپ کے فتوٰی کی رو سے باقی نہیں رہا ہے اگرچہ دوسرے ائمہ کے قول کے مطابق اس کا وضو نہ ٹوٹتا ہو، اسی طرح کے بعض دوسرے جزئیات کا بھی اس نے ذکر کیا تو جواب میں فرمانے لگے کہ اے شخص تو کیا کہتا ہے میں سعید بن المسیب (جو افضل التابعین سمجھے جاتے ہیں) ان کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا کیونکہ اس مسئلہ میں سعید کا مذہب بھی یہی تھا کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی موقع پر میں نے یہ بھی نقل کیا ہے اور تقریباً یہ روایت درجۂ شہرت تک پہنچی ہوئی ہے کہ امام مالک سے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے باصرار بلیغ کہا کہ آپ کے فقہی اجتہادات کو میں بزورِ شمشیر مسلمانوں میں چاہتا ہوں کہ نافذ کرا دوں۔ اس پر امام مالک نے شدت سے اس کو منع کیا اور کہا کہ جس علاقہ کے مسلمان جن امور کے پابند ہو چکے ہیں ان کو اسی حال میں چھوڑ دو۔ میں پوچھتا ہوں کہ امام مالک اگر ان مسائل کو جو ان کے اجتہادی مسائل سے مخالف تھے قطعی طور پر خلاف شرع سمجھتے تھے تو کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ جن کے نفاذ کا ایک بہترین ذریعہ ان کو مل گیا تھا اس سے نفع نہ اٹھاتے اور مسلمانوں کو غلط مسائل پر قائم رکھنے کا مشورہ دیتے؟ الغرض اسی قسم کی باتیں تقریباً تمام ائمہ کے حوالہ سے اس کتاب میں نقل کی گئی ہیں، کتاب "تدوینِ فقہ" جو ابھی غیر مطبوع نامکمل حال میں ہے اس کا یہ حصہ جس میں فقہی اختلافات کے اس پہلو کا ذکر آیا ہے "مجلہ تحقیقاتِ علمیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں شائع ہو چکا ہے جامعہ کے تحقیقاتی شعبہ سے غالباً یہ مل سکتا ہے۔ نیز برہان وغیرہ شہری مجلات میں بھی قسط وار یہ سلسلہ شائع ہو چکا ہے۔ ناشرین چاہیں تو صرف اسی مطبوعہ حصہ کو بھی شائع کر کے دین کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ بڑی تقطیع کے سو صفحات پر ٹائپ کے حروف میں یہ مقالہ شائع ہوا ہے۔

تم نے اُسے سُنا کیوں؟ بجائے سننے کے تم بھی اسی کے دہرانے میں کیوں مشغول نہ ہوگئے جسے امام اپنی طرف سے اور تمہاری طرف سے پڑھ رہا تھا اور بات اسی تک ختم ہو جاتی تو سمجھا جا سکتا تھا کہ خیر ایک حد پر پہنچ کر وہ ختم ہو گئی لیکن قصہ تو یہاں تک دراز ہوا کہ مسلمانوں کی دنیا جن لوگوں نے جبراً ان سے چھینی تھی ان ہی کے سامنے بخوشی و رضا یہ اپنے دین کو لے کر بھی پہنچے جن کی عدالتوں میں بیٹھے کے جھگڑوں کے لے جانے پر تو سمجھا جاتا تھا کہ مسلمان مجبور ہیں ان ہی عدالتوں کے حکام کے پاس وہ اللہ کی کتاب اور جن میں ان کے رسول کی حدیثیں تھیں ان سب کتابوں کو لے کر وہ غزیوئے یہ کہتے ہوئے حاضر ہوئے کہ آپ ہی بتائیے کہ ہم دونوں فریقوں میں ان کتابوں کی رو سے واقعی مسلمان کون ہے اور مسلمانوں کی مسجدوں کے استعمال کا قانونی حق کسے حاصل ہے طیش کی آگ اور غصہ کے شعلوں میں ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت کا سارا سرمایہ جل کر بھسم ہو چکا تھا ان فیصلوں پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے تھے جو اللہ اور رسول کے جھٹلانے والوں کی طرف سے کوئی فریق حاصل کرتا تھا اور ان ہی فیصلوں کی آڑ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے والی امت کی ایک جماعت عبادت گاہوں سے ڈھکیلی جا رہی تھی جو نہ عیسائیوں کر گرجے تھے اور نہ یہودیوں کی سنی گاگ، بلکہ یہ کیسا دلخراش منظر تھا کہ مسلمانوں کی مسجدوں سے مسلمانوں ہی کو نکالا جا رہا تھا کہ جو مسلمان نہیں تھے ان ہی حکام سے ان کے نکالنے کا فیصلہ خود مسلمانوں نے مسلمانوں کے لئے حاصل کیا تھا۔

سوال یہی ہے کہ زیادہ دن نہیں آج سے تیس چالیس سال پہلے غیروں کی تالیوں اور اپنوں کی گالیوں کے درمیان رسوائیاں اور بر سر بازار فضیحتوں کے مذکورہ بالا قصے جن کی آگ نصف صدی کے قریب قریب ہندوستان کے مختلف گوشوں کے تقریباً ہر اس گھر میں بھڑکی ہوئی تھی جس میں قرآن کی پڑھنے والی اور رسول کو ماننے والی امت آباد تھی۔ یہی میں پوچھتا ہوں کہ ارادی مخالفتوں کی اس آگ کے سلگانے میں کام لینے والوں نے کس چیز سے کام لیا تھا؟ ان اختلافات کے سوا آپ ہی بتائیے اور بھی کوئی چیز تھی جن کا ان حدیثوں کے علم و عدم علم کی وجہ سے پیدا ہو جانا ایک

قدرتی بات تھی جو پیغمبر کی ہی طرف سے عمومی رنگ میں اس لئے نہیں پھیلائی گئی تھیں کہ ان کے مطالبہ اور گرفت میں نرمی اسی تدبیر سے پیدا ہو سکتی تھی اور لب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فَلَا تُحَدِّثُوا عَنْ رَسُوْلِ اللهِ شَيْئًا (رسول اللہ کی طرف منسوب کرکے کوئی بات نہ بیان کرو) اس کا مطلب بھی مذکورہ بالا تفصیلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ ارادی مخالفتوں کو پیدا کرنے کے لئے حدیثوں کے بیان کرنے سے وہ منع فرما رہے ہیں، ورنہ جیسا کہ گزر چکا روایتِ حدیث سے مطلقاً ممانعت کی تجویز اگر ہم اس کو قرار دیں گے تو خود ان کے طرزِ عمل، صحابہ کے طرزِ عمل بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کے خلاف العیاذ باللہ یہ تجویز ہوگی، بلکہ آگے انہوں نے جو یہ فرمایا کہ "جب تم سے کوئی بات پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے" اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس تجویز کا تعلق ان ہی لوگوں سے ہے جو ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کے لئے حدیثوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے اور پھیلاتے ہیں انھوں نے اسی لئے قاعدہ ہی بنا دیا کہ جب کبھی اختلافی اغراض کے لئے حدیثوں کے متعلق کوئی پوچھ گچھ، کنج وکاؤ شروع کرے تو اعلان کر دینا چاہئے کہ مسلمانوں کو اتفاقی نقطہ پر سمٹے رہنے کے لئے وہی باتیں کافی ہیں جنھیں "البینات" کی شکل میں قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ حاصل یہی ہوا کہ قرآن کے "البینات" پر متحد ہو جانے کے بعد ضرورت نہیں ہے کہ غیر بیناتی مسائل میں بھی ایک ہی نقطہ پر مسلمانوں کو جمع کرنے کی فضول کوشش کی جائے کہ اس کوشش سے بجائے ختم ہونے کے اختلاف بڑھے گا۔ بڑھتا ہی چلا جائے گا جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں تم سے زیادہ اختلاف میں سخت ہو جائیں گی۔ بہرحال دین کے غیر بیناتی حصے کے متعلق صحیح مسلک یہی ہے اور اسی کو ہونا چاہئے کہ باہم مسلمان اس سلسلہ میں ایک دوسرے کے اختلاف کے برداشت کرنے کی صلاحیت اور گنجائش اپنے اندر پیدا کریں، قرآن کے قرأتی اختلاف کو ذریعہ بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اسی گنجائش کے پیدا کرنے کی مشق صحابہ سے کرائی اور ابوبکر صدیقؓ نے اپنی مذکورہ بالا تجویز کو پیش کرتے ہوئے میرا خیال یہی ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی مبارک منشا کی تعمیل پران مسلمانوں کو آمادہ کرنا چاہا تھا جو ان کے زمانے میں موجود تھے اپنے عہد کے لوگوں کو بھی انہوں نے اسی حکم کی تعمیل کی طرف توجہ دلائی۔ خبر احاد والی روایتوں کی بنیاد پر اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں فساد اور فتنے سے بچنے کی ایک دوامی تدبیر یہ بتا دی کہ جب وہ پیدا ہو یا اس کے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس زہر کے ازالہ کی یہی صورت ہے کہ قرآن کے "البینات" پر سمٹ جانے اور جمع ہونے کی دعوت مسلمانوں کو دی جائے، دین کے غیر بیناتی مسائل کے ناگزیر قدرتی اختلافات، ارادی و اختیاری جنگ وجدال کی شکل اختیار نہ کرنے پائیں، اس خطرے کے انسداد کی واحد تدبیر یہی ہے ورنہ "البینات" سے ہٹ کر "غیر بیناتی" مسائل میں بھی ایک ہی مسلک کا پابند مسلمانوں کو بنانے کا ارادہ جب کبھی کیا جائے گا درحقیقت یہ اجتماع و اتفاق کی دعوت نہ ہوگی بلکہ مسلمانوں کو مختلف ٹکریوں میں بانٹنے کی طرف خطرناک اقدام ہوگا، پس سیدھا، صاف، روشن راستہ "لَيْلُهَا وَنَهَارُهَا سَوَاءٌ" کا یہی ہے کہ "البینات" میں جو ایک ہیں وہ بہر حال ایک ہیں خواہ "غیر بیناتی مسائل" میں وہ جس حد تک مختلف ہوں۔ اس اختلاف سے ان کا اتحاد قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔ اختلاف کے ساتھ اتحاد، اور اتحاد کے ساتھ اختلاف کی یہی حکیمانہ درمیانی راہ تھی، جس کی عملی مشق کا موقعہ مسلمانوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی ملا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قریب تھا کہ راہ سے مسلمان ہٹ جائیں لیکن پُر ہونے سے پہلے فتنے کے اس سرچشمہ پر ہمیشہ کے لئے آپ نے ایک ایسی ڈاٹ لگا دی کہ وقت پر اگر اس کی خبر نہ لی جاتی تو بقول سعدی ہاتھیوں سے بھی اس سیلاب کا روکنا ناممکن تھا[1]۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں بھی لوگوں کو اسی مسلک پر قائم رکھنے کی کوشش کی، اور آئندہ رہتی دنیا تک کے لئے آپ نے اختلاف کے ساتھ اتحاد کو باقی رکھنے کا یہ کارگر بے خطا نسخہ مسلمانوں کے حوالہ فرما دیا کہ اتحاد کا معیار ہمیشہ دین کے بیناتی حصہ کو رکھا جائے جس کی تعبیر حضرت والا نے "کتاب اللہ" کے لفظ سے فرمائی۔

[1] گلستان سعدی کے مشہور کہتی شعر "سرچشمہ شاید گرفتن بمیل ؛ چو پر شد نشاید گرفتن بپیل۔" کی طرف اشارہ ہے۔

اور جیسا کہ شروع میں میں نے عرض کیا تھا کہ اپنی تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی طویل تاریخ میں مسلمانوں کی وسیع و عریض امت جو کرورہا کرور کی تعداد میں دنیا کے اکثر حصوں میں پھیلی ہوئی ہے، دین کے غیر بیناتی حصہ میں اختلافات رکھتے ہوئے بھی ان کی اکثریت عظیمہ اہل السنت والجماعت کی ایک ہی جماعت کی شکل میں جو پائی جا رہی ہے تو یہ اسی حکیمانہ تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اور جب کبھی غیر دینی یا اندرونی یا بیرونی مؤثرات کے دباؤ نے مسلمانوں کو اس راہ سے منحرف کیا ہے تو وہی صدیقی دعوت جس کا حاصل یہی ہے کہ

"ہمارے اور تمہارے درمیان (اشتراک کا نقطہ) اللہ کی کتاب ہے آؤ ہم سب اس کی حلال کی ہوئی باتوں کے حلال ہونے پر اور حرام کی ہوئی باتوں کے حرام ہونے پر جمع ہو جائیں"

ہمیشہ کام آئی، اور مسلمانوں کی دینی وحدت کی محافظ بن گئی۔ پچھلے دنوں ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی غیر بیناتی مسائل کے اختلافات شروع ہوئے اور بعض لوگوں میں اس کا جوش پیدا ہوا کہ اختلافی حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج میں جن پہلوؤں کو اپنے معلومات کی بنیاد وہ زیادہ بہتر اور اولیٰ سمجھتے تھے ان ہی پہلوؤں کا پابند ہندوستان کے ہر مسلمان کو بنا دیں لیکن پوری صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ ان کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ "البینات" پر متحد ہو جانے کے بعد غیر بیناتی مسائل کے اختلافات کے برداشت کرنے کی گنجائش اب ان میں بھی پیدا ہو چکی ہے اب وہ بھی کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں محسوس کرتے جو آمین زور سے نہیں کہتا یا رکوع میں جاتے اور سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ حقیقت ان پر واضح ہو چکی ہے بطور نام نہاد کے اپنے مسلک کو ایک خاص نام سے موسوم کر کے جی رہے ہیں۔ شاید یہ نام بھی زیادہ دن تک باقی نہ رہے گا۔[1]

---

[1] پچھلے چند دنوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ نام پر بھی اتفاق ان میں باقی نہیں رہا ہے، بعض اپنے آپ کو بجائے اہل حدیث یا عامل بالحدیث یا محمدی وغیرہ الفاظ کے کبھی "شافعی" کبھی "حنبلی" وغیرہ بھی کہنے لگے ہیں۔ "حنبلی" ہو جانے کے بعد وہی بات سامنے آ جائے گی جو پہلے سے چلی آ رہی تھی، میں عرض کر چکا ہوں کہ لفظ "حنبلی" کے ساتھ حنفی یا شافعی وغیرہ الفاظ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

اس میں شک نہیں کہ ایک مختصر سی بات کے لئے غیر معمولی طور پر مجھے طول کلامی سے کام لینا پڑا لیکن سچ پوچھئے تو دیکھنے کی حد تک ابوبکر صدیقؓ کے مذکورہ بالا الفاظ مختصر نظر آتے ہیں لیکن سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ خدمت ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے عہد صدیقی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق صرف دو مسئلے اہمیت رکھتے تھے، یعنی ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ یہ تو پہلی خدمت تھی جس کی نگرانی ہر مسلمان کے فرائض میں داخل تھی اس کے ساتھ دوسری اہم خدمت جیسا کہ بہ تفصیل بیان کر چکا ہوں یہ تھی کہ ان حدیثوں کی اشاعت میں چاہا جاتا تھا کہ عمومیت کا ایسا رنگ نہ پیدا ہونے پائے جس کے بعد نرمی اور مسامحت کی وہ کیفیت ان میں باقی نہیں رہ سکتی تھی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان حدیثوں کے مطالبہ اور گرفت میں بہر حال باقی رکھنا

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) سارے حنفی و شافعی وغیرہ مسلمانوں میں جس کی شخصیت قدسیہ "غوثیتِ کبریٰ" کے مقام سے سرفراز سمجھی جاتی ہے اور ملا جلاً ہے کہ جن کا قدم مبارک "علی رقبۃ کل ولی" ہے یعنی سیدنا الشیخ عبدالقادر الجیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ "حنبلی" ہیں۔ اس موقعہ پر ایک لطیفہ کا بار بار خیال آرہا ہے، میں نے براہِ راست بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت سنی ہے کہ حضرت کے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی تغمدہ اللہ بغفرانہ کی خدمت میں فرقۂ اہلِ حدیث کے ایک ممتاز و نمایاں عالم وہیں حاضر ہوئے۔ مولانا ابراہیم سے جب ملاقات ہوئی تو حضرت گنج مراد آبادی نے پوچھا کہ مولوی صاحب آپ عامل بالحدیث ہیں۔ بولے جی ہاں الحمدللہ۔ مولانا نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سونے کے وقت کون سی دعا پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اس وقت یاد نہیں ہے پوچھا کہ گھر سے نکلتے وقت کیا پڑھتے تھے بولے وہ بھی یاد نہیں ہے۔ الغرض یوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات اور مقامات میں جو دعائیں پڑھا کرتے تھے جیسے اکثر مولویوں کو عموماً یاد نہیں ہوتیں، مولوی صاحب بیچارے کو بھی یاد نہ تھی۔ تب مولانا نے ان ہی اہلِ حدیث مولوی صاحب کو خطاب کر کے کہنا شروع کیا کیوں مولانا! آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف اختلافی حدیثوں کو یاد کیا ہے لیکن جن حدیثوں کے متعلق کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے ان کے یاد کرنے کی ضرورت کو عمل بالحدیث کے لئے آپ نے ضروری خیال نہ کیا۔ کیا اسی کا نام "عمل بالحدیث" ہے۔ کہتے ہیں کہ مولوی ابراہیم جھینپ سے گئے۔ مولانا محمد علی مرحوم یہ بھی بیان فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ کی حاضری کے زمانہ میں مولوی ابراہیم نے ایک خواب دیکھا اور اسی خواب کے بعد حنفی مسلک پر واپس ہو گئے تھے۔ شاید اس مضمون کا ایک مکتوب بھی مولوی ابراہیم کا لکھا ہوا حضرت مولانا محمد علی کے پاس موجود تھا۔

چاہتے تھے۔ ہر شخص تک ان حدیثوں کو نہ پہنچانا، مکتوبہ مجموعے جو آپ کے زمانے میں لکھے جاچکے تھے ان کا ضائع کرادینا عمومی طور پر آئندہ ان حدیثوں کے لکھنے سے لوگوں کو منع کر دینا۔ ابوبکر صدیق رض کا اپنے ہاتھ سے جمع کی ہوئی حدیثوں کو نذر آتش کر دینا یہ اور اس کے سوا اس سلسلہ میں جن دوسرے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، بتا چکا ہوں کہ غرض و غایت سب کی یہی تھی اور عہد صدیقی سے ان ہی حدیثوں کے متعلق مسلمانوں کے ذمہ یہ تیسری خدمت سپرد ہوئی کہ مسلمانوں کو لڑانے بھڑانے، ان کی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنے کا ذریعہ ان حدیثوں کو نہ بنایا جائے۔ بالفاظ دیگر گویا سمجھنا چاہئے کہ حضرت صدیق اکبر رض نے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار بنایا کہ خبر احاد کی حدیثوں میں انفرادی معلومات کے لحاظ سے قدرتاً جو اختلافات رہ گئے ہیں ان کو ارادی و اختیاری مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کا ایندھن اگر کوئی بنانا چاہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے اس غلط استعمال سے اس کو روکا جائے اس میں شک نہیں علمی طور پر تدوینِ حدیث کی تاریخ میں حضرت ابوبکر رض کی اس خدمت کا اور اس کی قدر و قیمت کا لوگوں نے بہت کم تذکرہ کیا ہے بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابوبکر صدیق رض کی طرف مذکورہ بالا روایت جو منسوب کی گئی ہے گزرنے کی حد تک تو تاریخ حدیث کے پڑھنے والوں کے سامنے دوسری روایتوں کے ساتھ یہ روایت بھی گزرتی ہی ہوگی لیکن اس کا واقعی کیا مطلب ہے، ٹھہر کر سوچنے کی ضرورت شاید ہی کسی نے محسوس کی ہو لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عملاً ابوبکر صدیق رض کی عائد کی ہوئی اس ذمہ داری کو صحابہ رض نے قبول کیا اور بعد کو بھی تقریباً ہر زمانہ میں مسلمانوں کو اس باب میں ہم صحابۂ کرام کی اس روش کا پابند پاتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کے جو مختلف معلومات ان حدیثوں کے متعلق تھے، اور ان میں ہر ایک اسی پر عامل تھا جو وہ جانتا تھا لیکن عملی اختلاف کے باوجود آج تک کوئی ایسا واقعہ منقول نہیں ہے کہ ان اختلافات کی وجہ سے کسی صحابی نے دوسرے صحابی کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کیا ہو یا ان اختلافات کی بنیاد پر اپنے دین کو کسی صحابی نے دوسرے کے دین سے الگ قرار دیا ہو، بلکہ جہاں تک میں جانتا ہوں شاید ہی کسی صحابی نے اپنی دینی زندگی کو دوسرے صحابی کی دینی زندگی سے افضل و برتر خیال کیا ہو، کم از کم کوئی روایت مجھ تک تو

ایسی نہیں پہنچی ہے، صحابہ کا بھی طرزِ عمل یہی تھا، جسے ان کے فیض یافتوں یعنی تابعین نے دیکھا تھا کچھ دیر پہلے حضرت قاسم بن محمد کا یہ فتویٰ جو میں نے نقل کیا تھا کہ پوچھنے والے نے امام کے پیچھے قرأت کے متعلق جب حضرت سے سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"کہ اگر پڑھو گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں اس کا نمونہ موجود ہے اور نہ پڑھو گے تو اس کا نمونہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے صحابیوں میں تم کو ملے گا۔"

اپنی حکمرانی کے زمانے میں سلف صالح کے جن بزرگوں اور ان بزرگوں کے علم و تحقیق پر بھروسہ کرکے دین کے غیر بیناتی شعبہ میں جن پہلوؤں کو ہندوستان کے مسلمانوں نے افضل و اولیٰ قرار دے کر غیروں کے سامنے اس کفرستان میں اپنے مذہبی نظام کی وحدت و یکرنگی کے دل آویز سماں کو سیکڑوں سال محفوظ اور قائم رکھا تھا مگر زوالِ حکومت کے ساتھ ہی نہ معلوم کن اسباب و مؤثرات کے تحت اچانک بعضوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کا علم اور ان کی تحقیق سلف کے ان بزرگوں کے علم و تحقیق سے زیادہ بہتر اور صحیح ہے جن پر مسلمانانِ ہند نسلاً بعد نسلٍ بھروسہ کرتے چلے آتے تھے اس خیال کے زیرِ اثر عام مسلمانوں سے پھٹ کر اگر اپنے علم اور اپنی تحقیق کے وہ صرف پیرو بن جاتے تو شاید شکایت کرنے والوں کو ان سے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن وہ آگے بڑھے اور عہدِ صحابہ و تابعین کے تربیت یافتہ دماغوں، اسی عہد کے تقویٰ و طہارت سے منور قلوب کے فیصلوں سے بدکا بدکا اور بھڑکا بھڑکا کر وہ اپنے دماغوں کے پیدا کئے ہوئے نتائج کی تقلید کی دعوت احیاءِ سنت یا اتباعِ سنت کے نام سے اسی ملک میں مسلمانوں کو دینے لگے، قرآن جس فعل کو جرم ٹھہرا چکا تھا اور مختلف الفاظ میں اس کے حرام ہونے کا قطعی اعلان کر رہا تھا تفریق بین المسلمین کا یہ فعل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک نہ جرم ہے اور نہ کوئی ایسا کام ہے جو نصِ قطعی کے رو سے حرام قرار پا چکا تھا، وہ بدترین جرم کا ارتکاب صرف اسی لئے کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو ایسی باتوں کے پابند بنانے میں شاید وہ کامیاب ہو جائیں جن کی پابندی سے انحراف خود ان کے نزدیک بھی نہ جرم تھا اور نہ گناہ۔ ان جائز پہلوؤں میں جن کا ہر پہلو شرعی حدود سے باہر نہ تھا

زیادہ سے زیادہ وہ پہلو بہتر اور افضل تھا جس کے لئے وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

اللہ اللہ خبر احاد کی حدیثوں کے اختلاف کا قصہ جو نرم تھا، موم سے بھی زیادہ نرم تھا، اس میں سختی اور شدت بھری گئی ایسی سختی اور ایسی شدت کہ پتھر اور لوہا بھی اس کے سامنے شاید پانی نظر آتا تھا، اختلافی حدیثوں کا یہی سرمایہ ان کا گویا اسلحہ خانہ تھا۔ پیغمبر کی ایک ایک حدیث 'حدیث' نہیں بلکہ حرب کا آلہ اور ضرب کے اوزار بن چکی تھی وہ اس پر ان ہی حدیثوں میں سے کسی حدیث کو "السکین" (چھری) بنا کر وار کرتا تھا اور یہ اس پر حبل ڈوری کی شکل میں حدیثوں ہی کی کمند پھینکتا تھا اور اپنی اسی جنگ میں کبھی اس صف سے "ظفر مبین" کا شادیانہ بجایا جاتا تھا[1] اور کبھی اس صف سے "فتح مبین" کا نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، تحقیق کے بعد ہمیشہ یہی ثابت ہوتا تھا کہ ہر فریق جنگ کے پہلے گھنٹے پر جس مقام پر تھا وہاں سے نہ ایک قدم آگے بڑھا ہے اور نہ پیچھے ہٹا ہے، بلکہ نہ آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے کہ ہر ایک ہتھیاروں کے نہ ختم ہونے والے لامحدود ذخیرے پر قابض تھا۔

بہرحال کچھ بھی ہو اس سارے طول و طویل قصے۔ کے ذکر سے میری غرض یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے ساتھ ان گستاخانہ بازی گریوں کو دیکھتے ہوئے اللہ کا کوئی بندہ جھگڑنے والوں کے اس گروہ کو اگر یہ مشورہ دے کہ جب تمہارا یہی حال ہے تو ایسی صورت میں حدیثوں کا بیان کرنا ہی ترک کر دو، تو کیا مشورے کے ان الفاظ کا یہ مطلب لینا صحیح ہوگا کہ مشورہ دینے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو دنیا سے ناپید کرنا چاہتا ہے، یا پیغمبر نے اپنی جن حدیثوں سے استفادے کی راہیں امت پر کھلی رکھی ہیں ان کے فوائد سے امت کو محروم کرنا چاہتا ہے۔

کن لوگوں سے کہہ رہا ہے، کیوں کہہ رہا ہے، کن حالات میں کہہ رہا ہے، گفتگو کی ان تمام ماحولی

---

[1] پچھلی صدی میں جو رسالے اور کتابیں اس سلسلہ میں شائع ہوتی رہی ہیں ان ہی کے ناموں کی طرف تلمیح کی گئی ہے یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ واقعۃً ان رسالوں میں ایک رسالے کا نام "السکین" (چھری) تھا جو مسئلہ اس کے متعلق لکھا گیا تھا اسی مسئلہ میں دوسرا رسالہ حبل المتین تھا، باقی الظفر المبین اور الفتح المبین تو اس سلسلے کی مشہور کتابیں ہیں۔ بہرحال یہ ایک بڑی طویل تاریخی داستان ہے ۱۲

[illegible]

اس کوشش کے لئے ہمارے پاس "البینات" کے احکام و مسائل ہیں ان کے متعلق کسی مسلمان میں خدانخواستہ کسی قسم کا انحراف اگر محسوس ہو تو بلاشبہ اس وقت فرض ہو جاتا ہے کہ اس کے سامنے قرآن کی آیتیں تلاوت کی جائیں، نصوص صریحہ کو پیش کر کے اس انحراف اور اختلاف سے اس کو روکا جائے کہ ان میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی ہے۔ دین کا یہی وہ حصہ ہے قرآن میں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ "بینات" کے ہوتے ہوئے گزشتہ قومیں جدا جدا ہو کر آپس میں مختلف ہو گئی ہیں جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اس حصہ کو اتنا واضح اور روشن شکل میں رکھا گیا ہے کہ عام و خاص، اعلیٰ و ادنیٰ، عالم و جاہل سب ہی اس پر متفق ہو کر ایک ہو سکتے ہیں "البینات" کے ہوتے ہوئے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دین میں ایسی کوئی چیز تھی ہی کب جس پر ہم سب اپنے اختلافات کو ختم کر کے سمٹ جاتے میں تو سمجھتا ہوں کہ یہی مطلب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان الفاظ کا بھی ہے جو آخر میں فرمایا کہ یعنی

فَمَنْ سَأَلَكُمْ فَقُوْلُوْا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللهِ فَاسْتَحِلُّوْا حَلَالَهٗ وَحَرِّمُوْا حَرَامَهٗ۔

پھر تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو، کہ ہمارے تمہارے درمیان (اشتراک کا نقطہ) اللہ کی کتاب ہے پس چاہئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳)

تابعین کے بعد بھی مسلمانوں کو ہم اسی مسلک کا پابند پاتے ہیں، معلومات کا اختلاف صرف علم تک محدود تھا لیکن "عمل" میں اختلاف کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ البتہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اہم اصلاحی اقدامات کے بعد ان کے ماننے والوں میں سے بعضوں کے اندر پھر ان اختلافات کی کچھ لہریں اٹھی تھیں لیکن زہر کے ساتھ ساتھ سیدنا امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں ایک تریاقی وجود اسلام کو عطا ہوا، آپ نے اپنی بے لاگ صداقت بے پناہ علم، مستحکم تقوے کے زور سے ان اٹھنے والی لہروں کو اتنی قوت سے دبا دیا کہ پھر صحیح معنوں میں ان اختلافات کو پھلنے پھولنے کا موقع مسلمانوں کی عمومیت میں کبھی نہ ملا۔ بعض پیشہ ور مولوی

ان میں ارادی مخالفتوں اور مخاصمتوں کا رنگ اپنے خاص اغراض کے تحت بھرنا بھی چاہتے تھے تو ان کے خاص تعلیمی حلقوں سے آگے اس کا اثر عام مسلمانوں تک بحمد اللہ کبھی نہیں پہنچا۔ ممکن ہے کہ میرے اس خیال سے بعضوں کو اختلاف ہو لیکن میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ طبقۂ صوفیہ سے لوگوں کو اور جتنی بھی شکایتیں ہوں اس وقت ان سے بحث نہیں ہے لیکن انصاف کی یہ بات ہے کہ غیر بنیاتی مسائل کے اختلافات کے جس رنگ کو مولویوں کا ایک گروہ پختہ کرنا چاہتا تھا صوفیہ کا عام گروہ اس کے مقابلہ میں ہمیشہ اس رنگ کو دھیما اور پھیکا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ نہیں تو صوفیہ کے گروہ کا مسلمانوں پر یہی ایک احسان کیا کم ہے۔ بہرحال یہ ایک بڑی مفصل اور مبسوط بحث ہے۔ اہلِ علم کے لئے تو شاید یہ چند اشارے بھی کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جن کے لئے اتنے اشارے ناکافی ہیں ان کو میری کتاب "تدوینِ فقہ" کا انتظار کرنا چاہئے کہ ان مسائل کی تفصیل کے لئے وہی کتاب موزوں ہو سکتی ہے۔ امام شافعی کے اصلاحی اقدامات کیا تھے، ان سے بعضوں کو کیا غلط فہمیاں ہوئیں، حضرت امام احمد بن حنبل نے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کن تدبیروں سے کیا، ظاہر ہے کہ فقہ اور ائمہ فقہ کے حالات سے ان سوالوں کا حقیقی تعلق ہے ضمناً و ذیلاً تدوینِ حدیث کے سلسلہ میں بھی ان کا ذکر کر دیا گیا۔ [1]

---

[1] مختصراً یہ ہے کہ امام شافعی حجاز سے تعلیم پا کر جب دارالخلافت بغداد پہنچے تو خود ان کا بیان ہے کہ جامع مسجد میں درس کے چالیس حلقوں میں بیٹھنے کے بعد مجھ پر ظاہر ہوا کہ ہر پڑھانے والا نہ اللہ کا نام لیتا ہے اور نہ رسول کا، یعنی نہ کوئی قال اللہ کہتا ہے اور نہ قال الرسول بلکہ ہر ایک قال اصحابنا یعنی میرے استادوں نے یہ کہا۔ بس یہی سنتا ہے صرف ڈیڑھ سو سال کے اندر دین کے اصل سرچشمے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے علماء اسلام کی اس بے تعلقی کو دیکھ کر قدرتاً امام میں برہمی پیدا ہوئی اور اعلان کیا کہ علماء جن کا حوالہ دیا جاتا ہے ان میں ہر ایک کے تشریحات اور اجتہادی فیصلوں کو میں پھر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر پیش کر کے جانچوں گا۔ آپ نے بغداد میں بیٹھ کر حنفی مذہب پر تنقید کی اور مصر جہاں ان کے استاد امام مالک کا مذہب زیادہ عروج پر تھا وہاں پہنچ کر مالکی مذہب پر تنقید فرمائی۔ امام شافعی کو اس کا اجر ملتا رہے گا کہ ہٹنے کے بعد دین کے حقیقی سرچشموں کتاب اللہ اور سنت کی طرف مسلمان ان ہی کے طرزِ عمل کی وجہ سے لوٹتے رہے ہیں مگر فروعی اختلافات کو امام شافعی کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت جب حاصل ہو گئی تو امام احمد نے مفاہمت و مصالحت کی راہ کھولی ان کی طرف ایک ہی مسئلہ کے مختلف پہلو کے جواز و عدم جواز کا عموماً انتساب کتابوں میں جو کیا جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر پہلو اس مسئلہ کا ان کے نزدیک شرعی حدود سے باہر نہیں سمجھا جاتا ۱۲

بہرحال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں حدیث کے متعلق جو اہم خدمت انجام پائی وہ یہی تھی اسی حال میں پیغمبر کے دین اور پیغمبر کی امت کو چھوڑ کر آپ اپنے محبوب نبی کے بازو میں جاکر سو گئے۔ آپ کے بعد حضرت عمر فاروق رضؓ کا زمانہ آتا ہے (اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى نَبِيِّكَ وَحَبِيْبِكَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَخُلَفَائِهٖ اَجْمَعِيْنَ)۔

عہدِ فاروقی اور تدوینِ حدیث

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے، اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعض احتیاطی طریقۂ عمل کا ذکر عہدِ صدیقی کے واقعات کی ذیل میں کرچکا ہوں اور کوئی وجہ بھی نہیں ہوسکتی تھی کہ اَشَدُّهُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰهِ کی اشدیت دین کے دوسرے شعبوں میں جیسے نمایاں ہے حدیث کا شعبہ بھی اس سے کیوں مستفید نہ ہوتا۔ عدل و انصاف، سیاست و حکومت اور ازیں قبیل دوسرے معاملات میں فاروقِ اعظم کے بے لاگ فیصلوں کا جیسے لوگ اب تک ذکر کرتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث کی تاریخ میں بھی حضرت عمر رضؓ کے رعب و داب کا وہی اثر ہے، ان کے بہت بعد یعنی تقریباً اس وقت جب دوسری صدی ہجری گزر رہی تھی مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہ کے حالات میں لکھا ہے کہ حدیث کے طلبہ ان کے حلقہ میں جب آتے تو ان کی طرف خطاب کرکے کہتے کہ

لَوْ اَدْرَكْنَا وَاِيَّاكُمْ عُمَرُ لَاَوْجَعَنَا ضَرْبًا (جامع ج ۲ ص ۱۳۰) اگر پا لیتے ہمیں اور تمہیں عمرؓ تو مار کر دکھ پہنچاتے۔

دراصل سفیان کا اشارہ اشدیت کے ان ہی واقعات کی طرف ہے جن کا روایتِ حدیث کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی طرف انتساب کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں بعض فاسد اغراض کے تحت اسی نوعیت کی فاروقی روایات کی کافی تشہیر کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ابوسلمہ راوی ہیں کہ میں نے ابوہریرۃؓ سے کہا کہ جس آزادی کے ساتھ آج کل آپ حدیثیں بیان کیا کرتے ہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی ایسا کرسکتے تھے۔ جواب میں ابوہریرہؓ نے جو بات کہی تھی یعنی

لَوْ كُنْتُ اُحَدِّثُ فِیْ زَمَانِ عُمَرَ مِثْلَ مَا اُحَدِّثُكُمْ لَضَرَبَنِیْ بِمِخْفَقَتِهٖ (الذہبی ج ۱ ص ۷)۔

اگر عمر کے زمانے میں اسی طرح میں حدیثیں بیان کرتا جیسے تم سے بیان کرتا ہوں تو اپنے کوڑے سے عمر مجھے مارتے۔

اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو صرف اندیشہ ظاہر کیا تھا سعید بن ابراہیم کے حوالہ سے الذہبی ہی نے یہ دوسری روایت درج کی ہے کہ ان کے والد ابراہیم کہتے تھے کہ

اِنَّ عُمَرَ حَبَسَ ثَلَاثَةً اِبْنَ مَسْعُوْدٍ وَاَبَا الدَّرْدَاءِ وَاَبَا مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیَّ فَقَالَ اِنَّكُمْ قَدْ اَكْثَرْتُمُ الْحَدِیْثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ (ص ۷)

حضرت عمرؓ نے تین آدمیوں کو روک[1] دیا تھا، ابن مسعود کو ابودرداء کو اور ابومسعود انصاری کو اور ان سے کہا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بہت زیادہ حدیثیں روایت کیا کرتے ہو۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اندیشہ واقعہ کی صورت بھی بعض لوگوں کے ساتھ اختیار کر چکا تھا، یہ اور اسی قسم کی بعض دوسری روایتوں کو درج کرکے حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

> "جن لوگوں کو واقعات کا صحیح علم نہیں تھا اور بدعات (نئی باتوں) کے پیدا کرنے کا جن میں زیادہ شوق پایا جاتا تھا سنت (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں) سے جن کے قلوب میں گرانیاں تھیں انھوں نے مذکورہ بالا روایتوں سے جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں، یہ نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کے دین سے حدیثوں کو بالکلیہ خارج کر دینا چاہتے تھے" (جامع ج ۲ ص ۱۲۱)

پھر اس غلط نتیجہ کی تردید میں حافظ نے ایک طویل بحث کی ہے اور آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو ان روایتوں کی صحت میں بھی شبہ ہے، ابن حزم نے بھی کتاب الاحکام میں حضرت عمرؓ کی طرف اس سلسلہ کی منسوبہ روایات کے راویوں پر جرح کرکے ان روایتوں کو مشتبہ و مشکوک قرار دیا ہے۔

---

[1] بعض لوگوں نے حبس کا ترجمہ قید بھی کیا ہے یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان تینوں صحابیوں کو قید کر دیا تھا۔

حضرت عمرؓ کی روایات کی تعداد

مگر میں کہتا ہوں اور پہلے بھی کہا ہے کہ باوجود روایت ہونے کے اعتماد کرنے والوں نے ان ہی روایتوں پر جب اعتماد کیا ہے تو انصاف کی بات یہی ہے کہ ان حدیثوں کو بھی چاہئے تھا کہ یہ لوگ نہ بھولتے جو روایات ہی والی کتابوں میں خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ جن روایتوں سے یہ گروہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے ان کے اسناد کو یعنی جن راویوں سے یہ روایتیں مروی ہیں اور حضرت عمرؓ سے جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن راویوں کے توسط سے مروی ہیں دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کی یہ حدیثیں عموماً صحاح ستہ بلکہ بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہیں اور جن روایتوں کو مخالفتِ حدیث میں یہ لوگ پیش کرتے ہیں کم از کم صحاح کی کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ ابن جوزی نے تلقیح میں ان حدیثوں کی تعداد جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں پانسو سینتیس (۵۳۷) بتائی ہے۔ فرض کیجئے کہ متون کے ساتھ طرق کو بھی اس میں شمار کر لیا گیا ہو لیکن ابونعیم اصفہانی کے اس بیان میں تو اس شبہ کی بھی گنجائش نہیں ہے ابونعیم حافظ کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

أَسْنَدَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمُتُوْنِ سِوَى الطُّرُقِ مِائَتَيْ حَدِيْثًا وَّنَيِّفًا۔ (تلقیح ص ۱۸۴)

یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو سو سے کچھ اوپر حدیثیں مروی ہیں اس تعداد میں صرف متون کو شمار کیا گیا ہے طرق کی کثرت کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔

مان لیجئے کہ دو سو حدیثیں سہی۔ خیال تو کیجئے کہ جس شخص کا مسلک یہ قرار دیا جاتا ہو کہ وہ دنیا سے حدیثوں کے قصے ہی کو ختم کر دینا چاہتا تھا، وہی کیا دو ایک نہیں دو دو سو حدیثوں کا خود راوی بن سکتا ہے؟

اور تعداد کا یہ قصہ تو محدثین کی خاص اصطلاح کی بنیاد پر ہے ورنہ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں فن حدیث کے بعض نکات کا ذکر کر کے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کرنے والوں میں حضرت عمرؓ کا شمار صحابہ کے اس طبقہ میں کرنا چاہئے جنھیں مکثرین کہتے ہیں،

نی جن کی حدیثوں کی تعداد ہزار یا ہزار سے بالا ہو۔ شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:۔

"پس ایں عزیزاںؓ از مکثرین باشند و شواہد ایں مقدمہ بسیار است لکن بسط مقال درآں باب فرصتے می طلبد" (ازالہ ج ۲ ص ۲۱۴)

یعنی ان بزرگوں کو چاہئے کہ طبقۂ مکثرین (ہزار یا ہزار سے بالا حدیثوں کی روایت کرنے والوں) میں ان کو شمار کیا جائے۔ اس دعوی کی تائید میں بہت سی شہادتیں پیش ہو سکتی ہیں مگر اس کی تفصیل کے لئے فرصت کی ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن روایتوں کو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کر کے یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ حدیثوں کی روایت کے قصے ہی کو ختم کر دینا چاہتے تھے قطع نظر ان کمزوریوں کے جو ان روایتوں کی سندوں میں پائی جاتی ہیں میں پوچھتا ہوں کہ ان کے مقابلہ میں صحاح کی ان حدیثوں کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے جن کی اتنی بڑی تعداد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے کتابوں میں ملتی ہیں اور یہ بحثیں تو اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب خواہ مخواہ یہ مان لیا جائے کہ حضرت عمرؓ کی طرف یہ روایتیں جو منسوب کی گئی ہیں ان کا مقصد وہی ہے جو حدیث کے مخالفین ان سے سمجھنا یا سمجھانا چاہتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ معمولی تامل سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ لوگوں کو روایتوں کے اکثار سے منع فرماتے تھے یعنی چاہتے تھے کہ کَمًّا وَ کَیْفًا حدیثوں کے بیان کرنے میں کثرت کی راہ لوگ نہ اختیار کریں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن صحابیوں کو آپ نے روکا تھا، ان پر الزام حضرت کا یہی تھا کہ تم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں اکثار کی راہ اختیار کی آپ کے الفاظ إِنَّكُمْ أَكْثَرْتُمُ الْحَدِيْثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بہ کثرت حدیثوں کی روایت کو وہ روکنا چاہتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا

لہ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں چند اور صحابیوں کو بھی شمار کیا ہے "عزیزاں" کے لفظ سے سب ہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں حضرت عمرؓ بھی شریک ہیں ۱۲

کہ ان کے کس لفظ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ سرے سے کلیۃً روایتِ حدیث کے رواج ہی کو وہ مسدود کرنا چاہتے تھے بلکہ اسی سلسلہ میں قرظہ بن کعب صحابی سے شعبی نے یہ قصہ جو نقل کیا ہے اور مخالفین حدیث اس کو بھی عموماً اپنے خیال کی تائید میں پیش کرنے کے عادی ہیں۔ یعنی شعبی کہتے تھے کہ حضرت قرظہ بن کعب نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ

خَرَجْنَا فَشَيَّعَنَا عُمَرُ إِلَى صِرَارٍ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ ثُمَّ قَالَ أَتَدْرُونَ لِمَ خَرَجْتُ مَعَكُمْ قُلْنَا أَرَدْتَ أَنْ تُشَيِّعَنَا وَتُكْرِمَنَا قَالَ إِنَّ مَعَ ذٰلِكَ لِحَاجَةٍ خَرَجْتُ إِنَّكُمْ تَأْتُونَ بَلْدَةً لِأَهْلِهَا دَوِيٌّ بِالْقُرْآنِ كَدَوِيِّ النَّحْلِ فَلَا تَصُدُّوهُمْ بِالْأَحَادِيثِ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَشْغَلُوهُمْ جَوِّدُوا الْقُرْآنَ وَأَقِلُّوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِمْضُوا وَأَنَا شَرِيكُكُمْ۔

(جامع ج ۲ ص ۱۲۰ و تذکرۃ الحفاظ)

ہم (مدینہ سے) نکلے تو میری مشائعت میں حضرت عمرؓ صرار نامی مقام تک آئے پھر آپ نے پانی طلب کیا اور وضو کیا، پھر فرمایا تم لوگوں نے سمجھا بھی کہ تمہارے ساتھ میں بھی (مدینہ سے نکل کر یہاں تک) کیوں آیا، میں نے عرض کیا ہم لوگوں کی مشائعت کے لئے آپ تشریف لائے اور ہماری عزت افزائی فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے تب کہا کہ اس کے سوا ایک اور ضرورت بھی تھی جس کے لئے میں مدینہ سے نکل کر تمہارے ساتھ یہاں تک آیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم ایک ایسے شہر میں پہنچو گے جس کے باشندوں میں قرآن کی تلاوت اس طرح گونجتی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے تو دیکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو بیان کر کر کے تم لوگ ان لوگوں کو (قرآن کی مشغولیت سے) روک نہ دینا قرآن کو استوار کرتے چلے جائیو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثوں کے بیان کرنے میں کمی کیجیو۔ اب جاؤ میں تمہارا ساتھی ہوں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان تین صحابیوں والی روایت میں حضرت عمرؓ نے حدیثوں کے اکثار کی جہاں شکایت کی وہیں قرظہ کی اس روایت میں اپنے منشاء کو ظاہر کرتے ہوئے قطعی طور پر حدیثوں

کی روایت سے لوگوں کو منع نہیں کیا۔ بلکہ فرمایا کہ

اَقِلُّوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثوں کے بیان کرنے میں کمی کیجیو۔

ممانعت تو خیر دور کی بات ہے، میں تو حضرت عمرؓ کے ان الفاظ کو روایتِ حدیث کا حکم سمجھتا ہوں، البتہ یہ حکم ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے، یعنی کثرت کی راہ نہ اختیار کی جائے ورنہ اقلال اور کمی کی شرط کی تکمیل کرتے ہوئے اپنے مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ حضرت عمرؓ حدیثوں کی روایت کا یقیناً حکم دے رہے ہیں، حافظ ابن عبدالبر نے بھی ان روایتوں کا تذکرہ کرکے یہی لکھا ہے کہ

هٰذَا يَدُلُّ عَلٰى نَهْيِهٖ عَنِ الْاِكْثَارِ وَاَمْرِهٖ بِالْاِقْلَالِ مِنَ الرِّوَايَةِ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (ص۱۲۲)

حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ روایت حدیث میں کثرت اور زیادتی کو وہ روکنا چاہتے تھے اور اس کا حکم دے رہے ہیں کہ روایت حدیث میں کمی کی راہ اختیار کی جائے۔

پھر آگے چل کر وہی لکھتے ہیں اور بالکل سچ لکھتے ہیں کہ

وَلَوْ كَرِهَ الرِّوَايَةَ وَذَمَّهَا لَنَهٰى عَنِ الْاِقْلَالِ وَالْاِكْثَارِ

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت مطلقاً ان کے نزدیک ناپسند ہوتی تو چاہئے تھا کہ روایتوں کے بیان کرنے میں کثرت وزیادتی اور قلت وکمی دونوں ہی سے لوگوں کو روک دیتے۔

حضرت عمرؓ کے کثرتِ روایات سے منع کرنے کا مقصود

باقی اکثار سے کیوں منع کرتے تھے؛ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی بات کے منسوب کرنے میں منسوب کرنے والوں پر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توقع احتیاط کے اسی طریقہ سے ممکن ہے، حافظ ابن عبدالبر نے بھی اسی توجیہ کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے:

کثرت روایت سے ممانعت اور قلت روایت کا حکم حضرت عمرؓ نے اسی لئے دیا تھا کہ کثرت کی

صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات کے منسوب ہوجانے کا زیادہ اندیشہ تھا۔

نیز اس کا بھی خوف تھا کہ جو حدیثیں لوگوں کو اچھی طرح محفوظ نہ ہوں اور پورا بھروسہ اپنی یاد پر نہ ہو اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے پر لوگ جری ہوجائیں گے۔

آخر میں اپنے اس بیان کو حافظ نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے۔

إِنَّ ضَبْطَ مَنْ قَلَّتْ رِوَايَتُهُ أَكْثَرُ مِنْ ضَبْطِ الْمُسْتَكْثِرِ وَهُوَ أَبْعَدُ مِنَ السَّهْوِ وَالْغَلَطِ الَّذِي لَا يُؤْمَنُ مَعَ الْإِكْثَارِ (جامع ج ۲ ص ۱۲۲)

روایت میں کمی اور قلت کی راہ اختیار کرنے والوں کے لئے ضبط و احتیاط کی توقع روایتوں میں کثرت کی راہ اختیار کرنے والوں سے بھی زیادہ ہے، نیز بھول چوک اور غلطی سے وہ محفوظ نہیں رہ سکتا جو روایت میں کثرت کی راہ اختیار کرے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقصد یہ قطعاً نہ تھا کہ کلیۃً لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کرنے سے روک دیا جائے بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان ہی حدیثوں کی حد تک لوگ اپنے بیان کو محدود رکھیں، جن کے متعلق پورا اطمینان ہو کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا یا سنا ہے وہی وہ بیان کر رہے ہیں، ایک خاص حدیث جس کا ذکر آگے آرہا ہے خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو بیان کرتے ہوئے لوگوں سے کہا تھا کہ

مَنْ وَعَاهَا وَعَقِلَهَا وَحَفِظَهَا فَلْيُحَدِّثْ بِهَا حَيْثُ تَنْتَهِي بِهِ رَاحِلَتُهُ وَمَنْ خَشِيَ أَنْ لَا يَعِيهَا فَإِنِّي لَا أُحِلُّ لَهُ أَنْ يُكَذِّبَ عَلَيَّ۔ (ص ۱۲۲)

جس نے اس حدیث کو اچھی طرح حافظہ میں جمالیا اور اس کو سمجھ لیا اور یاد کرلیا، چاہئے کہ وہی اس کو ان مقامات تک بیان کرتا چلا جائے، جہاں تک پہنچ کر اس کا اونٹ رک جائے مگر جسے اندیشہ ہے کہ حدیث کو دل میں پورے طور پر جما نہیں سکا ہے میں اس کے لئے کبھی اس کو جائز نہ قرار دوں گا کہ میری طرف جھوٹ کو وہ منسوب کرے۔

حافظ نے حضرت عمرؓ کے ان الفاظ کو جو صحاح ستہ بلکہ بخاری و مسلم میں بھی موجود ہیں۔ پیش کرتے ہوئے پوچھا ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کا وہی مسلک ہوتا، جسے مخالفین حدیث

ان کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں تو لوگوں کو اس حدیث کے بیان کرنے کا حکم کیوں دیتے بلکہ ان کے آخری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنی یاد پر پورا اطمینان اور بھروسہ نہ ہو صرف ان ہی کو روکنا یہی حضرت عمرؓ کا اصل مقصود ہے۔ حافظ کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

يَخْرُجُ مَعْنَاهَا عَلَى اَنَّ مَنْ شَكَّ فِيْ شَيْءٍ تَرَكَهٗ وَمَنْ حَفِظَ شَيْئًا وَاَتْقَنَهٗ جَازَلَهٗ اَنْ يُّحَدِّثَ بِهٖ وَاِنْ كَانَ الْاِكْثَارُ يَحْمِلُ الْاِنْسَانَ عَلَى التَّقَحُّمِ فِيْ اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ مِنْ جَيِّدٍ وَّرَدِيٍّ وَّغَثٍّ وَّسَمِيْنٍ۔ (ص ۱۲۳)

حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حدیث کے متعلق کسی قسم کا شک جو اپنے اندر رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اس حدیث کی روایت ترک کر دے اور جس نے حدیث کو یاد رکھا ہے اور اچھی طرح سے اس کو محفوظ کر لیا ہے اس کے لئے جائز ہے کہ لوگوں سے اسے بیان کرے، بہرحال اکثار یعنی روایت میں کثرت و زیادتی کے جس طریقہ کا حضرت عمرؓ انسداد کرنا چاہتے تھے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جن لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بھلی بری درست و نادرست جو بات بھی ان کے کان پڑی اسے بیان کرنے لگتے ہیں، وہی اس حکم کے مصداق ہیں اور ان ہی سے اس کا تعلق ہے۔

آخر دینی زندگی کی جوہری تعمیر خبر احاد کی ان حدیثوں پر جب موقوف نہیں ہے، اسی لئے ہر مسلمان تک ان کا پہنچانا یوں ہی غیر ضروری ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تبلیغ میں عمومیت کی راہ اسی لئے اختیار نہیں فرمائی ایسی صورت میں کھلی ہوئی بات ہے کہ جو کچھ بیان کر رہا ہے بیان کرنے والے کو جب اس پر پورا اطمینان بھی نہ ہو تو خواہ مخواہ ان کے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے بلکہ مسلمانوں پر جو ذمہ داریاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کرنے میں عائد کی گئی ہیں ان کا اقتضا یہی ہے کہ ایسی روایت سے آدمی دامن کش ہو کر گزر جائے۔ مشہور حدیث نبوی جس میں فرمایا گیا ہے کہ

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔	کسی شخص کے جھوٹ کے لئے یہ کافی ہے کہ جو کچھ سنے اسے بیان کرتا چلا جائے۔

اس میں جیسا کہ حافظ ابن عبد البر نے بھی لکھا ہے، احتیاط کے اسی طرزِ عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہی نقطۂ نظر تھا جس کا ذکر بعض صحابہ اس وقت کرتے تھے جب لوگ ان سے کہتے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کیوں نہیں بیان کرتے۔ بخاری میں حضرت عبد اللہ بن زبیر کے حوالہ سے یہ مکالمہ نقل کیا گیا ہے یعنی عبد اللہ بن زبیر کہتے تھے کہ میں نے اپنے والد زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے ایک دفعہ عرض کیا کہ آپ کو میں دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں بیان کرتے، جواب میں حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ

اَمَا اِنِّیْ لَمْ اُفَارِقْهُ مُنْذُ اَسْلَمْتُ وَلٰكِنِّیْ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ مَنْ كَذِبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔	واقعہ یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں کبھی جدا نہ ہوا لیکن میں نے ان ہی سے سنا ہے کہ قصداً مجھ پر جو جھوٹ باندھتا ہے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنالے۔

حالانکہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیثوں کی کافی تعداد مروی ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو پھر بھی حضرت سے کمی روایت کی شکایت تھی، ان ہی شکایتوں کو سن کر آپ فرماتے

اِنِّیْ لَيَمْنَعُنِیْ اَنْ اُحَدِّثَ حَدِيْثًا كَثِيْرًا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَعَمَّدَ عَلَیَّ الخ۔ (طبرانی)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو میں کثرت سے جو بیان نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مَنْ تَعَمَّدَ والی روایت مجھ کو اس سے روکتی ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ روایت کی کثرت میں حضرت انسؓ کو اس کا اندیشہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ بعض صحابی جب زیادہ معمر اور بوڑھے ہو گئے تھے لوگ ان سے عرض کرتے کہ رسول اللہ کی کچھ حدیثیں بیان کیجئے تو فرماتے

كَبِرْنَا وَنَسِيْنَا وَالْحَدِيْثُ عَنْهُ صَلَّى اللّٰهُ	ہم اب مسن ہو گئے، بھول گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَشَدِيْدٌ۔ (ابن ماجہ) طرف منسوب کرکے حدیث کا بیان کرنا بڑا سخت معاملہ ہے۔

قرظہ بن کعب جن کو کوفہ رخصت کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اقلالِ روایت کی وصیت کی تھی ان کے متعلق بھی لکھا ہے کہ جب وہ کوفہ پہنچے اور لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کچھ بیان کیجئے تو انھوں نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ

نَهَانَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ (جامع ج ۲ ص ۱۲۱) ہمیں عمر بن الخطاب نے اس سے منع کیا ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ قرظہ نے کہا کہ عمرؓ کی اس وصیت کے بعد

مَا حَدَّثْتُ بَعْدَهُ حَدِيْثًا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (جامع ج ۲ ص ۱۲۰) حضرت عمرؓ کی ممانعت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے میں نے کوئی حدیث نہیں بیان کی۔

حدیثوں کے باب میں احتیاط ہی کی روش تھی جس کی پابندی بعد کو لوگ کرتے رہے، امام مالکؒ کے متعلق ان کے شاگردِ رشید امام شافعی تو کلیہ ہی بیان کرتے تھے کہ

كَانَ مَالِكٌ اِذَا شَكَّ فِي الْحَدِيْثِ تَرَكَهُ كُلَّهُ۔ (الدیباج المذہب ص ۲۴) امام مالکؒ کو جب کسی حدیث میں شک پیدا ہوجاتا تو اس کو کلیۃً ترک کر دیتے (یعنی اس حدیث کو بیان ہی نہیں کرتے تھے)۔

لوگوں نے لکھا ہے کہ حضرت امام مالک کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان کے کمرے سے سات صندوق نکالے جن میں صرف ابن شہاب زہری کی حدیثوں کے مسودات بھرے ہوئے تھے، مسودوں کی حالت یہ تھی کہ

ظُهُوْرُهَا وَبُطُوْنُهَا مَلْأَى۔ یعنی ہر ورق کے دونوں صفحات بھرے ہوئے تھے۔

ان کو باہر نکال کر لائے اور امام مالک کے شاگردوں کے حوالہ کیا۔ لوگوں نے پڑھنا شروع کیا۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان کو معلوم ہوا کہ ان مسودوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے امام مالک نے ایک چیز بھی کسی کے سامنے ان سے بیان نہ کی تھی۔ ان ہی کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ

لَمَّا مَاتَ مَالِكٌ فَأُصِيبَ فِي بَيْتِهِ صَنَادِيقُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا لَيْسَ فِي الْمُوَطَّأِ مِنْهُ شَيْءٌ إِلَّا حَدِيثَيْنِ۔ (ص ۷)

جب امام مالک کی وفات ہوئی تو گھر میں چند صندوق پائے گئے جن میں عبداللہ بن عمرؓ کی روایتیں تھیں ایسی روایتیں جن میں سے ان کی کتاب موطا میں صرف دو حدیثیں پائی جاتی ہیں۔

امام مالک کی کتاب موطا کے متعلق لوگوں نے لکھا ہے کہ شروع میں دس ہزار حدیثوں پر یہ کتاب مشتمل تھی، لیکن ہر سال امام مالک اس پر نظر ثانی کرتے اور جس روایت میں معمولی شک بھی ہوتا اس کو کتاب سے ساقط کر دیتے۔ اس طریقہ سے بڑا حصہ روایتوں کا موطا سے خارج ہو گیا (دیباچ ص۲۵)۔ امام مالک خود بیان کرتے تھے کہ ابن شہاب زہری سے میں نے جتنی حدیثیں سنی ہیں ان میں ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس کا میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔

الخلیب نے امام بخاری کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ

تَرَكْتُ عَشَرَةَ آلَافِ حَدِيثٍ لِرَجُلٍ فِيهِ نَظَرٌ وَتَرَكْتُ مِثْلَهُ أَوْ أَكْثَرَ بِغَيْرِهِ فِيهِ نَظَرٌ۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۵)

کسی شخص (راوی) کی روایت کردہ دس ہزار حدیثوں کو میں نے اس لئے چھوڑ دیا کہ اس شخص میں کوئی بات محل غور و فکر نظر آئی تھی اور اسی قدر یا اس سے زیادہ مقدار والی حدیثوں کو میں نے اسی لئے ترک کر دیا کہ ان کے بیان کرنے والے میں بھی کوئی بات قابل غور نظر آئی۔

احتیاط کرنے والے اس سلسلہ میں کن حدود تک پہنچ گئے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے جس کا ذکر ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں کیا ہے۔ تیسری صدی ہجری کے ایک محدث ابن رستم ہیں جن کا نام احمد بن مہدی بن رستم تھا، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ

افْتَقَدَ مِنْ كُتُبِهِ كِتَابُ قَبِيصَةَ ثُمَّ رُدَّ عَلَيْهِ فَتَرَكَ قِرَاءَتَهُ۔ (ج ۲ ص ۱۰۱)

قبیصہ (تابعی) کی روایت کردہ حدیثوں کا مکتوبہ مجموعہ گم ہو گیا، بعد کو گم ہونے کے بعد وہی نسخہ ابن رستم کو مل گیا مگر اس لئے کہ درمیان میں یہ نسخہ غائب ہو گیا تھا اس کی مندرجہ روایتوں کا پڑھنا چھوڑ دیا۔

یعنی ان کو شبہ ہوا کہ جس زمانہ میں کتاب غائب رہی ممکن ہے اس میں کسی نے کچھ کمی و بیشی کردی ہو صرف اس شک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس حصہ کا پڑھنا ہی انھوں نے ترک کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ حدیثوں کی روایت میں احتیاط کی ان نزاکتوں کا احساس خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدا کرایا ہوا تھا، عرض کر چکا ہوں کہ من کذب علی متعمداً والی روایت قریب تواتر کے درجہ میں جو پہنچ گئی ہے اس کی وجہ وہی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً صحابہ میں روایتِ حدیث کی ذمہ داریوں کو مختلف طریقوں سے رائج کرانا چاہتے تھے، صحاح کی کتابوں میں تو مجھے یہ روایت نہیں ملی لیکن امام ابو جعفر طحاوی نے مشکل الآثار میں اپنی متصل سند کے ساتھ اس کو درج کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی مجلس میں ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایک حدیث بیان کی، مجلس میں حضرت مالک بن عبادہ صحابی بھی شریک تھے، آپ نے فرمایا کہ

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَہِدَ اِلَیْنَا فِیْ حَجَّۃِ الْوَدَاعِ فَقَالَ عَلَیْکُمْ بِالْقُرْاٰنِ وَاِنَّکُمْ سَتُرْجَعُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ یَّشْتَھُوْنَ الْحَدِیْثَ عَنِّیْ فَمَنْ عَقِلَ شَیْئًا فَلْیُحَدِّثْ بِہٖ وَمَنِ افْتَرٰی عَلَیَّ فَلْیَتَبَوَّأْ بَیْتًا اَوْمَقْعَدًا فِیْ جَھَنَّمَ (مشکل الآثار ج ۱ ص ۱۷۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع (آخری حج) میں ہم لوگوں کو اس عہد کا پابند بنا کر فرمایا کہ چاہئے کہ قرآن کو پکڑے رہو، قریب ہے کہ تم ایسے لوگوں کے پاس واپس کئے جاؤ گے جو چاہیں گے کہ میری حدیثیں ان سے بیان کرو پس اس سلسلہ میں جس کسی نے کسی بات کو سمجھ لیا ہے اور یاد کر لیا ہے اسے چاہئے کہ اس حدیث کو بیان کر دے (اور یاد رکھو) کہ قصداً میری طرف جو جھوٹ کو منسوب کرے گا اسے اپنا ٹھکانہ یا (فرمایا) کہ اپنا گھر چاہئے کہ جہنم میں بنالے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وداعی وصیت کے ان الفاظ میں اور حدیثوں کی روایت کرنے میں حضرت عمرؓ لوگوں پر جن الفاظ کے ساتھ تاکید فرماتے تھے، کچھ بھی فرق ہے اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی مبارک وصیت کی تجدید اپنے اپنے عہد

خلافت میں حضرت ابوبکرؓ بھی اور حضرت عمرؓ بھی فرماتے رہے، صحابہ کو بھی روایت حدیث کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی اور صحابہ کے بعد مسلمانوں کی جو جماعت حضرت عمرؓ کے سامنے آئی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے استفادے کا موقع تو کیا ملتا، ان میں بڑی تعداد ایسوں کی تھی جنھوں نے پیغمبر کو دیکھا بھی نہ تھا مگر حضرت عمرؓ کی دار و گیر کی غیر معمولی سختیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ جب بڑے بڑے صحابہ میں کامل اطمینان کے بغیر حدیثوں کی روایت کرنے کی ہمت باقی نہ رہی تھی تو دوسروں کے لئے جسارت کا موقع ہی کیا تھا، یہی وجہ تھی جو امیر معاویہؓ اپنی حکومت کے زمانہ میں لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ

عَلَيْكُمْ مِنَ الْحَدِيْثِ بِمَا كَانَ فِي عَهْدِ عُمَرَ فَإِنَّهُ قَدْ اَخَافَ النَّاسَ فِي الْحَدِيْثِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (تذکرۃ الحفاظ)

لوگو ان ہی حدیثوں کو قبول کرو، جو عمرؓ کے زمانے کی ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثوں کے بیان کرنے پر عمرؓ نے لوگوں کو ڈرایا اور دھمکایا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اکثار یعنی بکثرت حدیثوں کی روایت سے ممانعت کی صرف یہ توجیہ کہ زیادہ روایت کرنے والوں سے احتیاط کی توقع جیسی کہ چاہئے نہیں کی جا سکتی۔ عام حالات میں تو یہ صحیح ہے مگر مجھ ہی سے آپ سن چکے ہیں کہ صحابہ میں بھی اور صحابہ کے بعد بھی محدثین میں ایک طبقہ ان لوگوں کا پایا جاتا تھا جن کی یادداشت اور حافظہ کی قوت کا تجربہ کیا گیا۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ دو تین نہیں بلکہ سیکڑوں حدیثیں ان بزرگوں کو اس طریقہ سے یاد تھیں کہ سال سال بھر کے بعد ان سے دوبارہ پھر وہی حدیثیں پوچھ کر لکھی گئیں اور پہلے لکھائے ہوئے مسودے سے ان کا مقابلہ کیا گیا تو ایک حرف کی کمی بیشی نہیں پائی گئی۔ آخر جن لوگوں کو اپنی روایتوں پر اتنا اعتماد ہو جیسا کہ ابوزرعہ کے حال میں گزر چکا کہ قسم کھانے والے نے یہ قسم کھائی کہ ابوزرعہ کو ایک لاکھ حدیثیں اگر زبانی یاد نہ ہوں تو میری بیوی کو طلاق پڑ جائے پھر ان سے دریافت کرنے آیا۔ جواب میں ابوزرعہ نے کہا تھا کہ اطمینان سے تو اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اطمینان کی کیفیت اور کیا ہو سکتی ہے۔

میں یہی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی روایتوں کے متعلق جن کے اطمینان کی یہ حالت ہو آخران کو کثرتِ روایت سے روکنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ یاد رکھنے والوں کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی روایت کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔ حضرت عمرؓ بھی لوگوں سے یہی کہتے تھے کہ جن لوگوں نے میری باتوں کو یاد رکھا ہے، چاہیئے کہ وہ ان کو دوسروں تک پہنچائیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے حضرت عمرؓ ہی کے حوالہ سے ان کا ایک قول حدیثوں کی روایت کے متعلق نقل کیا ہے، یعنی قیس بن عباد کہتے تھے:

سَمِعْتُ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ يَقُوْلُ مَنْ سَمِعَ حَدِيْثًا فَاَدَّاهُ كَمَا سَمِعَ فَقَدْ سَلِمَ	میں نے عمر بن الخطابؓ سے سنا کہ جس نے حدیث سنی اور جو کچھ سنا تھا اسی کو اس نے ادا کر دیا تو وہ محفوظ ہو گیا (یعنی روایت کی ذمہ داریوں کو اس نے پورا کر دیا)۔
(جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۳)	

ظاہر ہے کہ حضرت کے یہ الفاظ عام ہیں، ان لوگوں کو بھی شامل ہیں جن کی روایتوں کی تعداد قلیل ہو، اوران کو بھی جن کی روایتوں کی تعداد کثیر ہو، شرط صرف یہ رکھی گئی ہے کہ جو کچھ اس نے سنا ہو اسی کو اگر وہ بیان کر رہا ہے تو اپنی ذمہ داری اس نے پوری کر دی۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے متعلق جیسا کہ حافظ ابن عبدالبر نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّنْ يُنْظَرُ اِلَيْهِ وَيُؤْخَذُ عَنْهُ (جامع ج ۲ ص ۴۴)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ان لوگوں میں ہیں جن کی طرف دیکھا جاتا ہے اوران سے (دین) کو اخذ کیا جاتا ہے۔

اگر یہ ان ہی کا بیان ہے اور نہ ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں، رسول اللہ کے اصحاب کے متعلق جس کا یہ خیال ہو اوران ہی صحابۂ کرامؓ کی باتوں کو مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں جو اہمیت حاصل ہو سکتی تھی اس کا اظہار بار بار مختلف مواقع میں جو بایں الفاظ کرتا ہو کہ

اَنْتُمْ مَعَاشِرُ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَتٰى مَا تَخْتَلِفُوْنَ	تم لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو، جب تم ہی لوگ اس میں اختلاف کرو گے تو جو تمہارے بعد آنے والے

يَخْتَلِفُ مَنْ بَعْدَكُمْ۔ (ازالۃ الخفاج ۲ص ۹۸) ہیں وہ بھی باہم مختلف ہوجائیں گے۔

جوان ہی صحابیوں کو خطاب کر کرکے یہ پیش گوئی کرتا ہو کہ

أَنْتُمْ أَصْحَابُ بَدْرٍ وَقَدِ اخْتَلَفْتُمْ فَمَنْ بَعْدَكُمْ أَشَدُّ اخْتِلَافًا۔ (ازالۃ الخفاج ۲ ص ۸۸)

تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابیوں میں ہو جو بدر میں شریک تھے تم ہی جب اختلاف کر رہے ہو تو تمہارے بعد جو ہوں گے وہ زیادہ اختلاف کریں گے۔

کیا اسی فاروقی بصیرت سے یہ امر مخفی رہ سکتا تھا کہ ان ہی صحابیوں میں خبر آحاد کی حدیثیں عام طور پر مشہور و معروف ہو کر عمومیت کا رنگ جب اختیار کرلیں گی تو آئندہ نسلوں میں یہی رنگ کتنا پختہ اور گہرا ہوتا چلا جائے گا اور دین کے اس حصہ کی تبلیغ میں خاص روش پیغمبر نے قصداً جس مصلحت سے اختیار کی تھی اس مصلحت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

کچھ بھی ہو میرا خیال تو یہی ہے کہ منجملہ دیگر مصالح و وجوہ کے اقلالِ روایات پر حضرت عمرؓ کے اصرار کا ایک راز یہ بھی تھا، ازالۃ الخفا میں شاہ ولی اللہ نے قرظہ والی روایت جس میں أَقِلُّوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (روایتیں رسول اللہؐ سے کم بیان کرنا) کی وصیت کو فرخصت کرتے ہوئے صحابہ کی ایک جماعت کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی تھی، اسی روایت کو الدارمی کی کتاب سے نقل کرنے کے بعد شاہ صاحب نے دارمی ہی کا ایک تشریحی فقرہ جو اس حدیث کے آخر میں انھوں نے لکھا تھا یہ بھی درج کیا ہے:

قَالَ أَبُو مُحَمَّدٍ (هُوَ الدَّارِمِيُّ) مَعْنَاهُ عِنْدِي الْحَدِيثُ عَنْ أَيَّامِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ السُّنَنَ وَالْفَرَائِضَ۔ (ص ۱۴۱)

ابو محمد (یعنی دارمی) نے کہا کہ میرے خیال میں حضرت عمرؓ کے اس قول کا (یعنی اقلالِ روایت پر اصرار) کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام کی حیثیت سنن اور فرائض کی نہیں۔

الدارمی کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟ افسوس ہے کہ اس کی تفصیل کا صحیح مقام "تدوین فقہ" والی کتاب ہو سکتی ہے، تاہم مختصراً یہاں بھی اتنا اشارہ نامناسب نہیں ہوگا کہ "البینات"، میں نے دین کے جن عناصر و حقائق کا نام رکھا ہے اس کی تعریف تو پہلے کر چکا ہوں لیکن مصداقاً

قرآنی مطالبات اوران کے عملی تشکیلات ان کے اہم اجزا ہیں مثلاً اقیموا الصلوٰۃ میں الصلوٰۃ کا مطالبہ قرآن میں کیا گیا ہے لیکن الصلوٰۃ کی عملی شکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی، میرے نزدیک الدارمی کے مذکورہ بالا الفاظ میں فرائض سے قرآنی مطالبات اور سنن سے ان ہی فرائض کی عملی شکلیں مقصود ہیں۔ کچھ یہی نہیں بلکہ عام طور پر حدیثوں میں فرائض کے بعد سنن کا لفظ جہاں جہاں آیا ہے میں تو اس کا مطلب یہی سمجھتا ہوں، مثلاً حضرت ابو موسیٰؓ جب کوفہ کے والی حضرت عمرؓ کی طرف سے مقرر ہو کر آئے تو اس وقت آپ نے تقریر کرتے ہوئے یہ جو کوفہ والوں سے فرمایا تھا کہ

بَعَثَنِیْ اِلَیْکُمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اُعَلِّمُکُمْ کِتَابَ رَبِّکُمْ وَسُنَّۃَ نَبِیِّکُمْ۔	مجھے تم لوگوں کے پاس عمر بن الخطابؓ نے اس لئے بھیجا ہے کہ تمہارے رب کی کتاب (قرآن) تمہیں سکھاؤں اور تمہارے رسول کی سنت کی تعلیم تمہیں دوں۔
(ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۱۵)	

تو کتاب کے بعد سنت کا جو لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے وہ کتابی اور قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات ہی کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس میں ایک شخص نے جب یہ مطالبہ پیش کیا کہ

لَا تُحَدِّثُوْنَا اِلَّا بِالْقُرْاٰنِ۔	قرآن کے سوا ہمارے سامنے اور کچھ نہ بیان کرو۔

تو یہی "سنن" تھے جن کو پیش کرتے ہوئے آپ نے سمجھایا تھا کہ ان "سنن" یا عملی طریقوں کے بغیر قرآنی احکام کی تعمیل کی صورت ہی کیا ہو سکتی ہے، روایت میں ہے کہ جس شخص نے کہا تھا کہ قرآن کے سوا اور کسی چیز کا تذکرہ نہ کیا جائے، حضرت عمرانؓ نے اس سے کہا کہ میاں! ذرا میرے قریب آجاؤ۔ جب وہ آپ کے پاس آگیا تو آپ نے اس کو سمجھانا شروع کیا، پہلے آپ نے الصلوٰۃ ہی کو لیا جس کا بار بار قرآن میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے، پوچھنا شروع کیا:

اَرَاَیْتَ لَوْ وُکِّلْتَ اَنْتَ وَاَصْحَابُکَ اِلَی الْقُرْاٰنِ اَکُنْتَ تَجِدُ فِیْہِ صَلٰوۃَ الظُّھْرِ	تم سمجھتے ہو کہ تم اور جو تمہارے ہم نوا ہیں صرف قرآن ہی پر ٹیک لگالیں گے، تو کیا قرآن میں پا سکتے ہو کہ ظہر

اَرْبَعًا وَصَلٰوۃَ الْعَصْرِ اَرْبَعًا وَالْمَغْرِبَ ثَلَاثًا۔ — کی نماز چار رکعتوں پر اور عصر کی بھی چار اور مغرب کی نماز تین رکعتوں پر مشتمل ہے۔

پھر آپ نے تمثیلاً حج کا ذکر کیا اور فرمانے لگے:

اَرَاَیْتَ لَوْ وَکَلْتَ اَنْتَ وَاَصْحَابُکَ اِلَی الْقُرْاٰنِ اَکُنْتَ تَجِدُ الطَّوَافَ بِالْبَیْتِ سَبْعًا وَالطَّوَافَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَۃِ۔ — تم سمجھتے ہو کہ تم اور جو تمہارے ہم نوا رفقاء ہیں صرف قرآن ہی پر ٹیک لگالیں گے تو تم قرآن میں پاسکتے ہو کہ بیت اللہ (کعبہ) کا طواف سات دفعہ کرنا چاہئے اور صفا و مروہ کا طواف بھی سات دفعہ کرنا چاہئے۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے حج کے متعلق یہ بھی پوچھا تھا کہ

وَالْمَوْقِفَ بِعَرَفَۃَ وَرَمْیَ الْجِمَارِ۔ — عرفات میں وقوف (قیام) اور رمی جمار کے مسئلہ کو کیا قرآن میں تفصیلاً پاسکتے ہو۔

یا چور کے ہاتھ کاٹنے کا قرآن میں اسلامی حکمرانوں کو جو ذمہ دار بنایا گیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ

وَالْیَدَ مِنْ اَیْنَ تُقْطَعُ اَمِنْ ھٰھُنَا اَوْ مِنْ ھٰھُنَا۔ — اور ہاتھ کس طریقہ سے کاٹا جائے، کہاں سے، یہاں سے یا وہاں سے؟

راوی کا بیان ہے کہ پہلے آپ نے گٹے پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ یہاں سے پھر کہنی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ کیا یہاں سے؟ پھر کندھے کے قریب ہاتھ لے گئے اور پوچھا کہ کیا یہاں سے[1]؟

بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس وقت اس مسئلے کے تفصیلات میرے پیش نظر نہیں ہیں، تفصیلات کے لئے کتاب "تدوین فقہ" کا مطالعہ کیجئے۔ یہاں مجھے الدارمی کے ان الفاظ کی شرح مقصود ہے جن کا حضرت عمرؓ والی روایت کے اندراج کے بعد انہوں نے اضافہ کیا ہے یعنی "فرائض اور سنن" کے متعلق اقلال کا یہ حکم حضرت عمرؓ نے نہیں دیا تھا بلکہ "اَلْحَدِیْث عَنْ اَیَّامِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ" سے آپ کے اس حکم کا تعلق ہے، یہ بتانا چاہتا تھا کہ ایسے موقعوں پر "سنن" کا

---

[1] الکفایہ خطیب ج ۱۲ ص ۱۶۔

لفظ "فرائض" کے بعد جب بولا جاتا ہے تو مراد ان سے قرآنی فرائض و مطالبات کی عملی شکلیں ہوتی ہیں اور یہی وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کی اشاعت میں تو عمومیت ہی مقصود ہے پھر ان کے متعلق "اقلال" کا حکم حضرت عمرؓ کیسے دے سکتے تھے۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو واقعات پیش آئے یا آپ کے سامنے کرنے والے جو کچھ کرتے تھے یا ان ہی دنوں میں بجائے عام امت کے خاص خاص افراد سے جو باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں یا خاص لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ کرتے دیکھا تھا، الغرض عہد نبوت کی وہی چیزیں جن کی عمومی اشاعت پیغمبر کی طرف سے نہیں کی گئی تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے ایام کا جو لفظ دارمی نے استعمال کیا ہے اس کا یہی مطلب ہے جیسا کہ میں یہی کہتا چلا آرہا ہوں۔ امام بخاری نے بھی اس قسم کی حدیثوں کی تعبیر قریب قریب ان ہی الفاظ سے کی ہے انہوں نے بھی اپنی مرتبہ کتاب صحیح بخاری کا یہ نام جو رکھا ہے یعنی

"اَلْجَامِعُ الْمُسْنَدُ الصَّحِيْحُ الْمُخْتَصَرُ مِنْ اُمُوْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَيَّامِهٖ"

پہلے بھی اس کا تذکرہ کہیں کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ "امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ایامہ" یہ ان ہی حدیثوں کی تو تعبیر ہے جنہیں اپنی کتاب میں امام نے جمع کیا ہے۔ الدارمی اور بخاری میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایام کے ساتھ "امور" کا اضافہ بھی امام بخاری نے کیا ہے اور الدارمی نے صرف "ایام" کے عام اور حاوی لفظ کو کافی خیال کیا بظاہر یہ ایک قسم کی اصطلاح معلوم ہوتی ہے، گویا "خبر آحاد" کی ایک تعبیر یہ بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہے وہی بات یعنی دین کا بیّناتی حصہ غیر بیناتی چیزوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے دونوں میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے جو یہ طریقہ فرمایا تھا کہ ایک کی تبلیغ و اشاعت میں عمومیت کا رنگ جس حد تک پیدا ہو سکتا تھا اس کے پیدا کرنے پورا زور صرف کر دیا گیا اور گو پہنچانے کی حد تک پہنچا تو دیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے شعبے کو بھی لیکن اس کو ہر شخص تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اپنے زمانے میں اس امتیاز کے باقی رکھنے پر زور دیا اور یہی غرض حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان

تدبیروں سے تھی، جن کا انتساب روایتوں میں ان کی طرف کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی ازالۃ الخفا میں حدیثوں کے متعلق حضرت عمرؓ کے خدمات کی تفصیل کرتے ہوئے منجملہ دوسرے مصالح کے ان روایات کا ایک مطلب یہ بھی قرار دیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

باستقرا تام معلوم شد کہ فاروق اعظمؓ نظر دقیق در تفریق میان احادیث کہ بہ تبلیغ شرائع و تکمیل افراد بشر تعلق دارد واز غیر آں مصروف می ساخت۔ (ص ۱۴۱)

اچھی طرح چھان بین تلاش و تفتیش سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فاروق اعظمؓ کی دقیق نظر حدیث کے دونوں حصوں میں امتیاز پیدا کرنے پر جمی رہی یعنی وہ حصہ جس سے شرائع کی تبلیغ اور انسانی افراد کی تکمیل سے تعلق تھا اس میں مشغول رکھ کر دوسرے حصہ میں انہماک سے لوگوں کو روکتے تھے۔

"تبلیغ شرائع و تکمیل افراد بشر" کے الفاظ سے جیسا کہ ظاہر ہے قرآنی مطالبات کی عملی تشکیلات ہی کا تعلق ہے گویا الدارمی نے "سنن" کے لفظ سے جس مقصد کو ادا کیا تھا، شاہ صاحب نے زیادہ واضح الفاظ میں ان ہی کی تعبیر کی ہے۔ اس کے بعد ارقام فرماتے ہیں کہ

لہذا احادیث شمائل و احادیث سنن زوائد در لباس و عادات کمتر روایت می کرد۔ (ازالۃ الخفا، ج ۲ ص ۱۴۱)

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل شکل و صورت سے جن حدیثوں کا تعلق تھا اور سنن زوائد (یعنی قرآنی مطالبات کی عملی تشکیلات کے سوا) حدیثیں، جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس و عادات سے تعلق ہے حضرت عمرؓ اس قسم کی حدیثوں کو کم بیان کرتے تھے۔

+

ان روایتوں کو حضرت عمرؓ خود بھی کم بیان کرتے تھے اور دوسروں کو بھی حکم دیتے تھے کہ ان کا زیادہ چرچا نہ کریں یعنی اقلال روایت کی توجیہ کرتے ہوئے شاہ صاحب نے بھی لکھا ہے کہ

اینہا از علوم تکلیفیہ تشریعیہ نیست محتمل کہ چون اہتمام تام بروایت آں بکار برند بعض اشیاء از سنن زوائد بہ سنن ہدی

چونکہ ان حدیثوں کا شمار ان علوم میں نہیں ہے جن کا مکلف لوگوں کو بنایا گیا ہے اور عام تشریع و قانون کی حیثیت ان کی نہیں ہے اس لئے اس کا احتمال تھا کہ اگر زیادہ توجہ

مشتبہ گردد۔ ان کے بیان اور اشاعت کی طرف کی جائے گی تو سنن زوائد اور سنن ہدیٰ باہم ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ غلط ملط ہو جائیں گے۔ (ص ۵)

دارمی یا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ان اقوال کے پیش کرنے سے میری غرض یہی ہے کہ "اقلال روایت" کی جو وجہ میں نے بیان کی ہے یہ میرا کوئی انفرادی خیال نہیں ہے بلکہ ارباب تحقیق نے دوسرے مصالح ووجوہ کے ساتھ مختلف الفاظ میں مجھ سے پہلے بھی اس کو بیان کیا ہے۔

کچھ بھی ہو خبر آحاد والی روایتوں کے متعلقہ خدمات میں سے ایک خدمت جو یہ تھی یعنی عمومیت کی ایسی کیفیت ان میں نہ پیدا ہونے پائے جس کی وجہ سے دین کے بنیادی حصہ کے مطالبوں کی جو قوت ہے کہیں اسی قوت کو لوگ اس میں محسوس نہ کرنے لگیں جیسے عہد نبوت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نگرانی فرمائی اور گو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وقت ہی کیا ملا، لیکن جتنا وقت بھی ملا، جہاں دوسرے فرائض آپ نے ادا کئے وہیں اس کی طرف بھی آپ نے خاص توجہ مبذول رکھی پھر جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو اپنے عہد خلافت کے ابتدائی سالوں میں ہم ان کو بھی اس مسئلہ کی طرف متوجہ پاتے ہیں، بعد کو کچھ واقعات پیش آئے جن کا ذکر آئندہ آرہا ہے لیکن اس سے پہلے ان ہی حدیثوں کی وجہ سے قدرتاً معلومات میں لوگوں کے اختلاف کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اختلاف کو اختیاری وارادی مخالفت کے قالب میں ڈھلنے سے جیسے روکا تھا میں چاہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سلسلے میں جو کاروائیاں کی ہیں پہلے ان کا تذکرہ کراوں۔

اس قسم کے مسائل میں بعض چیزوں کے متعلق تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسی روایتیں نقل کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کے دونوں پہلوؤں کے جواز اور تصحیح کی آپ نے کوشش کی ہے۔ مثلاً نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے بسم اللہ بلند آواز سے پڑھی جائے یا آہستہ، یا رکوع سے نماز میں سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ بھی اٹھائے جائیں یعنی وہی رفع الیدین کا مشہور خلافیہ یا اور اسی قسم کے متعدد مسائل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دونوں طرح کی روایتیں کتابوں

میں ملتی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفاء میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ان مختلف روایات کو درج کرنے کے بعد یہی رائے قائم کی ہے کہ حضرت عمرؓ دونوں پہلوؤں کے جواز کے قائل تھے مثلاً رفع الیدین کے اختلافی روایات کے ذکر کے بعد ارقام فرماتے ہیں:

وَالْأَوْجَهُ عِنْدِي أَنَّ عُمَرَ رَأَى رَفْعَ الْيَدَيْنِ عِنْدَ الرُّكُوعِ وَالْقَوْمَةِ مِنْهُ مُسْتَحَبًّا فَكَانَ يَفْعَلُ تَارَةً وَيَتْرُكُ أُخْرَى - (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۹۲)

میرے نزدیک سب سے زیادہ لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ رکوع میں جانے اور سر اٹھانے کے وقت ہاتھ اٹھانے (یعنی رفع الیدین) کو مستحب خیال کرتے تھے اسی لئے کبھی کرتے تھے اور کبھی چھوڑ دیتے تھے۔

یہی بات کہ مسئلہ کے دونوں اختلافی پہلو کو حضرت عمرؓ جائز سمجھتے تھے بسم اللہ کے بآواز و بلند و پست کے قصے میں درج کرنے کے بعد شاہ صاحب نے بھی اسی واقعہ کو یاد دلایا ہے جس کا تفصیلی ذکر میں پہلے کر چکا ہوں یعنی قرآنی الفاظ میں قرارت اور تلفظ کے اختلافات کے ہر پہلو کو جائز اور کافی ٹھہراتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام میں اختلافات کے برداشت کرنے کی جو گنجائش پیدا کی تھی، اسی واقعہ کا ذکر شاہ صاحب نے بھی کیا ہے بسم اللہ والے اختلافی روایات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

اَلْأَوْجَهُ عِنْدِي أَنَّ عُمَرَ تَعَلَّمَ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قِصَّةٍ مَعَ هِشَامِ بْنِ حَكِيمٍ أَنَّ الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ كُلُّهَا كَافٍ شَافٍ (ص ۹۲)

میرے خیال میں لگتی ہوئی بات یہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس قصے میں جو ہشام بن حکیم کے ساتھ پیش آیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سیکھی تھی کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے سب ٹھیک اور شفا بخش ہے۔

اس کے بعد پھر بسم اللہ کے متعلق حضرت عمرؓ سے نقل کرنے والوں نے مختلف روایتیں جو نقل کی ہیں سب ہی کی شاہ صاحب نے تصحیح کی ہے اور قرار دیا ہے کہ ان تمام پہلوؤں کو حضرت عمرؓ جائز سمجھتے تھے اسی لئے کبھی یہ کرتے تھے کبھی وہ کرتے تھے بلکہ اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے ایک اور واقعہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے عجیب بات لکھی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ صرف قرارتوں کے

اختلافات ہی کی حد تک نہیں بلکہ قرآنی عبارت کے مطالب کے سمجھنے میں بھی دو مختلف نقاط نظر کی تصحیح کی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخی نظیر چھوڑی ہے یہ مسئلہ کافی دلچسپ مگر ذرا تفصیل طلب ہے خلاصہ یہ ہے کہ پانی کے نہ ملنے کی صورت میں بجائے وضو کے تیمم کر کے نماز پڑھ لینی چاہئے، یہ تو خیر اتفاقی مسئلہ ہے لیکن بجائے وضو کے اگر کسی کو غسل کی حاجت ہو یعنی ناپاک اور جُنب ہونے کے بعد کو نہانا چاہے اور پانی وقت پر نہ ملے تو بجائے غسل کے تیمم ہی کر کے کیا نماز پڑھ سکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اب تو سارے ائمہ اجتہاد کی طرف سے اس کا جواب اثبات ہی میں دیا جاتا ہے یعنی طے کر دیا گیا ہے کہ تیمم جیسے وضو کا قائم مقام بن سکتا ہے اسی طرح غسل کی قائم مقامی کا کام بھی ضرورت کے وقت تیمم سے لیا جا سکتا ہے۔

لیکن تیمم کے مسئلہ کی جو تاریخ ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابتداء اسلام میں بعض لوگ تیمم کو صرف وضو ہی کا قائم مقام سمجھتے تھے اور غسل کے مسئلہ میں ان کا خیال تھا کہ

لَا يَتَيَمَّمُ الْجُنُبُ وَاِنْ لَّمْ يَجِدِ الْمَاءَ شَهْرًا۔ (بحوالہ ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۸۹) — جنب (یعنی ناپاک آدمی) تیمم نہ کرے خواہ مہینہ بھر ہی اسے پانی نہ ملے۔

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن مسعودؓ کا یہی خیال تھا، ان دونوں حضرات کے اس خیال کی بنیاد تھی، اس وقت اس کی تفصیل میرے پیش نظر نہیں ہے بلکہ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں اس موقعہ پر جو ایک عجیب و غریب نکتہ درج کیا ہے صرف اس کا ذکر مقصود ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس مسئلہ میں یعنی تیمم غسل جنابت کا قائم مقام ہو سکتا ہے یا نہیں اس میں ابتداءً اختلاف ایک سفر کے موقعہ پر حضرت عمر اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان میں پیش آیا، حاشیہ[1] میں جس کا ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] قصہ یہ ہے کہ ایک دن کوفہ میں ابو موسیٰ اشعری صحابیؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ سے یہی مسئلہ پوچھا کہ بجائے غسل کے ناپاک آدمی کیا بضرورت تیمم نہیں کر سکتا اس پر عبداللہ نے کہا کہ ہاں نہیں کر سکتا، خواہ پانی ایک مہینے تک نہ ملے۔ تب ابو موسیٰ نے قرآن کی آیت سورۂ مائدہ والی تلاوت کی جس میں دوسری باتوں کے ساتھ (باقی بر صفحہ آئندہ)

سفر سے واپس ہونے کے بعد مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا، ہر ایک نے اپنا خیال اور خیال کی جو بنیاد تھی بارگاہِ نبوت میں اسے عرض کیا۔ روایت کو لوگوں نے جس طریقہ سے بیان کیا ہے جس کی حاشیہ میں تفصیل کی گئی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمارؓ ہی کے خیال کی تائید کی، صرف غسل والے تیمّم کے متعلق ان کا جو یہ خیال تھا کہ گرد میں لوٹ پوٹ کر پورے جسم پر گرد کا اثر پہنچانا چاہئے، صرف اس خیال کی ترمیم کردی گئی اور سمجھا دیا گیا کہ وضوٗ والے تیمّم کی شکل غسل کے تیمّم کے لئے بھی کافی ہے۔ بظاہر چاہئے تو یہی تھا کہ اس فیصلہ کے بعد حضرت عمرؓ اپنے خیال سے ہٹ کر عمارؓ کے خیال کو مان لیتے لیکن حاشیہ والی روایت میں ابن مسعودؓ نے جو یہ کہا کہ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) یہ بھی ہے کہ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (یعنی لگوتم عورتوں کو) فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً (پھر نہ پاؤ تم پانی) فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (تم تیمم کرلو پاک مٹی کے ساتھ) جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ہم بستری میں ناپاک ہونے کے بعد پانی اگر کسی کو نہ ملے تو تیمم کرلے۔ ابن مسعودؓ بجائے اس بات کے کہ آیت کا جواب دیتے، کہنے لگے کہ اگر اس کی اجازت دے دی جائے گی تو معمولی سردی اور ٹھنڈک میں بھی لوگ بجائے غسل کے تیمم سے کام چلانے لگیں گے۔ ابو موسیٰؓ نے کہا کہ اچھا تو تم لوگ تیمم کو جو ناپسند کرتے ہو اس کی وجہ یہ ہے؟ ابن مسعودؓ نے کہا کہ ہاں! تب حضرت ابو موسیٰؓ نے ابن مسعودؓ کو حضرت عمرؓ اور حضرت عمارؓ کے سفر کا واقعہ یاد دلایا جس میں عمرؓ اور عمارؓ میں اسی مسئلہ پر اختلاف ہوا تھا۔ عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیال تھا کہ بجائے غسل کے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کرکے نماز پڑھنی چاہئے مگر عمارؓ کو وضوٗ والا تیمم تو معلوم تھا لیکن غسل کی جگہ تیمم کرنے کی شکل کیا ہونی چاہئے اس کا علم ان کو نہ تھا۔ قیاس کرکے انہوں نے زمین میں لوٹ لگائی، گویا بجائے پانی کے خاک دھول سے انہوں نے غسل کیا۔ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، قصہ جو پیش آیا تھا دہرا دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارؓ سے کہا کہ زمین لوٹ لگانے کی ضرورت نہ تھی صرف یہ کافی تھا یعنی اشارہ کرکے آپ نے بتایا کہ وضوٗ والا تیمّم جیسے کیا جاتا ہے بس یہی غسل کے لئے بھی کافی تھا۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل سے عمارؓ ہی کے خیال کی توثیق ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ کا خیال اگر صحیح ہوتا تو چاہئے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمارؓ سے کہتے کہ تم نے جو تیمم کیا وہی غلط تھا۔ ابو موسیٰؓ نے ابن مسعودؓ کو یہی یاد دلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عمارؓ کے خیال کی توثیق کی تو غسل کا قائم مقام تیمم نہیں ہوسکتا اس خیال کی گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے۔ ابن مسعودؓ نے ابو موسیٰؓ کے اس بیان کو سن کر کہا کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ عُمَرَ لَمْ يَقْنَعْ بِقَوْلِ عَمَّارٍ (تم نے نہیں دیکھا کہ عمارؓ کے قول پر حضرت عمرؓ کو اطمینان نہ ہوا) ۱۲۰

أَلَمْ تَرَ أَنَّ عُمَرَ لَمْ يَقْنَعْ بِقَوْلِ عَمَّارٍ — تم نے نہیں دیکھا کہ عمارؓ کے قول پر حضرت عمرؓ کو اطمینان نہ ہوا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں اس فیصلہ کے صادر ہونے کے بعد بھی حضرت عمرؓ اپنے خیال ہی پر قائم رہے اور حضرت عمرؓ ہی نہیں بلکہ ابن مسعودؓ جو عمارؓ والے واقعہ سے واقف تھے انہوں نے بھی حضرت عمرؓ ہی کے خیال کا اعادہ ابو موسیٰؓ کے سوال پر کیا۔ ظاہر ہے کہ مسئلہ میں سخت پیچیدگی اس سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بھلا یہ کون مان سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے بعد بھی حضرت عمرؓ کا اپنے خیال پر اصرار باقی رہا۔ لیکن واقعہ بیان کرنے والے جس شکل میں بیان کرتے ہیں اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے سامنے یہی دشواری جو روایت کے الفاظ سے پیدا ہوتی ہے آئی، اسی دشواری کا حل ان کی سمجھ میں جو آیا ہے وہ یہ ہے، فرماتے ہیں کہ

وَتَتَبَّعْتُ أَنَا فَوَجَدْتُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَآهُمْ اخْتَلَفُوا فِي تَأْوِيلِ الْآيَتَيْنِ آيَةِ الْمَائِدَةِ وَآيَةِ النِّسَاءِ فَصَوَّبَ كِلَا التَّأْوِيلَيْنِ وَتَرَكَ كُلَّ مُؤَوِّلٍ عَلَى تَأْوِيلِهِ۔ (ص ۸۹)

یعنی چھان بین سے میں نے اس مسئلہ میں جہاں تک کام لیا اس سے مجھ پر واضح ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرؓ اور عمارؓ کو دیکھا کہ قرآن کی دو آیتوں کے مطلب کی تعیین یعنی تاویل میں مختلف ہو گئے ہیں یعنی سورۂ مائدہ[1] اور سورۂ نساء کی آیتوں کی تاویل یعنی مطلب کے سمجھنے میں پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرار دیا کہ جس نے قرآن سے جو کچھ سمجھا وہ ٹھیک ہے اور ہر ایک کو آپ نے اسی کے مسلک پر چھوڑ دیا۔

---

[1] دراصل دونوں آیتوں میں لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ کے الفاظ آئے ہیں۔ میں نے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی اتباع میں لَمَسْتُم کا ترجمہ "لگو تم" کے لفظ سے کیا ہے۔ محل اختلاف درحقیقت یہی لفظ لَمَسْتُمْ کا معلوم ہوتا ہے عام طور پر اس کا مطلب "ہم بستری" سمجھا جاتا ہے لیکن لگنے کے اردو لفظ میں جیسے اس کی گنجائش ہے کہ بجائے ہم بستری کے اس کا مفہوم "چھونا" لیا جائے یعنی عورتوں کے بدن کا صرف چھونا مراد ہے نہ کہ ان کے ساتھ ہم بستری کرنا۔ چونکہ قرآنی لفظ میں دونوں کی گنجائش ہے اس لئے بعض لوگوں نے ہم بستری مراد لیا اور بعضوں نے صرف عورت کا چھونا مراد لیا ہے۔ ثانی الذکر طبقہ کا خیال ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے پس اسی ٹوٹے ہوئے وضو کے متعلق قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ پانی اگر نہ ملے تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتے ہو، ایسی صورت میں (باقی برصفحہ آئندہ)

یہ ارقام فرمانے کے بعد شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ

وَعُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَجَلُّ اَنْ يَّخْفٰى عَلَيْهِ هٰذَا الْحَدِيْثُ وَاَتْقٰى لِلّٰهِ مِنْ اَنْ يَّبْلُغَهٗ هٰذَا الْحَدِيْثُ ثُمَّ لَا يَقُوْلُ بِهٖ اِلَّا لِمَعْنًى فَهِمَهٗ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔
(ص ۸۹)

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات اس سے بلند و بالا ہے کہ ان پر یہ حدیث پوشیدہ رہتی اور خدا سے ڈرنے والوں میں جتنے زیادہ ڈرنے والے وہ تھے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ رسول اللہؐ کی یہ حدیث ان تک پہنچی اور اس کے بعد بھی اس کے وہ قائل نہ ہوئے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کوئی بات ان کی سمجھ میں آئی۔

شاہ صاحب کا مقصد مبارک یہ ہے کہ گو بظاہر عمارؓ والی روایت کے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے حضرت عمرؓ کے، عمارؓ ہی کے خیال کی توثیق فرمائی یعنی غسل کی جگہ بھی آدمی بضرورت تیمم کر سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے یہی بات ثابت ہوتی ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق کے بعد بھی حضرت عمرؓ اپنے خیال پر جمے رہتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابن مسعودؓ جو حضرت عمرؓ کے اس مسئلہ میں ہم نوا تھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق کردہ طرزِ عمل کے خلاف فتویٰ دیتے۔

شاہ صاحب نے دعویٰ کیا ہے اور بجا دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دوسرے حالات جو تواتر کے ساتھ امت تک پہنچے ہیں قطعًا ان کا یہ اصرار جو گویا پیغمبرؐ کے حکم سے سرتابی کے مرادف ہے مخالف ہے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) تیمم غسل کا قائم مقام ہو سکتا ہے یا نہیں، قرآن کی آیت سے اس کا حکم نہ نکلے گا۔ شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے کہ اَشَارَ الشَّافِعِيُّ اِلٰى اَنَّ عُمَرَ وَابْنَ مَسْعُوْدٍ كَانَا يَحْمِلَانِ الْمُلَامَسَةَ عَلَى اللَّمْسِ بِالْيَدِ (امام شافعیؒ نے اشارہ کیا ہے حضرت عمرؓ و ابن مسعودؓ لامسہ (لگنے) کا مطلب عورتوں کو ہاتھ سے چھو نا لیتے تھے) شاہ صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ فَكَانَتِ الْاٰيَتَانِ سَاكِتَتَانِ عِنْدَهُمَا مِنَ التَّيَمُّمِ عَنِ الْجَنَابَةِ (پس حضرت عمرؓ و ابن مسعودؓ کے خیال کے مطابق سمجھا جائے گا کہ سورۂ نساء، و مائدہ کی دونوں آیتیں غسل والے تیمم سے خاموش ہیں) یعنی ان دونوں آیتوں میں اس کا حکم نہیں بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال حضرت عمرؓ و ابن مسعودؓ کی اس تفسیر کی بنیاد پر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں بزرگوں نے قرآن کے خلاف مسلک اختیار کیا ہے۔ ۱۲

پس یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ گو حضرت عمارؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر تشفی فرمائی کہ تمہارے لئے وضو والے تیمم کا کر لینا کافی تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طرز عمل سے حضرت عمرؓ کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ میرے خیال کی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تردید نہیں فرمائی ہے بلکہ آپ نے عمارؓ کو یہ سمجھا دیا کہ تم نے جب قرآن سے یہی سمجھا تھا کہ غسل کا قائم مقام بھی تیمم ہو سکتا ہے تو وضو والا تیمم کر لیتے۔ اور حضرت عمرؓ کو بھی آپ نے چھوڑ دیا کہ قرآن سے تمہاری سمجھ میں اگر یہی آیا ہے کہ تیمم کی آیتوں کا غسل سے تعلق نہیں ہے تو تم کو بھی اپنے مسلک پر قائم رہنے کا اختیار ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے یہ عذر جسے شاہ صاحب نے پیش کیا ہے، اگر صرف اسی پر اکتفا کر کے وہ گزر جاتے تو مشکل ہی سے ان کی یہ توجیہ شاید لائق پذیرائی ہو سکتی تھی بلکہ ایسی صورت میں میرے نزدیک تو یہ بات زیادہ آسان تھی کہ راویوں کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا کہ خدا جانے واقعہ کی تعبیر میں ان سے کیا غلطی ہوئی جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ پر ایسا صریح الزام عائد ہوتا ہے۔

لیکن اسی مقام سے شاہ ولی اللہؒ کی محدثانہ وسعت نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے مذکورہ بالا عذر کو پیش کرنے کے بعد شاہ صاحب نے النسائی کے حوالہ سے ایک روایت بھی نقل کی ہے اور وہ یہ ہے کہ

عَنْ طَارِقٍ اَنَّ رَجُلًا اَجْنَبَ فَلَمْ يُصَلِّ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ اَصَبْتَ فَاَجْنَبَ رَجُلٌ اٰخَرُ فَتَيَمَّمَ وَصَلّٰى فَاَتَاهُ فَقَالَ لَهٗ نَحْوًا مِمَّا قَالَ لِلْاٰخَرِ يَعْنِيْ اَصَبْتَ۔

(ص ۸۹)

طارق سے مروی ہے کہ ایک شخص حالت جنابت (ناپاکی) میں مبتلا ہوا اور اس نے نماز نہیں پڑھی پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس قصے کا ذکر کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ٹھیک کیا، پھر ایک دوسرا آدمی جنابت میں مبتلا ہوا اور تیمم کر کے اس نے نماز پڑھ لی، وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس سے بھی رسول اللہ نے وہی بات کہی جو پہلے سے کہی تھی یعنی تم نے ٹھیک کیا۔

کوئی شبہ نہیں کہ اس روایت کے بعد حضرت عمرؓ کی طرف سے جو توجیہ پیش کی گئی وہ بار د نہیں

بلکہ معقول توجیہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے سوا بھی بعض صحابیوں کے ساتھ یہی رویہ اختیار فرمایا تھا یعنی جس نے بجائے غسل کے تیمم نہیں کیا اور قرآنی آیت سے اس نے یہی سمجھا تھا اس کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مسلک پر رہنے دیا اور جن صاحب کی سمجھ میں قرآن سے یہ آیا کہ غسل کی جگہ بھی تیمم کیا جاسکتا ہے، ان کو بھی کو ان کے سمجھے ہوئے مطلب پر قائم رہنے کا اختیار دیتے ہوئے فرمایا کہ تم نے بھی جو کچھ کیا وہ ٹھیک ہی کیا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ بنی قریظہ کی مہم کے سلسلے میں. بخاری وغیرہ صحاح کی کتابوں میں جو یہ مشہور حدیث پائی جاتی ہے یعنی چند صحابہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بنی قریظہ کی بستی میں پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھنا، لوگ روانہ ہوئے مگر بعضوں نے راستہ ہی میں عصر کی نماز پڑھ لی اور بعض نے بنی قریظہ میں پہنچ کر نماز پڑھی، راستہ میں نماز پڑھنے والوں نے خیال کیا کہ مقصود رسول اللہؐ کا یہ ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو بنی قریظہ کے محلہ میں ہم لوگ پہنچ جائیں، اور جنہوں نے بنی قریظہ میں پہنچ کر پڑھی انہوں نے لفظاً بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کو ضروری خیال کیا. جب دونوں نے اپنا اپنا قصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تو بخاری میں ہے کہ لَمْ يُعَنِّفْ أَحَدًا یعنی دونوں میں سے کسی پر ملامت نہیں کی گئی اور پیغمبرؐ کے قول کا جو مطلب جس کی سمجھ میں آیا اسی کو درست قرار دیا گیا۔

اگر یہ ہے تو یہ ایک جزئی واقعہ لیکن اس جزئیہ سے جو کلیہ اختلافات کے مسئلہ میں پیدا ہوتا ہے، میرے نزدیک وہ قرآنی الفاظ کے قراءتی اختلافات سے کم اہم نہیں ہے۔ قرات والی روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف قرآنی الفاظ کے تلفظ کے اختلافات تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہمی اختلافات کی برداشت کی صلاحیت صحابہ کرامؓ میں آپ نے پیدا کرنی چاہی تھی لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عمارؓ کے سوا النسائی میں جن دو اور صحابیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلقہ قصہ سے تو علاوہ الفاظ کے قرآنی الفاظ کے معانی اور مطالب کے، اختلافات کے متعلق بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرزِ عمل سے یہ دکھا دیا کہ ہر ایک کو اپنے سمجھے ہوئے

مطلب پر قیام کی آزادی حاصل ہے حالانکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو مسئلہ کے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو متعین فرما دیتے، اور اگر آپ کے منشأ مبارک سے صحابہؓ کی سمجھ میں یہی بات آجاتی کہ کسی ایک پہلو پر آپ سب کو قائم کرنا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اپنے خیال سے دست بردار ہو کر وہ حضور کے منشأ کی تعمیل کی سعادت حاصل نہ کرتے جن بے چاروں نے اپنے سارے آبائی خیالات وعقائد، رسوم ورواج سب کو جس کے قدموں پر یک لخت نثار کر دیا تھا ان کے متعلق یہ کتنی گندی بدگمانی ہوگی کہ منشأ نبوت کے خلاف ایک معمولی جزئی مسئلہ میں اپنے خیال پر وہ اڑے رہے پس بات وہی ہے کہ نبوت کے مذاق شناس ہونے کی وجہ سے ان کو اندازہ ہو گیا کہ کسی ایک مسلک پر اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواہ مخواہ ہر ایک کو قائم کرنا نہیں چاہتے بلکہ آزادی عطا فرمائی گئی ہے کہ جس کی سمجھ میں جو بات اس مسئلہ میں آئی ہے، چاہے تو اسی پر وہ قائم رہ سکتا ہے، یہی راز تھا کہ حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ حضرت عمارؓ والے واقعہ کے بعد بھی غسل والے تیمم میں اپنے خیال پر قائم رہے۔ پوچھنے والا ان سے جب پوچھتا تو جو ان کا خیال تھا اسی کو ظاہر کرتے، لیکن اسی کے ساتھ اس مسئلہ میں جن کا خیال اس سے مختلف تھا، سمجھتے تھے کہ اختلاف کا یہ حق ان کا جائز حق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجودیکہ خلافت کبریٰ کی طاقت اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے اور جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا کہ بعض مسائل میں خاص وجوہ سے انہوں نے مسلمانوں کو بزور ایک ہی لفظ پر جمع ہونے کا حکم بھی دیا ہے ماسوا اس کے ایک بات غور کرنے کے قابل یہ بھی ہے کہ حدیثوں کی روایت میں اقلال اور کمی کی تاکید کا مقصد اگر صرف یہی تھا کہ کثرت روایت میں غلطیوں کی گنجائش زیادہ پیدا ہو سکتی ہے تو اس کے لئے فقط یہ کہنا کافی تھا کہ بجائے اکثار کے حدیثوں کی روایت میں اقلال کی راہ اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن اور اس کے ساتھ لوگوں کی مشغولیت کے ذکر کی ضرورت کیا تھی، حالانکہ حضرت عمرؓ کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قرظہ کو وصیت کرتے ہوئے یہی فرماتے ہیں کہ حدیثوں میں مشغول کر کے ایسا نہ ہو کہ قرآن سے لوگوں کی توجہ کو تم ہٹا دو اور حجۃ الوداع والی وصیت نبوی میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا

جارہا ہے کہ عَلَیْکُمْ بِالْقُرْآنِ (قرآن کو پکڑے رہنا) کے الفاظ کے ساتھ اپنی اس وصیت کو شروع فرماتے ہیں اور آخر میں صرف ان لوگوں کو جنہیں بھروسہ ہو کہ حدیث صحیح طور پر ان کو یاد ہے اور انہوں نے اس کو سمجھا ہے روایت کی بھی اجازت مرحمت فرمائی جاتی ہے۔

سوال یہی ہے کہ یہاں قرآن کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ میرے نزدیک تو خود یہی ایک مستقل قرینہ اس بات کا ہے کہ اقلال روایت کے اس حکم میں ان اغراض کے ساتھ جو حافظ ابن عبدالبر وغیرہ نے بیان کیا ہے، ایک بڑی غرض وہی معلوم ہوتی ہے کہ ابتداءِ اسلام میں قصداً یہ چاہا جاتا تھا کہ جن حدیثوں کو پیغمبر نے عمومیت کی راہ سے لوگوں تک نہیں پہنچایا ہے، ان میں عمومیت کی ایسی کیفیت نہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے ان کے مطالبہ اور گرفت میں بھی لوگ اسی قسم کی قوت محسوس کرنے لگیں، جو صرف قرآن اور قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات کے ساتھ مختص ہے قرآن پر زور دینے کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں میں عام اشاعت اور اکثار ان ہی مطالبوں کی کی جائے جن کا نام قرآن نے "البینات" رکھا ہے اور دین کے اس حصہ کو دوسرے حصہ سے ممتاز کرنے کی اصولی شکل اس زمانہ میں یہی ہو سکتی تھی کہ عمومیت کے رنگ کے پیدا ہونے سے اس کو بچایا جائے، اس کی تعبیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

اَقِلُّوا الرِّوَایَۃَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایتیں کم بیان کیا کرو۔

سے فرمائی، ورنہ اقلال کے اس حکم کا مطلب اگر صرف یہی تھا کہ غلطیوں سے محفوظ رہنے کی راہ یہی ہے تو اس موقعہ پر قرآن کی مشغولیت پر زور دینے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی حالانکہ خبر آحاد کی حدیثوں کے متعلقہ خدمات کے سلسلہ میں یہ خدمت یعنی ان سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج کی گرفت میں "البینات" کے نتائج واحکام کی گرفت کی کیفیت نہ پیدا ہونے پائے ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اس کی پوری نگرانی فرمائی، بلکہ بجائے عام صحابیوں کے ان کا علم خاص خاص صحابیوں تک جو محدود نظر آتا ہے، عرض کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قصداً ان حدیثوں کے پہنچانے میں یہ طریقۂ عمل جو اختیار فرمایا تھا

یہ ان روایتوں کی تبلیغ کے اسی طریقہ خاص ہی کا نتیجہ تھا جو اتفاقاً پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ چاہا گیا تھا کہ اسی رنگ میں لوگوں تک وہ پہنچے۔ بتایا جا چکا ہے کہ جن چیزوں سے آحاد کی ان روایتوں کی اس خصوصیت کے متاثر ہونے کا اندیشہ عہدِ نبوت اور عہدِ صدیقی میں پیدا ہوتا تھا، ان کے ازالہ کی طرف توجہ کی گئی۔ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نکتہ اوجھل رہ جاتا اسی لئے میرا خیال ہے کہ حدیثوں کے اقلال کے متعلق جتنی روایتیں حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں ان سے منجملہ دوسرے اغراض کے ایک بڑی غرض یہ بھی تھی۔

لیکن ظاہر ہے کہ ان حدیثوں کے متعلق یہ خدمت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے یہ ایسی بات ہے جس کی نگرانی کے تو مسلمان قیامت تک ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں، اس خدمت کا تعلق کسی خاص عہد اور زمانہ میں محدود نہیں ہے بلکہ جیسے پہلی صدی ہجری میں اس امر کے نگرانی کی ضرورت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے والے کوئی غلط بات منسوب نہ کر دیں، وہی ضرورت آج بھی موجود ہے اور قیامت تک اس کی ضرورت باقی رہے گی۔

لیکن یہ مسئلہ کہ خبر آحاد کی حدیثوں میں "البینات" کا رنگ نہ پیدا ہو، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس خدمت کا تعلق ایک خاص زمانے تک محدود رہ سکتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صحاح کی کتابوں میں مدون ہو جانے کے بعد کون نہیں جانتا اور میں کہہ چکا ہوں کہ خبر آحاد کی ان حدیثوں کی نوعیت متواتر روایتوں کی ہو گئی ہے یعنی یہ بات کہ صحاح کے مصنفین ہی کی یہ مدون کی ہوئی حدیثیں ہیں شک و شبہ سے یہ مسئلہ اسی طرح بالا و برتر ہو چکا ہے۔ جیسے مشہور کتابوں کا ان کے مصنفین کی طرف انتساب متواتر واقعہ ہوتا ہے مگر ظاہر ہے کہ مصنفین صحاح کے بعد متواتر ہو جانے کی وجہ سے ان روایتوں میں "البینات" کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔ "البینات" کی حیثیت تو ان ہی چیزوں کی ہو سکتی ہے جن کی اشاعت میں عہدِ نبوت ہی سے عمومیت کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو ورنہ اسلام کے ابتدائی قرون میں جو چیزیں خبر آحاد کی شکل میں الواحد سے واحد کی طرف

منتقل ہوتی رہیں یعنی اکے دکے آدمیوں تک ان کا علم اور ان کی روایت محدود رہی بعد کے قرون میں خواہ ان کی اشاعت کا دائرہ وسیع ہوتے ہوئے تواتر کے درجہ تک ترقی کر کے کیوں نہ پہنچ گیا ہو لیکن شریعت کے "بینات" میں وہ داخل نہیں ہو سکتیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں خبرِ آحاد کے متعلق اس خدمت کی یہی نوعیت یعنی صرف ابتدائی قرون تک اس کا محدود ہونا اسی نے ان دوسری خدمتوں کے مقابلہ میں جن کی طرف توجہ کسی خاص زمانے تک محدود نہ تھی اس کی اہمیت کو جیسا کہ چاہیئے تھا لوگوں پر واضح ہونے نہ دیا حالانکہ یہ سوچنے کی بات تھی کہ دین کے "بیناتی حصہ" کو جن ذرائع سے عام لوگوں میں منتقل کیا گیا تھا ان ذرائع کو خبر آحاد کی حدیثوں کی تبلیغ میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اختیار فرمانا چاہتے تو اس میں کونسی چیز مانع ہو سکتی تھی؟ سو یہی نہیں کہ ان ذرائع سے ان کی تبلیغ میں کام نہیں لیا گیا بلکہ عمومیت کی کیفیت کے پیدا ہونے کا خطرہ جن جن چیزوں سے پیدا ہو سکتا تھا پوری طاقت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں بھی ان کے انسداد کی کوشش فرمائی۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ بھی اس کی نگرانی فرماتے رہے، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو روایتوں کے اقلال اور کمی میں اتنی غیر معمولی دار و گیر سے اپنے زمانے میں کام لیا کہ ان کے طرزِ عمل سے بعضوں کو اس کا مغالطہ ہو گیا کہ سرے سے وہ حدیثوں کی اشاعت ہی کے مخالف تھے لیکن یہ ساری غلط فہمیاں اسی پر مبنی ہیں کہ لوگوں نے اس فرق ہی کو محسوس نہیں کیا جسے دین کے ان دونوں مختلف شعبوں کی تبلیغ میں شروع ہی سے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

حیرت ہوتی ہے کہ لوگ عام طور پر کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب فتح بیت المقدس کے موقعہ پر فلسطین تشریف لے گئے اور گرجا کا معائنہ فرماتے ہوئے آپ نے ظہر کی نماز پڑھنی چاہی، کلیسا کے اساقفہ اور پادریوں نے حالانکہ حضرت سے عرض کیا کہ آپ گرجے کے اندر نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن آپ نے یہ کہتے ہوئے کہ میرے نماز پڑھنے کے بعد مسلمان آئندہ اس گرجے میں کسی حق کے مدعی ہو جائیں گے، بجائے اندرون کلیسا کے اس کی بیرونی سیڑھیوں پر

نماز ادا کی، پیش بینوں اور ان کے متعلق دقیقہ سنجوں کے یہ انوکھے نمونے جو حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی میں ملتے ہیں، جس درخت (الشجرہ) کے نیچے بیعت رضوان کا واقعہ پیش آیا تھا، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اسی درخت کے نیچے نماز پڑھنے کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو دیکھ کر جیسا کہ صحاح کی کتابوں میں مذکور ہے اور عام طور پر لوگ اس سے واقف ہیں۔ حضرت عمرؓ کا حکم دینا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے یا حج سے واپسی کے موقعہ پر یہ دیکھ کر کہ راستہ کے بعض خاص خاص مقامات میں لوگ نماز پڑھنے میں سبقت کر رہے ہیں حضرت کا دریافت فرمانا کہ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں؟ جواب میں کہا گیا کہ جن جن مقامات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر حج میں نمازیں پڑھی تھیں لوگ انہی جگہوں میں خصوصیت کے ساتھ نماز پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں یہ دیکھ کر آپ کا اعلان فرمانا کہ

مَنْ عُرِضَتْ لَهُ مِنْكُمُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَمَنْ لَّمْ تُعْرَضْ لَهُ مِنْكُمُ الصَّلٰوةُ فَلَا يُصَلِّ۔ (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۹۱)

نماز کا وقت ان ہی مقامات میں جس کے سامنے پیش آجائے چاہئے کہ وہ نماز پڑھ لے لیکن جو ایسے وقت پر ایسی جگہ پہنچے کہ اس کی نماز کا وقت نہ ہو تو چاہئے کہ نماز نہ پڑھے۔

لیکن غسل والے تیمم کے مسئلہ میں کوئی روایت ایسی نہیں ملتی کہ حضرت عمرؓ کے خیال کے خلاف جن کا مسلک تھا آپ نے کبھی ان سے کبھی پوچھا بھی ہو کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔

بہرحال کچھ بھی ہو اختلافی مسائل میں رواداری کی یہ اپنی مثال آپ ہو سکتی ہے کہ پیغمبر کے سامنے دو مجتہدوں کی اجتہادی رائے ایک قرآنی حکم کی تاویل و توجیہ میں مختلف ہو جاتی ہے، اور دونوں میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی رائے پر قائم رہنے کی سند خود دربار نبوت سے عطا ہوتی ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ بالکلیہ اختلاف کا مٹانا یہی اسلام کا صحیح مقصد اگر ہوتا تو اس وقت جب وحی نازل ہو رہی تھی اور علم کی روشنی نبوت کی جس مشکوٰۃ سے ضیا باریوں میں مصروف تھی اس کا پٹ بھی بند نہیں ہوا تھا۔ فریقین میں ہر ایک پیغمبر کے فیصلے کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار تھا مگر باوجود ان تمام باتوں کے جیسا کہ شاہ صاحب کا خیال ہے دونوں فریق کو چھوڑ دیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول ان کے

صَوَّبَ کِلَا التَّاوِیْلَیْنِ وَتَرَکَ کُلَّ مُؤَوِّلٍ عَلٰی تَاوِیْلِہٖ۔ — دونوں تاویلوں کو درست قرار دیا اور جس نے جو مطلب سمجھا تھا اس کو اپنے سمجھے ہوئے مطلب پر چھوڑ دیا گیا۔

اور خواہ لوگوں نے سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن مسلمانوں کا دین کے غیر بنیادی شعبہ کے اختلافات کے متعلق جو حیرت انگیز رویہ عام طور گزشتہ تیرہ صدیوں میں رہا ہے میرا خیال تو یہی ہے کہ اس میں ابتداء اسلام کی ان ہی بنیادی کوششوں کو دخل ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس قسم کے مسائل میں صحابہؓ کے اختلافات کی حالانکہ کافی طویل فہرست ہے لیکن ان قدرتی اختلافات نے ارادی و اختیاری مخالفتوں اور مخاصمتوں کی صورت کبھی نہیں اختیار کی، ہر ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتا رہا اور جس احترام کا جو مستحق تھا اختلاف رکھنے والوں کے قلوب میں بھی ہمیشہ وہی احترام باقی رہا۔ یہی حضرت عمرؓ ہیں بیسیوں مسائل ہیں ان سے بعض صحابہ کو اختلاف تھا اختلاف رکھتے ہوئے بھی لوگوں نے ہمیشہ ان کو امیر المومنین ہی سمجھا اور جو اختلاف ان مسائل میں ان سے رکھتے تھے سلوک اور برتاؤ میں اس سے ذرہ برابر کبھی فرق پیدا نہیں ہوا چونکہ بجائے خود یہ ایک مستقل مضمون کا مواد ہے ان چند اشاروں سے زیادہ تفصیلات کی اپنی کتاب میں گنجائش نہیں پاتا۔

البینات کے متعلق اختلاف

البتہ یہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجود اختلاف رکھنے کے بلال کو سیدنا بلالؓ کہتے ہیں عمار بن یاسرؓ ان کے دربار میں اسی احترام کو حاصل کئے ہوئے ہیں جو اتفاق رکھنے والوں کو حاصل ہے لیکن یہ ساری رواداریاں ان ہی مسائل کی حد تک محدود تھیں جو "البینات" کے دائرہ سے خارج تھے اور سچی بات یہ ہے کہ عہد فاروقی تک اختلافات نے دین کے "البینات" کے دامن کو چھوا بھی نہ تھا صرف ایک ہی روایت اس سلسلہ میں بیان کی جاتی ہے کہ ایک شخص جس کا نام صبیغ[1] تھا۔ لوگ اس کو صبیغ العراقی کہتے تھے، حضرت عمرؓ تک پہنچانے والوں نے اسی کے متعلق یہ خبر پہنچائی کہ

یسأل عن اشیاء من القرآن فی اجناد المسلمین۔ — مسلمانوں کی چھاؤنیوں میں وہ قرآن کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کرتا پھرتا ہے۔

---

[1] صبیغ بروزن عظیم۔ اصابہ

[illegible]

بعض کہتے ہیں کہ پہلی مار ہی کے بعد صبیغ کے دماغ میں عقل واپس آگئی، لکھا ہے کہ مار کھا ہی رہا تھا کہ صبیغ نے چلانا شروع کیا :

يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ حَسْبُكَ قَدْ ذَهَبَ الَّذِيْ كُنْتُ اَجِدُ فِيْ رَاْسِيْ - (ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۸۱)

امیرالمومنین! بس کیجئے، اپنے سر میں جو کچھ میں پاتا تھا، وہ باہر نکل گیا۔[1]

بعضوں کا بیان ہے کہ متعدد دفعہ پٹائی کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ "قَدْ بَرِئْتُ" (میں بالکل چنگا ہو چکا ہوں) بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "البینات" میں اختلافی رنگ پیدا

---

[1] جیسا کہ میں نے عرض کیا، "صبیغ" کیا باتیں بناتا تھا اس کی کوئی تفصیل کتابوں میں مجھے اب تک نہیں ملی۔ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں "صبیغ" کا ذکر کیا ہے لیکن انہوں نے بھی اس مسئلہ میں اجمال ہی سے کام لیا، ایک روایت اصابہ میں پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ الذاریات کے متعلق اس نے کچھ شکوک پیدا کئے تھے لیکن ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک اجمالی بات ہی ہوئی۔ کچھ بھی ہو اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیدا کردہ اشتباہات کا تعلق قرآن ہی سے تھا اور اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنے شکوک و شبہات کی اشاعت میں وہ کوشاں تھا۔ مسلمانوں کی فوجی چھاؤنیوں میں پہنچ کر سادہ دل سپاہیوں کو بہکاتا تھا۔ اسی چیز نے اس کے جرم کی نوعیت کو ذرا زیادہ سخت کر دیا تھا۔ لکھا ہے کہ تائب ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے اس کو بصرہ بھیج دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ مسلمانوں کو اس سے ملنے جلنے نہ دیا جائے لیکن بعد کو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سفارش سے یہ قید بھی اٹھالی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ صبیغ اسی قسم کی باتیں شاید کرتا تھا جیسا کہ بعض لوگ قرآن کے حکم کو یعنی میتہ (مردار) دم (خون) لحم خنزیر (سور کے گوشت) کا مطلب یہ بیان کرتے تھے کہ عرب جاہلیت میں میتہ ایک عورت کا اور دم و لحم خنزیر دو مردوں کے نام تھے مسلمانوں کو ان سے ملنے جلنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اسی بنیاد پر وہ مردار، خون اور سور کے گوشت کو حلال سمجھتے تھے۔ یا اس زمانہ میں بعض لوگوں نے قرآنی حکم جو الربوٰا (سود) کے متعلق ہے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا ہے، اس زمانہ میں سود جس معاملہ کا نام ہے وہ الربوٰا سے مراد نہیں ہے، بلکہ ایام جاہلیت میں معاملہ کی ایک خاص شکل تھی جو اب دنیا میں مروج نہیں ہے۔ یا اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے متعلق قرآن میں دو جگہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ زندہ رہتے ہیں اس کا مطلب بعض لوگوں نے اس زمانہ میں یہ پھیلانا شروع کیا ہے کہ ان کا نام زندہ رہتا ہے۔ یا اس زمانہ میں جنت و دوزخ جن کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ طرح طرح کے مطالب بیان کرنے شروع کئے ہیں نیکی سے جو خوشی ہوتی ہے یا پاپ سے روح میں قدرتاً انقباض و کدورت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے یا مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک کے باغ دریا وغیرہ یا اسی طرح بعض بے معنی الفاظ روحانی جنت و دوزخ وغیرہ جو بولے جاتے ہیں، صبیغ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تفسیروں کا تاریخی پیشوا تھا۔

واللہ اعلم بالصواب

کرنے کے خطرے کو شروع ہی میں بھانپ لیا تھا اور آپ نے اندازہ فرمالیا کہ اس قسم کے لوگوں کا علاج افہام و تفہیم سے نہیں ہو سکتا سمجھانا بجھانا تو اسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے جو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو لیکن "البینات" کا تعلق انسانی فطرت سے ایسا نہیں ہوتا کہ جس میں غلط فہمی کی گنجائش ہو، ان میں شاخسانے وہی نکالتے ہیں یا نکال سکتے ہیں جو قصداً و عمداً فتنہ و فساد برپا کرنا چاہتے ہوں۔ اور اس قسم کی شرارتوں کا علاج اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جسے حضرت عمرؓ نے صبیغ کی اصلاح کے سلسلہ میں اختیار فرمایا تھا۔

بہرحال یہ طرز عمل حضرت عمرؓ کا "قرآنی بینات" کے اختلافات کے ساتھ تھا باقی شریعت کے غیر بیناتی شعبہ کے قدرتی اختلافات جن کا خبر آحاد کے متعلقہ معلومات کے اختلافات اور تفقہ کے سلسلہ میں مختلف اجتہادی نقاط نظر کے اختلافات کی وجہ سے پیدا ہو جانا، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ناگزیر تھا عام طور پر ان اختلافات کے متعلق حضرت عمرؓ کی روش وہی معلوم ہوتی ہے کہ اختلافات کے دونوں پہلوؤں کی سمجھتے تھے کہ دین میں گنجائش ہے جس پہلو کو اختیار کیا جائے اختیار کرنے والا دین ہی کے دائرے میں رہتا ہے۔

تاہم ان کے ایام خلافت کی طویل تاریخ میں بعض چیزیں ایسی ملتی ہیں جن کا بظاہر "بیناتی شعبہ" سے تعلق معلوم نہیں ہوتا بلکہ الواحد بعد الواحد کی راہ سے جو معلومات ان کے متعلق صحابہؓ تک پہنچے تھے ان ہی کے اختلاف پر ان مسائل کے اختلافات مبنی تھے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت و امارت کی قوت سے کام لیتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں صحابہؓ کو آمادہ کیا کہ ان مسائل کے اختلافات کو ختم کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز مُتعہ کا مسئلہ ہے، اگرچہ مسلمانوں کا ایک طبقہ متعہ کی حرمت کو دین کے "البینات" میں شمار کرتا ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ اس فعل کی حرمت قرآن کے نص صریح کا اقتضاء ہے مگر ان ہی لوگوں میں جو متعہ کی حرمت کے قائل ہیں۔ بعض ایسے افراد بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ "البینات" میں متعہ کی حرمت کو داخل کرنا ذرا مشکل ہے۔ بہرحال یہ الگ مسئلہ ہے مجھے تو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس اختلاف کو اختلاف ہی کی شکل میں باقی رہنے دیا جائے یا مسلمانوں کو اس مسئلہ میں کسی

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) اور مسلمان طائف کی طرف بڑھے تو اس عرصہ میں پھر اعلان کیا گیا کہ متعہ حلال کیا جاتا ہے لیکن اس کے کچھ دن بعد پھر اعلان کیا گیا کہ متعہ ہمیشہ کے لئے حرام کیا جاتا ہے. کوئی شبہ نہیں کہ جن الفاظ میں راویوں نے متعہ کے حلال و حرام ہونے کے قصہ کو بیان کیا ہے ان کے پڑھنے سے آدمی اس نتیجہ تک پہنچتا ہے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے یہ عجیب بات ہے حافظ ابن قیم نے بھی لکھا ہے کہ اگر واقعہ کی صورتِ حال یہی ہے تو یہ مسئلہ اپنی آپ نظیر ہے شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی. اس سلسلہ میں فقیر ایک خاص خیال رکھتا ہے تفصیل کا تو یہاں موقعہ نہیں۔ لیکن اجمالاً اپنے خیال کو ان الفاظ میں ادا کرسکتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ متعہ کی حرمت کے ساتھ عموماً اس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ خیبر سے واپسی کے موقعہ پر پالتو گدھوں کے گوشت کی حرمت کا بھی اعلان کیا گیا۔ میں یہی پوچھتا ہوں گدھے کے گوشت کی حرمت کے اعلان کا یہ مطلب کیوں لیا جائے کہ شریعت نے پہلے اس کو حلال قرار دیا تھا، یہ کیوں نہ سمجھا جائے اور یہی سمجھا بھی جاتا ہے کہ اس وقت تک اس کی حرمت کا چونکہ اعلان نہیں ہوا تھا اور جاہلیت والے گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے اس لئے اسی جاہلی رواج کی بنیاد پر بعض لوگوں نے خیبر میں گدھوں کو ذبح کیا اور ہانڈیوں میں پکنے کے لئے اس کے گوشت کو چڑھا دیا جیسا کہ روایتوں میں آیا ہے کہ دریافت کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ ہانڈیوں میں گدھے کا گوشت پک رہا ہے اسی وقت آنحضرتؐ نے ہانڈیاں الٹوادیں اور اعلان کرادیا گیا کہ گدھے کا گوشت حرام ہے. متعہ کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ جب خیبر سے واپسی ہونے لگی تو بعض عورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ رو رہی ہیں، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان سے بعضوں نے متعہ کیا تھا اور اب ان کو چھوڑ کر جا رہے ہیں، اسی لئے چیخ چیخ رو رہی ہیں" اس علم کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ "متعہ حرام ہے" پس کیوں نہ سمجھا جائے کہ جیسے گدھے کے گوشت کو جاہلی رواج کی بنیاد پر لوگ پکا رہے تھے، اسی طرح متعہ بھی جاہلی رواج ہی کی بنیاد پر لوگوں نے کیا تھا ایسی صورت میں یہ کہنا کہ متعہ کو اسلام نے کسی زمانہ میں حلال کیا درست نہ ہوگا، اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ فتحِ مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں فوج در فوج ہزار ہا ہزار کی تعداد میں نئے لوگ داخل ہوئے، مقام اوطاس میں ان ہی نومسلموں نے جن کو خیبر والے حکم کا علم نہ تھا قدیم جاہلی رواج کی بنیاد پر متعہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب علم ہوا تو پھر آپؐ نے دوبارہ ان نومسلموں کے لئے متعہ کی حرمت کا اعلان کیا۔ اگر واقعہ کی تعبیر اس طریقہ سے کی جائے تو خواہ مخواہ دو دفعہ کی حلت اور دو دفعہ کی حرمت، یا جائز ہے نہیں جائز ہے پھر جائز ہے نہیں جائز ہے اس قسم کی باتوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ دو دفعہ تو خیر بڑی بات ہے ایک دفعہ بھی اسلام میں حلال نہ ہوا۔ کرنے والوں نے جو کچھ بھی کیا تھا تو جاہلی رواج کی بنیاد پر کیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ راویوں نے متعہ کی حرمت و حلت کے واقعات کی تعبیر جن الفاظ میں کی ہے ان پر میری تعبیر کا منطبق ہونا میں خود جانتا ہوں کہ مشکل ہے لیکن واقعات کی تعبیر سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعی واقعہ کی شکل بھی وہی تھی، خاکسار نے جو بات عرض کی ہے، غور کیا جائے گا تو سارے الجھاؤں کا اس سے ازالہ ہو جاتا ہے اور مسئلہ کی جو اصلی صورت جیسا کہ میرا خیال ہے سامنے آجاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ۱۲

ایک نقطۂ نظر پر متفق کر دیا جائے ؟ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاروقی بصیرت نے دوسری صورت کو ترجیح دی اور برسرِ منبر جب صحابہؓ کا مجمع نیچے بیٹھا ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ

مَا بَالُ رِجَالٍ يَنْكِحُونَ هٰذِهِ الْمُتْعَةَ بَعْدَ نَهْيِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔
(فتح الملہم ص ۴۴۲ بحوالہ بیہقی وابن المنذر وغیرہ)

لوگوں کا یہ کیا حال ہے کہ متعہ کے طریقہ سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کے بعد بھی نکاح کر رہے ہیں۔

کسی روایت سے ثابت نہیں ہے کہ کسی صحابی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس سوال کے جواب میں یہ کہا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو حلال قرار دیا ہم اس کو کیوں ناجائز سمجھیں۔ اسی کے بعد لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے متعہ کی حرمت کا اعلان عام فرما دیا۔ علماء نے اسی بنیاد پر قرار دیا ہے کہ متعہ کی حرمت کا مسئلہ صحابہؓ کی اجماعی حرمت کا مسئلہ ہے، اور سارے شکوک و شبہات جو اس مسئلہ میں تھے ان کا ازالہ اس اجماع سے ہو گیا ورنہ ناممکن تھا کہ صحابہؓ حضرت عمرؓ کو نہ ٹوکتے جب کہ ثابت ہے کہ معمولی بڑھی عورت بھی حضرت عمرؓ کو ٹوک کر ان کے حکم میں ترمیم کرا سکتی تھی۔

کچھ بھی ہو یہ پہلا اہم مسئلہ ہے جس میں بجائے اس کے کہ اختلاف کو باقی رکھا جاتا امت کو ایک ہی اتفاقی مسلک پر جمع کرنے کی کوشش حضرت عمرؓ نے کی۔ اسی کے ساتھ لوگ حج والے متعہ یعنی تمتع کے متعلق بھی حضرت عمرؓ کے خاص حکم کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ مسئلہ معمولی ہے جس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں، البتہ دو اور مسئلے جن کا دین کے "غیر بیناتی" شعبہ سے حالانکہ تعلق ہے لیکن دیکھا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان دو مسئلوں میں بھی مسلمانوں کے اختلافی طرز عمل کے باقی رکھنے کو پسند نہیں فرمایا۔

جنازے کی نماز میں تکبیروں کی تعداد کتنی ہے ؟ اس سلسلہ کا یہ پہلا مسئلہ ہے، عہد فاروقی تک معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ چار بعض پانچ بعض چھ تکبیریں تک جنازے کی نماز میں کہنے کے علاوہ

تھے، یہ بھی بیان گیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی حکومت کے زمانے میں بھی لوگ یہی کر رہے تھے۔ ابراہیم نخعیؒ والی روایت کے الفاظ ہیں:

فَفَعَلُوْا ذٰلِكَ فِيْ وِلَايَتِهٖ (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۹۸) حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں لوگوں نے یہی کیا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہؓ نے کسی خاص تعداد کی پابندی کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اختلاف کی وجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طرزِ عمل تھا لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی خلافت کے کچھ دن گزر جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابیوں کو جمع کیا اور اپنا خیال ان کے سامنے پیش کیا کہ اس مسئلہ میں اختلافات کا باقی رہ جانا کچھ مناسب نہیں ہے۔ چاہیئے کہ آپ لوگ کوئی خاص تعداد تکبیروں کی طے کر لیں اور اس پر سب متفق ہو جائیں تاکہ

يَجْتَمِعُ بِهٖ عَلَيْهِ مَنْ بَعْدَكُمْ آپ کے بعد بھی مسلمان اسی پر متفق ہو جائیں۔

روایت میں ہے کہ صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کے مشورے کو قبول کیا۔ بحث و مباحثہ کے بعد طے یہ طے ہوئی کہ جنازے کی آخری نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پڑھائی ہے اس میں جتنی تکبیریں آپ نے کہی تھیں اسی پر سب لوگ جمع ہو جائیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ آخری فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس باب میں چار تکبیروں کا تھا یعنی چار تکبیروں سے آپ نے جو نمازِ جنازے کی پڑھائی تھی اس کے بعد کسی کے جنازے پر نماز پڑھانے کا موقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ملا۔ پس آپ کے اسی آخری فعل کو اختیار کر لیا گیا۔

یقیناً یہ سوال ہوتا ہے کہ جیسے بیسیوں مسائل ایسے تھے جن میں اختلاف کو باقی رہنے دیا گیا تھا تو جنازے کی ان تکبیروں کی تعداد کا مسئلہ ایسا کونسا اہم مسئلہ تھا جس کے لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اختلاف کو مناسب نہ خیال کیا۔ کوئی خاص بات اس سلسلہ میں اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی ہے البتہ اسی روایت کا ایک فقرہ جو یہ ہے کہ صحابہؓ کو سمجھاتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا تھا:

وَالنَّاسُ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِالْجَاهِلِيَّةِ — جاہلیت سے لوگوں کا رشتہ ابھی پرانا نہیں ہوا ہے پس یہی

فَاجْمَعُوْا عَلٰی شَیْءٍ۔ — مناسب ہے کہ کسی ایک پہلو پر سب اکٹھے ہو جاؤ۔

ہو سکتا ہے کہ ان الفاظ سے حضرت عمرؓ نے مسئلہ کی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہو[۱]۔

دوسرا مسئلہ اسی سلسلہ میں غسل جنابت سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں کہ غسل ہم بستری سے کس وقت واجب ہوتا ہے؟ ابتدائے اسلام میں بعض صحابہ کا خیال تھا کہ جب تک انزال نہ ہو صرف ہم بستری سے غسل واجب نہیں ہوتا یہی مسئلہ ہے جس کی تعبیر

اِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ — پانی پانی ہی سے واجب ہوتا ہے۔

سے کرتے ہیں، یعنی پانی سے غسل کرنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے کہ پانی خارج ہوا ہو، حضرت عمرؓ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور جن کا یہ خیال تھا ان سے آپ نے دریافت کیا کہ تم لوگوں نے یہ بات کہاں سے پیدا کی ہے گو روایات اس باب میں مختلف ہیں، مگر

---

[۱] اس وقت مجھے حضرت الاستاذ الامام الکشمیری کا ایک نفسیاتی نکتہ یاد آگیا جس کا ذکر اپنے درس حدیث میں حضرت عموماً فرمایا کرتے تھے آپ کا خیال تھا کہ شادی اور بیاہ کے مواقع میں عوام جن لایعنی حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں مثلاً گشت دولہے کو کرانا، آتش بازی، شور و ہنگامہ وغیرہ یا طول فضول مصارف ان کو "بدعت" کی مد میں بعض مولوی جو داخل کرتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ ممانعت تو ان امور کی کرنی چاہئے لیکن نہ اس لئے کہ وہ بدعت ہیں، اس لئے کہ بدعت تو دین میں اضافہ کا نام ہے اور اس قسم کے مواقع میں جن افعال کا ارتکاب کیا جاتا ہے کوئی بھی ان کو دین سمجھ کر نہیں کرتا یعنی یہ خیال سامنے نہیں رہتا کہ کرنے سے خدا خوش ہوگا یا ناخوش ہوگا۔ ہاں ان چیزوں کی ممانعت دوسرے شرعی دفعات کے تحت ہو سکتی ہے یعنی اسراف (فضول خرچی) کو اسلام نے جو حرام قرار دیا ہے یا سفاہت اور بیوقوفی کے حرکات یہ ہو سکتے ہیں شاہ صاحب فرماتے تھے مگر موت کا مسئلہ اس سے مختلف ہے۔ موت کا تعلق چونکہ دوسری دنیا سے ہے اس لئے جو افعال موت کے سلسلہ میں کئے جاتے ہیں عموماً سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کا دین ہی سے تعلق ہے اسی لئے غیر شرعی امور جن کا رواج موت کے وقت لوگوں میں ہے ان پر بدعت کے لفظ کا اطلاق صحیح ہے۔ میں یہاں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جنازے کی نماز کا تعلق ظاہر ہے کہ موتی سے ہے اسی چیز نے اس میں دینی اہمیت کا اضافہ کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فرمانا کہ لوگ نئے نئے مسلمان ہیں شاید اسی طرف اشارہ ہو کہ موتی سے تعلق ہونے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں اس اختلاف میں زیادہ شدت پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کی دینی تفریق کا سبب بن جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی مصلحت نے اختلاف کے ختم کرنے پر آپ کو آمادہ کیا ہو۔ فقہائے حنفیہ نے بعض کتابوں میں لکھ بھی دیا ہے کہ چار تکبیروں سے زائد تکبیر جنازے میں کوئی امام اگر کہے تو مقتدی کو چاہئے کہ اس کی پیروی نہ کرے۔ مولانا انور شاہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اس سے اختلاف کیا ہے (دیکھو عرف الشذی) میں یہ کہتا ہوں کہ اس حنفی فقہ کا تشدد اس کی شہادت ہے کہ مسئلہ میں شدت کے پیدا ہونے کی صلاحیت تھی راز دی ہے کہ اس کا تعلق موت سے ہے۔

زیادہ رجحان اسی طرف ہے کہ ان لوگوں نے وجہ صرف یہ بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم لوگ ایسا کرتے تھے لیکن ہمیں ممانعت نہیں کی گئی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے اس فعل علم تھا؟ جواب میں کہا گیا کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ حضرت عمرؓ نے تب مہاجرین وانصار کو جمع کیا اور دریافت کیا کہ آپ لوگوں کا خیال اور علم کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ لوگوں کی رائیں مختلف ہیں حضرت علیؓ اور معاذ بن جبلؓ کو اصرار تھا کہ صرف ہمبستری وجوب غسل کے لئے کافی ہے اسی کی تعبیر تھی کہ

اِذَا جَاوَزَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ۔	جب مرد کی شرمگاہ عورت کی شرمگاہ سے تجاوز کر جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔

لیکن دوسرے فریق کو اپنے خیال پر اصرار تھا آخر اس مسئلہ میں ازواج مطہرات سے دریافت کیا گیا حضرت علیؓ اور معاذؓ کا جو فتویٰ تھا اس کی تائید وہاں سے ہوئی اسی کو حضرت عمرؓ نے فیصلہ قرار دیا اور اس کے بعد آپ نے اعلانِ عام کرتے ہوئے فرمایا۔

لَا اَسْمَعُ بِرَجُلٍ فَعَلَ ذٰلِكَ اِلَّا اَوْجَعْتُهُ ضَرْبًا۔ (ازالۃ الخفاء، ج ۲ ص ۸۸)	اس کے بعد بھی اگر میں نے یہ سنا کہ کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے مار کا دکھ پہنچاؤں گا۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ بھی دین کے فروع سے تعلق رکھتا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں بھی مصلحت محسوس کی کہ اسی وقت اگر اس کو طے نہ کر دیا گیا تو آئندہ کسی بڑے فتنہ کا یہ مقدمہ نہ بن جائے۔ اسی موقعہ پر آپ نے فرمایا تھا کہ

اَنْتُمْ اَصْحَابُ بَدْرٍ وَقَدِ اخْتَلَفْتُمْ فَمَنْ بَعْدَكُمْ اَشَدُّ اخْتِلَافًا۔	تم لوگ ان صحابیوں میں ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر میں شریک تھے، تم اختلاف کرتے ہو تو تمہارے بعد والے زیادہ اختلاف میں سخت ہو جائیں گے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدِ اعتدال سے تجاوز کی صلاحیت آپ کو اس اختلاف میں بھی نظر آئی جیسے جنازے کی نمازوں کی تکبیروں کے متعلق بھی آپ کا یہی خیال تھا اس وقت بھی یہ کہتے ہوئے کہ لوگ جاہلیت سے ابھی نکلے ہیں آئندہ یہ اختلاف زیادہ شدت اختیار کرلے گا جنازے والے

مسئلہ میں تو خیر ایک خصوصیت نظر بھی آتی تھی لیکن غسل والے مسئلہ میں اختلافات کی شدت کا اندیشہ کیوں ہوا میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا بجز اس کے یہ فاروقی بصیرت تھی اور ان کو حق تھا کہ اس قسم کے امور میں اپنی بصیرت کے مطابق فیصلہ کریں۔

اس میں شک نہیں جنازے والے مسئلہ میں بھی ایک اچھی نظیر یہ ملتی ہے کہ چار رکعتوں سے زیادہ جب کسی وقت کی کوئی نماز نہیں ہے تو تکبیریں جو جنازے کی نماز میں رکعتوں ہی کی قائم مقامی کرتی ہیں ان کو بھی چار سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔ بعض روایتوں میں حضرت عمرؓ کے اس نکتہ کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے (دیکھو ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۹۸) اسی طرح غسل والے مسئلہ میں یہ نظیر پیش کی جاتی ہے کہ زنا کی سزا رجم یا تازیانہ انزال پر موقوف نہیں ہے بلکہ صرف وقاع کافی ہے تو غسل کے لئے بھی وقاع ہی کیوں کافی نہ ہوگا اس نظیر کا بھی ذکر آثار میں کیا گیا ہے (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۸۸)

مگر اس قسم کے ترجیحی وجوہ تو قریب قریب غیر بنیادی مسائل کے سارے اختلافات میں ملتے ہیں پس مناسب یہی ہے کہ ان دونوں مسائل میں بجائے اختلاف کے تمام مسلمانوں کو ایک ہی نقطہ پر متفق کرنے کی وجہ صرف فاروقی بصیرت کے فیصلہ ہی کو قرار دیا جائے۔ آخر جس کی زبان پر خود پیغمبر نے حق کو گردش کرتے ہوئے پایا تھا اور جس کے منشار کے مطابق وحی ایک سے زیادہ دفعہ نازل ہوئی خیال کرنے کی بات ہے کہ اسی کو اس قسم کے فیصلوں کا اختیار نہ دیا جائے گا تو کس کو دیا جائے گا۔[۱]

۱؎ اصول فقہ کی ایک اصطلاح "مصالح مرسلہ" بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خود صاحب شریعت سے وجہ منقول نہ ہو مگر باوجود اس کے کسی حکم کا فیصلہ کیا جائے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے مصالح مرسلہ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے اَلْحُكْمُ عَلَى اعْتِبَارِ عِلَّةٍ لَمْ يَثْبُتْ اعْتِبَارُهَا مِنَ الشَّارِعِ (العرف الشذی ص ۲۳۵) حضرت الاستاذ الکشمیری قدس سرہ العزیز نے اسی موقعہ پر اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ اِنَّ الْخُلَفَاءَ الرَّاشِدِيْنَ مُجَازُوْنَ فِي اِجْرَاءِ الْمَصَالِحِ الْمُرْسَلَةِ وَ هٰذِهٖ مَرْتَبَةٌ فَوْقَ مَرْتَبَةِ الْاِجْتِهَادِ وَدُوْنَ مَرْتَبَةِ التَّشْرِيْعِ (یعنی خلفائے راشدین مصالح مرسلہ کی بنیاد پر فیصلہ کا اختیار رکھتے تھے اور اجتہاد جو ائمہ مجتہدین سے متعلق ہے، مصالح مرسلہ والا حکم اس سے تو بلند مرتبہ کی چیز ہے لیکن تشریع یعنی کسی جدید قانون کا اضافہ جو فقط پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہے یہ اس سے مصالح مرسلہ والا اختیار کم درجہ رکھتا ہے) (کتاب مذکور ص ۲۳۵) حضرت الاستاذ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ائمہ مجتہدین کے اجتہادی اختیارات کی جو نوعیت ہے بس یہی نوعیت خلفائے راشدین کے اختیارات کی بھی ہے ان کو مزید اور کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں مگر شاہ صاحب نے اس خیال کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے طرز عمل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مصالح مرسلہ کی بنیاد پر حکم لگانے کا اختیار خلفائے راشدین کو حاصل تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کے مسائل کی تحقیقات کے سلسلے میں مثلاً غسل کے وجوب میں صرف ہم بستری کافی ہے یا مادۂ تولید کا خروج بھی اس کے لئے ضروری ہے، اس باب میں امہات المؤمنین سے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کا علم حاصل نہ ہوتا تو صحابہؓ کے جس اختلاف کو مٹا کر ایک ہی نقطۂ نظر کے قائم کرنے میں حضرت عمرؓ کو کامیابی ہوئی نہ ہو سکتی تھی آخر جن کا خیال اس کے برعکس تھا ان کو اپنے مسلک سے ہٹانے کے لئے حضرت عمرؓ بے چارے کیا کر سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اس خطرے کا اظہار کر کے رہ جاتے کہ اس مسئلہ کو اختلاف کے اسی رنگ میں آج اگر چھوڑ دیا جائے گا تو اس میں صلاحیت معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں اس کے متعلق اختلاف کی کیفیت خطرناک حد تک شدید ہو جائے۔

لیکن جب عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یاں سے یہ علم حضرت عمرؓ کے پاس آیا کہ صرف ہم بستری وجوبِ غسل کے لئے کافی ہے، تب آپ کے قلب میں قوت پیدا ہوئی اور کیسی قوت؛ اسی کے بعد آپ نے وہ فقرہ فرمایا تھا جسے پہلے نقل کر چکا ہوں یعنی

لَا اَسْمَعُ بِرَجُلٍ فَعَلَ ذٰلِكَ اِلَّا اَوْجَعْتُهٗ ضَرْبًا۔ (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۸۸)

اس کے بعد بھی میں نے سنا کہ کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے مار کا دکھ پہنچاؤں گا۔

اسی طرح ایک اور اہم تاریخی مسئلہ حضرت عمرؓ ہی کے عہد میں اس وقت پیش آیا جب ایک دفعہ آپ شام تشریف لے گئے تھے، ابھی شام نہ پہنچنے پائے تھے بلکہ عرب اور شام کے درمیان شام کے حدود پر سرغ نامی جو مقام تھا وہیں تک پہنچے تھے کہ شامی فوجوں کی چھاؤنیاں جہاں قائم تھیں وبا یعنی طاعون پھوٹ پڑا، فوجی سپہ سالاروں نے مناسب خیال کیا کہ حضرت عمرؓ کو اس واقعہ سے آگے بڑھ کر مطلع کر دیا جائے۔ سرغ میں ان سے ملاقات ہوئی، سپہ سالاروں کے سردار حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے بلکہ حضرت عمرؓ کو فوج میں طاعون کے پھوٹ پڑنے کی خبر سنائی حضرت عمرؓ وہیں ٹھہر گئے اور حکم دیا کہ میرے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابیوں کو فوج سے بھیج دو جنہوں نے مکہ معظمہ سے ہجرت کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا اصطلاحاً

جن کا نام اس زمانہ میں "مہاجرین اولین" تھا جتنے افراد شامی فوج میں اس جماعت کے موجود تھے وہ حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے سب سے مشورہ کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے آیا اس وبازدہ علاقہ میں داخل ہو جاؤں یا سرغ ہی سے مدینہ لوٹ جانا مناسب ہوگا؟ جواب میں رائیں لوگوں کی مختلف ہو گئیں، بعض کہتے تھے کہ آخر جن اغراض کو پیش نظر رکھ کر آپ نے سفر اختیار فرمایا تھا جب وہ اتنے اہم تھے کہ مدینہ چھوڑ کر سفر کی مشقت برداشت کرتے ہوئے سرغ تک آپ پہنچ چکے ہیں تو ان اغراض کی تکمیل کر کے واپس لوٹنا مناسب ہوگا، ان کا مقصد یہ تھا کہ طاعون واعون کا خیال نہ کیجئے اور چلے چلئے۔

لیکن دوسرا طبقہ ان ہی مہاجرین اولین میں ان حضرات کا بھی تھا جس نے اصرار کیا کہ آپ واپس لوٹ جائیے۔ کہتے تھے کہ ایسے خطرناک موقع پر آپ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خاص صحابیوں کو لے کر اقدام کرنا مناسب نہ ہوگا۔ رائے کے اس اختلاف کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگ تشریف لے جائیے۔ وہ فیصلہ چاہتے تھے اور ان بزرگوں نے بجائے فیصلہ کے مسئلہ میں اور زیادہ تذبذب پیدا کر دیا تھا، پھر آپ نے ان لوگوں کو فوج سے بلوایا جو طبقہ انصار سے تعلق رکھتے تھے، یہی سوال ان کے سامنے بھی پیش کیا ان میں بھی اسی اختلاف رائے کو حضرت عمرؓ نے پایا ان کو بھی آپ نے رخصت کر دیا اور حکم دیا کہ قریش کے ان سربرآوردہ لوگوں میں سے جو جو فوج میں موجود ہوں بھیج دو جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچے یعنی جنہیں "مہاجرۃ الفتح" کہتے تھے، کہتے ہیں کہ قریش کے یہ مشیخہ (بھاری بھرکم بڑے لوگ) جب حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے اس مسئلہ میں مشورہ لیا گیا تو اب کی ان میں سے ہر ایک کی رائے یہی ہوئی کہ آپ ہرگز ہرگز آگے بڑھنے کا ارادہ نہ فرمائیں اور یہیں سے مدینہ منورہ لوٹ جائیں حضرت عمرؓ نے ان کے مشورہ کو قبول کر لیا اور اعلان کر دیا گیا کہ سرغ ہی سے آپ واپس ہو جائیں گے۔ بعض اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے اس ارادہ پر اعتراض کیا، خصوصاً ابوعبیدۃ بن الجراح نے کہا کہ آپ خدا کی تقدیر سے بھاگتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے ان ہی کے اِس

اعتراض کے جواب میں وہ مشہور حکیمانہ فقرہ فرمایا کہ

نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ إِلٰى قَدَرِ اللّٰهِ [1] میں خدا کی تقدیر سے خدا کی تقدیر کی طرف بھاگ رہا ہوں۔

ابھی حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہؓ میں یہ گفتگو ہی ہو رہی تھی کہ اتنے میں حضرت عبدالرحمن بن عوف صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگئے وہ کسی ضرورت سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے دونوں کی گفتگو کو سن کر فرمایا کہ میرے پاس اس مسئلہ کے متعلق ایک "علم" ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل و تقریر ہی کا نام علم تھا، پھر اپنے علم کا اظہار ان الفاظ میں فرمانے لگے:

---

[1] تقدیر و تدبیر کی پرانی جنگ کو جن تقریروں سے طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے میرے خیال میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ چند الفاظ سب پر بھاری ہیں۔ مقصود حضرت کا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "تقدیر" خداوند تعالیٰ کے مقرر قوانین ہی کا تو نام ہے، پس جیسے مرض اور بیماری بھی خدا کے قانون ہی کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے اسی طرح مرض کا علاج جن دواؤں سے کیا جاتا ہے یہ دوائیں بھی کسی دوسرے کی بنائی ہوئی نہیں ہوتیں، بلکہ جیسے بیماری خدا کا قانون ہے اسی طرح دوا میں شفا بخشی کی قوت یہ بھی خدا کا قانون اور اس کی تقدیر ہی کا نتیجہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے تمثیلاً ابو عبیدہ سے کہا بھی تھا کہ تمہارے پاس اگر اونٹ ہوں اور ان کو چرانے کیلئے گھر سے باہر نکلو، سامنے دو وادیاں نظر آئیں ایک میں سبزہ لہلہا رہا ہو، مرغزار ہو۔ اور دوسری خشک میدان کی شکل میں ہو اور تم اس خشک وادی کو چھوڑ کر ہری بھری وادی کی طرف اگر رخ کرو گے تو کیا خدا کی تقدیر سے یہ بھاگنا ہوگا؛ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے جس وادی میں چرانے کا موقعہ تم کو ملے گا دونوں خدا کی تقدیر ہی ہوگی۔

طاعون کا مسئلہ حضرت عمرؓ کے عہد سے اس وقت تک مختلف فیہا بنا ہوا ہے۔ حنفی مکتب خیال کے علماء کی رائیں بھی مختلف ہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے درس حدیث میں ہمیشہ درمختار کے اس جزئیہ کو نقل فرمایا کرتے تھے، جس کا ذکر "مسائل شتّٰی" کے عنوان کے تحت اس کتاب میں کیا گیا ہے یعنی طاعون زدہ آبادی سے ہٹ جانے کی اجازت دی گئی ہے، اسی میں لکھا ہے کہ ممانعت صرف ان لوگوں کی حد تک محدود ہے جو سمجھتے ہیں کہ ان کی تدبیر سے جان بچ گئی۔ اس قسم کے اعتقاد رکھنے والے کو تو شاید دوا کرنے کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ خود بخاری میں لَا یُخْرِجُکُمْ اِلَّا فِرَارًا مِنْهُ کے الفاظ سے بھی لوگوں نے طاعون زدہ آبادیوں سے نقل مکان کا جواز نکالا ہے یعنی فراراً نکلنا ناجائز اور علاجاً نکلنا جائز ہے، جیسے علاج و معالجہ کے سارے طریقے خدا کی بیماریوں سے بھاگنا نہیں ہے، اسی طرح وبازدہ علاقے سے ہٹ جانا علاج ہی کا ایک طریقہ ہے۔ ۱۲

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِأَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهُ۔ (ج ۲ ص ۱۳۵)	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ کسی علاقہ میں اس وبا کے پھوٹ پڑنے کی خبر جب تمہیں معلوم ہو تو اس علاقہ کی طرف نہ جاؤ اور جس علاقہ میں تم مقیم تھے اگر وہیں یہ وبا پھوٹ پڑے تو وبا سے بھاگنے کے قصد سے اس علاقہ سے نہ نکلو۔

ظاہر ہے کہ حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فیصلہ کی تائید موجود تھی جو اس طاعون زدہ علاقہ میں نہ جانے کے متعلق آپ نے اختیار فرمایا تھا گویا عین منشار نبوی کی تکمیل فرما رہے تھے، لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے حدیث سن کر حضرت عمرؓ نے الحمد للہ کہا اور اپنے فیصلہ کے مطابق جس کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے بھی ہو چکی تھی، آپ سرغ ہی سے مدینہ لوٹ گئے۔

تدوینِ حدیث کا خیال لیکن پھر بربنائے مصلحت تامل

بہرحال طاعون زدہ علاقوں میں رہنے نہ رہنے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا حدیث جسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پیش کیا یا وجوب غسل کے مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے متعلق صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جو علم تھا یہ اور اسی قسم کے متعدد ایسے واقعات حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں پیش آتے رہے ہیں جن سے ایک طرف تو اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ دین کے اس حصہ کی تبلیغ ایسے رنگ میں کی گئی تھی کہ مہاجرین و انصار صحابہ کا عام گروہ بسا اوقات اس سلسلہ کی حدیثوں سے ناواقف نظر آتا ہے اور کتنا ناواقف کہ ہزار ہا ہزار صحابیوں کے درمیان ایک دو صاحب تک ان حدیثوں کا علم محدود تھا اور دوسری طرف جہاں تک میں سمجھتا ہوں غالباً ان ہی تجربات کے تسلسل نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان حدیثوں کے متعلق طرزِ عمل کے بدلنے پر شاید آمادہ کیا، میرا مطلب یہ ہے کہ بیہقی نے مدخل میں اور ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں زہری کے حوالہ سے حضرت عروہ بن زبیرؓ کے اس بیان کو جو نقل کیا ہے کہ

اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَرَادَ اَنْ یَّکْتُبَ السُّنَنَ فَاسْتَفْتٰی اَصْحَابَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ ذٰلِکَ فَاَشَارُوْا عَلَیْہِ اَنْ یَّکْتُبَہَا۔ (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۴)	عمر بن خطابؓ نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوا لیا جائے تب انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ حدیثیں لکھوا لی جائیں۔

صحابہ سے فتویٰ لینے کے لئے ان کی مجلس شوریٰ میں حضرت عمرؓ کا اپنی تجویز کو رکھنا۔ بظاہر اس کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ ان حدیثوں کی تبلیغ میں بجائے عمومیت کے خاص خاص افراد تک ان کے علم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مصلحت کے پیش نظر پہنچایا تھا اور ایک زمانہ تک خود حضرت عمرؓ بھی اسی مصلحت کی بنیاد پر ان حدیثوں کے بیان کرنے میں اقلال پر جو اصرار کرتے رہے تھے یہی دریافت کرنا چاہتے تھے کہ کیا اس مصلحت کی رعایت کی ضرورت اب بھی باقی ہے؟ کیونکہ پہلے بھی میں کہہ چکا ہوں کہ اس خدمت کی نوعیت ایک وقتی خدمت کی تھی، نبوت اور نبوت سے قریب تر زمانوں میں عمومیت کا رنگ ان حدیثوں میں اگر پیدا ہو جاتا تو یقیناً آئندہ زمانے میں ان کے مطالبات میں زیادہ سختی پیدا ہو جاتی جو شارع علیہ السلام کا مقصود نہ تھا، سوال یہی تھا کہ وہ زمانہ گزر گیا یا ابھی ان اسباب کی مزاحمت کے سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے جن سے ان حدیثوں کے مطالبات میں شدت کے پیدا ہونے کا خطرہ پیش آسکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کی اس مجلس شوریٰ نے یہی طے کیا کہ وہ وقت گزر گیا اور اب قلم بند ہو کر مسلمانوں کی ایک نسل سے دوسری نسل تک اگر حدیثیں منتقل بھی ہوتی رہیں گی تو لوگ ان کے مطالبات کو اسلام کے بنیادی مطالبات کے برابر نہ قرار دیں گے۔

لیکن مجلس شوریٰ کے اس فیصلہ سے حضرت عمرؓ کا قلب مطمئن نہیں ہوا، لکھا ہے کہ استشارہ کے بعد حضرت عمرؓ نے دوسرے مسنون طریقہ یعنی استخارہ سے بھی فیصلہ کی یکسوئی میں مدد حاصل کرنی چاہی، فاروقی احتیاط اور اس کی نزاکتوں کی یہ انتہا ہے کہ بجائے ایک دو دفعہ کے عروہ کا بیان ہے کہ

فَطَفِقَ عُمَرُ یَسْتَخِیْرُ اللّٰہَ	کامل ایک مہینے تک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس معاملہ میں استخارہ کرتے

کوئی کتاب دنیا میں اس وقت اگر موجود ہوتی تو کیا نفسیاتی طور پر مسلمانوں کے قابو کی یہ بات تھی کہ ان حدیثوں کے ساتھ اور ان سے پیدا ہونے والے احکام و مطالبات کے ساتھ تعلق کی اسی کیفیت کو کیا باقی رکھ سکتے تھے جو آج خبر آحاد کی روایتوں کے ساتھ ان کے دلوں میں پائی جاتی ہے، چونکہ واقعہ سامنے نہیں ہے اس لئے کہنے والے جو کچھ چاہیں کہہ سکتے ہیں لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے استخارے کی دعاؤں میں جس خطرے کا احساس ہوا تھا یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ خلط و ملط لبس اور گڈمڈ ہوجانے کا خطرہ جس کا اظہار

فَوَاللّٰہِ لَا اَلْبِسُ کِتَابَ اللّٰہِ بِشَیْءٍ خدا کی قسم اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مشتبہ ہونے نہ دوں گا۔ کے الفاظ میں انھوں نے فرمایا ہے۔ یقیناً یہ اندیشہ واقعہ کی شکل اختیار کرلیتا آخر مسلمان بھی انسان ہی ہیں ان کے عواطف و جذبات، احساسات و تاثرات بھی وہی ہیں جو دوسرے انسانوں کے ہیں ان ہی بے احتیاطیوں اور مراتب کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ دوسری قوموں میں بایں شکل ظاہر ہوچکا تھا جس کی طرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ میں نے تم سے پہلے کی قوموں کو دیکھا کہ انھوں نے ایسی کتابیں لکھیں جن پر وہ اس طرح ٹوٹ کر گریں کہ اللہ کی کتاب چھوڑ دی گئی بظاہر ان کا اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب و ادیان میں یہی خلط مبحث پیدا ہوا یعنی ان کے یہاں دین کے بنیاتی اور غیر بنیاتی حصہ کی کوئی تقسیم باقی نہ رہی۔ مذہب کی طرف کسی چیز کا انتساب اس طاقت کو پیدا کردینے کے لئے کافی ہے جس قوت کو صرف ان مطالبات ہی کی حد تک محدود رہنا چاہئے جن کی براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے ذمہ داری بندوں پر عائد کی گئی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ کتاب و سنت و قیاس سے پیدا ہونے والے نتائج کی گرفت اور لزوم کی قوت میں فرق سمجھا جاتا ہے[1]۔

---

[1] یہ واقعہ ہے کہ آج بائبل کے نام سے کتابوں کا جو مجموعہ پایا جاتا ہے، ان کے متعلق اس کا پتہ چلانا کہ براہ راست موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں عطا کی گئی تھیں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام (باقی بر صفحہ آئندہ)

[illegible]

کام لیتے ہیں بلکہ مخلوق سے ہٹ کر مسئلہ کی اہمیت ہی کا تو تقاضا تھا کہ خالق کے آستانہ پر اپنے آپ کو گرا دیتے ہیں اور کامل ایک مہینے تک خدا کی چوکھٹ پر ان کی جبینِ نیاز جھک جھک کر جو "خیر ہو، اسی کی توفیق عطا کی جائے" کی مسلسل درخواست میں مصروف رہتی ہے۔

آخر بات اگر اتنی ہی آسان تھی تو ان طول طویل قصوں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ مگر سچ یہ ہے کہ جس دین کے بعد قدرت طے کر چکی تھی کہ نسلِ انسانی کو کوئی دین نہیں دیا جائے گا، اگر شروع ہی سے اس کے ہر ہر پہلو کی نگرانیوں میں ان نزاکتوں سے کام نہ لیا جاتا تو آج جس روز روشن کی شکل میں اس دین کے سارے عناصر ہر عامی و خاصی کے سامنے واضح ہیں، کیا یہ کیفیت ان کوششوں کے بغیر یوں ہی پیدا ہو جاتی۔

بلاشبہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ الہامی فیصلہ تھا کہ اپنی خلافت و حکومت کی جانب سے حدیثوں کے قلم بند کرانے کا خیال جو ان کے اندر حالات نے پیدا کر دیا تھا، اس خیال کو آپ نے دماغ سے باہر نکال دیا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس استشارہ و استخارہ نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو اور جن خطرات کا اندیشہ تھا ان کے تمام گوشوں کو نئے سرے سے تازہ کر کے آپ کے سامنے پیش کیا بظاہر اسی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف حکومت ہی کی طرف سے "تدوینِ حدیث" کے کام کو اپنے زمانہ میں ایک خطرناک اقدام آپ نے قرار دیا بلکہ آپ کے عہدِ خلافت تک تقریباً ایک قرن یا جگ (بارہ سال) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو گزر چکا تھا، اس عرصہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر لوگ حدیثوں کو پھر قلم بند کرنے لگے تھے۔ ابن سعد نے قاسم بن محمد کے حوالے جو روایت طبقات میں درج کی ہے اس کے ان الفاظ سے یعنی

اِنَّ الْاَحَادِیْثَ قَدْ كَثُرَتْ عَلٰی عَهْدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَاَنْشَدَ النَّاسَ اَنْ یَّاْتُوْهُ بِهَا۔	عمر بن الخطابؓ کے زمانے میں حدیثوں کی پھر کثرت ہو گئی تب حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے پاس پیش کریں۔

سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ سال کے عرصہ میں پھر حدیثوں کے کافی مجموعے لکھے جا چکے تھے

[illegible]

ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان امصار میں ہر مصر اور چھاؤنی میں بھی حضرت عمرؓ نے گشتی فرمان جاری کیا۔ حافظ ابو عمرو بن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں یحییٰ بن جعدہ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ

اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَرَادَ اَنْ یَّکْتُبَ السُّنَّۃَ ثُمَّ بَدَا لَہٗ اَنْ لَّا یَکْتُبَھَا ثُمَّ کَتَبَ فِی الْاَمْصَارِ مَنْ کَانَ عِنْدَہٗ شَیْءٌ فَلْیَمْحُہٗ۔ (جامع بیان العلم ص ۶۵ ج ۱)	عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (پہلے تو) چاہا کہ حدیثوں کو قلمبند کر لیا جائے مگر پھر ان پر واضح ہوا کہ قلم بند کرانا ان کا مناسب نہ ہوگا تب الامصار (یعنی چھاؤنیوں اور دوسرے اضلاعی شہروں) میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس (حدیثوں کے سلسلے کی) کوئی چیز ہو چاہئے کہ اسے محو کر دے یعنی ضائع کر دے۔

اس روایت سے بھی حضرت عروہ کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ ارادہ کرنے کے بعد حدیثوں کے لکھوانے کے خیال سے حضرت عمرؓ دست بردار ہو گئے۔ اور دوسرے مسلمانوں سے بھی آپ نے مطالبہ کیا کہ قرآن کے سوا ان کے زمانے کا لکھا ہوا کوئی دوسرا نوشتہ آئندہ پیدا ہونے والے مسلمانوں میں نہ پہنچنے پائے اس میں ان کی مدد کریں۔ یہ مسئلہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس گشتی فرمان کی تعمیل میں کتنی سرگرمی دکھائی گئی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ بجز دو تین مکتوبہ سرمایہ کے حدیثوں کے متعلق ایسا کوئی نوشتہ سرمایہ مسلمانوں میں باقی نہ رہا جس کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہو کہ عہدِ فاروقی سے پہلے وہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا۔

بحث کے ختم کرنے سے پہلے ایک شبہ کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، یعنی حضرت عمرؓ کے متعلق مذکورہ بالا روایتوں میں عموماً "السنن" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ میں نے کسی موقعہ پر دعویٰ کیا ہے کہ عام حالات میں "السنن" کا لفظ جب "الفرائض" کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے تو عموماً اس سے مراد قرآنی مطالبات یعنی الفرائض کے عملی تشکیلات ہی ہوتے ہیں، اس بنیاد پر سوال ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کیا قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات کو لکھوانے کا ارادہ کیا تھا، یا ان کے سوا عام

خبر آحاد کی ان حدیثوں کو قلم بند کرا لینا چاہتے تھے جن کا علم انفرادی طور پر صحابہ میں پھیلا ہوا تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے ان روایتوں میں چونکہ "السنن" کا استعمال "الفرائض" کے مقابلہ میں نہیں کیا گیا ہے اس لئے اس کو صرف قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات تک محدود کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، اگر مان بھی لیا جائے کہ یہاں بھی "السنن" سے مراد قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات ہی تھے تو مسئلہ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے آخر قرآن کے سوا جب قرآنی مطالبات کی عملی شکلوں کو بھی مکتوبہ شکل میں آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے پر حضرت عمرؓ آمادہ نہ ہوئے تو عام انفرادی حدیثوں کے متعلق اس باب میں جو منشا ہوگا وہ ظاہر ہے۔

بہر حال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی طے کیا کہ قرآن کے سوا جو چیز بھی ان کے زمانہ تک نوشتہ کی شکل میں آئندہ نسلوں میں پہنچے گی وہ تورات کے مثناۃ کی حیثیت اختیار کرلے گی اسی لئے نہ خود اپنی حکومت کی جانب سے اس کام کے انجام دلانے پر آمادہ ہوئے اور جہاں تک ان کے بس میں تھا دوسروں سے بھی انھوں نے یہی چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی تبلیغ میں عمومیت کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا تھا ان کو ایسے زمانے میں قلمبند نہ کریں جس کے بعد اس مصلحت کے متاثر ہونے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا تھا جسے پیش نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام کیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اندیشے کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو بعد کو پیش آیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حدیثوں کے نہ لکھوانے کے اس ارادے کو طے کرنے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی بعض علمی و عملی چیزیں جن کا قرآن میں کم از کم صراحۃً ذکر نہ تھا یعنی چاہنے والا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے[1] کہ قرآن کے رو سے ان کا ماننا ضروری نہیں ہے اپنے اس فیصلہ

[1] مثناۃ کا یہ لفظ خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے جس کا ذکر ابن سعد نے طبقات میں اور دوسری کتابوں میں بھی لوگوں نے کیا ہے کہ اپنے زمانے میں حدیثوں کے قلم بند کرانے کے متعلق حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ یہودیوں کے ہاں توراۃ کے ساتھ جو مثناۃ کی حیثیت ہے وہی حیثیت قرآن کے ساتھ حدیثوں کی اسلام میں ہو جائے گی۔ یہ مثناۃ کیا چیز ہے؟ یہودیوں کا خیال ہے کہ تورات کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو زبانی روایات کا (باقی بر صفحہ آئندہ)

کے بعد یعنی قرآن کے سوا نوشتہ کی شکل میں کوئی چیز باقی نہ رہے۔ حضرت عمرؓ کو ایک دوسرا خطرہ ستانے لگا یعنی ایسا نہ ہو کہ آئندہ کسی زمانے میں انکار کرنے والے ان چیزوں کا انکار کر بیٹھیں اور دلیل میں اسی واقعہ کو پیش کریں کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے، خصوصاً شادی شدہ زانی مردوں اور زانیہ عورتوں کے متعلق رجم (سنگسار) کرنے کی جو سزا ہے اس کے متعلق تو یہی نہیں کہ قرآن اس کے ذکر سے ساکت ہے بلکہ سورۃ النور میں زانی اور زانیہ کی سزا جلد (تازیانہ) جو بیان کی گئی ہے یعنی فرمایا گیا ہے کہ

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔ (ع ۱ پ ۱۸) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ہر ایک کے سو سو کوڑے مارو۔

اس کو پیش کر کے یہ غلط فہمی بھی پھیلائی جا سکتی ہے کہ "رجم" کے قانون کی قرآن سے تو نفی ثابت ہوتی ہے، حالانکہ ایک بے بنیاد غلط فہمی کے سوا یہ اور کچھ نہیں ہے[1]۔

بہرحال قانونِ رجم کے انکار کے اس خطرے سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس درجہ

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گزشتہ) یہی ایک ذخیرہ دیا گیا تھا تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک زبانی روایتوں کا یہ سلسلہ یہودیوں کے ہاں قلم بند نہ ہوا، دوسری صدی عیسوی یعنی حضرت موسیٰؑ سے ایک ہزار سات سو سال بعد ابی یہودا حق دوش نے پہلی دفعہ ان کو قلم بند کیا۔ یہی کتاب مشناۃ کے نام سے مشہور ہوئی پھر ایک شرح اس کی یروشلم میں ہوئی اور دوسری بابل میں اسی شرح کو مکرا کہتے ہیں جس کے معنی کمال ہیں مشناۃ اور مکرا کو ملا کر تالمود کہتے ہیں آدم کلارک اور ہارن وغیرہ مفسرینِ توراۃ نے لکھا ہے کہ پچھلے زمانے میں یہودیوں کے ہاں مشناۃ اور تلمود کی اہمیت تورات سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔ توراۃ کو علماء یہود ناقص، مغلق غیر مفہوم قرار دیتے تھے اور دین کی حقیقی بناء انھوں نے بجائے تورات کے مشناۃ پر آخر زمانہ میں قائم کر دی تھی جیوفس اور دوسری انسائیکلو پیڈیاؤں میں تفصیلات پڑھئے انگریزی نہ جاننے والوں کو مولانا رحمۃ اللہ الہندی کی کتاب اظہار الحق عربی ایڈیشن مطبوعہ مصر ۱۳۱۵ھ ج ۲ ص ۵۶ میں اس سلسلہ میں معلومات مل سکتی ہیں ۱۲

[1] (حاشیہ صفحۂ ھٰذا) معتزلہ وغیرہ فرقوں نے اس کا دعویٰ کیا بھی ہے حالانکہ رجم کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں تو صرف جلد (تازیانہ) کی سزا کا ذکر ہے لیکن زانی کو رجم کی سزا نہ دی جائے یقیناً قرآن سے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالہ سے بخاری میں ان کا یہ قول جو نقل کیا گیا ہے کہ رَجَمْتُهَا بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللهِ (اس عورت کو رجم کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی بنیاد پر میں نے دی ہے) اس میں تصریح کر دی گئی ہے کہ قرآن پر نہیں بلکہ سنت پر اس قانون کی بنیاد قائم ہے۔ یوں بھی کنوارے اور محصن (شادی شدہ) زانیوں کی سزا میں فرق ایک قدرتی امر ہے ۱۲

متاثر تھے کہ قرآن کے سوا حالانکہ طے کر چکے تھے کہ اپنے زمانہ کی کسی نوشتہ چیز کو مسلمانوں میں منتقل ہونے نہ دوں گا، لیکن اس انکار کے خطرے کی شدت کا احساس کبھی کبھی اتنا بڑھ جاتا تھا کہ اپنے خطبوں میں آپ فرماتے

لَوْلَا اَنْ يَّقُوْلَ قَائِلُوْنَ زَادَ عُمَرُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مَا لَيْسَ مِنْهُ لَكَتَبْتُ فِيْ نَاحِيَةِ الْمُصْحَفِ (بخاری ص۱۳۶) صحاح	اگر اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ کہنے والے یہ کہنے لگیں گے کہ عمرؓ نے اللہ کی کتاب میں اس چیز کا اضافہ کر دیا جو قرآن کا جز نہ تھا تو قرآن کے حاشیہ پر اس کو (یعنی رجم کے قانون کو) لکھ دیتا۔

لیکن مصحف کے حاشیہ پر لکھنے کی جرأت تو وہ کیا کرتے یوں بھی آپ نے اس قانون کو قلم بند کر دینے کی ہمت نہ فرمائی۔ کبھی کبھی "رجم" کے اس قانون کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کا بھی ذکر ان الفاظ میں فرماتے کہ

اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ مِنْ بَعْدِكُمْ قَوْمٌ يُّكَذِّبُوْنَ بِالرَّجْمِ وَبِالدَّجَّالِ وَبِالشَّفَاعَةِ وَبِعَذَابِ الْقَبْرِ وَبِقَوْمٍ يَّخْرُجُوْنَ مِنَ النَّارِ بَعْدَ مَا امْتَحَشُوْا۔[1] (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۳۶)	کچھ لوگ عنقریب آئندہ زمانے میں ایسے بھی آنے والے ہیں جو رجم کے قانون کا اور دجال کے ظہور کا، واقعہ شفاعت کا، عذاب قبر کا اور اس بات کا کہ جلنے کے بعد جہنم سے بعض لوگ نجات یاب ہوں گے ان ساری باتوں کا انکار کریں گے۔

کیونکہ بظاہر قرآنی آیات سے ان چیزوں کا استنباط بھی ہر شخص کے لئے آسان نہ تھا[1] اسی لئے

---

[1] جن امور کا ذکر حضرت عمرؓ کے اس بیان میں کیا گیا ہے ان میں عذاب قبر کا مسئلہ ایسا ہے جس کے اشارات قرآن میں بھی ملتے ہیں، آل فرعون والی آیت اور يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ میں بھی لوگوں نے ان اشاروں کو پایا ہے موت کے وقت مرنے والوں کے سامنے جن غیبی حقائق کا ظہور ہوتا ہے ان کا ذکر بھی ایک سے زائد جگہ پر قرآن میں کیا گیا ہے ماسوا اس کے سورہ النبار کی آخری آیتیں یعنی اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (ہم نے دھمکایا تم کو قریب والے عذاب سے جس دن دیکھے گا آدمی ان چیزوں کو جنھیں اس نے اپنے آگے روانہ کیا تھا، اور کہے گا منکر کہ کاش ہم ہوتے خاک) اس آیت میں "عذاب قریب" میں قریب کا لفظ بتاتا ہے کہ کسی بعید عذاب کے مقابلہ میں آدمی قریبی زمانے میں اس سے دوچار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہنم کے عذاب، بعید کے مقابلہ میں یہ قبر ہی کا عذاب عذاب قریب ہونے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ آگے جو یہ کہا گیا کہ بھیجے ہوئے اعمال کو دیکھے گا یہ بھی، برزخی عذاب ہی کی خاصیت ہے کہ بجائے بدلہ بھگتنے کے آدمی کے اعمال مختلف شکلوں میں اس کے آگے پیش ہوں گے جن کو دیکھ دیکھ کر (باقی بر صفحہ آئندہ)

ان کو خطرہ گزرتا تھا کہ لوگ ان باتوں کا کسی زمانہ میں انکار نہ کر بیٹھیں، بظاہر اسی خطرے کے انسداد کی یہ تدبیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکالی کہ اقلال یعنی جہانتک ممکن ہو روایتیں کم بیان کی جائیں بجائے اس اقلال کے ان خاص امور کے متعلق اکثار یعنی کثرتِ ذکر کا طریقہ اختیار فرمایا خصوصًا اپنے خطبوں میں چرچا کر کے ان باتوں کو آپ نے اتنا مشہور کر دیا کہ خبر احاد کی حیثیت باقی نہ رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ علماء کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق مزید ایک اور قسم کا اضافہ کرنا پڑا یعنی متواتر اور خبر آحاد کے بیچ میں مشہور حدیثوں کی ایک اصطلاح مقرر کی گئی جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کی حیثیت نہ تو دین کے ان قطعی عناصر اور یقینی اجزا کی ہے جن کا انکار آدمی کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے یعنی تواتر کی راہ سے مسلمانوں کی ہر اگلی نسل سے پچھلی نسلوں میں جو چیزیں منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں یہ حیثیت بھی مشہور روایتوں کی نہیں ہے اور نہ ان کی حیثیت خبر آحاد کی ہے۔ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ درجۂ شہرت کو طے کر کے مسلمانوں تک جو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو کر پہنچی ہیں ان کا انکار بھی دین سے انکار کرنے والوں کو خارج کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشہور حنفی امام ابوبکر جصاص کا یہی خیال تھا لیکن عام طور پر علماء اس کے قائل نہیں ہیں، میں نے شاید پہلے بھی شمس الائمہ سرخسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قانونِ رجم اور مسح خفین جیسے مسائل کے منکر کے متعلق ان کا خیال تھا کہ

لٰكِنْ يُخْشٰى عَلَيْهِ الْاِثْمُ گناہ کا اندیشہ کیا جاتا ہے۔

بعضوں نے ان مشہور روایات کو بھی مختلف مدارج میں تقسیم کیا ہے، رجم والے قانون کی

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گزشتہ) گھبرائے گا اور اذیت محسوس کرے گا اور یہی وہ وقت ہے جب آدمی تمنا کرے گا کہ موت کے متعلق اس کا جو یہ خیال تھا کہ ازالہ احساس کی یہ تعبیر ہے یعنی مر کر آدمی مٹی میں مل جاتا ہے خاک دھول بن کر اڑ جاتا ہے کاش وہی واقعہ ہوتا۔ لیکن صورت حال اس سے بالکل مختلف نظر آئے گی یہ ہے وہ مطلب جو ان آیتوں سے میری سمجھ میں آیا ہے۔ اسی بنیاد پر برزخی عذاب کو قرآنی عذاب قرار دیتا ہوں یعنی عذاب قریب میرے نزدیک عذاب قبر ہی کی تعبیر ہے۔ نیز سورۃ الانعام میں اور سورۃ الواقعہ کی بعض آیتوں سے عذاب قبر کی طرف اشارے ملتے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ اسی طرح دجال کے شخصی وجود کے سوا شفاعت اور اہل ایمان کا آخری انجام نجات پر ہوگا۔ ان مسائل کو قرآن سے چاہا جائے تو فکر و تامل کے بعد مستنبط کیا جا سکتا ہے ۱۲

مثال دے کر لکھا ہے کہ اس قسم کی مشہور روایتوں کے منکر کو گمراہ قرار دیا جائے گا۔ صاحب کشف بزدوی نے عیسیٰ بن ابان حنفی امام کا قول نقل کیا ہے کہ

قِسْمٌ یُضَلَّلُ جَاحِدُہٗ وَلَا یُکَفَّرُ مِثْلَ خَبَرِ الرَّجْمِ۔ (کشف ج ۲ ص ۳۶۹)

ایک قسم مشہور روایتوں کی ایسی بھی ہے کہ اس کے منکر پر کفر کا فتویٰ تو نہیں لگایا جائے گا مگر اس کو گمراہ ٹھہرایا جائے گا مثلاً رجم کی روایت کا یہی حال ہے۔

بہر حال ان مسائل کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ مشہور روایتوں کے متعلق یہ مانتے ہوئے کہ

ھُوَ اسْمٌ لِخَبَرٍ کَانَ مِنَ الْاٰحَادِ فِی الْاَصْلِ اَیْ فِی الْاِبْتِدَاءِ۔ (کشف ص ۳۶۸)

کہ خبر مشہور درحقیقت ان ہی خبروں کو کہتے ہیں جو ابتداء میں آحاد ہونے کی حیثیت رکھتی تھیں۔

لیکن محض اس لئے یعنی

لِاتِّفَاقِ الْعُلَمَاءِ مِنَ الصَّدْرِ الْاَوَّلِ وَ الثَّانِیْ عَلٰی قُبُوْلِہٖ۔ (ص ۳۶۹)

صدر اول (عہد صحابہ) اور دوم (یعنی عہد تابعین) کے علماء نے چونکہ ان کے ماننے پر اتفاق کر لیا تھا۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ خبر آحاد کی جو نوعیت ہوتی ہے وہ ان کی باقی نہ رہی بلکہ "صدر اول" میں نہ سہی اس کے بعد بھی یعنی قرن ثانی و ثالث تک کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس زمانے تک جن خبروں میں شہرت کا رنگ پیدا ہو گیا تھا، ان کا شمار بجائے خبر آحاد کے خبر مشہور میں کیا جائے گا۔ صاحب کشف نے لکھا ہے کہ

وَالْاِعْتِبَارُ لِلْاِشْتِھَارِ فِی الْقَرْنِ الثَّانِیْ وَالثَّالِثِ وَلَا عِبْرَۃَ لِلْاِشْتِھَارِ فِی الْقُرُوْنِ الَّتِیْ بَعْدَ الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَۃِ[1]۔ (کشف ص ۳۶۹)

بہر حال قرن دوم و سوم (تابعین و تبع تابعین) کے عہد میں جو چیزیں شہرت کے درجہ تک پہنچ گئی تھیں (ان کی شہرت کا تو اعتبار کیا جائے گا) مگر ان تینوں قرون کے بعد کی شہرت ناقابل لحاظ غیر مؤثر قرار پائے گی۔

---

[1] لکھا ہے کہ قرونِ ثلٰثہ کے بعد تو تقریباً ساری آحاد خبریں چونکہ مشہور ہو گئیں اس لئے پچھلے قرون کی شہرت کا اعتبار نہ کیا جائے گا ۱۲

جس کا مطلب یہی ہوا کہ "خبر آحاد" والی حدیثوں کے ذخیرہ سے جن روایتوں میں شہرت کی کیفیت عہد صحابہ ہی میں نہیں بلکہ عہد تابعین و تبع تابعین میں پیدا ہو گئی ہو، ان کو بھی مشہور خبروں میں شمار کر لیا گیا ہے[1]۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ قلم بند ہوئے بغیر صرف زبانی چرچے کی زیادتی کی وجہ سے عہدِ صحابہ ہی نہیں بلکہ اس کے بعد والے دو قرنوں میں بھی جن معدودے چند روایتوں میں شہرت کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، جب ان کو "خبر آحاد" کے زمرے سے علماء نے خارج کر دیا تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلافت و حکومت کی طرف سے لکھوایا ہوا حدیثوں کا کوئی مجموعہ مسلمانوں کی پچھلی نسلوں تک منتقل ہوتا ہوا اگر پہنچتا تو اس کے ساتھ لوگوں کے قلبی تعلقات کی جو کیفیت ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کو احاد خبروں کی شکل میں چھوڑا تھا ان میں سے بعض چیزوں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خواہ زبانی تذکروں کے ذریعہ ہی شہرت کا رنگ کیوں پیدا کیا؟ یا حضرت عمرؓ کے بعد قرن ثانی و ثالث والوں نے ان روایتوں کو کیوں مشہور کر دیا یہ ایک جداگانہ بحث ہے اور علاوہ "مصالح مرسلہ" کے جسے خلفاء راشدین کے خصوصی اختیارات میں شمار کیا جاتا ہے قرون مشہود لہا بالخیر کے فیصلوں کے متعلق بھی یہ مانا گیا ہے کہ خاص دینی بصیرت ہی کے تحت ان کو بھی مناسب نظر آیا کہ بجائے خبر آحاد کی شکل میں باقی رکھنے کے ان میں شہرت کی کیفیت پیدا کر دی جائے۔

کچھ بھی ہو مجھے اس سے بحث بھی نہیں اور علماء نے لکھا بھی ہے کہ صحابہ کے بعد والے قرون میں جو روایتیں مشہور ہوئی ہیں، ان کے انکار کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ خطاکار قرار دیا

---

[1] اگرچہ ان مشہور روایتوں میں ایسی روایتیں جن میں شہرت کا رنگ عہد صحابہ میں پیدا ہو چکا تھا اس کو مشہور روایتوں کی ان قسموں پر ترجیح دی جاتی ہے جن میں یہی کیفیت بعد والے قرون میں پیدا ہوئی، تاہم اجمالی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شہرت کے درجہ تک ان تینوں قرون میں سے کسی قرن کے اندر جو روایتیں پہنچ گئی تھیں ان کو خبر آحاد کی مد سے نکال کر مشہور روایتوں میں داخل کر دیا جائے گا۔ تفصیل کے لئے اصولِ فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے ۱۲

جاسکتا ہے، لیکن کفر ہی نہیں بلکہ گمراہی کا انتساب بھی انکار کرنے والے کی طرف مشکل ہے[1] جیسے خلفاء راشدین کے عہد میں مشہور ہونے والی روایتوں کے منکروں کی تضلیل کا فیصلہ کیا گیا ہے یعنی ان لوگوں کو گمراہ سمجھا جائے گا جو خلفائے راشدین کے زمانہ میں مشہور ہو جانے والی روایتوں کے نتائج کا انکار کرتے ہیں اور میرے نزدیک مؤمن کے ایمان کا اقتضاء بھی یہی ہے۔

یہ تھی روئداد ان خدمات کی جو عہد فاروقی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق انجام دی گئی جن کا حاصل یہی ہے کہ بجز چند خاص روایتوں کے خبر آحاد کے سارے ذخیرے کو خبر آحاد ہی کی شکل میں باقی رکھنے کی جو ممکنہ تدبیریں ہو سکتی تھیں حضرت عمرؓ نے ان کے اختیار کرنے میں پوری مستعدی اور بیدار مغزی سے کام لیا۔ کوشش کا کوئی دقیقہ اس راہ میں اٹھا نہ رکھا، اور ان چند روایتوں کو شہرت کے درجہ تک پہنچانے کی کوشش آپ نے جو کی اس کی وجہ یا تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی بصیرت کو اسی میں مصلحت نظر آئی، یا ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص منشار کا علم ان امور کے متعلق کچھ ہو جس سے نبوت کے خصوصی مذاق شناس حضرات ہی واقف ہو سکتے تھے۔

یہاں ایک بات یاد رکھنے کی یہ بھی ہے کہ "مشہور حدیث" کا مطلب چونکہ یہ ہے کہ ابتداء میں خبر آحاد کی شکل میں رہنے کے بعد صحابہ اور تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں عام طور پر اتنی مشہور ہو گئی کہ

رَوَتْهُ جَمَاعَةٌ لَا يُتَصَوَّرُ تَوَاطُؤُهُمْ عَلَى الْكَذِبِ۔ (کشف ج ۲ ص ۳۶۷)۔ اتنے آدمیوں نے ان کو بیان اور روایت کیا ہے جن کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ خواہ وہ جھوٹ پر متفق ہو گئے تھے۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ متواتر اور مشہور میں فرق صرف اس قدر ہے کہ متواتر روایات میں تو ضروری ہے کہ ابتداء سے آخر تک ایسی جماعت اس کو بیان کرتی ہو جس کے متعلق غلط بیانی کا احتمال باقی نہ رہے۔ عقل کے لئے ناممکن ہو جائے کہ اس کو جھوٹ قرار دے اور مشہور روایتوں میں بھی گو یہی کیفیت پائی جاتی ہے الا یہ کہ ابتداء میں اس کی حیثیت چونکہ خبر آحاد کی تھی اس لئے متواتر

---

[1] تفصیلات اصول فقہ کی کتابوں خصوصاً کشف بزدوی میں پڑھئے ۱۲

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ([illegible])

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عہدِ عثمانی اور تدوینِ حدیث

بہر حال عہدِ فاروقی ان ہی حالات میں ختم ہوا آپ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ آیا، علمی خدمات کے لحاظ سے عثمانی عہدِ خلافت کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے جس کی وجہ سے آج تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال تک سارے جہان کے مسلمانوں میں قرآن مجید کا ایک ہی نسخہ مروج ہے۔ "تدوینِ قرآن" نامی کتاب میں اس مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے[۱]۔ حدیث کے سلسلہ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تدوینِ حدیث کی تاریخوں میں لوگوں نے کسی خاص واقعہ کا ذکر اگرچہ نہیں کیا ہے لیکن حضرت عثمانؓ سے جو روایتیں کتابوں میں نقل کی گئی ہیں ہم ان ہی میں ایک اس روایت کو بھی پاتے ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔

مَا يَمْنَعُنِيْ اَنْ اُحَدِّثَ عَنْ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں مجھے
رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	یہ چیز نہیں روکتی کہ دوسرے صحابیوں سے حدیثوں کے یاد
اَنْ لَّا اَكُوْنَ اَوْعٰى اَصْحَابِهٖ عَنْهُ	رکھنے میں کچھ کم ہوں مگر بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ
وَلٰكِنِّيْ اَشْهَدُ لَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ	صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے میری طرف کوئی ایسی
مَنْ قَالَ عَلَيَّ مَا لَمْ اَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ	بات منسوب کی ہے جو میں نے نہ کہی ہو تو چاہئے کہ اپنا ٹھکانا
مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (ص ۶۵)	وہ دوزخ میں بنالے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کافی حدیثیں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی یاد تھیں، لیکن ان کی عمومی اشاعت سے آپ بھی پرہیز کرتے تھے، کیوں کرتے تھے؟ ممکن ہے کہ مذکورہ الفاظ سے یہ نتیجہ بھی نکالا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کے منسوب ہو جانے کا اندیشہ حضرت عثمانؓ کو تھا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جب دوسرے صحابیوں کے مقابلہ میں خود ان کا دعویٰ تھا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کم حدیثیں محفوظ نہیں ہیں۔

---

[۱] اسی کتاب کا جوہری خلاصہ ہمارے عزیز شاگرد مولوی غلام ربانی ایم۔ اے حیدرآبادی نے کیا، ندوۃ المصنفین دہلی کے مکتبہ نے اس کو شائع بھی کر دیا ہے۔ اس خلاصہ کے بعد یہ واقعہ ہے کہ میری اصل کتاب بھی شائع نہ ہو تو اس کی ضرورت باقی بھی نہیں رہتی ہے ۱۲

تو حفظ اور یاد کے اس دعوے کے بعد ان کے کلام کو اس پر محمول کرنا کہ اپنی یاد پر حضرتؓ کو کامل بھروسہ نہ تھا اس لئے روایت سے پرہیز کرتے تھے، کچھ بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ وہی بات یعنی خلیفہ ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی اشاعتِ عام کا طریقہ اگر وہ اختیار کرتے تو ظاہر ہے کہ ہر طرح کے لوگ ان سے سنی ہوئی روایت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کرتے۔ حضرت عثمانؓ کو زیادہ سے زیادہ اعتماد اپنے حافظہ اور اپنی یاد پر ہو سکتا تھا لیکن ان سے سن کر روایت کرنے والے بھی صحیح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسی بات کو منسوب کریں گے، جو کچھ انہوں نے سنا ہے حضرت عثمانؓ کو چونکہ اس پر بھروسہ نہ تھا اندیشہ تھا کہ اس راہ سے پیغمبر کی طرف غلط بات منسوب نہ ہو جائے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیثیں آپ نے سنی تھیں ان کی اشاعت عام نہیں فرماتے تھے اور اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خبر آحاد کی ان روایتوں کو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام مسلمانوں میں اشاعت ضروری خیال نہ فرمائی، اسی طرح آپ کے خلفاء نے بھی یہی طرزِ عمل دین کے اس غیر بنیادی حصہ کے متعلق اپنے اپنے زمانہ میں اختیار فرمایا اسی سے اندازہ کیجئے کہ ایک دفعہ برسرِ منبر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمانے لگے، مسند احمد ہی میں ہے:۔

عَنْ اَبِیْ صَالِحٍ مَوْلٰی عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ عُثْمَانَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ یَقُوْلُ اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ کَتَمْتُکُمْ حَدِیْثًا سَمِعْتُہٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَرَاھِیَۃَ تَفَرُّقِکُمْ عَنِّیْ۔ (ص ۶۵)	حضرت عثمانؓ کے غلام ابو صالح سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا وہ کہہ رہے تھے لوگو! ایک حدیث جسے میں نے رسول اللہ سے سنا ہے اسے تم لوگوں سے اب تک اس لئے چھپاتا رہا کہ تم کو یہ حدیث مجھ سے جدا کر دے گی۔

پھر آپ نے فرمایا کہ

ثُمَّ بَدَا لِیْ اَنْ اُحَدِّثَکُمُوْہُ لِیَخْتَارَ امْرَأٌ — مگر مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں اس حدیث کو تم سے بیان ہی کر دوں،

لِنَفْسِهٖ مَا بَدَا لَهٗ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ رِبَاطُ يَوْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ يَوْمٍ فِيْمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَنَازِلِ۔

پھر اس حدیث کے سننے کے بعد جو اپنے لئے جس پہلو کو چاہے آدمی اختیار کرے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک دن کا رباط (یعنی اسلامی سرحدوں کی چھاؤنیوں میں بہ نیت جہاد قیام) دوسری جگہوں میں ہزار دن گزارنے سے بہتر ہے۔

اور یہی خبر آحاد کی حدیثوں کے استعمال کا صحیح مقام ہے جس کی طرف حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارہ فرمایا کہ ان سے عمل کی محرومی عام دینی ثمرات سے گو آدمی کو محروم نہیں کرتی لیکن دین میں جو آگے بڑھنا چاہتے ہیں وہ چاہیں تو ان حدیثوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

لیکن بایں ہمہ حضرت عثمانؓ ہی کو ہم دیکھتے ہیں کہ الواحد بعد الواحد ہی کی راہ سے سہی جب کبھی ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کی خبر ہو جاتی تھی تو بجائے اپنی رائے کے اسی خبر واحد کی تعمیل کو اپنی سعادت خیال فرماتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حج کے ارادے سے مکہ معظمہ تشریف لے جا رہے تھے جب قدید نامی مقام پر پہنچے تو آپ کے باورچی خانے میں چند چکور گاؤں والوں نے شکار کر کے پہنچا دیئے، چکوروں کو بھون کر اور کھانوں کے ساتھ طشت میں مرتب کر کے حضرت عثمانؓ کے دسترخوان پر لوگوں نے چن دیا، راوی کا بیان ہے کہ

كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلَى الْحَجَلِ حَوَالِي الْجِفَانِ۔

ہم ان بھنے ہوئے چکوروں کو گویا طشت کے کنارے چنا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ اپنے رفقاء کے ساتھ جب دسترخوان پر بیٹھے تو دیکھا کہ بعض لوگ کھانے سے رک رہے ہیں وجہ دریافت کی تو لوگوں نے کہا کہ قافلہ میں حضرت علیؓ بھی ہیں، ان کا بیان ہے کہ حج کے احرام کی حالت میں شکار کے گوشت کا کھانا جائز نہ ہوگا، سننے کے ساتھ ہی حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ نے بلا بھیجا، دونوں میں گفتگو ہوئی، حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ

یہ شکار ہے جسے نہ میں نے شکار کیا ہے، اور نہ اس کے شکار کرنے کا حکم میں نے دیا تھا گاؤں والے جو احرام کی حالت میں نہ تھے یہ ان کا شکار کیا ہوا ہے اور میرے پاس ان ہی لوگوں نے کھانے کے لئے بھیجا ہے، پھر اس کے کھانے میں کیا مضائقہ ہے۔

علی کرم اللہ وجہہ نے یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہا کہ احرام ہی کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گورخر کی ران تحفہ میں ایک شخص نے پیش کی تھی لیکن رسول اللہ ص نے فرمایا کہ ہم لوگ احرام کی حالت میں ہیں، پس چاہئے کہ یہ ران ان لوگوں کو کھلا دی جائے جو احرام کی حالت میں نہیں ہیں۔

بعض دوسرے صحابی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سفر میں ساتھ تھے انھوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ جوں ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی یہ روایت حضرت عثمانؓ کو پہنچی لکھا ہے کہ دسترخوان سے اٹھ گئے اور

فَدَخَلَ رَحْلَهٗ وَأَكَلَ ذٰلِكَ الطَّعَامَ أَهْلُ الْمَاءِ۔ (مسند احمد ص ۱۰۰) — اپنے خیمے میں چلے گئے اور گاؤں والوں نے اس کھانے کو کھا لیا۔

اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے اجتہاد و تفقہ کی روشنی میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس نتیجہ تک پہنچے تھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن کر اس سے دست بردار ہو گئے حالانکہ چاہتے تو گفتگو کر سکتے تھے اور بعد کو جیسا کہ حاشیہ کے تفصیلات سے معلوم ہوا ہوگا ائمۂ اجتہاد

لہ اس مسئلہ میں کہ خشکی کے شکار کو بحالتِ احرام کسی نے خود شکار نہ کیا ہو بلکہ جو حالتِ احرام میں نہ ہو اسی کا شکار کیا ہوا ہو، محرم یعنی جو احرام باندھے ہوئے ہو کیا اس شکار کے گوشت کو استعمال کر سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہی نقل کیا جاتا ہے کہ کھا سکتے ہیں لیکن شوافع حضرت علیؑ کی اسی روایت کی بنیاد پر کھانے کی اجازت نہیں دیتے۔ مسئلہ میں ہر فریق کے دلائل فقہ و حدیث کی شروح میں تلاش کیجئے۔ حنفیہ کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ران اس لئے واپس نہ کی تھی کہ اس کا کھانا بحالتِ احرام ناجائز تھا کیونکہ دوسری روایت صحاح ہی کی حضرت ابوقتادہ والی سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے خود بھی احرام کی حالت میں اس قسم کے شکار کے گوشت کو استعمال فرمایا اور دوسروں کو بھی اجازت دی۔ پس ران کے واپس کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی کہ احرام کی حالت میں شکار کرنے کونے کی ہمت افزائی نہ ہو یعنی ممانعت سد الذریعہ کے تحت کی گئی تھی ۱۲

کی اکثریت نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیان کی ہوئی اس روایت کے مقابلہ میں ابو قتادہ[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کو ترجیح دی، حنفیوں اور مالکیوں کا وہی مذہب ہے جسے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

صَیْدٌ لَمْ نَصْطَدْہُ وَلَمْ نَامُرْ   شکار ہے جسے نہ ہم نے خود شکار کیا اور نہ شکار کرنے کا اس کے حکم دیا،

---

۱ یہ روایت صحاح ستہ کی ہر کتاب میں مل سکتی ہے، روایت چونکہ ذرا دلچسپ ہے جی چاہتا ہے کہ اس کا تذکرہ کر دوں۔ ابو قتادہ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھ کر صحابیوں کے ساتھ مکہ معظمہ کے قصد سے تشریف لے جا رہے تھے، یہ صلح حدیبیہ والے سفر کا واقعہ ہے، ابو قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے احرام نہیں باندھا تھا لیکن احرام بند لوگوں کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے آگے تشریف لے جا رہے تھے بہرحال میں ان ہی احرام بند لوگوں کے قافلہ میں تھا میری چپل ٹوٹ گئی تھی اُسے درست کر رہا تھا۔ اچانک ان ہی لوگوں کی جو احرام کی حالت میں تھے ایک گورخر پر نظر پڑی، میں تو چپل کے سینے میں مشغول تھا گورخر کے دیکھنے والے چونکہ حالتِ احرام میں تھے اور قاعدہ ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کرنے کی بھی ممانعت ہے اور شکار کی طرف اشارہ کرنے کی بھی، گورخر کے دیکھنے والے سخت کش مکش میں تھے مجھ سے وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے، لیکن دل سب کا چاہتا تھا کہ میں چونکہ احرام کی حالت میں نہیں ہوں کاش میری نظر اس گورخر پر پڑ جاتی۔ ابو قتادہؓ سے بعض روایتوں میں یہ بھی مروی ہے کہ گورخر کے دیکھنے والی جماعت میں بعض لوگوں نے بعض کو دیکھ کر آپس میں ہنسنا شروع کیا۔ شاید ان کے ہنسنے پر ان کی نظر اٹھی سامنے دامن کوہ میں گورخر کھڑا ہوا تھا، اس پر نظر پڑ گئی، ابو قتادہ بڑے مشاق شکاری تھے۔ نظر پڑنے کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر چاہا کہ گورخر پر حملہ کریں لیکن جلدی میں نہ کوڑا ہی لے سکے تھے اور نہ نیزہ، تب ان احرام بند لوگوں سے کہا کہ میرا کوڑا اور نیزہ تو دے دو لیکن سبھوں نے شکار کرنے کے اس فعل میں امداد دینے سے انکار کیا۔ حضرت ابو قتادہ کہتے ہیں کہ مجھے ان کے انکار پر غصہ بھی آیا مگر کرتا کیا، گھوڑے سے اترا، کوڑے اور نیزے کو لے کر میں نے گھوڑے کو گورخر پر ڈال دیا بہت جلد وہ میری زد میں آگیا۔ نیزے سے میں نے اس کو گرا لیا، جب شکار ہو چکا تو ان احرام بندوں نے گوشت کے کھانے میں شرکت کی مگر بعد کو لوگ شک میں مبتلا ہوئے۔ ابو قتادہؓ کہتے ہیں کہ اس گورخر کی ایک ران میں نے چھپالی تھی۔ اسی حال میں قافلہ آگے روانہ ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قصہ پیش کیا گیا۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ گوشت باقی بھی رہ گیا ہے۔ ران جسے میں نے بچا رکھی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کو پیش کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا گوشت تناول فرمایا حالانکہ آپ بھی احرام ہی کی حالت میں تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دریافت کیا کہ احرام بندوں سے کسی نے شکار کی طرف اشارہ تو نہیں کیا تھا ۱۲

بِصَيْدٍ اصْطَادَهُ قَوْمٌ حِلٌّ فَأَطْعَمُونَاهُ فَمَا بَأْسٌ۔ یہ ان لوگوں نے شکار کیا ہے جو احرام بندنہ تھے انھوں نے میرے پاس کھانے کے لئے بھیجا تو اس کے کھانے میں کیا مضائقہ ہے۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ فطرۃً وہ بڑے نرم دل آدمی تھے، اختلاف اور مقابلہ پر ڈٹنے سے ان کی طبیعت کو دور کا لگاؤ بھی نہ تھا، حدیث پیش کی گئی، خاموش ہو گئے اور اسی پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

مگر اسی کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی اسی فطری نرم مزاجی اور رشیلی طبیعت نے لوگوں کی ہمتیں بلند کر دیں گو اپنی حد تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی خدمت کے متعلق جو کچھ وہ کر سکتے تھے کرتے رہے لیکن عنقریب معلوم ہوگا کہ "حدیث" میں فتنے کی ابتدا جن لوگوں کی راہ سے ہوئی یہ وہی تھے جن کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نرم حکومت نے بدبختانہ جسارتوں کے ارتکاب کے مواقع فراہم کر دیئے تھے۔

عہدِ مرتضوی اور تدوینِ حدیث

میں نے پہلے بھی کہیں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی عام عادت تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات آپ کے سامنے اگر کوئی بیان کرتا تو آپ اس سے قسم لیتے تھے شاید اس کی ایک وجہ عہدِ عثمانی کے وہ فتنے اور فساد بھی ہوں جو مسلمانوں میں پھوٹ پڑے تھے، یوں بھی اسلام کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو چکا تھا، نہ صرف مفتوحات کا بلکہ مختلف اقوام اور طبقات کے لوگ مسلمان ہو ہو کر اسلامی جماعت میں فوج در فوج شریک ہوتے چلے جاتے تھے اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا ان میں طرح طرح کے لوگ تھے، سب کے ایمان و اسلام کی وہی حالت نہ تھی جو صحابۂ کرام کی تھی۔ ان ہی امور کے احساس کا غالباً یہ نتیجہ بھی تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ عموماً منبر سے اس حدیث کا اعلان فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

[illegible]

[illegible]

دن حضرت سے آکر کہا کہ آپ کے اس طریقہ کا یعنی اس قسم کے مواقع میں صدق اللہ ورسولہ عام طور پر جو آپ فرمادیتے ہیں اسی سے لوگوں میں آپ کے متعلق یہ بات پھیل گئی ہے اشتر نے اس کے بعد کہا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں آپ سے کہی ہیں؟ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غلط فہمیاں ضرور پھیلی ہوئی تھیں، مسند احمد ہی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ

يَرْحَمُ اللّٰهُ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّهٗ كَانَ مِنْ كَلَامِهٖ لَا يَرٰى شَيْئًا يُعْجِبُهٗ اِلَّا قَالَ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَيَذْهَبُ اَهْلُ الْعِرَاقِ يَكْذِبُوْنَ عَلَيْهِ وَيَزِيْدُوْنَ عَلَيْهِ فِي الْحَدِيْثِ۔ (ج ۱ ص ۸۶)	علی پر خدا رحم کرے بات کرنے میں ان کی عادت تھی جب کوئی حسب دلخواہ بات دیکھتے تو کہتے کہ سچ کہا اللہ اور اس کے رسول نے، عراق والے (ان کے اسی عام فقرے کی بنیاد پر) ان کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے لگے اور بڑھا چڑھا کر ان کی طرف باتوں کو منسوب کرنے لگے۔

بلکہ مسند احمد ہی میں طارق بن شہاب کے حوالہ سے جو روایت نقل کی گئی ہے یعنی طارق کہتے تھے:

رَاَيْتُ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ يَخْطُبُ وَعَلَيْهِ سَيْفٌ حليته مِنْ حَدِيْدٍ فَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ مَا عِنْدَنَا كِتَابٌ نَقْرَءُهٗ عَلَيْكُمْ اِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ تَعَالٰى وَهٰذِهِ الصَّحِيْفَةُ اَعْطَانِيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهَا فَرَائِضُ الصَّدَقَةِ۔ (ج ۱ ص ۱۱۹)	میں نے منبر پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ان کی کمر میں تلوار تھی جس کے (قبضے کی) زینت لوہے کی گئی تھی میں نے اس وقت سنا وہ فرما رہے تھے کہ اللہ کی قسم ہے ہمارے ہاں اللہ کی کتاب (قرآن) اور اس صحیفہ کے سوا کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے تم لوگوں کے آگے پڑھوں اور یہ صحیفہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں صدقہ کے حصوں کی تفصیل ہے (یعنی قانونِ زکوٰۃ کی تفصیل)۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں حضرت والا نے ضرورت محسوس فرمائی کہ برسرِ منبر ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے جو آپ کے متعلق پھیل گئی تھیں یا پھیلائی جارہی تھیں عنقریب

لیکن پھر بھی اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس مسئلہ میں حزم واحتیاط اور اس کے متعلق داروگیر میں جس تشدد اور سختی سے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کام لیا تھا، حضرت علیؓ کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنی شدت اور کڑی نگرانی آپ کے نزدیک ضروری نہ رہی تھی، آخر سوچنا چاہیئے کہ اسی خبر آحاد کے مجموعہ کو لکھ لینے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جلا دیا تھا یا استشارہ و استخارہ کے بعد حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ ان کے عہدِ خلافت میں حدیثوں کا جو مجموعہ حکومت کی طرف سے مدون کرا دیا جائے گا آئندہ چل کر قرآن کی ہمدوش وہم سطح کتاب (یعنی مثناۃ کمثناۃ تورات) کی شکل اختیار کر لے گا اور اسی فیصلہ کی بنیاد پر صرف یہی نہیں کہ اس خیال سے خود ہی دست بردار ہوئے بلکہ گزر چکا کہ آپ کے زمانہ میں جس کسی کے پاس لکھی ہوئی حدیثیں تھیں جہاں تک آپ کے امکان میں تھا سب کو ضائع کر دینے کا جو حکم آپ نے دیا تھا ان بزرگوں کے اس عمل کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس طریقہ سے کیا نسبت ہے اپنی ذاتی یادداشت ہی کے لئے سہی لیکن بہر حال آپ نے چند خاص حدیثوں کو قلم بند تو فرمایا اور اپنی تلوار کی نیام میں اس کو محفوظ کر دیا تھا۔

سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ طرزِ عمل کے اس اختلاف کے اسباب کیا تھے؟ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خلافت کا جو زمانہ تھا، عہدِ نبوت کی قرب کی وجہ سے قدرتاً خود اس زمانے کے متعلق اور اس زمانے کی چیزوں کے متعلق مسلمانوں کے قلوب میں احترام وتقدس کے جو جذبات تھے، جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے احترام وتقدس کی اس کیفیت میں اضمحلال کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرزِ عمل کی تبدیلی میں کچھ اس کو بھی دخل ہو، ماسوا اس کے سیاسی حالات کے پیش رفت نے مدینہ منورہ چھوڑ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنی خلافت کے زمانہ میں کوفہ کو پایۂ تخت خلافت جو قرار دینا پڑا! اور اس کی وجہ سے کوفہ میں آپ کو قیام کرنا پڑا جیسا کہ معلوم ہے یہاں مسلمانوں کی بہت بڑی فوجی چھاؤنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں قائم ہو گئی تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ ابن سعد وغیرہ نے لکھا ہے کہ

هَبَطَ الْكُوْفَةَ ثَلَاثُمِائَةٍ مِّنْ أَصْحَابِ الشَّجَرَةِ وَ سَبْعُوْنَ مِنْ أَهْلِ بَدْرٍ۔ (ابن سعد ج ۶ ص ۴)

کوفہ کو وطن بنا کر رہنے والوں میں تین سو تو ایسے صحابی تھے جنہوں نے الشجرہ (درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر موت کی بیعت کی تھی) اور ستّر صحابی وہ تھے جو میدانِ بدر میں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے) ساتھ جنگ میں شریک تھے۔

لیکن جس کوفہ کا حال یہ ہو جیسا کہ طبقات ہی میں ہے کہ

بِهَا بُيُوْتَاتُ الْعَرَبِ (ص ۶)

اس میں عرب کے تمام قبیلوں اور خاندانوں کے لوگ تھے۔

اور بقول ابن خلدون عرب کے ان بیوتات کا حال یہ تھا کہ اس میں

سَائِرُ الْعَرَبِ مِنْ بَنِيْ بَكْرِ بْنِ وَائِلٍ وَعَبْدِ الْقَيْسِ وَ سَائِرُ رَبِيْعَةَ وَالْأَزْدُ وَكِنْدَةُ وَ تَمِيْمٌ وَ قُضَاعَةُ وَ غَيْرُهُمْ فَلَمْ يَكُوْنُوْا مِنْ تِلْكَ الصُّحْبَةِ بِمَكَانٍ إِلَّا قَلِيْلاً مِّنْهُمْ۔ (ج ۲ ص ۱۲۸)

سارے عرب قبائل کے لوگ آکر آباد ہو گئے تھے (یعنی) بنو بکر بن وائل والے عبد القیس والے اور ربیعہ قبیلہ کی تمام شاخوں کے لوگ اور قبیلہ ازد کے کندہ والے تمیم والے قضاعہ والے اور ان کے سوا بھی ان لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے استفادہ کرنے والے بہت کم تھے۔

جس کا مطلب یہی ہے کہ ان میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دولت سے تو سرفراز ہوئے تھے لیکن ان بیچاروں کو جمال جہاں آرائے محمدی سے اپنی مشتاق آنکھوں کو روشن کرنے کی سعادت میسر نہ آئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرظہ بن کعب الانصاری کو رخصت کرتے ہوئے جو یہ فرمایا تھا:

إِذَا رَءَوْكُمْ مَدُّوْا إِلَيْكُمْ أَعْنَاقَهُمْ وَ قَالُوْا أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (جمع الفوائد ص۲ بحوالہ دارمی)

جب تمہیں وہ دیکھیں گے تو اپنی گردنیں تمہاری طرف دراز کریں گے اور تلبہ کریں گے کہ دیکھو! یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں۔

یہ فاروقی بصیرت تھی جس نے اندازہ کر لیا تھا کہ صحبتِ نبوت سے محروم رہ جانے والے

مسلمانوں کے قلوب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کے جاننے کا ولولہ اور شوق کس طرح بھڑک اٹھے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کو دیکھ کر اپنے پیغمبر کے حالات کے جاننے کے لئے بیتابانہ کس طرح دوڑ پڑیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ پیش گوئی کتنی سچی نکلی اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ صحابہ نہیں بلکہ صحابہ کے دیکھنے والوں کے ساتھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان ہی چھاؤنیوں میں رہنے والے مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت یہ ہوگئی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہور شاگرد ثابت البنانی ان لوگوں سے جو اُن سے حدیث سننے کے لئے آیا کرتے تھے، کہتے

لَوْلَا تَصْنَعُوْا بِیْ مَا صَنَعْتُمْ بِالْحَسَنِ لَحَدَّثْتُکُمْ اَحَادِیْثَ مُؤَنَّقَةً۔

اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے ساتھ بھی وہی معاملہ تم لوگ نہ کرنے لگو گے جو (خواجہ) حسن بصری کے ساتھ تم ہی لوگوں نے کیا تو میں تم ہی لوگوں کو، بہت اچھی اچھی حدیثیں سناتا۔

پھر حسن بصری کے متعلق اپنی چشم دید شہادت یہ بیان کیا کرتے تھے کہ

مَنَعُوْهُ الْقَائِلَةَ وَمَنَعُوْهُ النَّوْمَ۔ (طبقات ابن سعد حصہ دوم ج، ص۴)

بے چارے کو لوگ نہ دن ہی کو لیٹنے کا موقعہ دیتے اور نہ سونے کا۔

حسن بصری جو تابعی یعنی صحابہ کرام کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں ان کا یہ حال، پھر عبداللہ بن عون جو تابعی نہیں بلکہ تبع تابعین کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اپنی داستان سناتے ہوئے اسی سلسلہ میں وہ کہا کرتے تھے کہ

قَدْ قَطَعُوْا عَلَیَّ الطَّرِیْقَ مَا اَقْدِرُ اَنْ اَخْرُجَ لِحَاجَةٍ یَعْنِیْ مِمَّا یَسْئَلُوْنَهٗ عَنِ الْحَدِیْثِ۔ (ابن سعد حصہ دوم ج، ص ۲۵)

لوگوں نے میرا راستہ روک رکھا ہے، کسی ضرورت سے بھی میں نہیں نکل سکتا یعنی لوگ مجھ سے حدیث پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔

سمجھا آپ نے ابن عون کیا کہہ رہے ہیں؟ اپنے پیغمبر کے حالات کے دریافت کرنے والوں کا حال ان کے ساتھ یہ ہوگیا تھا کہ راستہ تک چلنا ان کے لئے دشوار ہوگیا تھا، پوچھنے والوں کے ڈر کے

[illegible]

اَنَّ عَلِیَّ ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ خَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ مَنْ یَّشْتَرِیْ عِلْمًا بِدِرْھَمٍ فَاشْتَرَی الْحَارِثُ الْاَعْوَرُ صُحُفًا بِدِرْھَمٍ ثُمَّ جَاءَ بِھَا عَلِیًّا فَکَتَبَ لَہٗ عِلْمًا کَثِیْرًا۔ (ج ٦ ص ١١٦)	ایک دن (کوفہ) میں حضرت علی خطبہ دے رہے تھے اسی خطبہ میں فرمایا کہ ایک درم میں کون علم خریدنا چاہتا ہے، حارث اعور ایک درم میں کچھ کاغذ خرید کر لائے اور ان کاغذوں کو لئے ہوئے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت والا نے حارث کے لائے ہوئے اوراق میں بہت سا علم لکھ دیا۔

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا روایت میں صراحۃً اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حارث کو حدیثیں لکھ کر دی تھیں لیکن میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے اور یوں بھی جاننے والے جانتے ہیں۔ اس زمانہ کی اصطلاح ہی یہ تھی کہ "علم" کے لفظ کا زیادہ تر اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں ہی پر کیا جاتا تھا، اگر کل نہیں تو اس اصطلاح کی بنیاد پر اتنا تو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اس میں کچھ حصہ حدیثوں کا بھی چاہئے کہ شریک ہو، اور بات کیا صرف اسی حد تک محدود رہی۔ حجر[1] بن عدی جن کی شہادت کا قصہ اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات میں خاص اہمیت رکھتا ہے، ابن سعد نے ان ہی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

کَانَ ثِقَةً مَّعْرُوْفًا وَلَمْ یَرْوِ عَنْ غَیْرِ عَلِیٍّ شَیْئًا۔ (ج ٦ ص ١٥٤)	وہ بڑے معتبر مشہور آدمی تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سوا اور کسی سے کوئی روایت انھوں نے نہیں کی ہے۔

---

[1] امیر معاویہ کے زمانہ میں زیاد بن ابیہ جب عراق کا گورنر تھا حجر پر حکومتِ قائمہ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا خود کوفہ کے لوگوں نے ان کے خلاف شہادتیں دیں زیاد نے ایک جماعت کے ساتھ جن پر بغاوت میں حجر کی رفاقت کا الزام تھا، امیر معاویہؓ کے پاس شام بھیج دیا، فیصلہ ان سب کے قتل کا امیر معاویہ نے صادر کیا مشکیں کسے ہوئے مقتل میں سب لائے گئے۔ حجر نے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ لوگوں نے الزام لگایا کہ نماز میں قصداً دیر لگائی تاکہ جتنی دیر قتل سے بچ سکوں۔ قسم کھا کر بولے کہ آج تک وضو کرنے کے بعد اس سے زیادہ خفیف نماز میں نے کبھی نہیں پڑھی۔ جلاد نے کہا کہ گردن بڑھاؤ۔ بولے کہ اپنے قتل پر اعانت نہیں کرسکتا، آخر شہید کر دیئے گئے۔ حجر بن عدی کی جلالتِ شان کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ کوفہ سے شام گرفتار کرکے بھیجے گئے اور یہ خبر مدینہ پہنچی تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسی وقت امیر معاویہؓ کے پاس قاصد دوڑایا کہ حجر کو ہرگز ہرگز قتل نہ کرنا لیکن قاصد اس وقت پہنچا جب وہ شہید ہو چکے تھے۔ (طبقات ج ٦ ص ١٥٣)

ان ہی کے متعلق یہ روایت بھی درج کی ہے کہ پانی سے استنجاء کرنے کا ذکر ان کے سامنے ہوا تو حجر نے کہا کہ

نَاوِلْنِي الصَّحِيفَةَ مِنَ الْكُوَّةِ فَقَرَأَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هٰذَا مَا سَمِعْتُ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ يَذْكُرُ أَنَّ الطُّهُوْرَ نِصْفُ الْإِيْمَانِ۔ (ص۱۵۴)

طاق میں جو صحیفہ (نسخہ) رکھا ہوا ہے ذرا اسے لاکر مجھے دو، (جب لاکر دیا گیا) تو ابن عدی یہ پڑھنے لگے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ وہ روایتیں ہیں جنہیں میں نے علی بن ابی طالبؓ سے سُنا ہے، وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ طہور ایمان کا نصف ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سنی ہوئی حدیثوں کا کوئی لکھا ہوا مجموعہ حجر بن عدی کے پاس بھی تھا اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن الحنیفیہ کے پاس بھی حضرت علیؓ کی حدیثوں کا کوئی مکتوبہ مجموعہ تھا عبدالاعلیٰ بن عامر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ

كُلُّ شَيْءٍ رَوَى عَبْدُ الْأَعْلَى عَنِ ابْنِ الْحَنِيْفِيَّةِ إِنَّمَا هُوَ كِتَابٌ أَخَذَهُ وَلَمْ يَسْمَعْهُ[1]۔ (ص۹۴)

عبدالاعلیٰ محمد بن حنیفیہ سے جو کچھ روایت کرتے ہیں وہ دراصل ایک کتاب تھی اور عبدالاعلیٰ نے براہِ راست محمد بن حنیفیہ سے ان روایتوں کو نہیں سنا تھا۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حالات جو رجال کی کتابوں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاس بھی حدیثوں کا کوئی مکتوبہ مجموعہ تھا، فرمایا کرتے تھے کہ تم لوگوں سے جو حدیثیں بیان کیا کرتا ہوں یہ

رِوَايَةٌ رَوَيْنَاهَا عَنْ آبَائِنَا۔ (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۰۳)

وہ روایتیں ہیں جو اپنے باپ دادوں سے ہم لوگ روایت کرتے ہیں۔

اور فرماتے کہ اپنے والد امام باقر کے حوالہ سے جن حدیثوں کو میں بیان کرتا ہوں

إِنَّمَا وَجَدْتُهَا فِي كُتُبِهِ۔ (تہذیب ج ۲ ص۱۰۴) میں نے ان سب کو ان کے (امام باقرؒ) کتابوں میں پایا۔

---

[1] بعضوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عامر بن جہنی نامی شخص نے ابن الحنیفیہ کی ان حدیثوں کو قلمبند کیا تھا، عامر کو اگرچہ ابن حبان نے "ثقات" میں شمار کیا ہے لیکن عام طور پر محدثین کو اس شخص پر اعتماد نہیں ہے۔ دیکھو میزان لسان المیزان وغیرہ۔

اگر مذکورہ بالا روایات پر اعتماد کیا جائے تو حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیثوں کے تین چار مجموعے لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے جن میں حارث اعور والا نسخہ تو براہِ راست حضرت والا کے دستِ مبارک ہی کا لکھا ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوفہ پہنچنے کے بعد "تقلیل فی الروایۃ" کے اصول پر حضرت علیؓ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے اور روایتوں کی عمومیت کے جس دروازے کو ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عہد میں شدت کے ساتھ بند رکھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ دروازہ کھل گیا، آخر حارث والی روایت اگر صحیح ہے تو اس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہیں کہ خود کاغذ منگوا کر آپ نے لکھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان دو صحابیوں یعنی عبداللہ بن عمرو بن عاص اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم کے سوا حضرات صحابہ میں سے جن جن بزرگوں کی طرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے بھی رسول اللہؐ کی حدیثیں قلم بند کی تھیں یہ سارے قصے حضرت علیؓ کے طرزِ عمل کی تبدیلی ہی کے بعد کے واقعات ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جس زمانے میں یہ حکم دیا تھا کہ جس کسی کے پاس حدیثوں کا مکتوبہ مجموعہ ہو، اس کو وہ ضائع کر دے ان دونوں بزرگوں یعنی عبداللہ بن عمرو عاص اور حضرت انس نے اس حکم تعمیل اپنے لئے ضروری خیال نہ کی، ان کا عذر غالباً یہی ہوگا کہ براہِ راست رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے لکھا تھا۔ بلکہ انس بن مالک کا بیان جیسا کہ گزر چکا یہ تھا کہ لکھنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ میں اس کو پیش بھی کر چکا ہوں۔ بہرحال ان دو استثنائی خاص واقعہ کے اور جن جن صحابیوں کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی روایتیں قلم بند ہو چکی تھیں جن کا تفصیلی ذکر ابتدائے کتاب میں گزر چکا ہے۔ میرا خیال یہی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرزِ عمل کی تبدیلی سے ان صحابیوں میں اس کی جرأت پیدا ہوئی اور کیسی ہمت افزائی؟ کسی اور موقعہ پر بھی میں نے تذکرہ کیا ہے یعنی کوفہ میں خلیفہ ہونے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست راست آپ کے چچا زاد بھائی عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق مغازی کے امام موسیٰ بن عقبہ کہتے تھے کہ

يَوْمَ كَذَا مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ مَنْ يَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ۔ (ج ۲ ص ۲۴۷)

نے کیا کیا اور ابن عباسؓ کے ساتھ ایک شخص ہوتا جو ان ساری باتوں کو جنھیں ابو رافع بیان کرتے وہ شخص لکھتا جاتا

اور اس میں تو خیر اسی قدر ہے کہ ابن عباسؓ کا منشی حدیثوں کو لکھتا جاتا تھا، الکتانی ہی نے بحوالہ طبقات ابن سعد ابو رافع کی بیوی سلمیٰ[1] کی یہ روایت جو نقل کی ہے کہ

رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ مَعَهُ اَلْوَاحٌ يَكْتُبُ عَلَيْهَا عَنْ اَبِيْ رَافِعٍ شَيْئًا مِنْ فِعْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(الکتانی فی التراتیب الاداریہ ص ۲۴۷)

میں نے ابن عباسؓ کو دیکھا کہ ان کے پاس تختیاں ہیں جن پر وہ ابو رافع کی بیان کی ہوئی ان روایتوں کو لکھا کرتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کے متعلق ابو رافع بیان کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ کتب ابن عباس میں اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن حدیثوں کو انھوں نے خود قلم بند فرمایا تھا یا اپنے کاتب سے لکھوایا تھا ان کا ابن عباسؓ کی ان کتابوں میں نہ رہنے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔

---

[1] سلمیٰ آنحضرتؐ کی لونڈی تھیں، ابن سعد وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے جتنے بچے پیدا ہوئے قابلہ کا کام سلمیٰ ہی نے انجام دیا تھا اور ابراہیم علیہ السلام ماریہ قبطیہ کے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے جب پیدا ہوئے تھے تو اس وقت بھی قابلہ سلمیٰ ہی تھیں، ابو رافع جو دراصل حضرت عباس کے غلام تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عباس نے ہبہ کر دیا تھا ان کی شادی سلمیٰ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی تھی اور ابو رافع کو آزاد کر دیا تھا ان کے لڑکے جن کا نام عبید اللہ بن ابی رافع۔ حضرت علی علیہ السلام کے کاتب (سکریٹری) تھے غلاموں کو یہ بلندیاں اسلام نے عطا کی تھیں اس موقعہ پر بیساختہ سلمیٰ اور ابو رافع کا قصہ جس کا مسند احمد میں تذکرہ کیا گیا ہے یاد آگیا۔ سلمیٰ ایک دن روتی ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور شکایت کی کہ ابو رافع نے بلا وجہ مجھے آج مارا ہے۔ ابو رافع بلائے گئے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ بھائی تم نے اس بے چاری کو کیوں مارا۔ ابو رافع نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے یہ ستاتی ہے۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمیٰ سے دریافت کیا کہ تم نے ابو رافع کو کیا تکلیف پہنچائی۔ سلمیٰ نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ شخص نماز پڑھ رہا تھا اسی حال میں اس کا وضو ٹوٹ گیا اس پر میں نے کہا کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ریاح اگر خارج ہو جائے تو وضو کر لیا کریں۔ بس اسی پر یہ شخص مجھے مارنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میاں بیوی کے اس قصے کو سن کر ہنسنے لگے اور ابو رافع سے کہا کہ اس بیچاری نے تم سے اچھی بات تو کہی تھی۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۲۷۲)

بہرحال کتب ابن عباس کا یہ ذخیرہ ہو یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق میں نے جو نقل کیا تھا کہ حسن ابن عمرو بن امیہ الضمری کو اپنے گھر لے گئے اور لکھی ہوئی حدیثوں کا جو سرمایہ ان کے پاس تھا اسے جب دکھایا تو حسن ابن عمرو کہتے تھے کہ

فَاَرَانَا کُتُبًا کَثِیْرَۃً مِّنْ حَدِیْثِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ — مجھے ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی لکھی ہوئی کتابیں دکھائیں۔

اور پھر ابو ہریرہؓ کا یہ فرمانا کہ

قَدْ اَخْبَرْتُکَ اَنِّیْ اِنْ کُنْتُ حَدَّثْتُکَ بِہٖ فَھُوَ مَکْتُوْبٌ عِنْدِیْ۔ (مقدمہ فتح الباری) — میں نے تم کو مطلع کیا تھا کہ تم سے جو کچھ بھی حدیثیں میں نے بیان کی ہیں وہ سب میرے پاس لکھی ہوئی ہیں۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن حدیثوں کو بیان کیا کرتے تھے جن کی تعداد پانچ ہزار سے اوپر بتائی جاتی ہے یہ سب ان کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ اس کے سوا اور بھی جن جن صحابیوں کے متعلق ذکر کر چکا ہوں کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی روایتیں قلم بند ہو چکی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرزِ عمل کی تبدیلی کے بعد ہی کے یہ واقعات ہیں، آخر جب خود رسول کا خلیفۂ راشد اپنے دستِ مبارک سے لکھ لکھ کر لوگوں کو دینے لگا ہو تو دوسروں کو اس سے روکنے والی اور کون سی چیز ہو سکتی تھی، رہی وہ مصلحت جس کی وجہ سے عہدِ نبوت اور ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانے میں حدیثوں کی کتابت اور عام اشاعت میں مزاحمت کی جاتی تھی اور خود حضرت علیؓ کو بھی اسی مسلک کی رعایت کرتے ہوئے شروع میں پایا جاتا ہے پھر کتابت و اشاعت کی اس عام اجازت اور اس کی ہمت افزائی کے بعد اسی خطرے کے پیدا ہونے کا اندیشہ کیا باقی نہیں رہا تھا؟ مانا کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں اور عہدِ نبوت میں نسبتاً کافی فاصلہ پیدا ہو چکا تھا، لیکن کتنا فاصلہ؟ پچیس سے تیس سال ہی تک کا تو فاصلہ؟ پھر کیا یہ بڑا فاصلہ تھا؟ آخر کچھ بھی ہو اس پر تو امت کا اتفاق ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ خلافتِ راشدہ ہی کا زمانہ تھا۔ ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانہ کی مکتوبہ

چیزوں کے متعلق یہ خطرہ کہ آئندہ نسلوں میں غیر معمولی اہمیت ان روایتوں کو حاصل ہو جائے گی، اسی وجہ سے تو تھا کہ خلافتِ راشدہ کا وہ زمانہ تھا پس اسی خلافتِ راشدہ کا عہد جب حضرت علیؓ کے زمانہ تک موجود تھا تو اس خطرے کا احساس علی کرم اللہ وجہہ کو کیوں نہیں ہوا؟

بلاشبہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اس کو پیدا کرنا چاہئے، میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی سوال کے اٹھانے سے بعض ایسے واقعات و حقائق لوگوں کے سامنے آجائیں گے جن کی طرف اس وقت تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

اجمالی جواب تو اس سوال کا یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانہ میں یا اس کے بعد جو چیزیں لکھی گئیں پچھلی نسلوں میں ان کو وہ اہمیت جو نہیں حاصل ہوئی جس کا اندیشہ کیا جا سکتا تھا، آخر یہ تو ایک واقعہ ہے پھر وقوع سے پیشتر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی پیش آنے والے واقعہ کو اگر سمجھ لیا تو تاریخی رفتار نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو جن نقاط تک پہنچا دیا تھا ان کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت علیؓ تو خیر حضرت علیؓ ہی تھے میں تو سمجھتا ہوں کہ معمولی فہم و فراست رکھنے والے آدمی کے لئے بھی اس کا اندازہ چنداں دشوار نہ تھا، میں کیا کہنا چاہتا ہوں تفصیل اس کی یہ ہے۔ میرے نزدیک تدوینِ حدیث کی تاریخ کی چند اہم منزلوں میں ایک بڑی اہم منزل یہ بھی ہے۔ پڑھنے والوں سے امید کرتا ہوں کہ ذرا زیادہ سنبھل کر اس تفصیل کا مطالعہ کریں گے۔

"صحابیت" اور "حدیثِ رسول" کے خلاف پہلا ناپاک اقدام

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنی روش میں یہ تغیر کوفہ تشریف لانے کے بعد ہی کرنا پڑا، اور یہ وہی زمانہ ہے جس سے کچھ ہی دن پیشتر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے

آخری چند سالوں میں ایک عجیب و غریب اندرونی تحریک کے پھیلانے کی کوشش عام مسلمانوں میں جاری ہو چکی تھی، یوں کہنے کے لئے اس تحریک کے متعلق بیسیوں باتیں کہی جاتی ہیں لیکن جس چیز نے اس تحریک کو عجیب و غریب چیز بنا دی تھی وہ اس کی اصل روح تھی یعنی اس جوہری قوت کو قطعی طور پر ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا گیا تھا جو اسلام کی پشتیبانی اور نصرت کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد "صحابیت" کی شکل میں قدرت کی طرف سے جمع کر دی گئی تھی۔ کھلی ہوئی بات تھی کہ اسی خداداد قوت کو لے کر پیغمبر آگے بڑھے تھے، عرب کے دس لاکھ مربع میل پر پیغمبر کی زندگی میں جس اقتدار کے حاصل کرنے میں اسلام کامیاب ہوا تھا یا آپ کے بعد چند ہی سالوں میں روئے زمین کی سب سے بڑی سیاسی طاقت کا قالب اسلام نے اچانک جو اختیار کر لیا تھا یہ سب کچھ جو ہوا تھا خدا کی عطا کی ہوئی اسی قوت کے بل بوتے پر ہوا تھا اسلام کے بچے کھچے حریف، عرب کے مختلف گوشوں میں جو چھپے دبے تھے عہد عثمانی کے آخری زمانے کے ماحول کے بعض پہلوؤں کو اپنے پوشیدہ اغراض کی تکمیل کے لئے مناسب اور موزوں پا کر مخفی راہوں سے یہی ارادہ کر کے اٹھے کہ

"صحابیت"

کی اس قوت پر کوئی ایسی کاری ضرب لگائی جائے جس کے بعد اسلام کا دینی سرمایہ ہو یا دنیوی خود بخود صفر بن کر رہ جائے گا۔ تحریک چلانے والے بڑے ہوش و گوش کے لوگ تھے، قیادت جنوب عرب (یمن) کے یہود کے ہاتھ میں تھی جو آغاز اسلام سے پہلے ہی اگرچہ اس علاقہ کی حکومت کھو چکے تھے لیکن پھر بھی ان کی ذہنی اور دماغی سطح عرب کے عام باشندوں سے بلند تھی، جو حکمراں قوم کی وراثت کا لازمی نتیجہ تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس تحریک کے چلانے کے لئے جس وقت کو ان لوگوں نے تاکا تھا اور جن لوگوں کا انتخاب، تحریک سے متاثر کرنے کے لئے کیا گیا تھا مختلف وجوہ سے تحریک کے قبول کرنے کی صلاحیت ان میں پائی جاتی تھی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ کام کا آغاز جن لوگوں میں تحریک کے بانیوں نے کیا تھا، یہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جو بادیۂ عرب سے نکل نکل کر مسلمانوں کی فوجی نوآبادیوں میں آکر مقیم ہو گئے تھے یعنی بصرہ، کوفہ، شام و مصر میں جو نئی چھاؤنیاں قائم ہوئی تھیں، ان ہی میں یہ پھیلے ہوئے تھے اور گو شروع میں ان چھاؤنیوں میں کافی تعداد ان بزرگوں کی بھی شریک تھی، جن کے تزکیہ و تصفیہ اور تعلیم و تربیت کا کام براہِ راست صحبتِ نبویہ میں انجام پایا تھا لیکن جس زمانے میں اس منحوس تحریک کا آغاز ان چھاؤنیوں میں شروع ہوا اس وقت تک نبوت کی صحبت سے استفادہ کرنے والوں کی بڑی تعداد بتدریج دنیا سے رخصت ہو چکی تھی، ابن خلدون نے ان فوجی نوآبادیوں کے صحابۂ کرام کا ان الفاظ میں تذکرہ کرنے کے بعد یعنی

لَمَّا اسْتَكْمَلَ الْفَتْحُ وَاسْتَكْمَلَ لِلْمِلَّةِ الْمُلْكُ وَ نَزَلَ الْعَرَبُ بِالْاَمْصَارِ فِيْ حُدُوْدِ مَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْاُمَمِ مِنَ الْبَصْرَةِ وَالْكُوْفَةِ وَالشَّامِ وَمِصْرَ وَكَانَ الْمُخْتَصُّوْنَ بِصَحَابَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْاِقْتِدَاءِ بِهَدْيِهٖ وَآدَابِهٖ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ مِنْ قُرَيْشٍ وَاَهْلِ الْحِجَازِ وَمَنْ ظَفَرَ بِمِثْلِ ذٰلِكَ مِنْ غَيْرِهِمْ۔	جب فتح کی تکمیل ہو گئی اور ملت کا حکومت پر قبضہ کامل ہو گیا اور عرب کے لوگ ان الامصار (فوجی چھاؤنیوں) میں جا کر مقیم ہو گئے جو عربوں اور دوسری قوموں کے درمیان قائم کی گئی تھیں یعنی بصرہ، کوفہ، شام و مصر میں ان چھاؤنیوں میں وہ لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہؐ کی صحبت مبارک سے استفادہ کیا تھا اور آپ کی روش کی پیروی کی سعادت ان لوگوں کو میسر آئی تھی اور آپ کے طور و طریق کو اختیار کیا ان میں مہاجرین بھی تھے اور انصار بھی، قریش اور حجاز کے بھی، نیز اور بھی جن جن لوگوں کو اس کا موقعہ ملا۔

آخر میں ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن کی اکثریت کثیرہ سے یہ چھاؤنیاں بھری ہوئی تھیں لکھا ہے کہ۔

وَاَمَّا سَائِرُ الْعَرَبِ مِنْ بَنِيْ بَكْرِ بْنِ وَائِلٍ	لیکن باقی عرب کے لوگ جو بنو بکر بن وائل اور قبیلہ

وَعَبْدِ الْقَيْسِ وَسَائِرُ رَبِيعَةَ وَالْاَزْدُ
وَكِنْدَةَ وَتَمِيْمٌ وَقُضَاعَةُ وَغَيْرُهُمْ فَلَمْ
يَكُوْنُوْا مِنْ تِلْكَ الصُّحْبَةِ بِمَكَانٍ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْهُمْ۔ (تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۱۳)

عبد القیس اور ربیعہ قبیلہ کی شاخوں سے تعلق رکھنے والے
اور قبیلۂ ازد قبیلہ کندہ، قبیلہ تمیم قبیلہ قضاعہ وغیرہ کے
لوگ سو ان کو صحبتِ نبویہ سے حصہ بجز چند معدودے
افراد کے کسی کو میسر نہ آیا تھا۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا سازشی تحریک نے ان چھاؤنیوں میں جس زمانے میں سر نکالا ہے اس وقت زیادہ تر ان میں ان ہی قبائل کے افراد کی کثرت ہوگئی تھی، جن کے متعلق ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ بجز معدودے چند لوگوں کے نبوت کی صحبت سے ان کو کوئی حصہ نہ ملا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ عمرو بن معدی کرب یا بشر بن ربیعہ جیسے لوگ جن کا نام بڑے اہم معرکوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ یرموک اور قادسیہ کے جو سورما سمجھے جاتے ہیں حافظ ابن حجر نے اصابہ میں سابق الذکر یعنی عمرو بن معدی کرب کے حال میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ قرآن میں ان کا امتحان لیا گیا اور پوچھا گیا کہ تمہیں کچھ قرآن بھی یاد ہے، تو نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ

شَغَلْتُ بِالْجِهَادِ عَنْ حِفْظِہٖ۔ جہادی مشغولیت نے مجھے قرآن یاد کرنے نہ دیا۔

اسی طرح دوسرے صاحب بشر بن ربیعہ سے بھی جب یہی سوال کیا گیا تو حافظ ابن حجر ہی نے نقل کیا ہے کہ صرف "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سنا کر چپ ہوگئے۔ جس کا بظاہر مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ بسم اللہ کے سوا غالباً کوئی چیز قرآن کی اس بندۂ خدا کو شاید یاد نہ تھی[1]۔

[1] دیکھو اصابہ جلد ۱ ص ۔ اسی کتاب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ جنگی خدمات کے لحاظ سے ان دونوں کی حیثیت کتنی نمایاں تھی۔ عمرو بن معدی کرب کے متعلق تو لکھا ہے کہ قادسیہ کا مشہور فیصلہ کن معرکہ جو ایرانیوں اور مسلمانوں میں پیش آیا اس میں عمرو کو دیکھا جاتا تھا کہ ایرانی سپاہیوں کو گھوڑوں کی پیٹھ سے اس طرح اٹھا لیتے تھے جس طرح چھوکریوں کو کوئی اٹھالے اور دونوں صفوں کی بیچ میں لاکر ان کو اس طرح کاٹ کر رکھ دیتے کہ گویا گاجر اور مولی کاٹی گئی۔ کاٹ کر کہتے کہ ان لوگوں کے ساتھ یہی برتاؤ کرنا چاہیئے۔ یرموک میں بھی عمرو بن معدی کرب کا نام نمایاں نظر آتا ہے پُر خوری میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے۔ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نہ بھی ہوتے جب بھی صرف انسان ہی ہونا ان کا اس عجیب و غریب پیش کش کو مسترد کر دینے کے لئے کافی تھا جس کے اتارنے کا ارادہ ان کے قلوب میں کیا گیا تھا، دن دن نہیں ہے رات ہے، زمین ہی آسمان ہے اور آسمان کو غلط فہمی سے لوگ آسمان سمجھ رہے ہیں ورنہ درحقیقت وہی زمین ہے، سفیدی سفیدی نہیں سیاہی ہے، چار کا عدد چار نہیں تین ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے بدیہی البطلان دعووں کو جب تک آدمی ہے اور آدمی کے احساسات رکھتا ہے کیا ایک لمحہ کے لئے ان جہلات کی طرف توجہ کر سکتا ہے۔

صحابیت کی قوت کا اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تعلق تھا کیا وہ کسی بحث و تحقیق کا محتاج تھا؟ جن لوگوں میں اس بدیہی حقیقت کے متعلق شک و اشتباہ وہ پیدا کرنا چاہتے تھے، گو خود صحابی نہ تھے لیکن ان کی بڑی تعداد صحابہ کی دیکھنے والی تھی یا کم از کم صحابہ کے دیکھنے والوں سے ان کے حالات تواتر کی شکل میں ہر ایک کے کانوں تک پہنچے ہوئے تھے ساری فضا اس وقت کی صحابیت کی اس وقت کی گونج سے معمور تھی، یقیناً جس نصب العین کو وہ لے کر اٹھے تھے، کامیاب ہو جانے کے بعد اسلام کی فاش شکست پر ان کی یہ کوشش منتج ہوتی۔ خدانخواستہ اگر یہ ہو جاتا تو پہلی صدی ہجری میں جیسا کہ ان بداندیشوں نے سوچا تھا اسلام کا سارا ایوان سربسجود ہو کر رہ جاتا گویا شروع ہونے کے ساتھ ہی اسلام کی تاریخ ہمیشہ کے لئے اسی وقت ختم ہو جاتی، اس لئے اس کی تو داد دینی پڑتی ہے کہ تاکنے والوں نے ٹھیک اسی بنیادی اساس کو ضرب لگانے کے لئے تاکا تھا جس پر ضرب لگانے میں کامیاب ہو جانے کے بعد وہ بازی جیت لیتے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا دن کی کھلی روشنی میں خواہ دیکھنے والے جیسے کچھ بھی ہوں ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر یہ باور کرا دینا کہ آفتاب غروب ہو چکا ہے اور بجائے دن کے رات آگئی ہے کوئی آسان بات نہ تھی، آخر مغالطی مقدمات کی اثر اندازی بھی ایک خاص حد تک محدود ہوتی ہے آپ لاکھ نفسیاتی کرتبوں سے کام لیتے ہوئے چلے آیئے، لیکن آنکھیں کھولے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نہ اس زمانے میں اور نہ اس کے بعد اس وقت تک کسی طبقہ کے صحابیوں کو معصوم قرار دینے کا عقیدہ مسلمانوں میں کبھی پیدا ہوا، اور غیر معصوم ہونے کی وجہ سے جس قسم کی بھی کمزوریاں اس جماعت کے بعض افراد سے سرزد ہوئی ہیں بغیر جھجک کے مسلمان ہمیشہ ان کا تذکرہ زبانی بھی اور کتابوں میں بھی کرتے چلے آرہے ہیں۔ آخر خود سوچئے حضرت ماعز اسلمی، یا نعمان بن عمرو الانصاری، یا مغیرہ بن شعبہ، یا وحشی یا عمرو بن عاص یا خود امیر معاویہ وغیرہم حضرات[1] (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کی طرف حدیث و سیر و تاریخ وغیرہ کتابوں میں کون کون سی باتیں نہیں منسوب کی گئی ہیں اور یہ تسلیم کرکے منسوب کی گئی ہیں کہ واقعی ان لغزشوں میں وہ مبتلا ہوئے تھے، جرائم جنھیں ہم کبائر

[1] سیر صحابہ و تاریخ کی کتابوں میں ان صحابیوں کے حالات آپ کو ملیں گے خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ماعز کی طرف زنا کا جرم منسوب کیا گیا ہے اسی طرح مغیرہ بن شعبہ کی طرف بھی بعضوں نے اس جرم کو منسوب کیا ہے۔ نعمان بن عمرو انصاری تو وہی مشہور شگفتہ مزاج صحابی ہیں جن کی بعض ادائیں عجیب تھیں۔ لکھا ہے کہ مدینہ میں موسمی پھل وغیرہ جیسی چیزیں بیچنے کے لئے کوئی آتا تو ادھار اس سے خرید لیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہدیہ پیش کر دیتے، یہ خیال کرکے کہ نعمان کی طرف سے یہ ہدیہ ہے رسول اللہ خود بھی نوش جان فرماتے اور دوسروں میں تقسیم کر دیتے، جب قیمت مانگنے والا نعمان کے پاس آتا تو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ رسول اللہ کے سامنے لاکر اس سے کہتے کہ قیمت آپ سے مانگ لو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ تم نے تو ہدیۃً پیش کیا تھا کہتے کہ ہاں! پیش تو ہدیۃً ہی کیا تھا لیکن میرے پاس دام کہاں ہیں جو ادا کروں؟ ایک دفعہ ایک غریب بدو کے اونٹ کو جب وہ رسول اللہ کے پاس بیٹھا تھا انھوں نے بعضوں کے اشارے سے ذبح کر دیا بدو نے باہر نکل کر یہ تماشا جو دیکھا تو چیخنے لگا، رسول اللہ سے فریاد کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ نعمان کا نام لیا گیا۔ وہ بھاگ کر ایک شخص کے گھر میں چھپے ہوئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھتے ہوئے اس گھر میں گھس کر نعمان کو گرفتار کیا، دریافت کیا کہ یہ کیا حرکت تھی۔ کہنے لگے کہ جن لوگوں نے میرا پتہ آپ کو بتایا ہے ان ہی کے اشارے سے میں نے کیا تھا آخر رسول اللہ نے اپنی طرف سے اونٹ کی قیمت بدو کو ادا کی اور کباب بنا کر اونٹ کو لوگ کھا گئے ان ہی نعمان پر متعدد دفعہ شراب خواری کا الزام لگا، ثابت ہوا، حد لگی۔ وحشی بھی صحابیوں ہی میں شمار ہوتے ہیں حمص میں رہتے تھے شراب خواری کے الزام میں ان پر بھی حد لگی۔ رہے عمرو بن عاص اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سو ان کے متعلق مجھے کہنے کی بھی ضرورت نہیں، عام تاریخوں میں ان کے حالات لوگ پڑھتے ہی رہتے ہیں۔

کہہ سکتے ہیں" یہ واقعہ ہے ان کی شاید ہی کوئی قسم ہوگی جو اس فہرست میں نظر نہ آتی ہو، مگر حیرت ہوتی ہے کہ ان ہی صحابیوں کی طرف جہاں تک میرے معلومات ہیں اس جرم کے انتساب کی جرأت کسی زمانہ میں نہیں کی گئی ہے کہ جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی صحابی نے کوئی غلط بات منسوب کر دی تھی۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جس سے جو فعل بھی سرزد ہو جاتا تھا محض صحابی ہونے کی وجہ سے لوگ اس فعل کے انتساب سے نہیں جھجکتے تھے تو خدانخواستہ کذب علی النبیؐ کے جرم کا تجربہ ان ہی صحابیوں میں سے کسی صحابی سے اگر ہوتا، تو اس کے ذکر سے لوگوں کو کون سی چیز مانع آسکتی تھی اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ بیان کہ

كُنَّا لَا نَتَّهِمُ بَعْضُنَا بَعْضًا۔ — ہم لوگ (یعنی صحابہ) باہم ایک دوسرے کو متہم نہیں کرتے تھے (یعنی قصداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کر رہا ہے)۔

(طبقات ابن سعد قسم دوم ج، ص۱۳)

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ماننے پر آپس کے باہمی تجربات نے ان کو قطعی طور پر مجبور کر دیا تھا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہی حدیثوں کے سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس اعتراض کے سوا عموماً دوسری قسم کی تنقیدوں کا ان ہی صحابیوں میں عام رواج تھا۔[1] لیکن احادیث و آثار کے اس عظیم ذخیرے کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں ایسی کوئی

[1] حدیث کے معمولی طلبہ بھی جانتے ہیں کہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صحابیوں کی بیان کی ہوئی کتنی حدیثوں پر تنقید فرمائی إِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ (مردے پر رونے والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے) یہ حدیث ہو یا سماع موتی والی روایت ہو، یا قطع صلوٰۃ کے سلسلہ میں یہ روایت کہ عورت کے سامنے آجانے سے بھی نماز منقطع ہو جاتی ہے، یا نحوست نہیں لیکن مکان گھوڑے و عورت میں وغیرہا۔ روایتوں پر حدیث کی کتابوں میں صدیقہ عائشہ رضؓ کی تنقیدیں اس وقت نقل کی جاتی ہیں۔ اَلْوُضُوْءُ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ (یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو کرنا چاہیے) ابوہریرہؓ کی اس حدیث پر ابن عباس ان کے شاگرد کی تنقید کہ کیا گرم پانی سے بھی وضو کر دں اور یہ تو چند سرسری مثالیں ہیں، چلا جائے تو صحابہ کرام کی تنقیدوں کا ایک کافی ذخیرہ جمع کیا جا سکتا ہے جو دوسرے صحابیوں کی روایتوں پر ان کی طرف سے کی گئی ہیں ۱۲

بات نہیں ملتی جس کی بنیاد پر یہ سمجھا جائے کہ صحابی نے دوسرے صحابی پر کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا الزام کبھی لگایا تھا، وہی حدیث یعنی گھر والوں کے رونے کی وجہ سے موتی پر عذاب ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حضرت عمرؓ اور حضرت کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس روایت کو بیان کیا کرتے تھے، عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب سنا تو اس پر آپ نے اعتراض کیا، لیکن کن الفاظ میں، مسند احمد میں ہے صدیقہ نے فرمایا:

رَحِمَ اللّٰهُ عُمَرَ وَابْنَ عُمَرَ فَوَاللّٰهِ مَا هُمَا بِكَاذِبَيْنِ وَلَا مُكَذِّبَيْنِ وَلَا مُتَزَيِّدَيْنِ۔ (مسند احمد ج ٦ ص ٢٨١)	رحم کرے اللہ عمرؓ اور ابن عمرؓ پر بس قسم ہے خدا کی نہ تو یہ دونوں غلط بیانی سے کام لینے والے ہیں اور نہ جھوٹ منسوب کرنے والے اور نہ بڑھا کر بات بنانے والے ہیں۔

اور عمر و ابن عمر تو خیر بڑے لوگ ہیں۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بے چاری فاطمہ بنت قیس جن کی طلاق والی روایت کا شاید کہیں پہلے بھی ذکر آیا ہے، مسلمانوں کا خلیفہ اور وہ بھی کون خلیفہ ؟ عمر فاروقؓ! فاطمہ بنت قیس کی اس روایت کو سمجھتے ہیں کہ قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنت سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے، لیکن بایں ہمہ زیادہ سے زیادہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاطمہ اور ان کی اس روایت کے متعلق کچھ کہہ سکے تو یہی کہہ سکے کہ

لَا نَتْرُكُ كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَوْلِ امْرَءَةٍ لَا نَدْرِيْ اَحَفِظَتْ اَوْ نَسِيَتْ۔ (صحاح)	اللہ کی کتاب اور اللہ کے نبی کی سنت کو کسی ایسی عورت کے بیان سے ہم نہیں چھوڑیں گے جس کے متعلق ہم نہیں جانتے کہ اسے یاد رہا یا بھول گئی۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ بھول چوک اور نسیان سے زیادہ اور کسی چیز کے انتساب کی یعنی عمداً غلط بیانی کے انتساب کی ہمت حضرت عمرؓ میں بھی فاطمہ جیسی عورت کے متعلق پیدا نہ ہو سکی۔

خلاصہ یہ ہے کہ بحث و تنقید کی آزادی کا حال تو یہ تھا کہ صحابہ صحابہ ہی پر نہیں یا ان کے چھوٹے بڑوں ہی پر نہیں بے جھجک جہاں موقعہ ہوتا، اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے تھے، بلکہ

صحابیت کے شرف سے جو محروم تھے، دیکھا جارہا تھا کہ بے محابا وہ بھی صحابہ کو ٹوک رہے ہیں، جہاں ضرورت ہوتی ہے روک رہے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسی کو اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ العیاذ باللہ پیغمبر کو خدا کا سچا پیغمبر مانتے ہوئے ان کی طرف کسی غلط بات کے منسوب کرنے کی کوئی جرأت کر سکتا ہے، یہی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اپنے ایک پرانے قدیم شاگرد ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف جو صحابی نہ تھے ان کے سامنے وہ حدیث آپ نے روایت کی کہ جذام کا مرض جسے ہوگیا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس سے اس طرح بھاگنا چاہئے جیسے آدمی شیر کو دیکھ کر بھاگتا ہے، ابوسلمہ کہتے ہیں کہ سننے کے ساتھ میں نے ابوہریرہؓ سے کہا کہ آپ ہی نے تو یہ روایت بیان کی تھی کہ "عدویٰ" کوئی چیز نہیں ہے یعنی بیماریوں کے متعلق چھوت اور تعدی کا خیال صحیح نہیں ہے، مطلب یہ تھا کہ آپ اس کے خلاف ایسی روایت بیان کر رہے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماریوں میں تعدی اور چھوت کے قانون کو دخل ہے، اعتراض سخت تھا دونوں روایتوں میں کھلا ہوا تضاد محسوس ہو رہا تھا۔ اس تضاد کو ابوسلمہ ظاہر بھی کرتے ہیں ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جواب میں حضرت ابوہریرہؓ نے جو کچھ کہا وہ بھی ان کی سمجھ میں نہ آیا[1]۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق ابوسلمہ اپنے اندر جس

---

[1] ابوسلمہ کہتے ہیں کہ میرے اعتراض کے جواب میں فَرَطَنَ بِالْحَبَشِيَّةِ (یعنی ابوہریرہؓ حبشی زبان میں کچھ بولنے لگے) یہی وجہ ہوئی جو ان کی سمجھ میں حضرت ابوہریرہؓ کا جواب نہ آیا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عدویٰ جس کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد تعدی یا چھونے کا طبی قانون نہیں ہے جو تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے بلکہ وحشی اقوام جیسے ہندوستان وغیرہ میں بعض امراض کو خبیث روحوں کی طرف منسوب کرنے کا وہم جو پایا جاتا ہے مثلاً سیتلا دیوی کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ جب کسی سے خفا ہو جاتی ہے تو اسے چیچک میں مبتلا کر دیتی ہے، ہندوستان کے مختلف مقامات میں سیتلا دیوی کے مندر پائے جاتے ہیں کچھ اسی قسم کا خیال ایام جاہلیت میں عربوں کا بعض امراض کے متعلق اسی وہم کا ازالہ عدویٰ کی نفی سے مقصود ہے۔ بعض جدید کتابوں میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جذام کے جراثیم کی شکل بالکل شیر جیسی ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ کسی ڈاکٹر نے پیغمبر کی اس حدیث کو سن کر تعجب کیا گویا حدیث میں جذامی جراثیم کی اس شکل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ باقی ابوہریرہؓ نے جواب میں حبشی زبان کیوں استعمال کی بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کے مزاج میں کچھ ظرافت تھی اسی موقعہ پر نہیں بلکہ دوسرے مواقع پر بھی ابوہریرہؓ کو ہم پاتے ہیں کہ فارسی میں جواب دے رہے ہیں۔ فارسی اور حبشی زبانیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتے تھے۔ جب جی چاہتا استعمال فرماتے۔ انشاء اللہ ان کی سوانح عمری میں اس کی تفصیل بیان کی جائے گی۔ ان یسرہ اللہ لی ۱۲

تجرباتی تاثر کو پاتے تھے، اس کا اظہار ان الفاظ میں انھوں نے کیا تھا آج بھی حدیث کی عام کتابوں میں ان کا یہ فقرہ موجود ہے، یعنی ابوسلمہ کہتے تھے کہ

فَمَا رَأَيْتُهُ نَسِيَ حَدِيْثًا غَيْرَهُ۔ — پس میں نے نہیں پایا کہ اس حدیث کے سوا کسی اور حدیث کو وہ بھولے ہوں۔

(جمع الفوائد بحوالہ ابو داؤد وغیرہ)

ابوسلمہ جو حضرت ابوہریرہؓ کے حلقہ کے پرانے شاگرد ہیں ہزارہا حدیثیں ان سے ابوسلمہ نے اس عرصہ میں سنی ہوں گی لیکن اس طویل صحبت اور تجربہ کے بعد یہ کہنا کہ بجز اس روایت کے ان کو میں نے بھولتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق ایک وزنی شہادت ہے۔ بہرحال اس ایک موقعہ پر بھی خیال ابوسلمہ میں کسی چیز کا اگر پیدا ہوا بھی تو وہ صرف نسیان کا تھا حالات ہی ایسے تھے کہ اس کے سوا کسی دوسرے خیال کے پیدا ہونے کا امکان ہی کیا تھا۔ الخطیب نے الکفایہ میں یہ لکھنے کے بعد یعنی

عَلٰى اَنَّهٗ لَوْ لَمْ يَرِدْ مِنَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَرَسُوْلِهٖ فِيْهِمْ شَيْءٌ مِّمَّا ذَكَرْنَا لَاَوْجَبَتِ الْحَالُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا مِنَ الْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ وَالنُّصْرَةِ وَ بَذْلِ الْمُهَجِ وَالْاَمْوَالِ وَقَتْلِ الْاٰبَاءِ وَالْاَوْلَادِ وَالْمُنَاصَحَةِ فِي الدِّيْنِ وَ قُوَّةِ الْاِيْمَانِ وَالْيَقِيْنِ۔ (ص ۴۹)

صحابہ کے متعلق اللہ کے بیان یعنی قرآن میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں وہ تعریفی الفاظ اگر نہ بھی پائے جاتے جن کا میں نے ذکر کیا جب بھی جو حال تھا اس کا بھی یہی اقتضا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات صحابہ کرام منسوب نہیں کرسکتے تھے، یعنی ہجرت، جہاد اور پیغمبر کی نصرت، اپنی جانوں کی اور مالوں کی قربانیاں اپنے ماں باپ بچے اولاد کو اس راہ میں نثار کرنا اور دین کی بہی خواہیاں، ان کا ایمان ان کا یقین (ان ساری باتوں کو جو بھی پیش نظر رکھے گا وہ بھی اسی فیصلہ پر اپنے آپ کو مجبور پائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عمداً غلط بات کا انتساب وہ نہیں کرسکتے تھے)۔

اس نتیجہ پر جو پہنچے ہیں کہ دین کے ان ہی سربازوں اور جان فروش معماروں کے متعلق یہ

کیسے مانا جا سکتا ہے کہ جو باتیں دین نہ تھیں یعنی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی فرمائی ہوئی نہ تھیں قصداً وارادۃً ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرکے اس دین کو خود اپنے ہاتھوں انہوں نے ملیامیٹ کرکے رکھ دیا جس کے لئے انہوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اپنے اور اپنے بال بچوں کے خون سے جس دیوار کی انہوں نے تعمیر کی تھی، سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ خواہ مخواہ بلاوجہ اسی دیوار کو منہدم کرکے رکھ دینے کی آخر وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی لیکن جب صحابیت ہی کی قوت کو چاہا گیا کہ اسلامی تاریخ میں اس کے وجود کو صفر کر دیا جائے۔ صفر ہی نہیں بلکہ یہ باور کرانے کی کوشش ہونے لگی کہ اسلامی دین کو ضعیف کرنے میں اول سے آخر تک یہی قوت مسلسل کام کرتی رہی۔ یہ دعویٰ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا اتنا غیر معقول اور عجیب وغریب ہے کہ دلوں میں اس کا عام حالات میں اتارنا آسان نہ تھا آخر فوجی نوآبادیوں کے وہ سادہ لوح عرب سپاہی جن میں کام کرنے والے کام کر رہے تھے، جیسے کچھ بھی تھے اور جو کچھ بھی تھے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے وہ مسلمان تھے، عام انسانی احساسات اور حق و باطل کی تمیز کی عام فطری قوت سے وہ محروم نہ تھے۔ چارہ کار اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ راہ کی ہر وہ منزل جس میں دسیسہ کاریوں کی ہر دوسری تدبیر بے اثر ہو کر رہ جاتی تھی اسی منزل کو ان جھوٹی حدیثوں سے وہ بھر دیتے تھے جنھیں عین وقت پر گھڑ کر پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان بزرگوں کی طرف وہ منسوب کر دیا کرتے تھے جن کو صحابہؓ کی عام جماعت سے مستثنیٰ کرکے کہتے تھے کہ ان ہی گنے چنے چند صحابیوںؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخلصانہ تعلق تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے یہ دونوں انقلابی حوادث یعنی صحابیت کے خلاف جو طوفان اٹھایا گیا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کرکے جھوٹی حدیثوں کا جو دھواں اسلامی فضا میں پھیلایا گیا، اگرچہ بظاہر دیکھنے میں یہ دونوں حادثے الگ الگ حادثے نظر آتے ہیں مطالعہ کرنے والے بھی ان دونوں حوادث کا مطالعہ اس طریقے سے کرتے چلے آئے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے گویا کوئی تعلق نہ تھا لیکن اور کچھ نہیں صرف یہی بات کہ ان دونوں انقلابی حوادث

کی ابتداء کی تاریخ درج کرتے ہوئے حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا تھا کہ دونوں کی ابتدا ایک ہی سرچشمہ سے ہوئی تھی، میرے نزدیک تو دونوں حوادث کے باہمی تعلق کے سمجھنے کے لئے یہی واقعہ کافی تھا۔

لسان المیزان اٹھا کر دیکھئے، عبداللہ بن سبا کا ذکر کرتے ہوئے حافظ نے جہاں یہ لکھا ہے کہ صحابیت کے خلاف وہ طوفانِ عام جس میں ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو شریک کر لیا گیا تھا بلکہ بنیاد ہی اس پر رکھی گئی تھی کہ ان ہی دونوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے منشا کے خلاف کاروبار شروع کیا اور صحابہؓ کی عمومیت نے ان کا ساتھ دیا۔ گویا بنیادی الزام ان ہی دونوں پر لگایا گیا تھا اس واقعہ کے ذکر کے بعد تصریح کی ہے کہ

كَانَ عَبْدُ اللهِ بْنُ سَبَا اَوَّلَ مَنْ اَظْهَرَ ذٰلِكَ۔ (ج ۳ ص ۲۹۰)

عبداللہ بن سبا ہی پہلا آدمی ہے جس نے اس خیال کو ظاہر کیا۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ صحابیت کے خلاف جس نے سب سے پہلے مخالفانہ باتیں شروع کیں وہ بھی یہی عبداللہ بن سبا تھا اور اسی کے ساتھ حافظ ہی نے عامر شعبی کے حوالے سے ان کا دعویٰ نقل کیا ہے کہ

اَوَّلُ مَنْ كَذَبَ عَبْدُ اللهِ بْنُ سَبَا۔ (ج ۳ ص ۲۸۹)

اور سب سے پہلے جو جھوٹ بولا (یعنی جھوٹی حدیث بنائی) وہ عبداللہ بن سبا ہی تھا۔

دونوں انقلابی حادثوں کی اولیت کا اسی ایک شخص میں جمع ہونا یقیناً کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا بلکہ ایک کی تکمیل کے لئے دوسرے کا وجود ناگزیر تھا۔

عہدِ عثمانیؓ میں اس تحریک کے زور پکڑنے کی وجہ

اس میں شک نہیں کہ خلافتِ عثمانی سے پہلے بھی مخالفانہ قوتیں جو عرب کے مختلف گوشوں میں پوشیدہ تھیں موقع پا کر سر نکالتی رہتی تھیں۔ عہدِ صدیقی کا واقعہ ردہ نہیں ہو سکتا کہ ان مخالفانہ مخفی قوتوں سے بے تعلق تھا اور گو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں فتوحات کی وسعت

کی وجہ سے بادیۂ عرب کے ان سپاہیوں کو کسی ایک جگہ سمٹ کر بیٹھنے کا موقعہ نہ ملتا تھا، ان کو دنیا کے اس طول وعرض میں پھیلا دیا گیا جس کا دامن ایک طرف مغربی افریقہ کے حدود سے اور دوسری طرف مشرق میں چینی ترکستان سے ملا ہوا تھا ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ کسی دوسرے مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کی گنجائش ہی کب پیدا ہوتی تھی۔ ان کی حالت جیسا کہ تاریخوں میں بیان کیا گیا ہے یہ تھی کہ

لَا يَكُونُ هَمُّ اَحَدِ هِمُ الَّا نَفْسَهُ وَمَا هُوَ فِيْهِ مِنْ دُبُرَةِ دَابَّتِهِ اَوْ قَمْلِ فَرْوَتِهِ۔

(طبری ج ۵ ص ۹۴)

ان کے سامنے اپنی جان اور جس جانور پر سوار ہوتے تھے اس کے کیڑے اور اپنے پوستین کے جوں کے سوا اور کسی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہ تھا۔

لیکن بایں ہمہ صبیغ ہی کے جس واقعہ کا آپ ذکر سن چکے ہیں جو اجناد المسلمین (مسلمانوں کی فوجی چھاؤنیوں) میں مختلف قسم کے شکوک وشبہات قرآنی آیتوں کے متعلق پھیلاتا پھرتا تھا اور بظاہر اس کی تحریک گرچہ ایک ذہنی اور فکری تحریک معلوم ہوتی تھی لیکن العسکری کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ

اِتَّهَمَهُ عُمَرُ بِرَأْيِ الْخَوَارِجِ۔

(اصابہ ج ۲ ص ۲۵۹)

حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ وہ یعنی صبیغ خوارج کی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔

"الخوارج" کے لفظ سے یہاں مراد یقیناً اس کے وہ اصطلاحی معنی نہیں ہیں جو خاص قسم کے عقائد واعمال رکھنے والے ایک مستقل اسلامی فرقہ کی تعبیر ہے، کیونکہ خارجیوں کا یہ فرقہ تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانے میں پیدا ہوا، بلکہ "الخوارج" سے مقصود اس کے عام معنی ہیں یعنی حکومتِ قائمہ کے خلاف باغیانہ خیال وعمل رکھنے والے لوگ، جس کا مطلب یہی ہوا کہ صبیغ کی تحریک میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کوششوں کی جھلک نظر آتی تھی جنہیں اسلام اور دولت اسلامی کے خلاف لوگ اٹھانا چاہتے تھے مگر جیسا کہ آپ نے دیکھا عہدِ فاروقی کے حکام اتنے بیدار تھے کہ صبیغ کو فوراً پایۂ تختِ خلافت روانہ کر دیا گیا، حالات کا اندازہ کر کے جس حد

تک خود حضرت عمرؓ اس کی اصلاح کر سکتے تھے حالانکہ کر چکے تھے، وہ تائب بھی ہو چکا تھا لیکن باوجود اس کے زمانہ تک بصرہ جہاں صبیغ نے قیام اختیار کر لیا تھا وہاں کے والی اور حاکم حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ پر شدید تاکید حضرت عمرؓ کی طرف سے تھی کہ صبیغ پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔ حکم تھا کہ اس کے ارد گرد لوگ جمع ہونے نہ پائیں حکم کی تعمیل جس طریقہ سے اس زمانے میں کی جاتی تھی، اس کا اندازہ ابو عثمان النہدی کے اس بیان سے ہوتا ہے جو اسی صبیغ کے متعلق ان کی طرف منسوب ہے یعنی کہتے ہیں:

كَتَبَ اِلَيْنَا عُمَرُ اَنْ لَّا تُجَالِسُوْهُ قَالَ فَلَوْ جَاءَ وَنَحْنُ مِائَةٌ لَتَفَرَّقْنَا۔

عمرؓ نے لکھ بھیجا تھا کہ صبیغ کے ساتھ کوئی نشست و برخاست نہ کرے (اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ) جب صبیغ ہم لوگوں کی طرف آتا اور سو آدمیوں کی ٹولی بھی بیٹھی ہوتی تو ہم بکھر جاتے۔

(ج ۳ ص ۲۵۷)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان معاملات میں کتنے محتاط، بیدار اور چوکنے رہتے تھے، ذرا ان کے اس طرزِ عمل کو ملاحظہ کیجیے، جس کا ذکر ابن سعد نے احنف بن قیس کے تذکرہ میں کیا ہے یعنی مسلمان ہو کر حضرت عمرؓ کے پاس جب احنف آئے تو ان کی تقریری اور فکری صلاحیتوں کو دیکھ کر لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو کامل ایک سال تک اپنے پاس روکے رکھا جب سال پورا ہو گیا، تب ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بصرہ اس فرمان کے ساتھ روانہ کیا کہ "اس شخص کو اپنے پاس رکھنا اور مہمات میں اس سے مشورہ لیتے رہنا جو مشورہ دے اس پر عمل کرنا"۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ جب احنف روانہ ہونے لگے، تب حضرت عمرؓ نے ان کو مخاطب کر کے کہا:

> تم جانتے ہو، کامل سال بھر تک اپنے پاس تم کو میں نے کیوں روک رکھا تھا، میں تم کو جانچنا چاہتا تھا، اور خوب جانچا، پرکھا اب میں اپنے اس احساس کا اعلان کرتا ہوں کہ بجز بھلائی کے تم میں اور کوئی پہلو مجھے نظر نہ آیا۔ ظاہر تمہارا جہاں تک تجربہ ہوا مجھے بہت اچھا معلوم

معلوم ہوا اور میں امید کرتا ہوں کہ تمہارا باطن بھی ظاہر ہی کی طرح بہتر ہوگا[۱]۔ (ابن سعد ج ۳ قسم دوم)

لیکن حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے آخر زمانہ میں پہلی بات تو یہی نظر آتی ہے کہ اچانک جہادی مہموں کی سرگرمیوں پر ایک قسم کا جمود طاری ہوگیا۔ ۳۳ھ سے ۳۵ھ تک یعنی جس سال حضرت والا کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اس سے دو سال پہلے کی روئداد پڑھیے، ان میں آپ کو کسی فوجی مہم یا دشمنوں سے مسلمانوں کی آویزش کا کوئی تذکرہ نہ ملے گا خود اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے۔ علاوہ اس کے جب ملک کے مختلف اطراف وجوانب سے فتنوں کی خبریں آنے لگیں اور حضرت عثمانؓ نے مختلف صوبوں کے والیوں کو جمع کرکے مشورہ فرمایا تو مشورہ دینے والوں میں سے بعضوں نے مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اپنی طرف سے علاج کی تدبیر یہی پیش کی تھی۔

اَرٰی لَكَ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْ تُشْغِلَهُمْ بِالْجِهَادِ عَنْكَ۔ (کامل ج ۳ ص ۵۷)	امیر المومنین میرا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں کو جہاد میں مشغول کرکے اپنی طرف سے ہٹا دیجئے۔

اور حضرت عثمانؓ نے ان کی اس تجویز کے مطابق حکم بھی دیا جیسا کہ لکھا ہے:

اَمَرَهُمْ بِتَجْهِیْزِ النَّاسِ فِی الْبُعُوْثِ۔ (۷)	حکم دیا کہ لوگ فوجی مہموں میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔

لیکن ثابت ہوا کہ یہ علاج بعد از وقت ہے، بنانے والے فوجیوں کے بیکار اور خالی دماغوں میں فتنوں کے جن گھونسلوں کو بنانا چاہتے تھے بنا چکے تھے، اس پر بھی جس قسم کی کامیابی ان کو ہوئی شاید نہ ہوتی اگر عہد فاروقی کے بیدار مغز حکام کی جگہ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ نہ چلی جاتی جس کا اندازہ اسی واقعہ سے ہوتا ہے کہ یہی عبداللہ بن سبا جب شروع شروع

---

[۱] حضرت عمرؓ نے اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ایک روایت بھی بیان کی کہ آپ ان لوگوں سے ڈرایا کرتے تھے جو صاحب علم و شکر ہوں لیکن دین سے ان کا قلب بے تعلق ہو، یہ بھی کہا تھا کہ ہم لوگ آپس میں یہ گفتگو کیا کرتے تھے کہ اس امت کی ہلاکت اسی قسم کے لوگوں سے ہوگی جو علیم و منافق ہوں گے یعنی تعلیم یافتہ بے دینوں کے ہاتھ سے مسلمانوں کی بربادی مقدر ہے۔ اصل الفاظ حضرت عمرؓ کے یہ ہیں کہ کُنَّا نَتَحَدَّثُ اِنَّمَا یُهْلِكُ هٰذِهِ الْاُمَّةَ كُلُّ مُنَافِقٍ عَلِیْمٍ (قسم اول ج ۳، ص ۶۷)

اسلامی چھاؤنیوں میں داخل ہوا اور بصرہ میں پہلی دفعہ اس نے سر نکالا، حالانکہ جس قسم کے لوگوں میں وہ ٹھہرا تھا حکومت کی نگاہوں میں وہ خود مشتبہ تھے، اس وقت بصرہ کے حاکم ایک قریشی نوجوان عبداللہ بن عامر تھے۔ لوگوں نے ابن سبا کے مشکوک طرز عمل کی خبریں ان تک پہنچائیں بھی لیکن انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ اس کو بلوایا پوچھا کہ بھائی تم کہاں سے آئے ہو؟ جواب میں ابن سبا نے کہا کہ میں یمن کا رہنے والا ہوں، پہلے یہودی تھا اور اب مذہب اسلام کو میں نے قبول کرلیا ہے اور اب آپ کی پناہ میں یہاں آیا ہوں، ابن عامر نے یہ سن کر کہا کہ

"جس قسم کی خبریں تمہارے متعلق مجھے مل رہی ہیں ان کا اقتضاء ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔" (ص ۵۵)

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بصرہ سے وہ کوفہ چلا آیا، کوفہ میں بھی اس کے ساتھ بہ ظاہر کسی قسم کی سختی نہیں کی گئی، صرف کوفہ سے باہر ہو جانے کا حکم دیا گیا وہ مصر چلا گیا، یہاں کی حکومت ایسے حالات میں مبتلا تھی کہ اس نے اتنی زحمت بھی گوارا نہ کی کہ یہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور مصر میں کیا کر رہا ہے، اطمینان کے ساتھ اس کو موقعہ مل گیا، کامل ابن اثیر وغیرہ میں ہے:

فَاسْتَقَرَّ بِهَا وَجَعَلَ يُكَاتِبُهُمْ وَيُكَاتِبُونَهُ وَتَخْتَلِفُ الرِّجَالُ بَيْنَهُمْ (ج ۳ ص ۵۵)	مصر ہی میں ابن سبا ٹھہر گیا اور (اس کی سازش میں جو شریک تھے) ان سے وہ خط و کتابت کرنے لگا، وہ انہیں لکھتا اور وہ اسے لکھتے اور لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

مصر ہی سے اس نے صحابیت کے خلاف طوفان اٹھایا، اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھا ہے:

بَثَّ دُعَاتَهُ وَكَاتَبَ مَنِ اسْتَفْسَدَ فِي الْأَمْصَارِ وَكَاتَبُوهُ وَدَعَوْا فِي السِّرِّ إِلَى مَا عَلَيْهِ رَأْيُهُمْ۔ (ص ۵۹)	اس نے اپنے گوئندوں اور نمائندوں کو (اطراف ملک میں) بھیجا اور ان لوگوں سے خط و کتابت شروع کی جو الامصار (فوجی چھاؤنیوں) میں بگڑ چکے تھے وہ بھی انہیں لکھتا اور وہ اس کو لکھتے اور پوشیدہ طریقوں سے لوگوں کو ان ہی باتوں کی دعوت دینے لگے جو ان کی رائے تھی۔

عہد مرتضوی رضؓ میں اس کو ختم کرنے کی کوشش

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے منجملہ دوسرے ذرائع کے ایک بڑا حربہ جسے ابن سبا اور اس کے دُعاۃ و کارندے جو تمام امصار میں بکھرے ہوئے تھے استعمال کر رہے تھے وہ جھوٹی حدیثوں کا سلسلہ تھا جسے جہاں ضرورت ہوتی وہ پیغمبرؐ کی طرف منسوب کر کے لوگوں میں پھیلاتے رہتے تھے، آخر فتنے نے زور پکڑا، حضرت عثمانؓ شہید ہوئے، ان کے شہید ہونے کے بعد بھی فتنہ نہ دبا، مسلمان خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبا اور جن لوگوں کو اپنے زیر اثر لانے میں وہ کامیاب ہوا تھا اصطلاحاً جنہیں "السبائیہ" کہتے تھے، ان خانہ جنگیوں میں عموماً یہ حضرت علیؓ کی فوج میں گھلے ملے رہتے تھے۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلا معرکہ جو اس سلسلہ میں جنگِ جمل کے نام سے پیش آیا قطعاً پیش نہ آتا اگر غلط فہمی میں طرفین کو مبتلا کر کے عین وقت پر سبائیوں کی جماعت صلح کو جنگ سے بدل دینے میں کامیاب نہ ہو جاتی۔ جمل کے بعد صفین اور خوارج وغیرہ کی لڑائیوں کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رہا، سبائی اندر اندر کیا کر رہے ہیں، مسلمانوں میں کس قسم کے خیالات اور بے سر و پا حدیثیں پھیلا رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ان امور کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ ایک زمانے تک نہ ملا حالانکہ سبائی جو کچھ بھی کر رہے تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی کی فوج اور آپ ہی کے آدمیوں کے ساتھ مل جل کر کر رہے تھے، لیکن بات آخر کہاں تک چھپی رہتی۔ لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جماعت کے مشہور بزرگ مسیب[1] بن نخبہ ایک دن عبداللہ بن سبا کو پکڑے ہوئے کوفہ کی جامع مسجد میں منبر کے سامنے کھڑا کر کے اعلان کر رہے تھے کہ

---

[1] ثقہ راویوں میں ان کا شمار ہے، حضرت علیؓ اور حضرت حذیفہؓ سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے، علاوہ قادسیہ کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ صفین وغیرہ کی جنگ میں بھی شریک تھے لیکن زیادہ شہرت ان کی اس خاص واقعہ کی بناپر ہوئی جو حضرت امام حسینؓ کی کربلا میں شہادت کے بعد عین الوردہ کے مقام پر اس وقت پیش آیا جب توابین کے نام سے قتل حسینؓ کا بدلہ لینے کے لئے ابن زیاد کی فوج سے کوفہ کی ایک جماعت لڑی، مسیب بن نخبہ اسی واقعہ میں شہید ہوئے۔ توابین کی جماعت میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ ۱۲

[illegible]

[illegible]

[illegible] (٥٠٦٨)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ان سے منوا لیتے تھے لیکن دوسری طرف اربابِ خرد و بصیرت کا بھی آخر ایک طبقہ مسلمانوں میں بہرحال موجود تھا۔ اسلام کی روح اور اس کے کلیات کا وہ علم رکھتے تھے، خصوصاً ان میں جو شرفِ صحبت سے بھی فیض یاب تھے، ان کے کانوں تک جب سبائیوں کی خود تراشیدہ روایتیں پہنچتیں تو ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ آخر یہ ہے کیا؟

فتنۂ سبائی کے بعد

حدیث کی روایت میں احتیاطی اصول

میرا تو خیال ہے کہ اس قسم کی روایتیں جن کا تدوین حدیث کی تاریخوں میں لوگوں نے ذکر کیا ہے مثلاً امام مسلمؒ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں جو یہ واقعہ درج کیا ہے کہ بشیر بن کعب العدوی، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خدمت میں ایک دن آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثیں بیان کرنے لگے ان کا خیال تھا کہ حضرت ابن عباسؓ ان حدیثوں کو خاص توجہ سے سنیں گے لیکن حیرت کی انتہا نہ تھی جب دیکھا کہ

اِبْنُ عَبَّاسٍ لَا يَأْذَنُ لِحَدِيْثِهٖ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِ۔ — ابن عباسؓ نہ ان کی باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں اور نہ ان کو دیکھتے ہیں۔

بشیر نے گھبرا کر عرض کیا کہ حضرت! میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں آپ کو سنا رہا ہوں اور آپ اس بے التفاتی سے کام لے رہے ہیں؟ ابن عباسؓ نے اس وقت بشیر کو سمجھاتے ہوئے پہلے تو خود اپنے ایک حال کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

اِنَّا كُنَّا مَرَّةً اِذَا سَمِعْنَا رَجُلًا يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْتَدَرَتْهُ اَبْصَارُنَا وَاَصْغَيْنَا اِلَيْهِ — ایک زمانہ ہم ہی پر گزرا ہے کہ کوئی شخص جب یہ کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو فوراً ہماری نگاہیں اس کی طرف بے ساختہ اٹھ جاتی تھیں اور اپنے کانوں کو

[illegible]
[illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]	([illegible])
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible] — [illegible]

ہے کہ بجائے صیغۂ واحد کے تَرَکْنَا الْحَدِیْثَ عَنْهُ یعنی جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روش کے اختیار کرنے میں ان کے ساتھ دوسرے بھی شریک تھے۔ علاوہ اس لفظی قرینہ کے اسی بصرہ کے متعلق ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی تھی جو کہا کرتی تھی کہ

لَا تُحَدِّثُوْنَا اِلَّا بِالْقُرْاٰنِ (کفایہ ج ا ص ۱۵) قرآن کے سوا ہم سے اور کچھ نہ بیان کیا کرو۔

اور تو اور عمران بن حصین صحابی رضی اللہ عنہ جن کا قیام بصرہ ہی میں تھا ان کے پاس بھی آکر لوگ یہی کہنے لگے تھے کہ قرآن کے سوا اور کچھ نہ بیان کیجئے۔

بہرحال کچھ بھی ہو، اس فتنے نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوسرے فتنہ کو پیدا کیا یعنی چاہا گیا کہ سرے سے حدیث کے قصے ہی کو ختم کر دیا جائے۔ یہ عجیب کشمکش کی حالت تھی خود ابن عباسؓ ترک روایت کے اسی طرز عمل کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا کرتے:

اِنَّا كُنَّا نَحْفَظُ الْحَدِيْثَ وَالْحَدِيْثُ يُحْفَظُ عَنْ رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یاد کیا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اسی کی مستحق ہیں کہ انہیں یاد کیا جائے۔

مگر پھر کذب علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فتنہ کا تذکرہ فرماتے، اسی کے بعد یہ بھی فرماتے کہ

فَلَمَّا اِذَا رَكِبْتُمْ كُلَّ صَعْبٍ وَّذَلُوْلٍ فَهَيْهَاتَ (مقدمہ مسلم) لیکن جب ہر سرکش اور غیر سرکش سواریوں پر تم چڑھنے لگے تو پھر اس سے دُور ہی رہنا مناسب ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے سبائی فتنہ کو ممکنہ حد تک کچل دینے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی توجہ اسی مسئلہ کی طرف غالباً منعطف ہوئی یعنی آپ کے سامنے دو باتیں تھیں، ایک تو یہی کہ زنادقہ کی اس جماعت نے مسلمانوں میں جن غلط حدیثوں کو پھیلا دیا ہے، اس زہر کے ازالہ کے لئے کیا کیا جائے، اور دوسری بات یہ تھی کہ اس زہر کی شرکت کی وجہ سے لوگوں میں یہ رجحان جو بڑھتا جا رہا ہے کہ قطعی طور حدیثوں کی روایت اور ان کے سننے سنانے کے قصے ہی کو بالکلیہ

[illegible] | [illegible] ([illegible]) [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] | ([illegible]) [illegible]
[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بعض روایتوں میں ایک دو حرف کا اضافہ بھی پایا جاتا ہے لیکن مطلب ہر حال میں وہی ہے جسے میں نے ترجمہ کے خانہ میں درج کیا ہے۔

جس لب و لہجہ میں حضرت کے یہ الفاظ ادا ہوئے ہیں، ان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کے سامنے کچھ ایسے لوگ ہیں جن کے قلوب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی طرف سے گونہ بے نیازی اور استغنار کی کیفیت کسی وجہ سے پیدا ہوتی چلی جا رہی تھی اور ظاہر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے تک حدیثوں کے متعلق اس قسم کی افسردگی دلوں میں اگر کسی وجہ سے پیدا ہوسکتی تھی تو وہ سبائیوں کا ہی فتنہ ہوسکتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول گزر چکا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی حدیثوں کے منسوب کرنے کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا ہم لوگوں کا حال یہ تھا کہ کسی سے قال الرسول کا لفظ جو نہی کہ ہم سنتے ہماری آنکھیں اس کی طرف بے ساختہ اٹھ جاتیں اور کانوں کو اس کی طرف ہم لگا دیا کرتے تھے اور میں بتا چکا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کی ابتدا، سبائیوں ہی کی جماعت سے ہوئی تھی، الشعبی کی تاریخی شہادت گزر چکی کہ

اَوَّلُ مَنْ کَذِبَ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ سَبَا۔ — سب سے پہلے جو جھوٹ بولا (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ بات منسوب کی) وہ عبداللہ بن سبا تھا۔

بہرحال جوں کے خوف سے لبادے ہی کو نذر آتش کر دینے کا خیال جن لوگوں میں پیدا ہو چلا تھا یعنی سبائیوں کی پھیلائی ہوئی جھوٹی روایتوں کی وجہ سے یہ غلط فیصلہ کر بیٹھے تھے کہ آئندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت ہی ترک کر دیں گے۔ میرا خیال یہی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مذکورہ بالا ارشاد کا رُخ ان ہی غیر صحیح رجحانات کی طرف ہے، آپ ان ہی لوگوں کو سمجھانا چاہتے تھے کہ کچھ بھی ہو لیکن یہ طریقہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی جائے اس کی طرف توجہ نہ کی جائے یہ صحیح طریقہ نہیں ہے بلکہ اب بھی یہی سمجھنا چاہیے جیسے ہمیشہ سے لوگ یہی سمجھتے چلے آتے تھے کہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اسی تقریر کے آخر میں آپ نے اس کا بھی اعلان کیا تھا کہ میں اس شخص کو افترا پردازی اور غلط بیانی کی سزا دوں گا، جس کے متعلق اس قسم کی خبریں مجھ تک پہنچیں گی۔ (لسان ج ۳ ص ۲۹۰)

ظاہر ہے کہ آپ کی طرف منسوب کرکے جو جھوٹی باتیں مسلمانوں میں پھیلائی جاتی تھیں، ان کے علاج کی یہ آخری صورت ہو سکتی تھی، گزر چکا کہ آخران ہی قصوں کے سلسلے میں حضرت والا کے حکم سے سبائیوں کو دنیا ہی میں آگ کے عذاب میں مبتلا ہونا پڑا جس سے معلوم ہوا کہ سزا کی جس دھمکی کا منبر سے آپ کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا وہ صرف دھمکی نہ تھی بلکہ عمل کی شکل بھی اس نے اختیار کی رہا روایتوں کا وہ عام ذخیرہ جسے اپنی مختلف ناپاک ضرورتوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکر کے مسلمانوں میں بدبختوں کی اس ٹولی نے پھیلا دیا تھا۔ مختلف قرائن واسباب کی روشنی میں کم از کم اسی نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ اسی زہر کے ازالہ اور اسی کے مقابلہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس رویہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس فرمائی جو حدیثوں کے متعلق اب تک آپ بھی اختیار کئے ہوئے تھے اور آپ سے پیشتر خلفائے راشدین منشار نبوت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس پر زور دیتے چلے آئے تھے، میرا اشارہ تقلیل فی الروایہ کی طرف ہے یعنی روایتوں میں کمی کا طریقہ جس کے تفصیلی مباحث گزر چکے۔ اس طریقہ میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس آپ میں پیدا ہوا۔

یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ براہِ راست خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے چشم دید ذاتی مشاہدات ومسموعات جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپ رکھتے تھے۔ معلومات کے اس قیمتی ذخیرے کے مقابلے میں ان بے سروپا روایتوں کی بھلا مسلمانوں کی نگاہوں میں کیا وقعت باقی رہ سکتی تھی جو ان کے کانوں تک مختلف ذرائع سے سبائیوں نے پہنچا دیا تھا۔

اسی صورتِ حال کا اندازہ کرکے کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اگر اپنا رویہ بدل دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتار و رفتار عادات واطوار سیرت وکردار کے متعلق

آپ کے جو معلومات تھے ان کی تحریرًا و تقریرًا وسیع پیمانے پر اشاعت حضرتِ والا نے شروع کر دی تو خود سوچنا چاہئے کہ سبائی روایات کی طرف سے مسلمانوں کی توجہ کے موڑنے کی اس وقت کوئی دوسری ممکن تدابیر اور کیا ہو سکتی تھیں۔

خیال تو کیجئے کہ کہاں آپ ہی کا ایک حال یہ تھا کہ قراب سیف (یعنی تلوار کی نیام) میں جو حدیثیں آپ کے پاس لکھی ہوئی تھیں، ان کے دکھانے پر بھی اصرار شدید کے بعد آمادہ ہوتے ہیں اور کوفہ پہنچنے کے بعد آپ ہی کو دیکھا جاتا ہے کہ برسرِ منبر اعلان عام فرماتے ہیں کہ۔

ایک درم میں علم کا کثیر ذخیرہ مجھ سے کون خریدتا ہے؟

لانے والے کاغذ لے کر حاضر ہوتے ہیں اور براہِ راست دستِ مبارک سے لکھ کر حدیثیں اس کے حوالہ کی جاتی ہیں۔ یہی کوفہ کا منبر ہے، بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ دوسروں کے دریافت کرنے پر نہیں بلکہ لوگوں کو خود خطاب کر کر کے فرماتے:

> پوچھو مجھ سے اور دریافت کرو، خدا کی قسم جس چیز کے متعلق مجھ سے دریافت کرو گے میں اس کے متعلق بتاؤں گا۔ مجھ سے اللہ کی کتاب کے متعلق دریافت کرو، کیونکہ خدا کی قسم قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے متعلق میں یہ نہیں جانتا کہ رات کو اتری ہے یا دن کو میدانی علاقہ میں اتری ہے یا پہاڑ پر۔ (تہذیب وغیرہ ص ۳۳۸)

مجمع کے سامنے بھی آپ کا یہی حال تھا اور انفرادی طور پر بھی جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ بجائے تقلیل کے روایتوں کی اشاعت میں تکثیر سے کام لے رہے ہیں، تذکرۃ الحفاظ میں الذہبی نے کمیل بن زیاد کے ساتھ حضرتِ والا کی جس طویل گفتگو کا تذکرہ کیا ہے تو اس میں یہ نہیں ہے کہ زیاد نے آپ سے آکر کچھ دریافت کیا تھا، بلکہ لکھا ہے، زیاد کا بیان ہے کہ

اَخَذَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ بِیَدِیْ	میرے دونوں ہاتھوں کو حضرت علیؓ نے پکڑا اور صحرائی
فَاَخْرَجَنِیْ اِلٰی نَاحِیَۃِ الْجَبَّانِ (تذکرہ ج ۱ ص ۱)	میدان کی طرف مجھے نکال کر لے گئے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو خود پکڑ پکڑ کر آپ لے جاتے اور پیغمبر سے جو علم آپ تک

پہنچاتھا، اس کی تبلیغ فرماتے بجنسہٖ قریب قریب اسی کے مصنع عامری کا بیان تھا، ابن سعد نے نقل کیا ہے، مصنع کہتے تھے کہ میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے خطاب کر کے فرمایا:

يَا اَخَا بَنِيْ عَامِرٍ سَلْنِيْ عَمَّا قَالَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ فَاَنَا اَهْلُ الْبَيْتِ اَعْلَمُ بِمَا قَالَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ (ابن سعد ج ۶ ص ۲۶۷)	اے قبیلۂ بنی عامر کے آدمی پوچھ مجھ سے ان امور کے متعلق جو اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا ہے کیونکہ ہم گھر کے لوگ ہیں (یعنی رسول اللہ کے گھر کے آدمی ہیں) اللہ اور رسول کی باتوں کو زیادہ جانتے ہیں۔

آگے کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ایک طویل گفتگو مصنع سے آپ نے فرمائی جس کا ابن سعد نے ذکر نہیں کیا ہے۔ آخر ایک ہی شخص کے طرزِ عمل میں اختلاف اور اتنا شدید اختلاف بلا وجہ پیدا نہیں ہو سکتا، لوگ سوچتے نہیں ورنہ عام کتابوں میں آپ کا جو یہ قول نقل کیا جاتا ہے، الذہبی نے بھی خزیمہ بن نصیر کے حوالہ سے اس کو تذکرۃ الحفاظ میں درج کیا ہے یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے:

قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَیَّ عِصَابَةٍ بَيْضَاءَ سَوَّدُوْا وَاَیَّ حَدِيْثٍ مِّنْ حَدِيْثِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْسَدُوْا۔ (ج ۱ ص ۱۱)	خدا انہیں غارت کرے کتنی روشن جماعت کو انہوں نے سیاہ کر دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی حدیثوں کو انہوں نے بگاڑ دیا۔

بلاشبہ اس میں خاص جماعت کا آپ نے نام نہیں لیا ہے اور راوی نے چونکہ حضرت سے ان الفاظ کو اس وقت سنا تھا جب صفین میں آپ معرکہ آرائی میں مصروف تھے، لیکن تفصیلات جو آپ کے گوش گزار ہو چکے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا اس میں شک کی گنجائش ہے کہ آپ کا اشارہ ان ہی لوگوں کی طرف ہے جنھوں نے صحابیت کے خلاف طوفان اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیوں کی جیسی قدسی جماعت کو رسوا اور بدنام کرنے کی کوشش کی اور اپنی اسی ناپاک غرض کی تکمیل کے سلسلہ میں بے سروپا روایات کے جس ذخیرے کو مسلمانوں میں انھوں نے پھیلا دیا تھا جن کی وجہ سے صحیح حدیثوں کا مسئلہ بھی مشتبہ ہو گیا، گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا

چلا جا رہا تھا، یقیناً ان ہی دونوں فتنوں کے جو بانی تھے، ان ہی کی طرف آپ کا اشارہ ہے۔
بہرحال اس فقرے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کی حدیثوں کے متعلق اشتباہی تاریکیاں جو پھیلا دی گئی تھیں اس کا آپ کو کس قدر افسوس تھا۔

پھر اسی دینی مصیبت کے مقابلہ میں اگر مذکورہ بالا تدبیر آپ نے اختیار فرمائی تو اس پر کیوں تعجب کیا جائے؟ افسوس ہے کہ حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ کے متعلق آپ کے طرزِ عمل میں یہ تبدیلی جیسا کہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے، کوفہ پہنچنے کے بعد ہوئی، کوفہ کے قیام کی مدت ہی کتنی ہے کم و بیش یہ چار ساڑھے چار سال کا زمانہ ہے اور یہ چند سال حضرت کے جن حالات میں گزرے ہیں ان سے کون ناواقف ہے۔ جمل کے فتنہ سے فارغ ہو کر کوفہ تشریف لائے پھر کیا ایک دن بھی آپ کو اس کے بعد چین سے بیٹھنے کا موقعہ ملا، زیادہ وقت تو صفین کی جنگ کے نذر ہوا، پھر خوارج نکل پڑے۔ الغرض شامیوں اور خارجیوں کی آویزش ہی میں یہ ساری مدت قریب قریب ختم ہوئی اور اسی عرصہ میں جب فتنوں کا یہ سیلاب مختلف شکلوں میں برپا ہی تھا کہ آپ کی شہادت کا فاجعہ پیش آگیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جس شخص کے عزم و استقامت کا یہ حال ہو کہ صفین کی مشہور خطرناک رات جس کا تاریخ میں لیلۃ الہریر کے نام سے تذکرہ کیا گیا ہے، دونوں صفیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئی تھیں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا، لیکن لکھا ہے کہ رات کی نماز اور اوراد و وظائف کا وقت اسی حال میں آگیا، کسی کو کسی کی خبر نہ تھی، لیکن حضرت نے حکم دیا کہ نطع (چمڑے کا فرش) ٹھیک اسی مقام پر بچھا دیا جائے جہاں صف میں آپ کھڑے ہوئے تھے، حضرت والا گھوڑے سے اتر کر جا نماز پر اسی حال میں جم گئے، دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ

فَیُصَلِّیْ عَلَیْہِ وِرْدَہٗ وَالسِّھَامُ تَقَعُ بَیْنَ یَدَیْہِ وَتَمُرُّ صِمَاخَیْہِ یَمِیْنًا وَّشِمَالاً فَلَا یَرْتَاعُ لِذٰلِکَ وَلَا یَقُوْمُ حَتّٰی

اسی پر اپنے مقررہ وظائف آپ نے پورے کئے حالانکہ تیران کے آگے بھی گر رہے تھے اور کان کے پردوں کے سامنے دائیں بائیں گزر رہے تھے مگر دل میں کسی قسم کی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کہ علاوہ صحابہ کے حافظ ابن حجر نے تہذیب میں صرف ان لوگوں کی فہرست جنھوں نے عموماً قیام کوفہ کے بعد آپ سے حدیثیں سنی ہیں تقریباً پچاس آدمیوں کا نام درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وَخَلَائِق" یعنی ان کے سوا بھی بہت بڑی جماعت آپ سے روایت کرنے والی ہے۔ (دیکھو تہذیب ج ۷ ص ۳۷۵)

اور واقعہ تو یہ ہے کہ ایک نہیں متعدد مجموعے جب اپنے دستِ مبارک سے لکھ لکھ کر آپ نے لوگوں میں تقسیم کئے تھے جن کا میں پہلے ذِکر کرچکا ہوں اس زمانے میں تحریری اشاعت کا جس کا یہ حال ہو، زبانی تقریراً روایتوں کے پہنچانے میں اس نے جو کچھ کیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔

باطل کے مقابلہ میں حق کا یہ سیلاب جو آپ کی طرف سے بہایا گیا تھا یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے باطل کے زور کے توڑنے میں مدد نہ ملی ہوگی، لیکن آپ ہی سے ذہبی نے آپ کا جو یہ قول نقل کیا ہے کہ لوگوں سے خطاب کرکے آپ فرمایا کرتے تھے:

حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا یَعْرِفُوْنَ وَ	اپنی باتوں کو لوگوں کے سامنے بیان کیا کرو جنہیں جانتے
دَعُوْا مَا یُنْکِرُوْنَ (تذکرہ ص ۱۲)	پہچانتے ہو اور جنہیں نہ پہچانتے ہو انہیں چھوڑ دو۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جعلی حدیثوں کی روایت کرنے کا جو سلسلہ جاری ہوگیا تھا اس کو روکنے کے لئے آپ کی طرف سے روایت کی تکثیر کا جو طریقہ بطور ردّ عمل کے اختیار کیا گیا تھا، غالباً کافی ثابت نہ ہوا، اسی لئے جعلی روایتوں کو صحیح حدیثوں سے جدا کرنے کے لئے مسلمانوں کو ایک اور کسوٹی کے اختیار کرنے کا یہ نیا مشورہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے دیا گیا، حاصل جس کا بظاہر یہی ہے کہ اسلامی کلیات اور اسلامی تعلیم کی روح سے جو حدیثیں مطابق ہوں صرف ان ہی کو قبول کرنا چاہئے اور قرآن[1] جس دانش و عقل کو آدمی کے اندر پیدا کرتا ہے جو چیزیں اس کے مخالف ہوں

[1] میں نے ان الفاظ کا قصداً اضافہ کیا ہے، وجہ یہ ہے کہ اگر مطلق عقل کو معیار بنالیا جائے تو ہر زمانے کی عقل کا معیار مختلف ہوتا ہے، بالکل ممکن ہے کہ آج سے سو سال پہلے کی عقل ایک چیز کو قبول نہ کرتی ہو لیکن سو سال بعد اسی کو قبول کرنے لگے۔ پس اصلی معیار حدیثوں کے رد و قبول کا قرآنی عقل کو قرار دینا چاہئے۔

ان کو ترک کردینا چاہئے کیونکہ یہ مطلب ان الفاظ کا اگر نہ لیا جائے اور ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے اس کا مآل تو پھر وہی ہوگا جو کذب علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فتنے کے بعد ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اختیار کیا تھا یعنی بالکلیہ حدیثوں کے سننے اور سنانے کے قصے کو ختم کردیا جائے حالانکہ نہ خود اس پر آپ عامل تھے اور نہ عقلاً یہ بات آدمی کی سمجھ میں آتی ہے، آخر حضرت والا کی زندگی میں بڑے بڑے صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود تھے۔ پھر کیا ان کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کی ان ہی روایتوں کو تسلیم کرنا چاہئے، جن سے تم پہلے سے واقف ہو اور جن کا علم پہلے سے نہ ہو، ان کو چھوڑ دینا چاہئے۔

بہرحال میرا خیال یہی ہے کہ حدیثوں کے ردّ و بدل کا ایک معیار مذکورہ بالا الفاظ میں آپ نے پیش کیا ہے اور یہ وہی معیار ہے جس پر آخر وقت تک محدثین عامل رہے ہیں تو سمجھتا ہوں کہ ابن جوزی نے یہ کلیہ بیان کرتے ہوئے کہ

كُلُّ حَدِيْثٍ رَأَيْتَهُ يُخَالِفُ الْعُقُوْلَ اَوْ	جس حدیث کو تم پاؤ کہ عقول اور اصول کے مخالف ہو تو
يُنَاقِضُ الْاُصُوْلَ فَاعْلَمْ اَنَّهُ مَوْضُوْعٌ	سمجھ لیا کرو کہ وہ موضوع یعنی جعلی اور گھڑی ہوئی ہے۔

اسی کی تشریح ان الفاظ میں جو کی ہے کہ

اَوْ يَكُوْنُ مِمَّا يَدْفَعُهُ الْحِسُّ وَالْمُشَاهَدَةُ	یا حدیث ایسی ہو کہ حواس و مشاہدہ اسے مسترد کرے
اَوْ مُبَايِنًا لِنَصِّ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ الْمُتَوَاتِرَةِ	یا اللہ کی کتاب اور متواتر حدیث یا قطعی اجماع کے
اَوِ الْاِجْمَاعِ الْقَطْعِيِّ حَيْثُ لَا يَقْبَلُ شَيْءٌ	مخالف ہو، یعنی کسی تاویل کی گنجائش اس حدیث میں
مِّنْ ذٰلِكَ التَّاوِيْلَ۔ (فتح الملہم للعثمانی ص۱۶)	باقی نہ رہے۔

یہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے پیش کردہ معیار ہی کی دوسری تعبیر ہے، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف مقدمۂ صحیح مسلم میں ایک روایت یہ بھی جو منسوب کی گئی ہے کہ جعلی حدیثوں کے فتنہ کا تذکرہ کرکے آپ نے فرمایا کہ

لَمْ نَاخُذْ مِنَ النَّاسِ اِلَّا مَا نَعْرِفُ	ہم لوگوں سے نہیں لیتے مگر ان ہی حدیثوں کو جنھیں

(ص ۱۲۸) ہم جانتے پہچانتے ہیں۔

حالانکہ دوسری روایت میں ان ہی ابن عباسؓ کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس فتنے کا تذکرہ کر کے کہتے تھے:

تَرَكْنَا الْحَدِيْثَ عَنْهُ۔ اسی وجہ سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔

اگر تعدد روایت پر ابن عباسؓ کے ان دو مختلف بیانوں کو محمول کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے تو انہوں نے بھی ارادہ کیا تھا کہ آئندہ سے حدیثوں کے سننے سنانے کے قصے کو ختم ہی کر دیا جائے لیکن پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس پیش کردہ معیار کو آپ نے قبول کر لیا اور اسی کے بعد یہ مسلک اختیار فرمایا کہ صرف ان ہی حدیثوں کو ہم قبول کریں گے جنہیں ہم پہچانتے ہوں یعنی "مانعرف" کو قبول کریں گے۔ ابن عباسؓ کے اسی قول کی تشریح کرتے ہوئے الاستاذ العلامہ العثمانیؒ نے بھی لکھا ہے کہ

اَیْ مَا یُوَافِقُ الْمَعْرُوْفَ اَوْ نَعْرِفُ فِیْهِ اِمَارَاتَ الصِّحَّةِ وَسِمَاتِ الصِّدْقِ (فتح الملہم ص ۱۲۸) یعنی مانوس جانی پہچانی ہوئی روایتوں کے جو موافق ہوں یا ان میں صحت کی نشانیاں اور سچائی کے علامات پائے جائیں

اور یہ بجنسہ وہی مطلب ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے الفاظ سے فقیر سمجھنا چاہتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عجیب و غریب فتنے کے مقابلے میں جس کو اگر بڑھتے ہوئے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا تو پیغمبرؐ کے صحابیوں اور پیغمبرؐ کی حدیثوں دونوں کا معاملہ ایسے اشتباہی وساوس کا شکار ہو جاتا جن کی تاریکیوں کا دور کرنا آسان نہ تھا لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان ہی بے چینیوں اور پریشانیوں میں جن میں آپ کی خلافت کا پورا زمانہ ختم ہوا، اس فتنے کی اہمیت کو محسوس کر کے علماً و عملاً آپ سے اس کے مقابلے میں جس قسم کی کوشش ممکن تھی کرتے رہے جھوٹ کے مقابلہ میں صحیح معلومات کا جو ذخیرہ آپ کے پاس تھا اس کی اشاعت فرماتے رہے اور صحیح حدیثوں کو جعلی و مصنوعی روایتوں سے جدا کرنے کے لئے ایک ایسا علمی معیار مسلمانوں کے

حوالہ آپ نے کردیا جو اسی زمانے میں نہیں بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا آخر وقت تک اہل علم اس سے کام لیتے رہے اور آئندہ لیتے رہیں گے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ پیش کردہ معیار بہرحال ایک علمی معیار ہے اس سے صحیح معنوں میں وہی لوگ زیادہ کام لے سکتے تھے یا اب بھی لے سکتے ہیں جن کے متعلق ابن دقیق العید نے یہ سچی بات لکھی ہے کہ

حَصَلَتْ لَهُمْ لِكَثْرَةِ مُحَاوَلَةِ اَلْفَاظِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَيْئَةٌ نَفْسَانِيَّةٌ وَمَلَكَةٌ قَوِيَّةٌ يَعْرِفُوْنَ بِهَا مَا يَجُوْزُ اَنْ يَكُوْنَ مِنْ اَلْفَاظِ النُّبُوَّةِ وَمَا لَا يَجُوْزُ۔ (فتح الملہم ص ۱۶)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک کی کثرت استعمال اور ان کے برتنے میں مشغولیت کی شدت ان لوگوں میں ایک خاص قسم کا سلیقہ پیدا کردیتی ہے اور اور ایسی غیر معمولی حذاقت جس کی وجہ سے وہ اس کو پہچاننے لگتے ہیں کہ کون سے الفاظ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب درست ہوسکتا ہے اور کس کا انتساب درست نہ ہوگا۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ آج ہی نہیں اسی زمانہ میں جس وقت یہ معیار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے مسلمانوں میں پیش کیا گیا تھا جو اہلِ علم کا طبقہ تھا وہ تو اس سے مستفید ہوا، گزرچکا کہ ابن عباسؓ نے اسی مسلک کو اختیار فرمالیا تھا، اور ابن عباسؓ تو خیر ابن عباسؓ ہی تھے واقعہ یہ ہے کہ کوفہ کو پایۂ تخت خلافت مقرر کرکے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب یہاں قیام اختیار فرمایا تو اس سے پہلے اس شہر میں ایک گروہ ان بزرگوں کا پھیل چکا تھا جن کی تعلیم و تربیت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحبت میں ہوئی تھی، یہ وہی لوگ تھے جن کو کوفہ میں پاکر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا:

اَصْحَابُ عَبْدِ اللهِ سِرَاجُ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ (ابن سعد ج ۶ ص ۴)	عبداللہ کے صحبت یافتہ لوگ اس آبادی (کوفہ) کے چراغ ہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ کا کوفہ میں کم و بیش بیس سال تک قیام رہا تھا[1] اور ایک بڑا گروہ آپ کے تلامذہ کا کوفہ میں پیدا ہو گیا۔ اہلِ علم کا یہ گروہ پہلے سے کافی صلاحیتوں کا مالک ہو چکا تھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تشریف فرمائی نے ان کے لئے وہی کام کیا جو سونے میں سہاگہ کرتا ہے۔ گویا ان کی علمی شراب دو آتشہ ہو گئی، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی و علمی قیادت کا بہت بڑا حصہ اس وقت تک کوفہ کے ان ہی بزرگوں کو حاصل ہے[2]۔

واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دوسرے مسائل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اس غیر مترقبہ صحبت سے اس طبقہ نے فائدہ اٹھایا تھا، اسی طرح آپ نے حدیثوں کی جانچ کا جو معیار کوفہ والوں کو دیا، ایک طرف عبداللہ بن مسعودؓ کے حلقہ کے مشہور رکن علقمہ کہتے تھے کہ

اِنَّ مِنَ الْحَدِیْثِ حَدِیْثًا لَہٗ ضَوْءٌ کَضَوْءِ النَّھَارِ تَعْرِفُہٗ وَاِنَّ مِنَ الْحَدِیْثِ حَدِیْثًا لَہٗ ظُلْمَۃٌ کَظُلْمَۃِ اللَّیْلِ تُنْکِرُہٗ۔ (ص ۱۲۹)	حدیثوں میں بعض حدیثیں ایسی ہیں کہ ان کی روشنی دن کی روشنی کے مانند پہچانی جاتی ہیں اور ان ہی حدیثوں میں بعض حدیثیں ایسی بھی ہیں کہ جن کی تاریکی رات کی تاریکی جیسی ہے جس سے تم مانوس نہ ہو گے۔

یہ اور اس قسم کی بیسیوں عالمانہ باتیں ان بزرگوں سے کتابوں میں منقول ہیں جنہیں ابن مسعودؓ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد خوش قسمتی سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی صحبت اتفاقاً کوفہ میں قیام کی وجہ سے میسر آگئی تھی لیکن اسی کوفہ میں حضرت والا کے اردگرد ایک اور طبقہ بھی جمع ہو گیا تھا جس کو اس ماحول سے استفادہ کا موقعہ نہیں ملا تھا، جو ماحول عہدِ فاروقی کے ولاۃ و حکام خصوصًا

---

[1] آپ کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس فرمان کے ساتھ کوفہ بھیجا تھا کہ میں تم لوگوں کے پاس عبداللہ بن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں میں نے یہ قربانی کی ہے کہ بجائے اپنے تم لوگوں کو ابن مسعودؓ سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دے رہا ہوں، چاہئے کہ ان سے جو کچھ حاصل کر سکتے ہو حاصل کرو۔ ابن مسعودؓ اس فرمان کے ساتھ کوفہ آئے اور حویلی بنا کر یہیں مقیم ہو گئے۔ ۳۲ھ میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں مدینہ واپس ہوئے اور مدینہ ہی میں وفات ہوئی۔

[2] میرا اشارہ حنفی مذہب کی طرف ہے جو اس وقت روئے زمین کے مسلمانوں کی اکثریت کی دینی زندگی کا سب سے زیادہ مقبول و پسندیدہ ہر دل عزیز قالب ہے۔ ۱۲

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بدولت کوفہ میں پیدا ہوگیا تھا، زیادہ تر ان میں بادیۂ عرب کے وہی سادہ دل سپاہی تھے جو مسلمان ہو ہو کر اسلام کی فوجی چھاؤنیوں میں جنگی اغراض کو پیش نظر رکھ کر آئے دن شریک ہوتے رہتے تھے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سبائی جو عام مسلمانوں کے ساتھ گھلے ملے ہوئے تھے اور جس میں صلاحیت پاتے ان کو اپنے خاص خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بدقسمتی سے سبائیوں کے خیالات کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ جس قسم کی ذہنیت ان خیالات کے قبول کر لینے کے بعد پیدا ہوجاتی تھی، قدرتاً جس ذہنیت کے لوگ سبائیوں کی صحبت میں جاتے تھے اس ذہنیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صحیح کو غلط روایتوں سے جدا کرنے کا جو معیار بارگاہِ مرتضوی سے مسلمانوں کو ملا تھا اس معیار کے استعمال کی صلاحیت ہی اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں میں باقی نہیں رہ سکتی تھی، خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق ان کے خیالات عجیب و غریب تھے اور ان ہی خیالات کی بنیاد پر حضرت والا کے سامنے آپ ہی کو خطاب کر کے ایسی باتیں کہہ دیا کرتے تھے کہ ان کے ذکر سے بھی قلم جھجکتا ہے۔ اسی روایت سے اندازہ کیجئے، جس کا ذکر حافظ ابن حجر نے حبیب بن صہبان کے حوالہ سے لسان المیزان میں درج کیا ہے یعنی حبیب کہتے تھے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، اسی سلسلہ میں ذکر دابۃ الارض کا بھی آپ کی زبانِ مبارک پر آیا اور آپ نے اس کے صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

تَاكُلُ بِفِيهَا وَتُحْدِثُ بِاسْتِهَا۔ منہ سے کھاتا ہے اور چوتڑ سے فضلہ نکالتا ہے۔

حبیب کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ رشید ہجری (جو کوفہ کے فوجیوں میں ایک ممتاز اور نمایاں سپاہی تھا) عین خطبہ کے درمیان اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ

اَشْهَدُ اَنَّكَ تِلْكَ الدَّابَّةُ[1] (ص ۴۶۰) میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ دابہ تم ہی ہو۔

---

[1] قرآن مجید کی سورۂ نمل کی مشہور آیت وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ میں دابۃ کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مفسرین کی رائیں مختلف پہلوؤں سے اتنی مختلف ہیں کہ صاحب بحر کو لکھنا پڑا کہ اِنَّهُمْ اخْتَلَفُوْا فِيْ مَاهِيَّتِهَا وَشَكْلِهَا وَمَحَلِّ خُرُوْجِهَا وَعَدَدِ خُرُوْجِهَا وَمِقْدَارِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا تَفْعَلُ بِالنَّاسِ وَمَا الَّذِيْ تَخْرُجُ بِهٖ (باقی بر صفحہ آئندہ)

افسوس ہے کہ حبیب نے اس کے بعد قصہ کو مختصر کر دیا۔ یعنی آگے صرف یہ بیان کیا کہ

فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ قَوْلاً شَدِيْدًا۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر نہایت سخت بات رشید کو کہی۔

لیکن اس کی تشریح نہیں کی کہ وہ کیا سخت بات تھی۔

اسی رشید الہجری کے متعلق ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں الشعبی کے حوالہ سے یہ واقعہ جو نقل کیا ہے، اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ بادیۂ عرب کے ان سادہ لوح سپاہیوں کی ذہنیت کتنی بگاڑ دی گئی تھی، یہ قصہ تو طویل ہے خلاصہ یہ ہے کہ شعبی کو ایک شخص رشید ہجری کے پاس لے گیا۔ اس شخص کے ساتھ الشعبی کو دیکھ کر خاص طریقہ سے رشید نے انگلیاں بند کیں، یہ ایک رمزی اشارہ تھا کہ یہ نیا آدمی ہماری جماعت سے تعلق رکھتا ہے یا کوئی اجنبی شخص ہے۔ شعبی کو جو لے گیا تھا اس نے بھی انگلیوں کی بندش کے اشارے سے جواب دیا جس کا مطلب تھا کہ اپنا آدمی ہے، تب رشید نے قصہ سنانا شروع کیا:

> میں ایک دفعہ حج کے ارادے سے مکہ گیا اور حج سے جب فارغ ہو گیا تو دل میں خیال آیا کہ امیر المؤمنین سے تازہ ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لئے مدینہ چلوں، یہ سوچ کر میں مدینہ پہنچا اور حضرت علیؓ کے دروازے پر حاضر ہو کر میں نے ایک آدمی سے کہا کہ اندر جا کر سید المسلمین سے عرض کرو کہ رشید الہجری ملاقات کی اجازت چاہتا ہے اس آدمی نے یہ سن کر کہا کہ وہ تو مرے ہوئے ہیں (رشید کا بیان ہے کہ سید المسلمین کے لفظ سے اس آدمی نے سمجھا کہ میں امام حسنؓ

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) اِخْتِلَافًا مُضْطَرِبًا مُعَارِضًا بَعْضُهُ بَعْضًا فَاطَّرَحْنَا ذِكْرَهُ لِاَنَّ نَقْلَهُ تَسْوِيْدٌ لِلْوَرَقِ وَتَضْيِيْعٌ لِزَمَانِ نَقْلِهِ (یعنی دابۃ الارض کی ہیئت و حقیقت، اس کی شکل و صورت اور کہاں سے نکلے گا کتنی دفعہ نکلے گا اور ان کی تعداد کیا ہے نیز یہ کہ دابۃ الارض لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا اور جس دمیہ سے نکلے گا، ان ساری باتوں میں اتنا اختلاف اور اضطراب ہے کہ روایتوں میں سخت قسم کا تعارض پایا جاتا ہے، ان ہی وجوہ سے ان تفصیلات کو میں نے قلم انداز کر دیا ہے کیونکہ کاغذ سیاہ کرنے اور وقت کے ضائع ہونے کے سوا اس کا کوئی حاصل نہیں ہے)۔ سچ پوچھئے تو اس قسم کی باتوں میں سلامتی کی راہ یہی ہے کہ قرآن میں جب اس کی تفصیل نہیں کی گئی اور اجمال سے کام لیا گیا تو ہم بھی لاحاصل تفصیلات کے درپے کیوں ہوں۔ بعض شیعہ فرقوں کا عقیدہ تھا کہ دابۃ الارض سے مراد حضرت علی ہیں، رشید الہجری کا بھی یہی عقیدہ

مراد لے رہا ہوں، اسی لئے ان کے سونے کی خبر اس نے دی، تب میں نے کہا کہ حسنؓ سے اجازت لینے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ امیرالمؤمنین امام المتقین قائد الغر المحجلین کو اطلاع دو کہ رشید ہجری حاضر ہوا ہے، میرے ان الفاظ کو سن کر آدی۔ نے کہا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ ان کی تو وفات ہو چکی، تب میں نے اس شخص سے کہا کہ نہیں ان کا انتقال نہیں ہوا ہے وہ زندہ ہیں اور جیسے زندہ آدمی سانس لیتا ہے اسی طرح سانس لے رہے ہیں، گرم کپڑا آپ کے پسینے سے تر آلود ہے۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ خیر جب ابو محمد یعنی حضرت کے حقیقی راز سے تم واقف ہی ہو تو آؤ اندر چلے آؤ۔ حاضر ہو کر حضرت کو سلام کر کے واپس ہو جانا لیکن ان کو پریشان نہ کرنا۔[1]

الشعبی نے بیان کیا کہ رشید نے اس کے بعد دعویٰ کیا کہ میں امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہوا،

فَأَنْبَأَنِي بِأَشْيَاءَ تَكُونُ۔ (تذکرہ ج ۱ لسان ج ۲ ص ۴۶۱) — پھر آئندہ پیش آنے والی بعض چیزوں سے مجھے حضرت علیؓ نے آگاہ کیا۔

حافظ ابن حجر نے ابن حبان کے حوالہ سے یہ بھی نقل کیا ہے:

كُوفِيٌّ كَانَ يُؤْمِنُ بِالرَّجْعَةِ (ص ۴۶۱) — وہ (یعنی رشید ہجری) "الرجعۃ" کے عقیدے کو مانتا تھا۔

سمجھا آپ نے "الرجعت" کے اس لفظ کا مطلب؟ امام مسلم نے اپنی کتاب صحیح کے مقدمہ میں اس کی تشریح ان الفاظ میں سفیان ثوری کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ

إِنَّ عَلِيًّا فِي السَّحَابِ فَلَا يَخْرُجُ مَعَ مَنْ يَخْرُجُ مِنْ وَلَدِهٖ حَتّٰى يُنَادِيَ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَاءِ يُرِيدُ عَلِيًّا أَنَّهٗ — حضرت علیؓ بادل میں ہیں پھر ان کی اولاد میں سے اس شخص کے ساتھ لوگ نکلیں گے جس کے متعلق آسمان سے پکارنے والا پکارے گا کہ فلاں کے ساتھ نکلو آسمان

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۰، میں اور لسان المیزان ج ۲ ص ۴۶۰ میں شعبی کے حوالہ سے رشید ہجری کا بیان نقل کیا گیا ہے، دونوں کتابوں کی عبارت میں اجزاء کی کمی بیشی پائی جاتی ہے میں نے دونوں کتابوں کی عبارت کو پیش نظر رکھ کر رشید کے بیان کا خلاصہ اور ترجمہ درج کیا ہے۔ ۱۲۔

يُنَادِيْ أَخْرُجُوا مَعَ فُلَانٍ (ص ۱۳۹) — سے پکارنے والے یہ حضرت علیؓ ہوں گے۔

سمجھا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کی عقلی اور ذہنی سطح اتنی پست اور دماغی حال جن کا اتنا زبوں ہو صرف یہی نہیں کہ شہید ہونے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی واپسی کے اسی دنیا میں جو منتظر بنا دیئے جا سکتے ہوں بلکہ منوانے والوں نے جن سے یہ تک منوا لیا ہو کہ حضرت والا بادل میں چھپے ہوئے ہیں، بھلا ایسے سادہ لوحوں کے لئے صحیح اور غلط روایتوں کی تمیز کا وہ معیار کیا کارآمد ہو سکتا تھا جس کے استعمال کے لئے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خاص قسم کی حذاقت اور نبوی الفاظ کے شناخت کی خاص بصیرت ہونی چاہیئے، قرآنی کلیات اور اسلامی روح سے مناسبت اور عدم مناسبت کا پتہ ان غریبوں کو کیا چل سکتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر پیدا کرنے والوں نے اس عقیدے تک کو پیدا کر دیا تھا، حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں ان ہی لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

هُمْ يَعْتَقِدُوْنَ إِلٰهِيَّةَ عَلِيٍّ (لسان ج۲ ص۲۹) — وہ حضرت علیؓ کے متعلق اس کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ خدا تھے۔

سارے قصے یعنی وفات کے بعد آپ سے ملاقات کا ادعا، آئندہ ہونے والے واقعات سے حضرت کا انتقال ہونے کے بعد آگاہ کرنا اور بادل پر سوار ہو کر فضاء آسمانی میں اس لئے گھومتے رہنا کہ اپنی اولاد میں سے جس کسی کی رفاقت پر لوگوں کو آپ آمادہ فرمانا چاہتے ہیں جب وہ اٹھ کھڑا ہو تب بادل ہی سے لوگوں کو پکار پکار کر آگاہ کرنا کہ میری اولاد میں سے یہ شخص جو کھڑا ہوا ہے ساتھ دینے والوں کو چاہیئے کہ اسی کا ساتھ دیں۔ شاید الوہیت ہی کے اس عقیدے کے شاخسانے تھے جو عام طور پر بادیۂ عرب کے ان سادہ دل فوجیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور یہ کوئی ایک دو آدمی ہی نہیں تھے، یحییٰ بن معین کہا کرتے تھے کہ

قَدْ رَأَى الشَّعْبِيُّ رُشَيْدَ الْهَجَرِيَّ وَحَبَّةَ الْعُرَنِيِّ وَأَصْبَغَ بْنَ نُبَاتَةَ لَيْسَ يُسَاوِيْ هٰؤُلَاءِ شَيْئًا (لسان ج۲ ص۴۰)

شعبی نے اس گروہ کے لوگوں میں رشید ہجری، حبۃ العرنی اور اصبغ بن نباتہ کو دیکھا تھا کسی چیز کے برابر نہیں تھے۔ (یعنی ان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی)

بلکہ ان ہی عامر الشعبی جو حدیث اور فقہ دونوں کے امام الائمہ تابعی ہیں، ان کے حوالہ سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہ ٹولی جو کوفہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اردگرد اکٹھی ہوگئی تھی، اور اپنے آپ کو "اصحابِ علیؓ" کے نام سے عموماً موسوم کرتی تھی، ان لوگوں کے متعلق شعبی عموماً اچھے الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ زکریا بن ابی زائدہ نے جو شعبی کے مشہور تلامذہ میں ہیں، ایک دفعہ پوچھا بھی کہ

مَالِكَ تُعِيْبُ اَصْحَابَ عَلِيٍّ وَاِنَّمَا عِلْمُكَ عَنْهُمْ ۔ — آپ کو کیا ہوگیا ہے کہ "اصحاب علیؓ" پر آپ نکتہ چینی کرتے ہیں حالانکہ آپ کا علم ان ہی لوگوں سے ماخوذ ہے؟

اس پر الشعبی نے کہا کہ میں نے ان میں سے کس کس سے علم حاصل کیا ہے؟ زکریا نے بطور مثال کے حارثِ اَعْوَر اور صَعْصَعَہ کا نام لیا حالانکہ کے اس گروہ کے یہ ممتاز لوگ تھے، لیکن شعبی نے ہر ایک کے متعلق اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں اچھے خیالات ظاہر نہیں کئے، حارثِ اعور کے بارے میں کہا کہ حساب اور فرائض اگرچہ اسی شخص سے میں نے سیکھا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ شخص وسواس کے مرض میں گرفتار تھا، صعصعہ کے متعلق کہا کہ بڑا اچھا بولنے والا آدمی تھا لیکن دین کی سمجھ اس میں بھی نہ تھی، شعبی کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

كَانَ خَطِيْبًا وَلَمْ يَكُنْ بِفَقِيْهٍ (تذکرہ ص۵) — وہ واعظ بڑا اچھا تھا لیکن فقیہ نہ تھا۔

الذہبی نے اسی کے قریب قریب الشعبی کے متعلق یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک دفعہ کہنے لگے کہ کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں و مستفیدوں کے سوا میں نے تو کسی کو فقیہ کبھی خیال نہیں کیا، اس پر ایک شخص نے ٹوکتے ہوئے ان لوگوں کا نام لینا شروع کیا جو ابن مسعودؓ سے مستفید نہیں ہوئے تھے اور صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جماعت میں شریک ہوگئے تھے اس فہرست میں بھی حارث، ابن صبوہ، صعصعہ، رشید وغیرہ کا نام ہے، اس وقت بھی الشعبی نے ہر ایک کے متعلق ان ہی خیالات کا اظہار کیا، جن کا ذکر زکریا سے کیا تھا، بلکہ رشید الہجری کا وہ قصہ یعنی مدینہ پہنچنے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے وفات کے بعد ملاقات کرنے کا قصہ اسی موقع پر

بیان کیا تھا۔ تذکرۃ الحفاظ، لسان المیزان وغیرہ میں آپ کو ان چیزوں کی تفصیل مل سکتی ہے۔

بہرحال بادیہ عرب کے مختلف گوشوں سے کوفہ کی چھاؤنی میں اس قسم کا ایک خاص طبقہ جو جمع ہو گیا، جن کے ممتاز افراد کا میں نے ذکر کیا ان کے متعلق یہ سمجھنے کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ اسلام کو انہوں نے اخلاص و صداقت کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا، ان ہی لوگوں کے دوسرے حالات بھی ان ہی کتابوں میں ملتے ہیں جو ان کی راستبازی اور سرفروشی کی واضح شہادتوں پر مشتمل ہیں بلکہ آگے بڑھ کر میں تو یہاں تک کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ رشید ہجری کے اس قصہ کے سوا جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ میں ملاقات کا اس نے دعویٰ کیا ہے جو ظاہر ہے کہ بے اصل واقعہ ہے، اس کے سوا قصداً غلط بیانی کا انتساب بھی اگر کل کی طرف نہیں تو ان کے سربرآوردہ افراد کی طرف مشکل ہے۔ مثلاً حارث اعور ہی ہیں، آج ہی نہیں، الشعبی کے بعض بیانات میں ان کی طرف کذب کے انتساب کو پاکر اسی زمانے میں بعض جلیل القدر بزرگوں نے اس پر اعتراض کیا تھا، حافظ ابن حجر نے تہذیب میں نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی کے سامنے کسی نے شعبی کے اس دعویٰ کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ

أَظُنُّ الشَّعْبِيَّ عُوْقِبَ بِقَوْلِهِ فِي الْحَارِثِ. — میں خیال کرتا ہوں کہ الشعبی کو اسی کی سزا[1] ملی جو حارث کے متعلق وہ کہتے تھے۔ (ج ۲ ص ۱۴۷)

اور یہ بھی یہی بات کہ حارث معمولی آدمی نہیں ہیں وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تعلیمی حلقہ کے ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، حافظ ہی نے لکھا ہے کہ

تَعَلَّمَ الْفَرَائِضَ مِنْ عَلِيٍّ (ج ۲ ص ۱۴۷) — فرائض کا علم حضرت علیؓ ہی سے حارث نے سیکھا تھا۔

اور شعبی نے حارث ہی سے اس علم کو سیکھ کر کوفہ میں اس علم کی اشاعت کی، گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت دنیا میں فرائض کا علم جو پایا جاتا ہے شاید اس کی تعلیمی سند حارث ہی پر ختم ہوتی ہو،

---

[1] حجاج کے زمانہ میں امام شعبی غیر معمولی آزمائشوں میں جو مبتلا ہوئے غالباً اسی کی طرف اشارہ ہے۔ جن کی تفصیل تاریخ کی عام کتابوں میں پڑھئے۔ ۱۲

ابن سعد کے حوالہ سے خود اسی کتاب میں کسی موقعہ پر میں نے بھی نقل کیا ہے کہ اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حارث کو وہ نوشتہ دیا تھا جس میں علم کثیر تھا.

اور ایک حارث ہی کا یہ حال نہیں ہے، حارث تو شعبی کے استاذ تھے. کوفی کی اسی جماعت کی مشہور شخصیت جابر بن یزید الجعفی کی ہے شعبی سے ہمعصری کا تعلق تھا. رائے قائم کرنے والوں کی رائیں اس شخص یعنی جابر جعفی کے متعلق بھی عجیب ہیں. ایک بڑا طبقہ جابر پر معترض ہے لیکن جابر کے مداحوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے. واللہ اعلم اصل واقعہ کیا ہے، لیکن جہاں تک اس طبقہ کے حالات کا میں نے مطالعہ کیا ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کردار سے زیادہ ان کا اصلی عیب یہ تھا کہ جعلی روایتوں کو صحیح حدیثوں سے جدا کرنے کا معیار یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان الفاظ میں جس کی تعبیر کی تھی کہ

حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ	لوگوں سے وہی باتیں (یعنی حدیث کے متعلق) بیان کرو
وَدَعُوْا مَا	جنہیں لوگ جانتے پہچانتے ہوں، اور جن سے نامانوس
يُنْكِرُوْنَ.	ہوں انہیں چھوڑ دو.

اس علوی معیار کے استعمال سے اپنی خاص قسم کی دماغی کیفیت کی وجہ سے وہ معذور تھے آخر خود سوچنا چاہیئے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مواجہہ مبارک میں اور وہ بھی بحالتِ خطبہ بھری مجلس میں بے دھڑک

اَشْهَدُ اَنَّكَ تِلْكَ الدَّابَّةُ	میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ دابہ تم ہی ہو.

کہنے سے جو نہ جھجکتے ہوں اور اس قسم کے دوسرے رکیک وسخیف خیالات پر جنہیں اصرار ہو میں نے نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ ان لوگوں کی عقلیت اس کا فیصلہ کیسے کر سکتی تھی کہ اسلامی تعلیمات سے مانوس وغیر مانوس باتیں کونسی ہیں، ان کی اسی عقلی سادگی سے نفع اٹھانے والے نفع اٹھاتے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے قدرتاً حضرت والا کے ساتھ ان کی عقیدت غیر معمولی طور پر چونکہ بڑھی ہوئی تھی، حریفوں نے اسی کو ہتھکنڈہ بنا لیا حضرت کی طرف

منسوب کر کر کے جس قسم کی باتیں چاہتے ان سے منوا لیتے تھے اور میں تو سمجھتا ہوں کہ حارث اعور کے متعلق احمد بن صالح مصری کی طرف یہ قول جو منسوب کیا گیا ہے یعنی کسی نے احمد کے سامنے الشعبی کے اعتراض کا ذکر کیا تو جواب میں احمد نے کہا:

لَمْ يَكُنْ يَكْذِبُ فِي الْحَدِيْثِ إِنَّمَا كِذْبُهُ فِي رَأْيِهٖ۔ (صـ۱۴۱)	اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حارث حدیث کی روایت میں غلط بیانی سے کام لیتے تھے، بلکہ غلطی کا تعلق حارث کی رائے سے ہے۔

تقریباً یہ وہی توجیہ ہے جسے میں پیش کر رہا ہوں کہ قصداً حضرت علی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کی جرأت یہ لوگ نہیں کر سکتے تھے، ان کے دوسرے حالات سے اس کی تردید ہوتی ہے، البتہ ان لوگوں کی رائے یعنی عقائد و خیالات غلط تھے جن میں مبتلا ہو جانے کے بعد پھر صحیح و غیر صحیح روایتوں میں تمیز کی صلاحیت ہی آدمی میں باقی نہیں رہ سکتی، آخر بادل سے حضرت علیؓ کی آواز سننے کا جو انتظار کر سکتے ہوں، آپ ان لوگوں سے کیا چیز نہیں منوا سکتے۔ الشعبی ہی سے براہ راست ذہبی نے حارث کے متعلق جو یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ

تَخْشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ مِنْهُ الْوَسْوَاسَ (تذکرہ جلد ا صفحہ ۷۸)	مجھے اس شخص کے متعلق اس کا اندیشہ ہے کہ وہ وسواس کے مرض میں مبتلا تھے۔

اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ شعبی کو حارث اعور کی عقلیت پر بھروسہ نہ تھا میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں ایک دوسری مثال سے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں، مذکورہ بالا طبقہ کی ممتاز اور نمایاں شخصیتوں کی فہرست جو میں نے پیش کی ہے، دیکھئے اسی میں ایک صاحب ہیں حبۃ العرنی جن کا نام ہے، ابن معین کے حوالہ سے لسان المیزان کا وہ فقرہ ابھی گزرا ہے جس میں دوسروں کے ساتھ حبۃ کے متعلق ان کا یہ فیصلہ تھا کہ لَا يُسَاوِيْ شَيْئًا (کسی چیز کے برابر نہیں ہے) یعنی اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں لیکن اسی کے ساتھ حافظ ابن حجر نے ہی تہذیب میں

سلمہ بن کہیل جیسی باوقار اور مستند بزرگ ہستی کی یہ چشم دید شہادت بھی نقل کی ہے:

مَا رَأَيْتُهُ قَطُّ إِلَّا يَقُوْلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، إِلَّا أَنْ يُّصَلِّيَ أَوْ يُحَدِّثَنَا۔ (تہذیب جلد ۲ صفحہ ۱۷۶)

میں نے کبھی اس کو (یعنی حبۃ العرنی کو) نہیں دیکھا مگر اسی حال میں پایا کہ سبحان اللہ الحمد للہ لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرتے ہوں، البتہ نماز پڑھ رہے ہوں یا ہم لوگوں سے حدیث بیان کرتے ہوں۔ (اس وقت یہ الفاظ ان کی زبان پر جاری نہ ہوتے)۔

عقلاً اسی قسم کی شخصیت کے متعلق یہ خیال کہ قصداً وہ جعلی روایتیں بنا بنا کر حضرت علیؓ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا کرتے تھے، شاید صحیح نہیں ہو سکتا اور یہی سوال ہے کہ نقد رجال کے ائمہ آخر حبۃ کی روایتوں کی ایک حبۃ بھی قیمت جو نہیں لگاتے۔ ابن معین ہی نہیں، ددری، جوزجانی، نسائی، ابن خراش اور ان کے سوا بھی اس راہ کے ارباب تحقیق کی یہی رائے نقل کی گئی ہے کہ حدیث میں وہ کچھ نہ تھے۔ (دیکھئے تہذیب لفظ حبۃ العرنی ج ۲ ص ۱۷۶) اور اب میں اسی سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ عہد عثمانی کے آخری سالوں میں غلط اور بے سروپا بے بنیاد روایتوں کا سیلاب مسلمانوں میں بہا دیا گیا تھا۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے جیسا کہ بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے ذاتی معلومات کی اشاعت سے اس طوفان کا مقابلہ مناسب خیال فرمایا اور اسی کے ساتھ صحیح اور غلط روایتوں کے جانچنے کا فطری اور عقلی معیار یعنی معروف و مانوس اور منکر وغیر مانوس باتوں میں تمیز کی جو کسوٹی مسلمانوں کو آپ نے عطا فرمائی، اس کو دیکھ کر حریفوں کو دوسری چال سوجھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی زندگی کی حد تک تو خاموش رہے اور گو فتنہ کے سرغنوں کو بھی، جہاں تک آپ سے ہو سکا ختم کر چکے تھے لیکن چند ہی دنوں کے بعد آپ کی شہادت کا حادثۂ فاجعہ پیش آیا۔ حکومت کی باگ جن ہاتھوں میں چلی گئی، سیاسی مہمات کی مشغولیت نے دوسری طرف متوجہ ہونے کا موقعہ ان کے لئے باقی نہ رکھا تھا، چھپی دبی

چنگاریاں فساد کی ملک کے مختلف گوشوں میں جو باقی رہ گئی تھیں، ان کو بھڑکنے اور چمکنے کا ایک مغتنم موقعہ مل گیا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ بقیۃ السیف افراد فتنہ پردازوں کے جو پوشیدہ تھے وہ پھر باہر نکل آئے جیسا کہ تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے یہ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فوجیوں میں گھلے ملے تھے وہ حضرت کی فوج اور آپ کے طرفداروں کے حالات سے بھی خوب واقف تھے جانتے تھے اور ان کی ذہنی اور دماغی کیفیتوں کا ساتھ رہنے کی وجہ سے بہت اچھا اور کافی تجربہ رکھتے تھے جیسا کہ معلوم ہے حضرت کے ساتھ دینے والوں میں غالب تعداد کوفہ کی چھاؤنی کے فوجیوں کی تھی، کوفہ والوں میں عبداللہ بن مسعودؓ کے زمانہ کے جو لوگ تھے ان کو متاثر کرنا ان کے لئے آسان نہ تھا۔ البتہ بادیۂ عرب کے ان سادہ دل سپاہیوں میں کام کرنے کی کافی گنجائش نظر آئی خصوصاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذاتِ اقدس سے جو زیادہ عقیدت رکھتے تھے اور ان کے قلوب مخالفوں کی سیاسی کامیابیوں اور اپنی ناکامیوں سے جیسا کہ چاہیئے تھا محزون و مغموم تھے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ امام برحق کے مقابلہ میں مخالف جماعت کیسے کامیاب ہوگئی۔ بہرحال اسی جماعت کے مختلف افراد کا انتخاب کیا گیا اور کسی دوسرے کے نام سے نہیں بلکہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کر کے ان بے چاروں میں اپنی خود تراشیدہ روایتوں کی ترویج میں نفسیاتی اصول کے تحت جن میں وہ غیر معمولی مہارت رکھتے تھے، بتدریج کوشش شروع کی۔ پھر زیادہ دن گزرنے نہ پائے تھے کہ دیکھا گیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی واقعی روایت کردہ حدیثوں کے ساتھ مصنوعی اور جعلی روایتوں کا ایک انبار ان ہی لوگوں میں جمع ہوگیا جن کو اپنے اس عمل کے لئے فتنہ پردازوں کی اس ٹولی نے چُنا تھا۔ خیال تو کیجئے کہ جابر بن یزید الجعفی جو تقریباً اسی زمانے کا آدمی ہے یعنی الشعبی، عکرمہ وغیرہ کا شاگرد ہے۔ ابتداء میں بے چارے کی دینی حالت غیر معمولی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بہتر تھی، اچھے اچھے لوگ اس کے مداح تھے، سفیان ثوری، شعبہ، وکیع جیسے اکابر اس کے ساتھ خاص عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ اسی آسیب زدہ جماعت سے جابر کا تعلق ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ جابر کے استاذ شعبی کو جب اس کی بھنک لگی تو بطور فہمائش کے اس کو

سمجھایا بھی کہ جابر دیکھ! میں خیال کر رہا ہوں کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھ کر مرے گا۔" (میزان ج ۱ ص ۱۴۵) مگر بدقسمت جابر فتنہ کا شکار ہو چکا تھا۔ اسی کے بعد یہ دعویٰ کرتا ہوئے کہ

اِنْتَقَلَ الْعِلْمُ الَّذِیْ کَانَ فِی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی عَلِیٍّ ثُمَّ مِنْ عَلِیٍّ اِلَی الْحَسَنِ ثُمَّ لَمْ یَزَلْ حَتّٰی بَلَغَ جَعْفَرًا۔ (میزان ج ۱ ص ۱۵۴)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو علم تھا وہ حضرت علیؓ تک منتقل ہوا اور علیؓ سے امام حسنؓ تک یونہی وہ منتقل ہوتا ہوا جعفر تک (یعنی اسی شخص تک پہنچا)۔

ان روایتوں کی تعداد جن کے متعلق جابر مدعی تھا کہ امام جعفر کے والد حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے اس کو پہنچی ہیں جو کچھ بتاتا تھا خود اس کی زبان سے براہ راست سننے والوں کا بیان ہے، امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں بایں الفاظ نقل کیا ہے کہ

سَمِعْتُ جَابِرًا یَقُوْلُ عِنْدِیْ سَبْعُوْنَ اَلْفَ حَدِیْثٍ عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّھَا (مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۵)	میں نے سنا ہے جابر کہتا تھا کہ میرے پاس ستر ہزار ایسی روایتیں ہیں جو کل کی کل ابو جعفر (امام باقر علیہ السلام) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچیں۔

مسلم کے اسی مقدمہ میں ایک روایت پچاس ہزار کی بھی ہے، امام ابو حنیفہؒ تک کے سامنے اس نے تیس ہزار روایتوں کا دعویٰ کیا تھا۔ تہذیب میں ہے:

اَنَّ عِنْدَہٗ ثَلٰثِیْنَ اَلْفَ حَدِیْثٍ لَمْ یُظْھِرْھَا (تہذیب ج ۲ ص ۴۸)	تیس ہزار روایتیں ایسی ہیں (جسے کہتا تھا) کہ اس نے (یعنی جابر نے) لوگوں پر ظاہر نہ کیا۔

واللہ اعلم بالصواب، جابر کے یہ دعوے اس کے خود تراشیدہ دعوے تھے یا جس جماعت میں وہ شریک ہو گیا تھا یعنی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن حبان نے لکھا ہے کہ

کَانَ سَبَائِیًّا مِّنْ اَصْحَابِ عَبْدِاللّٰہِ	جابر دراصل سبائی تھا، یعنی عبداللہ بن سبا کے

ا؎ اسی مقصد کو کبھی ان الفاظ میں ادا کرتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلایا اور جو کچھ آپ کو خدا سے علم ملا تھا سب آپ کو سکھایا۔ حضرت علیؓ نے امام حسنؓ کو امام حسنؓ نے امام حسینؓ کو امام حسینؓ نے اپنے بیٹے کو، تا اینکہ امام جعفر صادق تک اس قصہ کو پہنچایا۔ (میزان ج ۱ ص ۱۵۳)

بنِ سَبَا۔ (میزان ج ۱ ص ۱۵۴) لوگوں میں سے تھا۔

ان لوگوں سے یہ چیزیں اس تک پہنچی تھیں، اس کے ابتدائی حالات جو بیان کئے گئے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ قرین عقل وقیاس یہی ہے کہ جھوٹ کا یہ طومار دوسروں ہی سے اس تک پہنچا تھا[1]۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میری غرض تو صرف یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام سے پھیلانے والوں نے جھوٹ کے جس سمندر کو انڈیل دیا تھا اس کا اندازہ آپ کو صرف اسی ایک قطرے سے ہو سکتا ہے، آخر جب ایک ایک آدمی اپنے پاس ستر ستر ہزار، پچاس پچاس ہزار روایتوں کا پشتارہ رکھتا، ہو تو مجموعی طور پر ان روایتوں کی مقدار کیا ہوگی، جو حضرت والا کے اسم مبارک کی طرف منسوب کر کر کے اس قسم کے مفتون لوگوں میں پھیلا دی گئی ہوں گی۔

انتہا یہ ہے کہ جیسے حضرت علیؓ کی طرف سے تحریری شکل میں بعض روایتوں کی اشاعت عمل میں آئی تھی، ان لوگوں نے اس سے بھی نفع اٹھایا یعنی سینوں سے سینوں میں جو کچھ وہ منتقل کر رہے تھے وہ تو خیر کر رہے تھے، واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھ لکھ کر جعلی روایتوں کی کتابوں کو بھی حضرت والا کے اسم گرامی کی طرف منسوب کر کے پھیلانے والے پھیلا رہے تھے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں نقل کیا ہے کہ

اُتِیَ ابْنَ عَبَّاسٍ بِکِتَابٍ فِیْہِ قَضَاءُ عَلِیٍّ فَمَحَاہُ اِلَّا قَدْرَ وَ اَشَارَ سُفْیَانُ بِذِرَاعِہٖ۔ (ص ۱۲۹)	ابن عباسؓ کے سامنے ایک کتاب پیش ہوئی جس میں لکھا جاتا تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فیصلے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے اس کتاب کو لے کر مٹانا شروع کیا مگر اتنا۔ سفیان نے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا یعنی ایک ہاتھ کے برابر کتاب کو باقی رکھا۔

---

[1] آخر خود خیال کیجئے وکیع بن الجراح جیسے امام تک جس کے متعلق یہ کہتے ہوں کہ خواہ اور کسی چیز میں تم شک کرو لیکن جابر معتبر اور ثقہ آدمی ہے اس میں شک نہ کرنا چاہئے۔ سفیان ثوری کی عقیدت کا حال ابتداء میں اسی کے متعلق اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ نقد رجال کے امام شعبہ نے جابر پر جب جرح کا ارادہ کیا تو سفیان نے کہلا بھیجا تھا کہ جابر پر اگر تم کلام کرو گے تو میں پھر تم پر کلام کروں گا۔ ۱۲

مگر ظاہر ہے کہ ابنِ عباسؓ ہی جیسی ہستی اس کی جرأت کرسکتی تھی، بلکہ قاضی ابن ابی ملیکہ جو طائف کے قاضی تھے ان کے جس قصہ کا ذکر اسی مقدمہ میں امام مسلم نے کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابن عباسؓ کو ابن ابی ملیکہ نے لکھ بھیجا کہ آپ میری راہ نمائی کے لئے کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجئے، حضرت ابن عباسؓ نے اسی "قضار علی" نامی کتاب کو منگوایا، آپ نے چاہا کہ اسی کی نقل کر کے بھیج دوں، لیکن جب لکھنے بیٹھے تو راوی کا بیان ہے

يَمُرُّ بِهِ الشَّيْءُ فَيَقُوْلُ وَاللهِ مَا قَضٰى بِهٰذَا عَلِيٌّ إِلَّا أَنْ يَكُوْنَ قَدْ ضَلَّ۔ (ص ۱۲۹)

ان کے سامنے کوئی بات آتی تو فرماتے قسم ہے خدا کی نہ فیصلہ کیا علیؓ نے یہ مگر یہ کہ وہ راہ سے بھٹک گئے۔

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یقطعًا نہ تھا کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف ضلالت اور بھٹک جانے کا العیاذ باللہ الزام لگا رہے تھے بلکہ اس کی مثال ٹھیک ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے یہ دعویٰ تو وہی کرسکتا ہے جو اسلام کا منکر ہو گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ مقصد اس قسم کے طرزِ بیان سے یہ ہوتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے یہ دین اسلام کا ایسا بدیہی اور واضح عقیدہ ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے کوئی اس دعوے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ابن عباسؓ کا مقصد بھی مذکورہ بالا تعبیر سے محض اس جعلی اقوال کی نوعیت کا اظہار ہے یعنی ان کا مصنوعی ہونا اتنا واضح ہے کہ گمراہ ہوئے بغیر ایسا فیصلہ حضرت علیؓ کر ہی نہیں سکتے۔ الغرض روایت کا وہی معیار جس سے خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے روایات کی تنقید میں کام لینے کی ہدایت فرمائی تھی اور آپ سن چکے کہ ابن عباسؓ نے بھی

فَلَا نَأْخُذُ إِلَّا مَا نَعْرِفُ۔

اب ہم نہیں قبول کرتے مگر ان ہی روایتوں کو جو جانی پہچانی مانوس ہیں۔

کے الفاظ سے اسی طریقۂ کار کا اظہار بھی فرمایا تھا لیکن ظاہر ہے کہ ابن عباسؓ ہونا تو خیر بڑی بات ہے جس قسم کی بصیرت اور پختہ نظری کثرت مشق اور مزاولت، نیز دوسرے اسباب کے تحت ان میں پیدا ہو گئی تھی، یہ بات ہر کس و ناکس کو کیسے میسر آسکتی تھی نتیجہ وہی ہوا جو بداندیشوں

نے سوچا تھا، یہی نہیں کہ جھوٹ کا ایک سیلاب سارے اسلامی علاقوں میں پھیل گیا۔ عبدالملک بن مروان نے اپنے ایک مدنی خطبہ میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک دفعہ کہا تھا کہ

وَقَدْ سَالَتْ عَلَيْنَا اَحَادِيْثُ مِنَ قِبَلِ هٰذَا الْمَشْرِقِ وَلَا نَعْرِفُهَا (ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۱۷۳)	المشرق (عراق وغیرہ جس میں کوفہ، بصرہ وغیرہ الامصار تھے وہاں) سے حدیثوں کا ایسا سیلاب بہہ کر ہماری طرف آگیا ہے جنہیں ہم نہیں پہچانتے

ظاہر ہے کہ ھٰذَا الْمَشْرِقِ سے عبدالملک کا اشارہ اسی مشرقی شمالی حصہ کی طرف تھا، جہاں سے یہ طوفان اٹھایا گیا تھا۔ شاید پہلے بھی اس کا کہیں ذکر آچکا ہے کہ یہ اموی فرمانروا عبدالملک زمانے تک علم حدیث کا طالب العلم رہ چکا تھا اور ممتاز و نمایاں طلبہ میں اس کا شمار تھا اس لئے اس کے قول کو میں نے نقل بھی کیا ہے کہ اس وقت وہ بادشاہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ حدیث کے ایک طالب العلم کی حیثیت سے گفتگو کر رہا تھا، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد اس فتنہ کے نتائج و آثار کو کتنے دنوں تک اور کتنے دور دور فاصلوں پر لوگ محسوس کر رہے تھے۔

اور قصہ صرف اسی پر ختم ہوجاتا تو سمجھا جاتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت کے آخری سالوں میں جو مصیبت دراندازوں کے ہاتھوں حدیث کے اس علم پر نازل ہوئی تھی، یعنی وہی مصیبت جس کے بعد ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جیسا کہ گزر چکا تَرَكْنَا الْحَدِيْثَ عَنْهُ (یعنی رسول اللہؐ سے حدیثوں کی روایت کو ہم نے چھوڑ دیا) کا فیصلہ کر لیا تھا، گویا یہی مصیبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد پھر واپس ہوگئی لیکن اس مصیبت کے مقابلہ کے لئے عوام کے لئے نہ سہی مگر خواص کے لئے تو لَمْ نَاْخُذْ مِنَ النَّاسِ اِلَّا مَا نَعْرِفُ (ہم نہیں قبول کریں گے لوگوں سے مگر ان ہی حدیثوں کو جنہیں ہم جانتے پہچانتے ہیں) کا معیار تو رہ گیا تھا۔

مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کوفہ پہنچ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے جن معلومات اور مسموعات کی اشاعت کی طرف توجہ فرمائی تھی، ظاہر ہے کہ وہ معمولی معلومات نہ تھے

یوں بھی سوچنا چاہئے کہ حضرت علیؓ جو آٹھ نو سال کی عمر سے آخر وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور بقول شخصے اس وقت بہ ظاہر علیحدہ ہوئے جب دیکھا گیا کہ دفن کر کے روضۂ مبارک سے وہ باہر نکل رہے ہیں، اس دوامی رفاقت واستمراری معیت کے ساتھ ساتھ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے جو گوناگوں روابط تھے اور ان روابط کی وجہ سے نبوت کے متعلق معلومات کا جو قیمتی سرمایہ ان کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ معلومات کا یہی سرمایہ جب وقفِ عام کر دیا گیا ہو تو اس غیر مترقبہ نعمت کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے بقول حافظ الدنیا شیخ ابن حجر کہ پیغمبر کے متعلق جس شخص کے معلومات کا یہ حال ہو کہ

هٰذِهٖ عَائِشَةُ اَخَصُّ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَقُوْلُ لِسَائِلِهَا عَنْ شَيْءٍ مِّنْ اَحْوَالِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَلْ عَلِيًّا (تہذیب ج ۷ ص ۳۳۷)	یہ عائشہ صدیقہؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں میں سب سے زیادہ خصوصیت رکھتی ہیں، جب ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے متعلق کوئی کچھ دریافت کرتا تو فرماتیں کہ علیؓ سے پوچھو۔

یہ آخری مہر توثیق اس علم کی وسعت کے متعلق ہو سکتی ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس تھا لیکن اس علم کا انجام بھی کیا ہوا؟ کسی دوسری جماعت کے آدمی نے نہیں بلکہ ایک ایسے شخص نے جو "اصحابِ علیؓ" میں شمار ہوتے تھے ان ہی سے مشہور کوفی امام ابو اسحاق السبیعی نے براہِ راست یہ شہادت سنی۔ امام مسلم ہی نے اپنے مقدمہ میں اس کو بھی نقل کیا ہے یعنی

عَنْ اَبِيْ اِسْحَاقَ قَالَ لَمَّا اَحْدَثُوْا تِلْكَ الْاَشْيَاءَ بَعْدَ عَلِيٍّ قَالَ رَجُلٌ مِّنْ اَصْحَابِ عَلِيٍّ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَيَّ عِلْمٍ اَفْسَدُوْا۔ (ص ۱۲۹)	ابو اسحاق سے ان کا یہ بیان نقل کیا جاتا ہے وہ کہتے تھے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد جو نئی باتیں لوگوں نے پھیلائیں تو ایک شخص جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صحبت یافتوں میں تھا کہا کرتا تھا، (ہائے!) کس علم کو ان لوگوں نے غارت کیا۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے جن

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن بن اسحاق الزجاجی کی امالی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بتائے ہوئے یہ کلیات

نَحْوًا مِّنْ عَشْرَةِ اَسْطُرٍ (ج ۲ ص ۲۳۲) تقریباً دس سطروں سے

زیادہ نہ تھے لیکن ابراہیم نے جو ابکری الکرمانی کی نسبت سے مشہور تھے، ان حضرت نے دس سطروں کو دس ورقوں میں پھیلا کر سب کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کر دیا اور نام اس کا "التعلیقہ" رکھ دیا تھا، ابن عساکر کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ ان ہی دس سطروں کو

جَعَلَ هٰذَا الشَّيْخُ اِبْرَاهِيْمُ قَرِيْبًا مِّنْ عَشْرَةِ اَوْرَاقٍ (تاریخ دمشق ج ۲ صـ ۲۳۲) انہیں شیخ ابراہیم نے ان ہی دس سطروں کو دس ورق بنا دیئے۔

اور ایک یہی کیا زندگی کے کن کن شعبوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اسم مبارک سے پھیلانے والوں نے دنیا میں کیا کچھ نہیں پھیلایا ہے جس کی داستان طویل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد کا یہ حملہ اس حملہ سے کہیں زیادہ تباہ کن اور زیادہ سخت تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں علم حدیث پر کیا گیا تھا، ایسی گہری اشتباہی تاریکیاں پھیلا دی گئیں کہ حق و باطل کے امتیاز کی کوئی شکل باقی نہ رہی تھی اور قریب تھا کہ ہمیشہ کیلئے اس کا جہاز غرقاب ہو جائے پس لے دے کر وہی معیار رہ گیا تھا لیکن بار بار عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ ہر عامی و خاصی کہہ دمہ میں اس معیار کے استعمال کا صحیح سلیقہ ہو، یہ مسئلہ آسان نہیں کیونکہ کچھ بھی ہو روایتوں کی پرکھ اور جانچ کا یہ وہی معیار ہے، جس کی عام تعبیر اس زمانہ میں "معیار درایت" سے کرتے ہیں، درایت کے اس معیار کی حقیقت یہی تو ہے کہ چند کلی ضوابط و اصول بنا دیئے گئے ہیں، چاہا گیا ہے کہ جو جزئی روایت سامنے آئے اس کو ان ہی کلیات و ضوابط کی روشنی میں دیکھ کر فیصلہ کیا جائے لیکن درایت کے اس معیار ہی کی حد تک بات محدود نہیں ہے بلکہ کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنے کی ضرورت جہاں کہیں پیش آتی ہے کافی دشواریوں سے دوچار ہونا ناگزیر ہے۔ مشق مزاولت، تکرار، تجربہ و مشاہدے کی کثرت ہی سے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ہدایت فرمائی گئی ہے، آگے بڑھ کر کوئی چاہے تو قرآن میں بھی اس کے اشارے پاسکتا ہے[۱]۔

بہرحال درایت کا یہ معیار روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن جیسا کہ آپ دیکھ چکے ایسی روایتیں جن کا تعلق کسی دین اور مذہب سے ہو، ان کی راہوں میں درایت کا یہ معیار اپنی خصوصیتوں کی وجہ سے چنداں کارگر ثابت نہیں ہوتا، پھر بنی نوع انسانی کے لئے دین کا جو آخری نظام تھا کیا یہ ممکن تھا کہ اس خطرے کے انسداد کا قدرت کی طرف سے اس میں انتظام نہ کیا جاتا۔

جو نہیں جانتے ہیں ان میں شاید یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ روایتوں کی تنقیح و تنقید میں درایت کے معیار کو محدثین نے بعد کو استعمال کیا۔ اور روایتوں ہی کی تنقید کا ایک طریقہ جس

---

[۱] حافظ ابو عمرو بن عبد البر کی کتاب جامع العلم میں اور الخطیب نے الکفایہ میں، نیز دوسری کتابوں میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض ایسی حدیثیں روایت کی گئی ہیں جن کا حاصل یہی ہے کہ مسلمان اپنے احساسات سے مانوس جن روایتوں کو پائیں ان کو قبول کرنا چاہئے اور جن میں ان کے احساسات اجنبیت محسوس کریں ان کو رد کر دینا چاہئے۔ الفاظ یہ نقل کئے جاتے ہیں اِذَا سَمِعْتُمُ الْحَدِيْثَ عَنِّيْ تَعْرِفُهٗ قُلُوْبُكُمْ وَتَلِيْنُ لَهٗ اَشْعَارُكُمْ وَاَبْشَارُكُمْ وَتَرَوْنَ اَنَّهٗ مِنْكُمْ قَرِيْبٌ اَوْلَاكُمْ بِهٖ وَاِذَا سَمِعْتُمُ الْحَدِيْثَ عَنِّيْ تُنْكِرُهٗ قُلُوْبُكُمْ وَتَنْفِرُ مِنْهُ اَشْعَارُكُمْ وَاَبْشَارُكُمْ وَتَرَوْنَ اَنَّهٗ مِنْكُمْ بَعِيْدٌ فَاَنَا اَبْعَدُكُمْ مِنْهُ (دیکھو کفایہ ص۴۳۰) یعنی جب میری طرف منسوب کرکے حدیث بیان کی جائے تو تمہارے دل جسے پہچانتے ہوں اور تمہارے بال اور کھال جس کے لئے نرم پڑجائیں اور پاؤ کہ وہ تم سے قریب ہے تو اس حدیث کے متعلق سمجھو میں تم سے قریب ہوں اور اس کے برخلاف پاؤ تو میں اس حدیث سے دور ہوں مگر ظاہر ہے کہ ان احساسات سے مقصود مسلمانوں کے وہی احساسات ہیں جو قرآن کے زیر اثر ان میں پیدا ہوتے ہیں عموناً خاکسار جس کی تعبیر میں قرآنی عقلیت یا ایمانی ذہنیت سے کیا کرتا ہے۔ باقی دین باختوں کی وہ عقلیت جس سے قرآنی تعلیمات بھی بسا اوقات اچٹ جاتے ہیں جو اپنی اسی عقلیت کو دینی روایات کی تنقید کا معیار بنائیگا وہ حدیث تو حدیث شاید بیسیوں قرآنی آیات کو بھی قرآن سے العیاذ باللہ نکالنے پر مجبور ہوگا بہرحال مذکورہ بالا روایت اگر صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی درایت کے اسی معیار کو استعمال کرنے کا حکم دیا ہے اسی طرح قرآن میں امن اور خوف کی خبروں کے متعلق یہ حکم جو دیا گیا ہے کہ عوام ان کی اشاعت نہ کریں بلکہ رسول یا رسول نہ ہوں تو مسلمانوں میں امر اور حکم کا اختیار جن لوگوں کو ہو ان تک پہنچادیں اور اس کے بعد یہ ارشاد ہوا کہ یہی لوگ استنباط سے کام لیں گے یعنی صحیح اجزاء کو غلط اجزاء سے جدا کرلیں گے۔ دیکھو سورۂ نساء۔ ظاہر ہے کہ روایتوں اور خبروں کے متعلق یہ حکم درایت ہی کے استعمال کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ۱۲۔

میں روایتوں کے راویوں اور رجال کی جرح و تعدیل سے کام لیا جاتا ہے یہی پرانا طریقہ تھا جو محدثین میں مروج تھا مگر میرے نزدیک یہ واقعات و حالات سے عدمِ واقفیت کا نتیجہ ہے روایت کے اس معیار کی تاریخ آپ دیکھ چکے کہ کتنی پرانی ہے۔ اپنا خیال تو یہی ہے کہ اس معیار کی بعض قدرتی خامیوں اور کوتاہیوں کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ الدین الخاتم کے ماننے والوں کے قلوب میں روایتوں کی جانچ پڑتال کے ایک اچھوتے اور قطعاً نئے طریقے کا الہام قدرت کی طرف سے ہوا اور یہ وہی طریقہ ہے جس کی تعبیر محدثین کے حلقوں میں

فن جرح و تعدیل

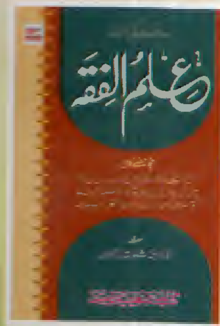
سے کی گئی ہے جس میں روایت کی سند کے ایک ایک راوی کو لیا جاتا ہے اور جن کتابوں میں ان راویوں کے ان صفات و خصوصیات کو کافی تحقیق و تنقیح کے بعد درج کیا گیا ہے جن سے ان کی بیان کردہ روایتیں متاثر ہو سکتی ہیں، ان ہی رجسٹروں کو سامنے رکھ کر ہر راوی کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس فیصلہ کے بعد "روایت" کی جو نوعیت متعین ہوتی ہے، جس درجہ میں شریک ہونے کا حق وہ حاصل کرتی ہے، اسی درجہ میں اس روایت کو جگہ دی جاتی ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے، مذہبی روایات کی تنقیح و تحقیق، تنقید، تغلیط و تصحیح کا یہ خاص طریقہ آخری دین کے ماننے والوں کا خاص الہامی طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے ان خامیوں اور کوتاہیوں کی تلافی ہو جاتی ہے جو درایت والے معیار میں باقی رہ جاتی تھی۔ اس نئے فن کا الہام مسلمانوں کو کیسے ہوا، کن بزرگوں کا ذہن تحقیق کے اس نئے طریقہ کی طرف شروع میں منتقل ہوا اور بتدریج تکمیل کے مدارج تک مسلمانوں کا یہ نیا ایجاد کردہ فن کب اور کیسے پہنچا۔ اس فن سے کام لینے کا صحیح طریقہ کیا ہے، یہ اور اسی قسم کے سارے متعلقہ مباحث کے لئے آئندہ باب کا انتظار کرنا چاہئے۔ وَالْاَمْرُ بِیَدِہٖ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالیٰ۔

تمت بالخیر





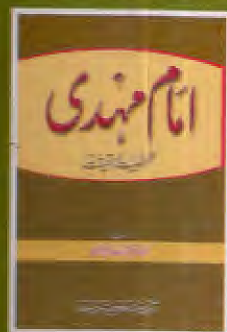












Rs.220/-

NAIMIA BOOK DEPOT
DEOBAND-247554 (U.P.) INDIA
Ph: (01336) 223294(O) 224556(R) 01336-222491(FAX)
e-mail - naimiabookdepot@yahoo.com